READING SECTION
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING SECTION
مارچ 2017
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

شعاع

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

www.paksociety.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرِ منتظم — آذر ریاض

مدیرۂ اعزازی — امت الصبور

فلم/ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالد جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، کوثر خالد 11
نعت، نوربانو محبوب 11
نبیؐ کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

گپ شپ، درویش سمیرا حمید 17
دستک، شاہین رشید 26
بند ھن، رہاج خان 22
جب تجھ سے نا تا، یاسمین اقبال 30

ناول

شہرزاد، صائمہ اکرم 34
خواب شیشے کا، عفت سحر طاہر 236
رقص بسمل، نبیلہ عزیز 254

مکمل ناول

برہا بہاگ کی مینا، سمیرا حمید 184
کارزارِ دعا، مصباح علی سید 100

ناولٹ

شہرِ خطا، نایاب جیلانی 132
محبت بادل بارش، عطیہ خالد 72

افسانے

بہار حاضر ہو، منشا محسن علی 67
زندگی، ماجرہ ریحان 94
ریشم بنجارن، آسیہ مظہر چوہدری 128
چل اٹھری، میمونہ صدف 174
دیوار یار، سمیرا عثمان گل 179

نظم و غزل

نظم، حمایت علی شاعر 265
غزل، خمار بارہ بنکوی 265

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری	
پاکستان (سالانہ) -----	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---	7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	272	پارچے کے جھروکے	امۃ الصبور	284
مسکراہٹیں	ادارہ	266	موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	288
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	282	خوبصورت نغمے	ادارہ	290
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	268			
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	271			

مارچ 2017
جلد 31 شمارہ 7
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: بی ۔۶ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

نگہت سیما

پہلی شعاع

شعاع کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

زندگی ایک مسلسل سفر ہے۔ اس سفر کا ہر مسافر اجل کی راہ پر گامزن ہے۔ فانی انسان دُنیا سے چلا جاتا ہے۔ زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ کسی کے جانے سے وقت نہیں رُکتا۔ کارخانۂ قدرت اپنے معمول کے مطابق معروف عمل رہتا ہے۔ رُتیں بدلتی رہتی ہیں۔ موسم آتے جاتے رہتے ہیں مگر وہ لوگ جن کے عزیز، جن کے پیارے ان سے چھن جائیں، ان کے دل کے نہاں خانوں میں ایک ہی موسم ٹھہر جاتا ہے۔ خزاں کا موسم۔

موت اپنی جگہ ایک بہت اندوہ ناک حقیقت ہے۔ کتنے سفاک کتنے بے رحم ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے مذموم مقاصد کے لیے سینکڑوں لوگوں کے گھروں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔

ایک کے بعد ایک سانحہ اس قوم کا مقدر بن گیا ہے۔ مختصر عرصے کے سکون کے بعد ایک بار پھر وطن عزیز کو دہشت گردی کی تیز لہر کا سامنا ہے۔ ملک کے چاروں صوبے اس کی زد میں ہیں۔ سینکڑوں معصوم بے گناہ انسان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اور سینکڑوں زخمی جو اپنے قیمتی اعضا گنوا کر معذوری کی زندگی گزاریں گے۔ ایک بار پھر وہی مناظر پردۂ اسکرین پر ہیں۔ روتی بلکتی مائیں۔ اپنے پیاروں کی تلاش میں سرگرداں دوڑتے بھاگتے لوگ اور زبانِ خاموشی سے سوال کرتے بے جان لاشے۔ ہمارا قصور کیا تھا؟ ہمیں کس جرم کی پاداش میں زندگی سے محروم کر دیا گیا۔

جہاں جزا و سزا کے قانون پر عمل درآمد ہی نہ ہو، جہاں نہ مجرموں کا سراغ ملے نہ انہیں سزا دی جائے تو پھر وہاں سانحات کا سلسلہ کیسے رُک سکتا ہے۔ آج بھی سانحہ بلدیہ ٹاؤن کے زندہ جلائے جانے والے دو سو ساٹھ انسانوں کے لواحقین انصاف کے منتظر ہیں۔

اس شمارے میں،

کہتے ہیں، حقیقت افسانے سے زیادہ سفاک اور ناقابلِ یقین ہوتی ہے۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، وہ اکثر حقیقت نہیں ہوتا۔ جو کچھ سمجھتے ہیں وہ بعض اوقات محض گمان ہوتا ہے۔ چمکتے روشن چہرے دل میں کتنے داغ چھپائے ہوتے ہیں۔ شہرت اور دولت کے پیچھے بھاگنے والے زندگی میں کیا کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔

اس ماہ سمیرا حمید کا ناول "برہا بھناک کی مینا"، شائع کیا جا رہا ہے۔ سمیرا حمید نے اس میں ایسی ہی کچھ حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔

- کارزارِ دُعا۔ مصباح علی سید کا مکمل ناول،
- نایاب جیلانی کے ناولٹ "شہرِ خطا" کی آخری قسط،
- عطیہ خالد کا ناولٹ۔ محبت، بادل، بارش، تم،
- فاطمہ اکرم، عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- میمونہ صدف، منشا محسن علی، ہاجرہ ریحان، آسیہ مظہر چوہدری اور سمیرا عثمان کے افسانے،
- ٹی وی فنکار وہاج خان اور ثمینہ وہاج خان کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کے تجربات،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مارچ کا شمارہ آپ کو کیسا لگا، آپ کی رائے آپ کے خطوط کے ذریعے ہم تک پہنچے گی۔ ہمیں خط ضرور لکھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

حمد
باری تعالیٰ

خدائے ذوالجلال نے دستِ ہنر دیا ہے
مانگے بنا ہی مجھ کو برگ و ثمر دیا ہے

راحت کی وادیاں دیں امن و سکون کا جھولا
ہر پل خیال اپنا، اپنا ذکر دیا ہے

صحرائے نفس میرا باغ و بہار رکھا
سچ کی تاثیر پائی شیریں اثر دیا ہے

ہستی میری طوفان کی موجوں سے دور رکھی
الفت حبیب کی دی، انوکھا ہنر دیا ہے

تقدیر تیری کوثر رب نے حسین بنائی
فلک حمد کی خاطر لفظی شہر دیا ہے

کوثر خالد

نعت
رسول مقبولؐ

عرش پہ پہنچا ہوا یہ کون تھا
اک خدا تھا دوسرا یہ کون تھا

کس نے پایا امتیازی مرتبہ
سب میں رہ کر بھی جُدا یہ کون تھا

پتھروں کا کس نے چمکایا نصیب
کاشفِ غارِ حرا یہ کون تھا

جب وہ گزرے چاند تاروں نے کہا
دیکھنا یہ کون تھا یہ کون تھا

دل میں آ کر بس گیا محبوب کون
مظہرِ ذاتِ خدا یہ کون تھا

نور بانو محبوب

Downloaded From http://paksociety.com

ہدایت اور علم

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اس ہدایت اور علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا' اس بارش کی مانند ہے جو کسی زمین پر برسی۔ چنانچہ اس (زمین) کا ایک حصہ عمدہ تھا۔ اس نے پانی کو اپنے اندر جذب کیا اور گھاس اور کثیر مقدار میں دیگر جڑی بوٹیاں اگائیں۔ اور اس کا ایک حصہ سخت تھا (جو پانی کو فوری طور پر جذب نہیں کرتا) اس نے پانی کو اکٹھا کر لیا۔ تو اس کے ذریعے سے اللہ نے لوگوں کو نفع دیا۔ انہوں نے خود بھی پیا' جانوروں کو بھی پلایا اور کھیتوں کو بھی سیراب کیا۔ اور وہ بارش زمین کے ایک اور حصے کو بھی پہنچی جو چٹیل تھا (ایسا ہموار اور صاف جہاں پانی ہی نہ ٹھہرے) جس نے پانی اکٹھا کیا نہ کوئی گھاس اگائی۔ چنانچہ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے دین میں سمجھ حاصل کی اور اس ہدایت سے اللہ نے اسے نفع پہنچایا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے بھیجا۔ پس اس نے خود بھی علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھلایا اور اس شخص کی مثال جس نے اس کی طرف سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا (اعراض و گریز کیا) اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جس کے ساتھ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث کا علم حاصل کرتے ہیں اور اس پر عمل کرنے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دینے کے علاوہ اس علم سے مزید استنباط و استخراج کر کے قرآن و حدیث کے فیض کو زیادہ سے زیادہ عام کرتے ہیں' یہ سب سے بہتر لوگ ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو علم تو حاصل کرتے ہیں لیکن اس سے استنباط و استخراج کی استعداد نہیں رکھتے' اس علم سے اگرچہ ان کو خود بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے' تاہم ان کا فیض پہلی قسم کی بہ نسبت کم ہے۔ اس اعتبار سے یہ دونوں قسمیں محمود ہیں۔ (جیسا کہ مثال کا بھی مقصود ہے)

تیسرے وہ لوگ ہیں جو قرآن و حدیث کے علم سے اعراض و گریز کا راستہ اپناتے ہیں' نہ خود اسے سنتے اور پڑھتے ہیں جس سے انہیں فائدہ ہو اور نہ اسے سیکھ کر دوسروں تک پہنچاتے ہیں کہ وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ لوگوں کی بدترین قسم ہے۔ ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا شمار پہلی دو قسموں میں سے کسی ایک قسم میں ہو۔

ہدایت کی طرف بلانا

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''اللہ کی قسم! تیرے ذریعے سے کسی ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ کا ہدایت دے دینا تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ : ''سرخ اونٹوں سے بہتر ہے'' یہ ایک تمثیل ہے' ہر بہتر چیز کے لیے۔ سرخ اونٹ عرب میں بہت بیش قیمت ہوتا تھا۔ اس میں دعوت الی اللہ کی فضیلت اور لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے کی ترغیب

Downloaded From http://paksociety.com

ہے۔ تاہم اس کے لیے پہلے ضروری ہے کہ انسان خود بھی ہدایت کے راستے سے آگاہ اور واقف ہو' اس لیے قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام ہی نہیں دیا جاسکتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری طرف سے لوگوں کو (احکام الٰہی) پہنچا دو اگرچہ ایک آیت ہی ہو اور بنی اسرائیل سے بیان کرو' اس میں کوئی حرج نہیں اور جو مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل : 1۔ اس میں ایک تو قرآن و حدیث کا علم حاصل کرنے اور پھر اسے آگے پھیلانے کی تاکید ہے' جس کو تھوڑا یا زیادہ جتنا بھی علم ہو' وہ اس کی تبلیغ ضرور کرے اور لوگوں تک احکام الٰہی پہنچائے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ تبلیغ و دعوت تو صرف علماء اور سند یافتہ لوگوں ہی کا کام ہے بلکہ ہر شخص اپنے علم کی حد تک اس کا مکلف ہے' حتیٰ کہ کسی کو کسی ایک آیت ہی کا علم ہے' یعنی کسی ایک حکم الٰہی ہی سے وہ آگاہ ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو بھی اس سے آگاہ کرے۔

2۔ اس میں بنو اسرائیل سے بیان کرنے کی جو اجازت ہے' اس سے مراد صرف بعض وہ واقعات اور قصے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں اور وہ صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ اس کا مقصد ہر قسم کی اسرائیلی روایات بیان کرنے کی عام اجازت دینا نہیں ہے' جیسا کہ عام طور پر اس سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔

3۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنے پر سخت وعید ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ احادیث کی تحقیق اور چھان پھٹک نہایت ضروری ہے اور جو حدیث بے سند ہو یا اس کے سلسلہ سند میں متہم یا کاذب راوی ہوں' یعنی شدید ضعف کی حامل ہو تو ایسی روایت کو حدیث رسول کے طور پر پیش کرنا سخت جرم ہے۔ ضعیف روایات کے مختلف درجے ہیں لیکن ان درجات کا علم اسمائے رجال اور اصول حدیث پر گہری اور وسیع نظر کے بغیر ممکن نہیں اور ایسے اصحاب علم جو علوم حدیث پر ماہرانہ نظر رکھتے ہوں بہت ہی قلیل ہوتے ہیں۔

جنت کا راستہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص علم (دین) کی تلاش کے لیے کسی راستے پر چلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔" (مسلم)

فائدہ : علم سے مراد' دین' یعنی قرآن و حدیث کا صحیح علم ہے جو فقہی تعصب کی عینک کے بغیر حاصل کیا جائے' ورنہ فقہی تعصب علم کو بھی حجاب اکبر بنا دیتا ہے۔

اجر عظیم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص ہدایت کی طرف بلائے گا' اس کو ان تمام لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس ہدایت کی پیروی کریں گے اور یہ پیروی کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : اس حدیث کا اگلا حصہ یہ ہے: "جو گمراہی کی دعوت دے گا تو اس کو ان تمام لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جو اس گمراہی کی پیروی کریں گے اور یہ ان گمراہی کی پیروی کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔"

اس میں خیر کی دعوت دینے والوں کے لیے بڑی خوش خبری اور شر کی دعوت دینے والوں کے لیے سخت

Downloaded From http://paksociety.com

وعید ہے۔

صدقہ جاریہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے' مگر تین چیزوں کا ثواب اسے ملتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ اور وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔" (مسلم)

فائدہ : 1۔ عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے" کا مطلب ہے کہ اس پر اجر و ثواب ملنا بند ہو جاتا ہے' تاہم تین عمل ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی ان کا ثواب میت کو پہنچتا رہتا ہے۔ صدقہ جاریہ' جیسے مرنے والا مسجد و مدرسہ' اسپتال اور سرائے وغیرہ بنا جائے تو جب تک لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے' میت کو ثواب پہنچتا رہے گا۔ علم' جس سے فائدہ اٹھایا جائے' کا مطلب ہے' دوسروں کو علم سکھانا' یا تالیفات و تصنیفات کے ذریعے سے علم پھیلانا۔ جب تک اس کا سلسلہ تلمذ قائم اور کتابیں محفوظ و موجود رہیں گے اور لوگ ان سے برابر فائدہ اٹھاتے رہیں گے تو ان کا اجر بھی استاد یا مصنف کتاب کو ملتا رہے گا۔ اولاد کی نیک تربیت بڑی ضروری ہے تاکہ وہ مرنے کے بعد صحیح طریقے سے اپنے والدین کے حق میں دعائے خیر کرتی رہے کیونکہ اولاد کی دعا والدین کے حق میں مفید ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"دنیا ملعون ہے اور جو کچھ سامان اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے' سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے اور عالم یا متعلم کے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے فرمان) وما والاہ کا مطلب ہے: اللہ کی اطاعت (ایسے امور بجالانا جن میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کی قربت کا پہلو ہو۔)

فوائد و مسائل : 1۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی دنیا اور اس کا ساز و سامان ملعون ہے بلکہ دنیا کا وہ مال و متاع ملعون ہے جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کردے۔ یا اس کے لیے ملعون ہے جس کو دنیا میں اللہ یاد ہی نہ آئے۔

2۔ اسے کتاب العلم میں اس لیے بیان کیا ہے کہ علم دین کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ انسان کو علم ہو کہ فلاں بات یا کام اللہ کی رضا کا اور فلاں اس کی ناراضی کا باعث ہے' اسی لیے اس میں عالم اور متعلم کو مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص علم کی جستجو میں نکلتا ہے تو وہ لوٹنے تک اللہ کی راہ میں (شمار) ہو گا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن بھلائی سے ہرگز سیر نہیں ہوتا' یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل جنت میں پہنچ جاتا ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے میری فضیلت تمہارے ایک ادنیٰ آدمی پر۔" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتے اور آسمان و زمین کی مخلوق' حتیٰ کہ چیونٹی اپنے بل میں اور مچھلی تک (پانی میں) لوگوں کو بھلائی سکھلانے والوں پر (اپنے اپنے انداز میں) رحمت بھیجتے اور دعائیں کرتے ہیں۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

Downloaded From http://paksociety.com

فوائد و مسائل : 1- عالم سے مراد قرآن و حدیث کا عالم ہے، جو فرائض و سنن کی پابندی کے ساتھ تعلیم میں مصروف رہتا ہے۔ اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جو اپنا زیادہ وقت عبادت الٰہی میں گزارتا ہے۔ اس کے نوافل اور کثرتِ ذکر کا فائدہ چونکہ اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے، جب کہ عالم کے علم کا فیض دوسرے لوگوں تک بھی پہنچتا ہے، اس لیے وہ عابد پر بہت زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

صلوٰۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہوتے ہیں: رحمت بھیجنا، فرشتوں کی طرف ہو تو معنی ہیں: مغفرت کی دعا کرنا اور دوسری مخلوق، انسان و حیوان کی طرف ہو تو معنی ہیں: دعا و التجا کرنا۔ گویا معلم خیر پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتا ہے، فرشتے اس کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں اور دوسری مخلوق اس کے حق میں خیر کی دعائیں کرتی ہے۔

اس میں عالم کی فضیلت اور علما کی توقیر و تکریم کا بیان ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"جو شخص ایسے راستے پر چلے جس میں وہ (دین کا) علم تلاش کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے اور فرشتے طالب علم کے لیے، اس کے اس عمل سے خوش ہو کر، اپنے پر رکھ دیتے ہیں اور عالم کے لیے آسمان و زمین کی ہر مخلوق، حتیٰ کہ مچھلیاں پانی میں مغفرت کی دعا کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے، جیسے چاند کو سارے ستاروں پر فضیلت حاصل ہے اور علما انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے اپنے ورثے میں دینار اور درہم نہیں چھوڑے، وہ تو (دین کا) علم ہی ورثے میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ چنانچہ جس نے وہ علم حاصل کیا، اس نے (شرف و فضل کا) ایک بڑا حصہ حاصل کر لیا۔" (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : اس میں بھی گزشتہ حدیث کی طرح علم دین حاصل کرنے کی فضیلت اور علما کے شرف و احترام کا بیان ہے۔ فرشتوں کے پر رکھ دینے کا مطلب ہے کہ وہ اپنے پروں کو بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں، جیسے علم و ذکر کی دوسری محفلوں کو وہ گھیر لیتے ہیں۔

لوگوں تک پہنچانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"اللہ تعالیٰ اس آدمی کو تر و تازہ رکھے جو ہم سے کوئی بات سنے، پھر اسے اسی طرح دوسروں تک پہنچا دے جس طرح اس نے سنا۔ اس لیے کہ بہت سے ایسے لوگ جن کو بات پہنچائی جائے، (پہلے) سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : اس میں جہاں علم کی فضیلت کا بیان ہے، وہاں دعوت و تبلیغ کی ترغیب بھی ہے۔

آگ کی لگام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس سے علم دین کی کوئی بات پوچھی جائے، پھر وہ اسے چھپائے تو قیامت والے دن اس کو آگ کی لگام دی جائے گی۔" (اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ سائل کو دین کی صحیح بات نہ بتلانا سخت کبیرہ گناہ ہے جس پر جہنم کی شدید وعید ہے۔

اللہ کی رضا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص وہ علم جس سے اللہ کی رضامندی طلب

Downloaded From http://paksociety.com

کی جاتی ہے' اس لیے حاصل کرے تاکہ اس کے ذریعے سے دنیا کا ساز و سامان حاصل کرے' تو وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔"
(اسے ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ علم دین صرف اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جائے۔ اگر دنیا حاصل کرنے کا مقصد پیش نظر ہو گا تو یہ بہت بڑا جرم ہے کہ دین کا عالم جنت کی خوشبو تک سے محروم رہے گا۔ ہاں بغیر قصد و نیت کے دنیا مل جائے تو اور بات ہے' وہ انسان کے لیے نقصان دہ نہیں۔

عالم کی وفات

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"اللہ تعالیٰ علم اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں (کے سینوں) سے کھینچ لے' لیکن وہ علم کو علما کی وفات کے ذریعے سے اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ کسی عالم کو باقی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے۔ چنانچہ ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ اور (یوں) خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 یہ قرب قیامت کی ایک علامت کا بیان ہے کہ علمائے دین ناپید ہو جائیں گے اور جاہل لوگ سردار' پیشوا اور امام بن جائیں گے' جن کو قرآن و حدیث کا علم ہی نہیں ہو گا' اس کے باوجود وہ مفتی اور مجتہد بنے ہوں گے اور اپنے فتووں اور خود ساختہ مسئلوں سے اپنے ساتھ دوسرے لوگوں کی بھی گمراہی کا باعث بنیں گے۔

2۔ اس میں جہاں اس امر کی ترغیب ہے کہ علمائے دین زیادہ سے زیادہ تیار کیے جائیں' وہاں اس کی بھی تاکید ہے کہ جاہلوں کو دین کا پیشوا بنانے سے اجتناب کیا جائے۔

کام کا آغاز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر اہم کام جو اللہ کی حمد و ثنا سے شروع نہ کیا جائے' ناقص اور بے برکت ہے۔" (یہ حدیث حسن ہے۔ اسے ابوداود وغیرہ نے روایت کیا ہے۔)

فائدہ : ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس اہم کام کی ابتدا بسم اللہ سے نہ کی جائے' وہ بے برکت ہے۔ بہرحال ہر کام کے آغاز میں اللہ کا نام لینا یا اس کی حمد کرنا دیگر دلائل کی روشنی میں مستحب ہے۔

صبر

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کسی بندے کی اولاد فوت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کی اولاد (کی روح) کو قبض کیا ہے؟"

تو وہ کہتے ہیں: "ہاں۔" چنانچہ اللہ فرماتا ہے: "تم نے اس کے دل کا پھل قبض کیا ہے؟"

وہ کہتے ہیں: "ہاں۔"

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "میرے بندے نے کیا کہا؟"

وہ کہتے ہیں: اس نے تیری حمد بیان کی اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : اس میں مصیبت کے وقت صبر کرنے اور اللہ کی حمد کرنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ خاص طور پر اولاد کی دائمی جدائی کے صدمے پر جزع فزع اور بے صبری کا مظاہرہ کرنے کی بجائے اللہ کی رضا و تقدیر پر صبر و شکر کرنا بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

کیٹ درویش

سمیرا حمید

ایک سادہ درویش۔۔۔ جس کے ہاتھ میں زمرد جڑی انگوٹھیاں ہیں نہ گلے میں موتی جڑی مالائیں۔ نہ ہاتھ کی تسبیح اس کے ولی ہونے کی گواہی دینے کو موجود ہے۔ نہ قلندرانہ چوغہ اور کشکول درکار ہیں کہ اوڑھ کر 'تھام کر وہ در در بھٹکے اور "حق ہُو" کی صدائیں لگائے۔ وہ چار دیواری میں رہتی ہیں۔ قلم کو روشن کر کے' لفظوں کو عیاں کرتے' وہ "رزق حرام" کی پُرزور ممانعت کرتے' رزق حلال کو اسلام کی اساس قرار دیتے "راجہ گدھ" لکھتی ہیں۔

" حکومت کے ایک پروگرام کے تحت باب (bob) جو ایک روایتی امریکی شخص تھا ہمارے گھر رہنے لگا۔ باب مجھ سے پوچھا کرتا۔

"بانو آپا! مجھے بتائیے کہ اسلام کس طرح دوسرے مذاہب سے بہتر ہے؟"

چونکہ میں اناڑی تھی تو میں کہتی۔

"مسلمانوں کا یقین ہے کہ اللہ ایک ہے۔"

وہ کہتا۔ "تو کیا یہودیوں کا خیال ہے کہ اللہ تین ہیں؟"

میں ہار مان لیتی۔ چند دنوں تک مجھ سے اسی طرح سوال کرتا رہا۔

کچھ دن گزرے تو مجھے غصہ آنے لگا۔

عصر کے قریب کا وقت تھا۔ شام کو ڈرائنگ روم کے پردے ہٹا کر بیٹھی تھی۔ ہمارے لان میں ایک درخت ہوتا تھا جسے سندری کا درخت کہتے ہیں۔ سندری کے درخت سے سارنگی بنائی جاتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ سندری کے درخت میں یک دم بتیاں جل اٹھیں اور وہ خوب روشن ہو گیا۔ اور اس میں سے آواز آنے لگی۔ " رزق حرام ۔۔۔ رزق حرام ۔۔۔ رزق حرام۔"

باب آیا تو میں نے کہہ دیا۔ "تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کسی مذہب نے "رزق حرام" کی ممانعت پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے دیا ہے۔ اگر تم "رزق حرام" کھاؤ گے تو تمہاری آنے والی اولاد میں دیوانگی کے اثرات پیدا ہو جائیں گے۔"

میری یہ بات سن کر باب نے کہا۔ "یہیں رک جائیں۔" کہہ کر وہ چلا گیا۔

مغرب کی اذان ہو رہی تھی تب وہ واپس اندر آیا اور کہنے لگا۔ "بانو آپا! میں مسلمان ہو گیا ہوں۔"

درخت کی روشنیاں بجھ گئیں' البتہ اس میں سے سارنگی کی آواز آ رہی تھی۔ میرے ناول "راجہ گدھ" کا پہلا معجزہ یہ واقعہ ہے۔ پھر صبح چہل قدمی کے لیے چھت پر گئی تو وہاں ایک کتاب رکھی تھی جس کی جلد پر موٹا موٹا "راجہ گدھ" لکھا تھا۔ میں نے قلم اٹھایا اور مجھے نہیں پتا کتاب کیسے لکھی گئی۔ (راجہ گدھ ایک مہینے کے عرصے میں لکھی گئی تھی)

کچھ قلم کار ادب کا باب ہوتے ہیں اور کچھ پوری کتاب۔ کچھ ادب کے باب لکھتے ہیں اور کچھ ابواب۔ بانو قدسیہ کا شمار ان ہی چند لوگوں میں ہوتا ہے جو خود کتاب تھے اور کتنے ہی ابواب لکھ گئے۔ جس دور سے بانو قدسیہ نے لکھنا شروع کیا' اس دور کے لکھنے والوں کے قلم ہجرت' معاشرہ' انسانی نفسیات' محبت' بدلتی اقدار' نئی نسل اور پرانی نسل کی کشمکش کا احاطہ کر رہے تھے۔ لیکن بانو قدسیہ نے نہ صرف نئے موضوعات پر نئے انداز سے قلم اٹھایا بلکہ انہوں نے ادب میں "اللہ اور بندے" کے تعلق اور محبت کے اظہار پر مبنی وہ

Downloaded From http://paksociety.com

تحریریں لکھیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھی تھیں۔ انہوں نے خدا اور انسان پر قلم اٹھایا۔ جیسے کہ ....

"شاید ابلیس کا گناہ فقط تکبر ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ تکبر کا حاصل مایوسی ہے۔ جب ابلیس اس بات مُصر ہوا کہ وہ مٹی کے پتلے کو سجدہ نہیں کر سکتا تو وہ تکبر کی چوٹی پر تھا لیکن جب تکبر ناکامی سے دوچار ہوا تو ابلیس اللہ کی رحمت سے ناامید ہوا۔ حضرت آدم بھی ناکام ہوئے' وہ بھی جنت سے نکالے گئے لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے۔ ابلیس نے دعوا کر رکھا ہے میں تیری مخلوق کو تیری رحمت سے مایوس کروں گا۔ ناامید مایوس لوگ میرے گروہ میں داخل ہوں گے۔ اللہ جانتا ہے کہ اس کے چاہنے والوں کا اغوا ممکن نہیں۔ وہ کنویں میں لٹکائے جائیں' آگ پر جلائے جائیں' صلیب پر لٹکیں لیکن وہ مایوس نہیں ہوں گے۔" (ابن آدم)

بانو قدسیہ کو اگر انسانی نفسیات کے بیانیہ پر "کمال فن" کا درجہ دیا جائے تو ہرگز مبالغہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے مرد' عورت' باپ' بھائی' شوہر' معاشرتی انسان' گناہ گار' قاتل' چور' طوائف وغیرہ' سب کو کچھ ایسے بیان کیا کہ کرداروں کا ظاہر باطن تصویر میں ڈھل کر سامنے آگیا۔

"اس کی چپ' اس کا گونگا پن' اس کے مرن برت سب ماں کو ستانے کے لیے ہوتے تھے۔ ابا کی چپ میں بڑی چال تھی۔ میں ابا کی طرح چپ نہیں تھی' میری چپ حویلی کے صدر دروازے کے قدموں میں گرے ہوئے اس قفل کی مانند تھی' جسے پچھلی رات چور دروازے کے کنڈے سے اتار کر پھینک گئے ہوں۔ ایسا تالا بہت کچھ کہتا ہے' لیکن کوئی تفصیل بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے۔" (انتر ہوت اداسی)

"ساری عمر میں خود ترسی کا شکار رہا۔ تو میں نے اپنا یہ جذبہ ضائع کیا۔ میں رشتے توڑتا' ان کا الزام دوسرے کے سر دھرتا رہا ہوں۔ میں بے وفا بھی تھا اور دھونسیا بھی۔" (تنگی دل)

"شادو تو اچھے وقتوں میں کبھی نہ بولی تھی' اب کیا بولتی۔ ایسی روحیں تو ازل سے چپ ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری باتیں' روز قیامت کے لیے روک رکھی تھیں۔" (بڑا بول)

بانو قدسیہ نے کبھی بھی محبت کو لولی بنا کر' بنا کر سجا کر پیش نہیں کیا۔ انہوں نے محبت کی اسی حقیقت کی عکاسی کی' جو جوہڑ کا پانی بھی رہی اور آبشار کی بوچھاڑ بھی۔

"سن آمنہ! ہر انسان چاہے وہ مرد ہو' چاہے عورت' اندر سے وہ رب ہے۔ چھوٹا سا رب۔ ہر رب کی آرزو ہے کہ کوئی ایسا بھی زندگی میں آئے جو اس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔" (مشک نافہ)

اس کی محبت ایسی حرف ساز تھی کہ میری ساری عبارت جو بے معنی تھی' دلآویز غزل بن گئی پھر جو پڑھتا گیا' سوز و گداز سے بھر گیا۔" (پابند)

شر و خیر کی نمائندہ سطر۔ "ہم دونوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہے' جیسے ڈکیتی سے پہلے رہزن گم صم رہتے ہیں۔" (پابند)

بانو قدسیہ نے 'کہانی کاری' کردار نگاری' ناول نگاری کی سدھ بدھ کچھ اس انداز سے بدلی کہ اس میں کئی جہتیں متعارف کروادیں۔ انہوں نے اکثر گرائمر کے قواعد کو' زبان کے بیان کو فراموش کیا تو "اردو ادب" کو ایک نیا انداز بھی دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بانو نے مرد بن کر لکھا' اور یہ بھی کہ بانو نے مرد ادیبوں سے آگے جا کر لکھا۔ لیکن درحقیقت بانو نے صرف "بانو قدسیہ" بن کر لکھا۔ وہ کبھی بھی مردوں سے مقابلے میں نہیں رہیں' نہ ہی اپنے ہم عصروں سے۔ کیونکہ شاید وہ بھی اچھی طرح سے سمجھتی تھیں کہ مقابلہ تعمیر میں تو ہو سکتا ہے لیکن تخلیق میں نہیں۔ تخلیق تو وہ عہد ہے جو ہر تخلیق کار' اپنی ریاضت سے قائم اور ادا کرتا ہے۔ اس میں تکرار نہیں ہوتی' صرف

Downloaded From http://paksociety.com

ادائی ہوتی ہے۔

روحانیت ایک ایسا موضوع ہے جسے پڑھ کر، سمجھ کر، طے کر کے نہیں لکھا جا سکتا۔ روحانیت وہ ندی ہے، جو لکھنے والے میں نہ بہے، وہ اس میں ڈوب کر نہ نکلے تو وہ خواہ مخواہ اس میں قلم بھگو کر، کچھ لفظ تو شاید گھسیٹ سکتا ہے۔ لیکن اس کھوکھلے جسم میں "روح" نہیں پھونک سکتا۔ کیونکہ حقیقت آشکار نہ ہو، تو اس کی عکاسی بھی محال ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ بانو قدسیہ کی ذات میں وہ ندی (شاید دریا، یا سمندر یا اسے بھی زیادہ) بہتی تھی جس میں ڈوب کر انہوں نے وہ تحریریں نکالیں، جو صرف قلم کی روشنائی، سوچ کی پرکاری سے نہیں بُنی جا سکتیں۔

"راجہ گدھ" ایک ایسا ناول ہے جس کا شمار اردو زبان کے ان چند ناولز میں ہوتا ہے، جو اپنی اشاعت سے

اب تک کسی بھی دوسری کتاب سے زیادہ خریدا اور پڑھا جا رہا ہے۔ جو برٹش لائبریری میں دنیا بھر کی بہترین کتابوں کی محدود فہرست میں، اردو سیکشن میں سب سے اوپر ہے۔ یہی ناول سی ایس ایس نصاب میں شامل ہے۔

نومبر 1928ء کو فیروز پور، پنجاب (انڈیا) میں پیدا ہونے والی بانو، اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آئی تھیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اردو کی کلاس میں ان کی ملاقات اشفاق احمد سے ہوئی۔ انہوں نے اپنی پہلی کہانی پانچویں کلاس میں لکھی تھی جو بعد ازاں "درماندگی شوق" کے نام سے شائع ہوئی۔

اشفاق احمد نے ہی بانو قدسیہ کو لکھتے رہنے پر مائل رکھا۔ ممتاز مفتی بھی یہ کہا کرتے تھے کہ یہ چولہا چوکا چھوڑ اور بس لکھا کر۔ یقیناً" دونوں مرد حضرات یہ بھانپ چکے تھے کہ "بانو قدسیہ اور اس کا قلم" کیا ہے۔

اشفاق احمد کا کہنا تھا کہ "شروع میں بانو قدسیہ کی اردو ٹھیک نہیں تھی۔ لیکن پھر بانو کی ہی اردو اتنی اچھی ہو گئی کہ اس نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔ ہم دونوں میں فرسٹ آنے کا مقابلہ چلتا رہتا تھا اور بانو فرسٹ آجایا کرتی تھی۔"

بانو قدسیہ نے جب ڈرامہ لکھنا شروع کیا تو انہیں اس فیلڈ میں ٹرینڈ سیٹر کہا گیا۔ انہوں نے عورتوں کی نفسیات، جذبات، ان کی سائیکی، نچلے طبقے کی نمائندگی، ایلیٹ کلاس کے کمپلیکس کو کچھ اس منفرد انداز سے لکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ادب کی طرح ڈرامہ انڈسٹری

Downloaded From http://paksociety.com

میں بھی ان کی انفرادیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کے ڈرامے ''آدھی بات'' کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

ایک انڈین ڈائریکٹر' پروڈیوسر کا کہنا تھا کہ وہ بانو قدسیہ کے ڈراموں کی کیسٹ اپنی ٹیم کو دکھایا کرتے تھے تاکہ وہ ان جیسا اسکرین پلے جملے' اور اسکرپٹ لکھنا سیکھ جائیں۔

بانو قدسیہ کو بہترین پلے رائٹ کا گریجویٹ ایوارڈ' تاج ایوارڈ' ستارہ امتیاز' کمال فن اور کئی دوسرے ایوارڈز سے نوازا گیا۔

ایک بار بانو قدسیہ سے اسٹیج پلے لکھوایا گیا۔ پہلے شو سے پہلے تک لوگوں کی آراء تھیں کہ بانو جو ایک بوڑھی سی خاتون ہے' فلسفیانہ باتیں کرتی ہے' مزاح ٹریند تھیٹر کا ڈرامہ کیسے لکھ پائے گی۔ شو ناکام ہو جائے گا۔ لیکن پھر جب پہلا شو ہوا تو لوگ حیران رہ گئے کہ مزاح کی سچویشن اتنی نفیس' اور ایسی منفرد بھی ہو سکتی ہے۔ ڈرامہ بے حد کامیاب رہا۔

ایسا لکھاری' جو وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہے' اور ایک نہیں کتنی ہی نسلوں کے دلوں' دماغوں تک رسائی حاصل کرے۔

اور ادب کی' حقیقت کی' راز کی باتیں ہر دور میں آشکار کرتا چلا جائے' وہ عام لکھاری نہیں ہوتا۔ اس کی تحریریں' ہر نسل سے ہمکلام رہتی ہیں' ہر دور میں بولی' سمجھی' پڑھی جاتی ہیں۔ وہ ایک معنی نہیں رکھتیں' ہر بار' نئے معنی دیتی ہیں۔ وہ رکتی نہیں' بہتی ہیں اور انہیں لکھنے والا' ایسا حقیقی تخلیق کار ہوتا ہے' جو اپنی پسند پر نہیں ''حکم خداوندی'' پر لکھتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے' اس پر پر تحسین چڑھاتا نہیں چلا جاتا۔

''مجھ پر آشکار ہوا کہ ابھی میں بڑی عام سی زندگی میں معمولی طور پر زندہ ہوں۔ مجھے اعزاز پا کر خوشی ہوتی ہے اور میں اتنی بڑی نہیں ہوں جس قدر میرے قارئین نے سمجھ رکھا ہے۔ مجھے تعریف کی خواہش اور اپنے لیے تالی بجنے کا انتظار رہتا ہے۔ سب سے بڑا تعجب مجھے یہ ہوا کہ آپ لوگوں نے یہ شبہ ڈال رکھا تھا کہ میں درویش صفت ہوں لیکن انعام کے ساتھ جو رقم نتھی ہے' اس نے یہ پول بھی کھول دیا۔ یقین کیجیے کہ ابھی مجھ میں وہ قوت پیدا نہیں ہوئی کہ بازار سے تو گزرے پر خریدار نہیں تھے۔

جہاں تک اردو کی خدمات کا سوال ہے تو یقین جانیے یہ بھی ایک مغالطہ ہے۔ میں نے اردو کو کلہاڑا بنا کر اپنے لیے ہی لکڑیاں کاٹی ہیں۔ میرے اندر کی تو حرص ہی مجھے سوائے اپنے کسی اور کی خدمت کرنے نہیں دیتی۔ پھر اردو کی خدمت کا جھنڈا لے کر کیسے چلوں؟'' (بانو قدسیہ)

اور میں سمیرا حمید...... میرا کہنا یہ ہے۔

''جو لکھ دیا گیا' وہ تاریخ ہو چکا...... جب جب پڑھا جائے گا' پڑھنے والا اسیر ہو گا۔''

رفعت سراج کو صدمہ

مایہ ناز مصنفہ رفعت سراج کے والد محترم محمد سراج الدین صاحب مختصر سی علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

سراج صاحب انتہائی محنتی' خوددار اور با اخلاق انسان تھے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کی طویل علالت میں بڑی مستقل مزاجی اور ہمت سے ان کا ساتھ دیا۔ بچوں کی عمدہ تربیت میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ ان کی دائمی جدائی رفعت سراج اور دیگر اہل خانہ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ ہم رفعت سراج کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

SnScares @SnSca

Downloaded From http://paksociety.com

بندھن

وہاج خان ہمراہ ثمینہ وہاج خان

شاہین رشید

شادی ایک مقدس فریضہ ہے۔ ہر عاقل و بالغ کو اپنی مرضی سے اپنی پسند سے شادی کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لیکن اس کے باوجود جو اولاد والدین کی مرضی اور پسند سے شادی کرتی ہے اس پر اللہ کی خاص رحمت برستی ہے۔ وہاج خان اس فیلڈ کا ایک معتبر نام ہے۔ لوگ ان کے کام کو پسند کرتے ہیں۔ "سرگودھا" کے رہائش پذیر کام کے سلسلے میں کراچی آتے ہیں۔ کیونکہ یہ بلائے جاتے ہیں۔ اچھا فنکار ملک کے کسی بھی کونے میں ہو اگر ڈائریکٹر کی ضرورت ہے تو اسے ضرور بلاتے ہیں۔

"بندھن" کے اس مشہور و معروف سلسلے میں آج ہمارے مہمان وہاج خان اور مسز وہاج خان ہیں۔

"کیا حال ہے وہاج صاحب؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"کیا مصروفیات ہیں آج کل؟ کام کیسا چل رہا ہے؟"

"مصروفیات کافی ہیں۔ اور کام بھی اچھا چل رہا ہے۔"

"کچھ بتایئے اپنی مصروفیات کے بارے میں؟"

"جی آج کل میں "جیو" کے دو سیریلز کر رہا ہوں۔ "خان" اور "سویرا" "خان" کے ڈائریکٹر "علی فیضان" ہیں اور سویرا کے "تاشی بھائی" دونوں بہت اچھے پروجیکٹ ہیں اور دونوں میں میرا کام بہت اچھا ہے۔ ایک احمد کامران کا پہلے کر رہا ہوں۔ اور کچھ کام ابھی پائپ لائن میں ہیں۔ تنویر جمال صاحب سے بھی ایک سیریل پہ ڈسکشن چل رہی ہے اور ایک نئے پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ بھی بات چیت چل رہی ہے۔"

"فیملی لائف کیسی گزر رہی ہے۔۔۔ بچے ماشاء اللہ کیا کرتے ہیں؟"

"فیملی لائف ماشاء اللہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔ بیگم اور بچے آپ کو پتا ہی ہیں کہ "سرگودھا" میں ہوتے ہیں۔ اور پڑھ رہے ہیں۔ سب سے چھوٹا بیٹا جس کا نام "احمد" ہے اسے شوق ہے اداکاری کا، جس طرح میں اپنے بچپن میں بولتا رہتا تھا کہ مجھے ایکٹر بننا ہے۔ اسی طرح وہ بھی بولتا رہتا ہے کہ مجھے ٹی وی پہ آنا ہے، مجھے کراچی جانا ہے اور ماشاء اللہ شرارتی بھی ہے اور مجھے اس میں ٹیلنٹ نظر بھی آتا ہے۔۔۔ بیٹی وانیہ کو میڈیا سے تو کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ البتہ اسے پینٹنگ کا شوق ہے اور بہت اچھی کرتی ہے۔ اسے ٹیچر بننے کا بہت شوق ہے۔ فصام میرا بیٹا بہت شرارتی ہے۔ ڈانس کرنا اور فلمیں دیکھنا اسے پسند ہے۔ احمد اس فیلڈ میں آسکتا ہے مگر اس کی پڑھائی متاثر ہوگی۔ اور ویسے بھی سارا کام کراچی میں ہوتا ہے۔۔۔ ہاں کسی کمرشل کی آفر آئی یا کسی ڈرامے میں بہت اچھا رول ملا تو ضرور کرے گا۔۔۔ وانیہ ماشاء اللہ کلاس 4th میں ہے۔ فصام کلاس ٹو میں ہے، احمد پلے گروپ میں ہے لیکن اس نے تین ماہ میں اپنا سلیبس (کورس) پورا کرلیا ہے تو اس کی میڈم اسے اگلی کلاس کی تیاری کروا رہی ہیں۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے (آمین)

"بہت خوب۔۔۔ ثمینہ کیسی ہیں۔ مزاج پہلے جیسا ہے یا کچھ تبدیلی آئی ہے؟"

"جی۔۔۔ بیگم ٹھیک ٹھاک ہیں اور مزاج میں تبدیلی تو وقت کے ساتھ آتی ہی ہے، کیونکہ ہم بڑے ہو رہے

Downloaded From http://paksociety.com

ہیں۔۔۔ روزانہ یا ہفتے وار اپنا موازانہ کریں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے تو ہم چھوٹے تھے اور اب ہم بڑے ہوگئے ہیں۔۔۔ شادی سے لے کر اب تک کا موازنہ کرتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ شادی کے وقت تو ہم بچے تھے اب ہم بہت بڑے ہوگئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔"

"بیگم کیا کر رہی ہیں۔ آج کل۔۔۔ گھرداری یا کچھ اور بھی؟"

"بیگم کو "ہومیو پیتھک" ڈاکٹر بننے کا شوق ہو رہا ہے اور اس کی وہ پڑھائی بھی کر رہی ہیں۔ ایک سمسٹر باقی رہ گیا ہے پھر وہ "ہومیو پیتھک" ڈاکٹر بن جائے گی۔۔۔ مجھے تو یہ سب کچھ اتنا پسند نہیں۔ میں تو کہتا تھا کہ کسی اور مضمون میں ماسٹرز کرلو۔۔۔ اس میں نہ کچھ کرو۔۔۔ مگر اس کا شوق تھا' کیا کہہ سکتے ہیں۔۔۔ ویسے اسے لیڈیز بوتیک کا بھی شوق ہے تو ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ بوتیک کھول لے۔۔۔ اور گھر داری تو ماشاءاللہ وہ بہت اچھی طرح نبھا رہی ہے۔"

"ماشاءاللہ سے شادی کو کتنے سال ہوگئے ہیں اور آپ کی زندگی کے سب اہم کام اپریل میں ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھی کچھ بتائیں ہمیں؟"

"شادی کو ماشاءاللہ گیارہ سال ہوگئے ہیں اور ہماری شادی 22 اپریل کو ہوئی تھی۔ اپریل کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میں 25 اپریل کو پیدا ہوا' شادی بھی اپریل میں ہوئی۔ پہلی فلم بھی 4 اپریل کو ریلیز ہوئی تھی اور جب میں نے شوبز جوائن کیا تب بھی اپریل کا مہینہ تھا۔"

"واہ۔۔۔" ہمیں معلوم ہے کہ آپ کی شادی ارینج تھی۔ تفصیل آپ بتائیں؟

"آپ یقین کریں میں نے اپنی بیوی کو شادی کے دن ہی دیکھا تھا۔۔۔ شادی سے پہلے کچھ واقعات ایسے ہوئے تھے کہ میرا دل بہت بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ پھر والد صاحب کے انتقال نے مجھے اور بھی زیادہ افسردہ اور حساس کردیا۔ ہر وقت اداس اور پریشان رہتا تھا تو والدہ نے کہا کہ شادی کرلو۔ پسند ہو تو بتادو میں نے کہا کہ جہاں آپ مناسب سمجھیں' کردیں۔ مگر یہ خیال رکھیے گا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو۔ کہ کل کو ہمارے بچے ہوں تو ان کی تربیت اچھے انداز میں ہو۔"

"پھر "ماں" کی پسند آپ کو پسند آئی؟"

"جی۔۔۔ بہت ماشاءاللہ میری بیوی ثمینہ نہ صرف پڑھی لکھی ہے بلکہ خوب صورت' ذہین اور سگھڑ بھی ہے۔۔۔ میں بہت خوش ہوں اپنی ازدواجی زندگی سے۔"

"گڈ۔۔۔ لیکن فرض کریں سب کچھ اس کے برعکس ہوتا تو؟"

"قہقہہ۔۔۔ تو شاید زندگی اچھی نہ گزر رہی ہوتی اور مجھے سمجھوتا کرنا پڑتا۔۔۔ لیکن سچ پوچھیں تو مجھے اپنی

Downloaded From http://paksociety.com

امی کی پسند پر بھروسا تھا۔

"آج کے دور میں "ماؤں" کی پسند پر کون بھروسا کرتا ہے' بڑی بات ہے کہ آپ نے بھروسا کیا۔"

"سب کو "ماں" کی پسند پر بھروسا کرنا چاہیے..... وہ جب ہماری تربیت اتنی اچھی کر سکتی ہیں۔ ہماری پرورش کے لیے تکالیف اٹھاتی ہیں تو کیا ہماری لائف پارٹنر کے لیے وہ کوئی غلط فیصلہ کریں گی؟..... ایسا نہیں ہو سکتا..... باقی تو سارے کھیل قسمت کے ہیں۔ برا ہو جائے تو اس میں ہمارے بڑوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔"

"گویا کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے والدین کی پسند کو ترجیح دینا چاہیے۔"

"بالکل' میرا یہی خیال ہے۔ کیونکہ ہم جب کسی لڑکی سے محبت کر رہے ہوتے ہیں' اس سے جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔ بہت کچھ بڑھا چڑھا کر بتا رہے ہوتے ہیں اور جب شادی کے بعد سچ سامنے آتا ہے تو پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور نوبت علیحدگی تک آجاتی ہے۔"

"بات تو بالکل ٹھیک کہی آپ نے۔ آپ نے ثمینہ کو شادی کے دن دیکھا..... پھر کیسا پایا انہیں؟"

"بہت اچھا' بلکہ بہت زیادہ اچھا۔ بہت اچھی بیوی' بہت اچھی بہو اور بہت اچھی ماں ہے۔ ایک مکمل بیوی والی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔"

"اچھی زندگی کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے؟"

"بہت زیادہ ضروری ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ شادی ہی اس وقت کرنی چاہیے جب آپ کے پاس پیسہ ہو۔ کیونکہ شادی کے بعد مرد کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ فیملی بن جاتی ہے' اخراجات میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے اور پیسہ جیب میں نہ ہو تو زندگی بہت ٹف ہو جاتی ہے۔"

"بیگم فضول خرچ اور شکی مزاج ہیں؟"

"میں فضول خرچ ہوں۔ بیگم تو اچھی خاصی کفایت شعار ہیں۔ مجھے اچھا موبائل لینے اور گھر سے باہر کھانا کھانے کا شوق ہے۔ اور شروع شروع میں شکی مزاج تھیں..... مگر اب ایسا کچھ نہیں ہے۔"

مسز ثمینہ وہاج

"جی ثمینہ کیا حال ہے آپ کا؟"

"الحمد للہ۔"

"ماشاء اللہ شادی کو تقریباً گیارہ سال ہو گئے ہیں۔ اتنے سالوں میں کیا تبدیلی آئی آپ میں اور وہاج صاحب میں؟"

"مجھ میں کیا تبدیلی آئی' یہ تو وہاج ہی بتا سکتے ہیں اور وہاج ہی کیا تبدیلی آئی تو میں یہ ہی کہوں گی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے و اب پہلے سے زیادہ میرا خیال رکھتے ہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے..... ورنہ یہ جس فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سر پر خطرے منڈلاتے ہی رہتے ہیں؟..... کیوں ایسا ہی ہے؟"

"ایسا شادی کے شروع شروع دنوں میں اور پھر کچھ عرصہ اور محسوس ہوا لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' میرے شکوک و شبہات ختم ہوتے گئے۔ کیونکہ نہ صرف میں نے انہیں اپنی فیملی کے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ بھی بہت مخلص پایا ہے۔ اس لیے اب کسی قسم کا شک نہیں کرتی۔"

"آپ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بن رہی تھیں۔ ہو گئی پڑھائی مکمل؟"

"جی..... جی..... ایک ہی سمسٹر رہ گیا ہے۔ پھر ان شاء اللہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر کہلاؤں گی۔ مجھے ہمیشہ سے ہی ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔"

"ثمینہ کچھ اپنے بارے میں بتائیے..... اور یہ بھی بتائیے گا کہ آپ دونوں کے رشتے میں شوبز نے راہ ہموار کی یا کچھ رکاوٹ درپیش ہوئی؟"

"اپنے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارا تعلق گجرات سے ہے۔ ہمارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں۔ میں نو مارچ کو پیدا ہوئی اور بہن بھائیوں میں میرا نمبر سیکنڈ لاسٹ ہے۔ اور جہاں تک رشتے کی بات ہے تو شوبز رکاوٹ بنا مگر اتنا

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں کہ ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ بس گھر والوں نے تھوڑا سا اعتراض کیا اور پھر اللہ کا شکر ہے کہ مان گئے۔"

"بڑی چکا چوند کردینے والی لائف ہے شوبز... آپ کا دل چاہا اس طرف آنے کو؟"

"نہیں... نہیں... میرا تو کبھی بھی دل نہیں چاہا اس فیلڈ میں آنے کو... اور شادی کے کچھ عرصے تک تو میں ان کے ساتھ شوٹ پہ جاتی تھی۔ مگر پھر جب ماشاء اللہ بچے ہوگئے تو میں نے جانا چھوڑ دیا۔ اور ویسے اگر میں ارادہ بھی کرتی تو شاید مجھے اجازت بھی نہ ملتی... کیونکہ ان کے گھر کا ماحول اس ٹائپ کا نہیں ہے کہ لڑکیاں اس فیلڈ میں کام کریں۔"

"آپ پڑھ بھی رہی ہیں اور گھرداری بھی۔ بچوں کی تربیت بھی۔ تو کیا وہاج صاحب تعریف کرتے ہیں اور آپ کا ساتھ دیتے ہیں؟"

"تعریف تو بہت کرتے ہیں اور بچوں کی تربیت میں بھی حصہ لیتے ہیں اور جب گھر آتے ہیں تو بچوں کو بھی بہت ٹائم دیتے ہیں۔ چونکہ شوٹس کی وجہ سے زیادہ تر کراچی رہتے ہیں تو جب بھی سر گودھا آتے ہیں، ہم سب کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارتے ہیں۔"

"غصے کے تیز ہیں یا دھیمے مزاج کے ہیں؟"

"غصے کے تیز ہیں... اور کبھی کبھار آتا ہے مگر بہت تیز آتا ہے اور ان کی یہ اچھی عادت ہے کہ گھر میں شور شرابا مچانے کے بجائے گھر سے باہر چلے جاتے ہیں... اور جب موڈ ٹھیک ہوجاتا ہے تو پھر گھر آجاتے ہیں۔"

"صلح میں پہل کون کرتا ہے؟"

"زیادہ تر صلح میں پہل وہاج ہی کرتے ہیں۔ مگر میری بھی کوشش ہوتی ہے کہ طوالت نہ پکڑے۔"

"گھر کا بجٹ تو آپ کے ہاتھ میں ہی ہوگا؟ اور اپنے ہاتھوں سے پکاتی ہیں کھانا وہاج صاحب کے لیے؟"

"گھر کا باقاعدہ بجٹ نہیں بنتا... جتنی ضرورت ہوتی ہے اسی حساب سے خرچ کرتے ہیں... اور جہاں تک کھانا پکانے کی بات ہے تو انہیں میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت پسند ہے۔ اس لیے میں ان کے لیے زیادہ تر خود ہی پکاتی ہوں۔"

"کیا پسند ہے آپ کے ہاتھ کا پکا ہوا؟"

"انہیں ماش کی دال۔ مٹن کڑاہی بہت پسند ہے۔ کھانے کے کافی شوقین ہیں۔ مگر ہاتھ روک کر کھاتے ہیں کہ کہیں موٹا نہ ہوجاؤں ظاہر ہے شوبز کے آدمی ہیں۔ خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہنی مون کے لیے کہاں گئی تھیں۔ اور رونمائی میں کیا ملا تھا آپ کو؟"

"ہنی مون کے لیے کراچی آئے تھے کیونکہ کراچی میں ان کی شوٹ تھیں اور چونکہ میں پہلی بار کراچی آئی تھی تو مجھے یہی ہنی مون اچھا لگا۔ رونمائی میں انہوں نے مجھے "سونے کا لاکٹ" دیا تھا۔ 22 اپریل ہماری شادی کا دن ہے اور ہم اس دن کو ضرور مناتے ہیں۔ کہیں باہر کھانا کھا کر اور ایک دوسرے کو گفٹ دے کر۔"

"شوبز کے بندے ہیں۔ فیشن کے تو دلدادہ ہوں گے؟"

"نہیں اتنے کوئی خاص نہیں... لیکن یہ ضرور دل چاہتا ہے کہ جب یہ گھر آئیں تو میں انہیں اچھے لباس اور میک اپ میں ملوں۔ اس لیے میں بھی اپنا خاص خیال رکھتی ہوں۔"

"لڑکی اور لڑکے کے لیے شادی کس حد تک ضروری ہے؟"

"میرے خیال میں شادی بہت ضروری ہے۔ ایک تو شریعت خداوندی ہے پھر لڑکی ہو یا لڑکا۔ لائف پارٹنر کے بغیر زندگی گزارنا تھوڑا مشکل ہوجاتا ہے۔ زندگی گزر تو جاتی ہی ہے لیکن لائف پارٹنر سے زندگی زیادہ حسین ہوجاتی ہے اور پھر فیملی بن جاتی ہے۔ بچوں کے ساتھ زندگی مزید حسین ہوجاتی ہے اور اپنی تخلیق کی پرورش کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اس جوڑے سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☆

Downloaded From http://paksociety.com

دستک دستک دستک

شاہین رشید

رباب ہاشمی

"کیا حال ہے؟"

"الحمد للہ!"

"منت، مرضی" اور دیگر سیریلز آج کل اسکرین پہ آپ کا ہی راج ہے؟

"جی..... اللہ کا بڑا کرم ہے۔ کام تو ہم اتنا ہی کرتے ہیں جتنا شاید ہر آرٹسٹ۔ مگر جب وہ کام ایک کے بعد ایک آن ایر ہو جاتا ہے تو لگتا ہے کہ جیسے ہم ہی ہم ہیں۔"

"سمیع خان کے ساتھ کافی کام کر رہی ہیں آپ؟"

"بس اتفاق ہے..... شاید ڈائریکٹرز یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کام کر رہے ہیں یا لوگ ہمیں پسند کر رہے ہیں..... اور یہ اتفاق بھی ہے کہ سمیع کے ساتھ میرے ڈرامے ایک کے بعد ایک آن ایر ہو گئے۔"

"منت" کا کیا رسپانس ہے۔ آپ کو زیادہ کون سا اچھا لگا منت یا مرضی؟"

"دونوں بہت اچھے ہیں..... ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور دونوں کا رسپانس بہت اچھا رہا..... "مرضی" تو اب ختم ہو چکا ہے البتہ "منت" آن ایر ہے۔"

"نئے آنے والے سیریلز کون سے ہیں؟"

"کافی ہیں جو ابھی انڈر پروڈکشن ہیں۔ ایک سیریل "عشق وے" بہت جلد آن ایر ہونے والا ہے اور اس میں میرا کردار بہت اچھا ہے۔ محبت، نفرت اور حسد کی کہانی ہے..... اس میں میں ایک ایسی لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہوں جسے اپنی دوست کے منگیتر سے محبت ہو جاتی ہے اور اس محبت میں وہ اتنی آگے بڑھ جاتی ہے کہ اپنی دوست کی دشمن ہو جاتی ہے۔"

"فلموں میں اپنا سکہ کب جمانا ہے....."

"ابھی نہیں..... ابھی میں ڈراموں میں بہت مصروف ہوں۔ ویسے بھی ابھی مزید اپنے آپ کو میچور کرنا چاہتی ہوں۔ پھر فلموں کی طرف توجہ دوں گی۔ ویسے آفرز کافی آ رہی ہیں۔ مگر ابھی سب کو منع کر دیا ہے۔"

"ڈیمانڈ بڑھ جائے تو معاوضے بھی بڑھ جاتے ہیں ایسا ہے آپ کے خیال میں....."

Downloaded From http://paksociety.com

"معاوضہ تو ہر کوئی اپنے حساب سے ہی دیتا ہے۔ البتہ وہ لوگ یا وہ فنکار جو فلم کرنے کے بعد کسی ڈرامے میں بک کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ اس لیے ڈائریکٹرز کا رجحان ان کی طرف کچھ کم ہو گیا ہے۔ اب وہی فنکار زیادہ بک کیے جا رہے ہیں جو صرف اور صرف ٹی وی پہ یا ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر رہے ہیں۔"

"آپ بچپن میں کس نوعیت کے پروگرام کرتی تھیں؟"

"ہنستے ہوئے۔۔۔" بچپن میں ڈرامے نہیں کرتی تھی۔ بلکہ بچوں کے پروگرام کی میزبانی کیا کرتی تھی' جیسے گیم شوز ہو گئے۔ جیسے کوئی اہم تہوار ہوا۔ بچوں کا۔۔۔ پھر جانوروں کے حوالے سے ایک ڈاکومینٹری پروگرام کی میزبانی دو سال تک کی۔ تو بس اس طرح سلسلہ چلتا رہا۔"

"پھر گیپ کیوں آیا۔۔۔"

"جب مڈل ایج ہوتی ہے تو پرسنالٹی میں چینج بہت تیزی سے آتا ہے پھر مجھے تعلیم بھی مکمل کرنی تھی سو گیپ آگیا۔"

"آپ تو بچپن سے شوبز سے وابستہ ہیں۔ پھر "ٹاپا" میں داخلہ لینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"جی "ٹاپا" میں ایڈمیشن کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ میں اداکاری کو باقاعدہ سیکھنا چاہتی تھی۔ بے شک مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ میں سب کچھ کر لوں گی۔ مگر پھر بھی میں سیکھ کر اس فیلڈ میں آنا چاہتی تھی۔ اور اب میں دو سالوں سے باقاعدہ اداکاری کر رہی ہوں۔"

"ٹاپا" میں آپ کے استاد کون تھے؟"

"طلعت حسین۔ راحت کاظمی اور ضیا محی الدین صاحب ہمارے استاد تھے' اور یہی میرے رول ماڈل بھی ہیں۔ میرے سینئرز بھی ہیں اور ہم سب کے لیجنڈ بھی ہیں۔"

"فلموں کے اسکرپٹ پڑھ کر انکار کیا یا ویسے ہی آپ نے انکار کر دیا۔"

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

مارچ 2017ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "حسن الماب اور۔۔۔" سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- "عشق مجذوب" مصباح نوشین کا مکمل ناول،
- "ہم صورت گر کچھ خوابوں کے" نعیمہ ناز کا ناول،
- راشدہ رفعت، اُم ایمان قاضی اور سعدیہ حمید چوہدری کے ناولٹ،
- قرۃ العین سکندر، سمیرا عثمان گل، شازیہ الطاف ہاشمی، نادیہ جہانگیر، سیدہ بر جیس رباب اور حنا ابرار کے افسانے،
- باصلاحیت فنکارہ "ماہا وارثی" سے ملاقات،
- "کرن تعبیر" سے باتیں،
- "خامشی کو بیاں ملے" قارئین سے سروے،
- "حرف سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ" مصنفین سے سروے،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2017 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

Downloaded From http://paksociety.com

"اسکرپٹ پڑھ کر انکار کیا۔ کیوں کہ میں سوچ رہی تھی کہ اگر بہت اسٹرونگ قسم کا اسکرپٹ ہو گا تو پھر انکار نہیں کروں گی' مگر مجھے کہانی کچھ زیادہ جان دار نہیں لگی سو میں نے انکار کر دیا۔"

"کام کون سا دلچسپ ہے۔ میزبانی کا یا اداکاری کا؟"

"اداکاری میں زیادہ مزہ آرہا ہے۔ میزبانی میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ مگر اداکاری میں بہت ٹائم لگتا ہے مگر یہ کام ایسا ہے کہ بندہ انجوائے کرتا ہے اور کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔"

"اور تھکن؟"

"جی تھکن تو بہت ہوتی ہے۔ محنت بھی ہے مگر رزلٹ بھی تو اچھا ملتا ہے۔"

حریم فاروق!

"ہیلو کیا حال ہے؟"

"جی ٹھیک۔"

"صنم میں آپ کا رول بہت عمدہ ہے کیا رسپانس ہے۔"

"شکریہ' جی بہت اچھا رسپانس ہے۔ بہت مختلف کردار ہے۔ اس لیے لوگ پسند بھی کر رہے ہیں۔"

"آج کل کیا فلمی سرگرمیاں ہیں؟"

"بہت اچھی' میں اس وقت کئی فلموں میں بک ہوں' مگر اس بارے میں ابھی کچھ بتانا نہیں چاہتی۔۔۔۔ اب جب سب کچھ مکمل ہو جائے گا بتا دوں گی۔"

"اور ڈرامے؟"

"ڈرامے تو چل ہی رہے ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہی ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی مہربانیاں رکھے تو سب کچھ ٹھیک ہے۔"

"پہلی انٹری تھیٹر یا ڈراما تھا؟"

"پہلی انٹری تھیٹر میں دی۔۔۔۔ جب تعلیم سے فارغ ہوئی تو دل چاہا کہ کچھ کروں' اداکاری کا بہت زیادہ شوق تھا' تو تھیٹر کا رخ کیا۔ آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی۔۔۔۔ یہ 2009 کی بات ہے جب تھیٹر میں آئی اور آڈیشن میں کامیابی کے بعد کئی ڈراموں میں کام کیا۔"

"کون سا ڈراما شہرت کا باعث بنا۔ جو آپ کو ٹی وی تک لے کر آیا؟"

"انور مقصود صاحب کا ڈراما تھیٹر "پونے چودہ اگست" اور "آنگن ٹیڑھا" نے مجھے شہرت دی' مجھے پہچان دی' اور اس کے بعد ایک فلم "سیاہ" کی آفر آئی۔ اور اس میں بھی میرے کام کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔"

"گھر والے خوش ہوئے۔"

"جی۔۔۔۔ بہت زیادہ اور گھر والوں کی سپورٹ کی وجہ سے ہی میں اس مقام پر ہوں۔ ان کا پیار' ان کی حوصلہ افزائی ان کی سپورٹ نے مجھے حوصلہ دیا۔"

"اس فیلڈ میں آکر خوش ہیں۔"

"جی بہت زیادہ کیوں کہ مجھے جنون کی حد تک شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا اور اداکاری کا۔۔۔۔ وقت نے میرا ساتھ دیا اور میں کامیاب ہوئی۔"

"2009 میں تھیٹر سے آغاز کیا' 2013 میں فلم میں کام کیا اور پھر ٹی وی کا رخ کیا' دیر سے آنے کی وجہ؟"

"دیر سے آنے کی وجہ یہ تھی کہ میں تھیٹر میں مصروف تھی۔ اور اس انتظار میں بھی تھی کہ ٹی وی والے خود بلائیں۔ سو جب مجھے بلایا گیا میں پہنچ گئی۔۔۔۔"

"پھر پہلا ڈراما؟"

"میرے ہم دم میرے دوست۔" پھر "موسم" اور موسم تو دوبارہ آج کل ان ایئر بھی ہے۔ ایک ڈرامے کی کامیابی نے مزید ڈراموں کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ "صنم" کی مقبولیت تو بہت زیادہ ہی ہے۔ ایک تھوڑی سی نفسیاتی لڑکی کا کردار ہے اس میں۔"

"اپنا فیوچر کس میں دیکھتی ہیں۔ ماڈلنگ و اداکاری فلم یا تھیٹر؟"

"یہ تو سوچنا پڑے گا لیکن میرا خیال ہے مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔ کیونکہ میں اپنا فیوچر اداکاری میں دیکھ رہی ہوں اور آپ بہت جلد مجھے ڈائریکشن کی فیلڈ میں بھی دیکھیں گی۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"ملک سے باہر جانے کا آپ کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ کیا اب بھی ہمارے ڈرامے پسند کیے جاتے ہیں؟"

"بالکل جی... بالکل' ملک سے باہر ہمارے ڈرامے بہت پسند کیے جاتے ہیں... کیونکہ ہمارے یہاں بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔ ہر شعبے میں۔"

"کچھ سینئرز کا کہنا ہے کہ کہانیوں میں یکسانیت آگئی ہے۔ کوئی نیا پن یا نئی اسٹوری سامنے نہیں آرہی... ایسا ہے؟"

"بالکل ایسا ہے... ملتی جلتی کہانیاں ہوتی ہیں جو کبھی کبھی بوریت بھی پیدا کردیتی ہیں۔ اگر نئے رائٹرز کو موقع دیا جائے تو یکسانیت دور ہو سکتی ہے۔"

"نئے رائٹرز ... اب تو کافی آرہے ہیں؟"

"ہاں آتو رہے ہیں... مگر اور بھی آنے چاہئیں۔ ہمیں اب ایسے رائٹرز کی ضرورت ہے جو لوگوں کی سوچ کو بدل دیں اور ابھی تک ایسے رائٹرز سامنے نہیں آئے ہیں جو سوچ کو بدل دیں۔"

"مصروفیات کی وجہ سے کوئی ایسا کام جو آپ ہر وقت نہ کر سکتی ہوں۔ جس کا شکوہ سب کو ہو؟"

"چوں کہ بہت زیادہ مصروف رہتی ہوں تو اپنے دوستوں کو نہ تو فون کالز کر سکتی ہوں۔ نہ ان کے فون کا جواب دے سکتی ہوں اور نہ اس ایم ایس کرتی ہوں۔ جس کی وجہ سے اکثر ساتھی ناراض رہتے ہیں اور میں شرمندہ ہوتی رہتی ہوں۔"

"ہاں تو جب فارغ ہوا کریں تو جواب دے دیا کریں؟"

"فارغ وقت بہت کم ملتا ہے اور جب ملتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی نیند پوری کرلوں۔ کیونکہ اچھی صورت کے لیے اچھی نیند کی بہت ضرورت ہے۔ یا پھر مجھے مطالعہ کا شوق ہے' میوزک کا شوق ہے تو پھر تھوڑا وقت اپنے ان مشاغل کو بھی دیتی ہوں۔"

"ڈیزائنرز کے ملبوسات کا کریز ہے؟"

"نہیں' نہیں' بالکل نہیں' جو لباس دل کو اچھا لگے

جو لباس جسم کو سکون و آرام دے وہی پہنتی ہوں۔ لباس اچھا ہو خواہ کسی بھی برانڈ کا ہو یا برانڈ کے بغیر عام لباس ہو۔"

"گہرے رنگ پسند ہیں یا ہلکے؟"

"نہ گہرے نہ بہت ہلکے' ہلکے کھلتے ہوئے رنگ مجھے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اس لیے ان ہی کا استعمال کرتی ہوں۔"

"سالگرہ کب مناتی ہیں؟"

"26 مئی کو اسلام آباد میں پیدا ہوئی اور میرا ستارہ جیمنائی ہے۔"

"ستاروں پر یقین ہے؟"

"بالکل نہیں ہے یقین' جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے مجھے اپنے اللہ پر ہی بھروسا ہے۔"

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

جب تجھ سے ناتا

یاسمین اقبال

س : "شادی کب ہوئی؟"

ج : "10 مارچ 1985ء۔"

س : "شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟"

ج : " رسائل اور ریڈیو پروگرامز میں لمبے لمبے خطوط لکھنا۔ نظمیں لکھنا' پڑھنا پڑھنا اور ڈھیر سارا پڑھنا' کتابوں سے عشق تھا۔ بہت چھوٹی عمر سے تمام شائع ہونے والے رسالے زیر مطالعہ رہے۔ ہمارے پڑوس میں باجی فاطمہ زہرا جبیں کا گھر تھا وہ افسانے لکھا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں' ان کے گھر بچوں اور بڑوں کے ڈھیروں رسالے آیا کرتے تھے۔ وہیں سے بچوں کے رسالے پڑھتے پڑھتے کب بڑوں کی کتابوں تک آن پہنچے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ پھر اتنے رسالوں سے بھی ہمارا پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ابا مزدور آدمی تھے۔ گھر میں غربت تھی۔ کتابیں خرید کر تو نہیں پڑھ سکتے تھے۔ محلے کی لائبریری سے کرائے پر ناول ڈائجسٹ اور عمران سیریز حاصل کرتے۔ میرے ساتھ ساتھ میرے چاروں بھائیوں کو بھی لت لگ گئی پھر ہم پیسے ملا کر خریدتے اور باری باری پڑھتے۔ میرا ایک بھائی تو پڑھنے میں اتنا سست تھا کہ ہم مل کر اس کا ریکارڈ لگاتے کہ ہجے کر کے پڑھتا ہے۔ جنون کا تو یہ عالم تھا کہ جب بچہ ٹافیوں سے بہلایا جاتا تھا۔ ہمیں تندور کی روٹی لپٹے اخبار سے بہلایا جاتا۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی چھت پر سونے کے بہانے چاند کی روشنی میں پڑھا کرتے اور پھر ہماری عینکوں کے نمبر بڑھتے ہی چلے گئے۔"

"نانی اماں تو چٹیا سے پکڑ کر خوب (کٹ) لگاتیں اور کہتیں۔

"نے کڑیے! تیرا ستیاناس جائے موٹی موٹی کتابیں پڑھ پڑھ کر جو ہی جیسے بوتھے پر ویلڈنگ کرنے والوں جیسے کھوپے لگوا لیے ہیں۔ میں جھٹ سے کہتی "نانی آپ نے دیکھا نہیں فلاں فلم میں شبنم اور بابرہ نے بھی ایسی ہی عینک لگائی ہے۔" نانی بڑبڑاتیں درفٹے منہ شلجم تے باجرہ داناں ولی پٹھے تے کام ولی پٹھے۔

(لعنت ہو شلجم' باجرا نام بھی الٹے' کام بھی الٹے)

شرارتیں کرنا پسندیدہ مشغلہ تھا' میری امی جب بھی مجھے اسکول داخل کروانے جاتیں۔ میڈم یہ کہہ کر انکار کر دیتیں۔ یہ لڑکی پڑھنے والی نہیں اس کی آنکھوں سے شرارت چھلکتی ہے۔

تھوڑی سی چھڈے باز قسم کی لڑکی تھی۔ ایک دفعہ پانی بھرتے ہوئے محلے کے ایک لڑکے سے جھگڑا ہوا۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ بالوں سے پکڑ کر ایسی کٹ لگائی کہ اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا ہی پڑا۔

خط لکھنا بھی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ خط بڑے دلچسپ انداز میں لکھا کرتی تھی۔ ہمارے سامنے والا گھر ملک صاحب کا تھا۔ ان کی بیٹی پنجاب کے دور دراز گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ ملکانی ہر ہفتے مجھ سے اپنی بیٹی کے لیے خط لکھوایا کرتی تھیں۔ آم کے درختوں سے بھرا ہوا ان کا بڑا سا گھر ان کے گھر کا بڑا سا لکڑی کا دروازہ ہفتے میں ایک بار میرے لیے کھلا کرتا (مین گیٹ دوسری گلی میں تھا) میں بڑی شان سے قلم کاغذ تھام کر محل جیسے گھر میں داخل ہوتی۔ بڑا اسپیشل پروٹوکول ملتا۔ اور جب ان کی بیٹی کے نام خط لکھ کر سناتی تو ملکانی جی جذبات میں آ کر میرا منہ چوم لیتیں اور کہتیں۔

"صدقے تھیواں' میری دھی نے تاں میرا دل کھول کے خط وچ رکھ دیتا اے۔"

(صدقے جاؤں میری بیٹی نے تو میرا دل کھول کر خط میں رکھ دیا ہے۔)

س : "رشتے میں مرضی؟"

ج : "ہمارے ہاں لڑکیوں سے مرضی نہیں پوچھی جاتی۔ ابو کی خواہش تھی کہ اپنی بہن کے ہاں رشتہ دیں جبکہ امی چاہتی تھیں ان کی بہن کے ہاں میرا رشتہ ہو۔ بڑی کھینچا تانی کے بعد امی جیت گئیں اور خالہ جی کا گھر

Download Free http://paksociety.com

میرا سسرال بنا۔ نہ منگنی دھوم دھام سے ہوئی اور نہ ہی شادی۔ والد صاحب بڑے مذہبی 'صوم و صلوٰۃ کے پابند انسان تھے۔ سادہ بندے تھے اور سادگی پسند کرتے تھے۔ اس لیے نہ ڈھولک بجی نہ شہنائی 'سادگی سے نکاح ہوا اور سادگی سے رخصتی (اللہ اللہ تے خیر صلا)۔"

س : "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

ج : "پانچویں یا چھٹی جماعت میں تھی جب منگنی ہوئی اور میٹرک کے پیپر میں ایک ماہ رہ گیا تھا کہ میرے سسر جو بیرون ملک ملازمت کرتے تھے۔ اچانک چھٹی پر پاکستان آگئے اور افراتفری میں شادی ہوگئی۔ چونکہ کراچی سے بیاہ کر لاہور گئی تھی۔ میٹرک کے پیپر دے ہی نہ پائی۔"

س : "جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟"

ج : "میں چونکہ شاعری کرتی تھی تو مزاج بھی بڑا شاعرانہ تھا۔ ہوا کے سنگ اڑنا پھولوں سے اٹکھیلیاں کرنا 'بارشوں میں بھیگنا اچھا لگتا تھا۔ جیون ساتھی کے حوالے سے بھی ایسا ہی تصور تھا کہ میرے جیسا ہو۔ مگر جناب یہاں تو وہ حساب تھا کہ یہاں کسی کو بھی کچھ حسب آرزو نہ ملا۔

تمام کزنز کا مشترکہ خیال تھا کہ اتنا روکھا اور سڑیل بندہ ہمارا شوہر ہوتا تو ہم کب کے بھاگ چکے ہوتے۔ مگر جناب ہم نے ان کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے تھوڑا پکڑا تھا میرے شوہر میرے تصور کے مطابق نہیں تھے۔ باوجود کوشش کے وہ میرے جیسے نہ ہوسکے تو میں نے ہی ہار مان لی۔" سدا سے عورت ہی ہار مانتی آئی ہے اور میں نے خود کو ان کے مطابق ڈھال لیا اور اپنے رب کی رضا میں راضی ہوگئی تو اس مہربان رب نے ان کے لیے میرے دل میں محبت بھی ڈال دی۔

س : "شادی کے لیے قربانی؟"

ج : "قربانی نہیں جناب قربانیاں کہیں 'سب سے بڑی تو دو قربانیاں 'ایک تو تعلیم ادھوری رہ گئی اور دوسرا میرا عشق جو کتابوں سے تھا۔ مجھے جتنا عشق کتابوں سے تھا 'انہیں اتنی ہی چڑ تھی۔ میرے ہاتھ میں کتاب تو انہیں برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔ بس زندگی یوں کٹی جیسے روح کے بنا جسم۔"

س : "رسموں کے لین دین پر جھگڑا ہوا؟"

ج : "حق مہر لکھنے پر بدمزگی ہوئی۔ میرے تایا کا کہنا تھا 'بری میں جتنا زیور چڑھایا جائے گا سب ہی لکھا جائے گا جبکہ یہ لوگ راضی نہیں تھے۔ بہرحال بحث و تکرار کے بعد میری ساس نے کہا۔ ہم صرف چوڑیاں لکھ کردیں گے۔ پھر بات ختم ہوگئی۔"

س : "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

ج : "حق مہر کی بات کو لے کر ان کا موڈ کافی خراب تھا۔ کچھ بھی نہیں کہا نہ کوئی تعریف نہ کوئی محبت بھرا جملہ۔"

نئے درجات سے پہلے نئی اک آزمائش ہے
نئے انعام سے پہلے نئے آلام دیکھے ہیں

س : "کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

ج : "میں بیاہ کر کراچی سے لاہور گئی تھی۔ میری ساس کی خالہ کا انتقال ہوگیا 'اس لیے ہمارا ولیمہ شادی کے ایک ہفتے بعد ہوا۔ ایک ہفتے بعد ہی گھر کا کام سنبھال لیا۔ میں نے امی کے گھر کبھی کام نہیں کیا تھا بس عیش ہی عیش کیے تھے۔ مجھے ٹھیک طرح سے کھانا بنانا بھی نہیں آتا تھا۔ میں نے ان ہی ڈائجسٹوں سے طریقہ 'سلیقہ اور مزے دار کھانا بنانا سیکھا پہلی مرتبہ

Downloaded From http://paksociety.com

آلو کا حلوہ بنایا۔ سب ہی نے بہت پسند کیا۔"

س : "میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟"

ج : "میکے اور سسرال کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں پایا۔ میکے میں امی بناتی تھیں اور سسرال میں میں خود بناتی تھی۔ اور آپ نے سنا ہی ہوگا۔ سسرال کی روٹی بڑی مہنگی اس میں سو فیصد سچائی ہے۔"

س : "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن پر تنقید؟"

ج : "ایک چپ اور سو سکھ والی بات پلّے سے باندھ لی تھی۔ دل جلانے والی باتوں پر جلتی کڑھتی تو بہت تھی۔ بہت روتی بھی تھی مگر چپ رہتی تھی۔ اکثر یہ جملہ سننے کو ملتا تھا "کچھ بھی کہہ لو آگے سے جواب نہیں دیتی۔" ابھی دل خوش بھی نہ ہو پاتا تھا کہ ایک کونے سے آواز آتی۔ "گھنی اور میسنی ہے۔"

اگر یہ تعریف ہے تو ایسی تعریف تو اکثر و بیشتر ہوتی ہی رہتی تھی۔ پہلے بچے کی پیدائش پر وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ اس پر بڑی تنقید ہوتی تھی۔

س : "سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟"

ج :

وہ سب سوال جو میری سمجھ سے باہر ہیں
میں جاگ جاگ کے ان کے جواب سوچتی ہوں
پلٹ کے دیکھتی ہوں جب راہِ وفا کی طرف
تو عمر بھر کے دکھوں کا حساب سوچتی ہوں

میری سسرال سے وابستہ دو اہم نام س اور ش یعنی ساس اور شوہر برسوں بیتے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے جو اس دنیا سے چلے گئے ان کے متعلق کچھ مت کہو وہ اپنے کیے کا بدلہ پا چکے اس لیے نو کمنٹس۔"

اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ ان کی مغفرت کرے۔ میرے ساتھ مل کر سب آمین ضرور کہیں کیونکہ جب ہم دنیا سے چلے جائیں اور ہمارے لیے دعائے مغفرت کی جائے تو ہم پر آمین کہی جائے۔

میرے اللہ! ہم بہت گناہ گار ہیں تیری رحمت کے پھر بھی طلب گار ہیں۔

س : "سسرال میں مقام؟"

ج : "میں نے اپنی زندگی کے مشکل ترین 25 سال اپنے تین بچوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں گزارے ہیں۔ سسرال میں ساری زندگی گزارنے کے بعد ایک کمرے سے دوسرا کمرہ نہیں ملتا (بھولے بادشاہو اتنی مقام دی گل کردے او) آپ سب نے سنا ہوگا' سسرال سسرال ہوتا ہے خالہ جی کا گھر نہیں۔"

س : "پہلے بچے کی پیدائش؟"

ج : "ناتجربہ کاری اور کم عمری کے باعث شادی کے دس ماہ بعد پیدا ہونے والا بیٹا چند سانسیں ہی لے سکا۔ بہت باتیں سنیں۔ کسی نے کہا۔ فلاں کا پہلا بیٹا مر گیا تھا۔ دوبارہ ساری زندگی بیٹے کی شکل نہیں دیکھی یا یوں کہ پہلا بچہ مر گیا اب پتا نہیں دوبارہ اولاد ہوگی بھی یا نہیں۔ مگر میرا اللہ بڑا مہربان ہے۔ اگلے دس ماہ بعد پھر میرے ہاں بیٹا ہوا صحت مند اور بہت خوب صورت پھر اوپر تلے اللہ نے مزید بیٹے اور بیٹی سے نوازا۔

اے اللہ میں تیرا شکر کیسے ادا کروں تو کتنی محبت کرنے والا اور مہربان ہے۔

س : "جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟"

ج : "جوائنٹ فیملی اچھی لگتی ہے اگر محبت سے سب مل جل کر رہیں تو بہت اچھا لگتا ہے مگر آج کل کے جو حالات ہیں اب وہ محبتیں کہاں ہیں۔ اب تو سگے بھائیوں کی آپس میں نہیں بنتی علیحدہ رہنا ہی اچھا ہے۔"

س : "شادی شدہ بہنوں کے نام کوئی پیغام؟"

ج : "کسی سے توقعات وابستہ نہ کریں۔ اللہ پر ہی کامل یقین رکھیں۔ اللہ ہی سے مدد طلب کریں۔ صبر سے کام لیں۔ صبر وہ سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔"

س : "غیر شادی شدہ بہنوں کے نام کوئی پیغام؟"

ج : "خوش رہیں اور خوش رکھیں۔ ماں باپ کی خوب خدمت کریں۔ شادی کے بعد یہ موقع نہیں ملتا۔ خاص طور پر لڑکیوں کو۔"

☆

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

صائمہ اکرم چوہدری

شہزاد

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میرپاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

خاقان علی۔ نے دو شادیاں کی ہیں' پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی' لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو' تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

طوبیٰ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے' لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں' بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے' لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

ٹینا بیگم' شہزاد کے ساتھ ایک آستانے پر جاتی ہیں۔ واپسی پر گھر کے گملے ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے تیسرے شوہر ہارون رضا بتاتے ہیں کہ رومیصہ نے پھر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ نیب دکھاتے ہیں تو ٹینا بیگم کا سر گھوم جاتا ہے۔

۳
تیسری قسط

اس خبر کو سننے کے بعد وہ انتہائی پریشانی سے کسی میزائل کی طرح اپنی گاڑی اڑاتی ہوئی شالیمار کلب سے نکلی۔ غائب دماغی کے عالم میں اس نے گاڑی کی ہیڈلائٹس تک آف نہیں کیں' دماغ میں بگولے کی طرح ایک ہی فقرہ گردش کر رہا تھا۔

"رومی کو پولیس نے اریسٹ کرلیا ہے' مرڈر کے الزام میں....."

"وہ کسی کا قتل کیسے کرسکتی ہے....؟" شہزاد کا دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

"پولیس کو یقیناً" کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوگئی' ورنہ رومی اتنی بہادر تو نہیں ہے۔" اس نے خود کو تسلی دینا چاہی۔

"لیکن پولیس شک کی بنا پر کسی لڑکی کو کیوں گرفتار کرے گی....؟ دماغ میں ایک اور سوچ ابھری۔

"یقیناً" کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا....." اس سوچ کے آتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار لاشعوری طور پر بڑھادی۔

ایک سو دس کی رفتار سے گاڑی چلاتی وہ ایک چوک پر پہنچی' اس نے دور سے دیکھا' سگنل کھلا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ بجلی کی سی تیزی سے وہاں سے گزر جائے گی لیکن ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ سبز سگنل' زرد ہوگیا اور اس کے آگے موجود گاڑی ایک دم رک گئی' اور وہ جو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی' ایمرجنسی بریک کے باوجود اس کی گاڑی ٹھاہ کرکے اگلی گاڑی سے جا ٹکرائی۔

"اونو....." شہزاد نے انتہائی شرمندگی سے اپنا سر پکڑا۔

وہ جانتی تھی' غلطی سراسر اس کی اپنی تھی۔ زیادہ اسپیڈ کی وجہ سے وہ گاڑی پر اپنا کنٹرول نہیں رکھ پائی' جس کی وجہ سے یہ حادثہ ہوگیا۔ آگے والی گاڑی سے کوئی فکرمند انداز سے نیچے اترا' اس کی نئی کار کا بمپر ٹوٹ چکا تھا۔

"محترمہ' اپنی گاڑی ایک سائیڈ پر کریں....." ٹریفک وارڈن بھاگ کر اس کے پاس آیا۔

"آئی ایم سوری' میں مینٹلی کچھ ڈسٹرب تھی' اس لیے بروقت بریک نہیں لگا سکی۔" اس نے نیچے اترتے ہی اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

وہ کوئی چھبیس ستائیس سال کا نوجوان تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے اس کی معذرت سنی تھی۔ اس نے ایک نظر میں شہزاد کی گاڑی کا بھی معائنہ کیا' وہاں بھی اچھا خاصا ڈنٹ پڑچکا تھا۔

"آپ لوگ طے کرلیں' اب کیا کرنا ہے۔" پولیس کانسٹیبل اپنی جان چھڑا کر دوبارہ چوک میں جاچکا تھا۔

"ایکسٹریملی سوری' میری وجہ سے آپ کی گاڑی کا بمپر ٹوٹ گیا۔" شہزاد نے دل ہی دل میں نقصان کا تخمینہ لگایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"اٹس اوکے....." دوسری جانب سے کمال بے نیازی کا مظاہرہ ہوا' شہرزاد نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ نہیں پائی تھی۔

"پلیز ڈونٹ وری' آپ کا جتنا نقصان ہوا ہے' میں ابھی پے کردیتی ہوں۔" شہرزاد نے اپنی گاڑی کی اگلی سیٹ پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔

"اس کی ضرورت نہیں' نقصان تو کسی سے کہیں پر بھی ہو سکتا ہے۔ میں ٹھیک کروالوں گا خود ہی۔ ٹیک کیئر۔" وہ برٹش انگلش لہجے میں بڑی روانی سے انگلش بولتا ہوا اسے حیران کر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے مزید کچھ کہتی' ٹینا بیگم کی سیل فون پر آنے والی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سیل فون کان سے لگا کر ایک طرف ہوئی۔

"شیری! کہاں ہو تم....." دوسری طرف ٹینا بیگم سخت جھنجلائی ہوئی تھیں۔

"مام' آئی ایم جسٹ کمنگ..... پلیز ویٹ....." اپنی پیشانی مسلتے ہوئے' اس نے انہیں دلاسا دیا۔

"ہری اپ' گاڑی کی ضرورت ہے مجھے....." ان کے لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

"ڈونٹ وری مام' بی ریلیکس' آئی ایم کمنگ....." اس نے دھیرج سے کہا اور کال منقطع کردی۔

"دیکھیں مسٹر....." وہ جیسے ہی کال بند کرکے مڑی' اسے دھچکا لگا۔ وہ اسے حیران کرکے ہوا کے جھونکے کی طرح جا چکا تھا۔ خفت کی ایک لہر لحظہ بھر کو ابھری اور پھر فوراً" ہی معدوم ہوگئی۔ وہ پیشانی پر آئے پسینے کے قطروں کو صاف کرتی ہوئی دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"بھلا مانس انسان تھا' جو ایسے ہی چھوڑ گیا۔" وہ دل ہی دل میں ممنون ہوئی۔

بیس منٹ کے بعد اس کی کار اپنے بنگلے کے پورٹیکو میں داخل ہوئی جہاں پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ اتھل پتھل ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے نیچے اتری اور گھر میں ہونے والی غیر معمولی ہلچل سے اسے اندازہ ہوا کہ گھر کے سب ہی مکین' اس خبر سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ورنہ یہاں اتنی صبح سویرے جاگنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ سردیوں کی نرم دھوپ بنگلے پر پھیل چکی تھی۔

وہ لاؤنج کا شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی' باورچی خانے میں کھڑے خانساماں نے جھانک کر باہر دیکھا اور اسے سلام کرکے واپس مڑ گیا' اسی وقت ملازمہ چائے کی ٹرالی لیے کچن سے نمودار ہوئی۔

"کون آیا ہے؟" شہرزاد نے لوازمات سے لدی ہوئی ٹرالی کو دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

"ہارون صاحب۔" ملازمہ کی اطلاع پر اس کے اعصاب تن گئے۔

"اور دوسری گاڑی کس کی ہے؟" اس کے چہرے پر بے زاری کے تاثرات نمودار ہوئے۔

"کوئی وکیل صاحب ہیں شاید....."

"اچھا ٹھیک ہے' جاؤ اور مام کو بتادینا' میں آگئی ہوں۔" وہ مضطرب انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ اس کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ لباس تبدیل کرکے بالوں میں برش کرنے لگی۔

"مجھے مام سے ملنا چاہیے' پتا نہیں روی کی کیا سچویشن ہو۔" اس نے برش بیڈ پر پھینکا اور تیزی سے کمرے سے نکلی۔

ابھی وہ لاؤنج کی سیڑھیوں پر پہنچی ہی تھی کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا' ٹینا بیگم کے پریشان چہرے کے پیچھے ہارون رضا ہاتھ میں سگار پکڑے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شہرزاد کا حلق تک

Downloaded From http://paksociety.com

کڑوا ہو گیا۔

"کہا تھا نا' تمہاری یہ بیٹی کوئی نہ کوئی کارنامہ ضرور سرانجام دے گی' دیکھ لو' ایسا ہی ہوا۔" اعصاب شکن خاموشی میں ہارون کا تمسخرانہ لہجہ ٹینا بیگم کو بہت ناگوار گزرا' شہرزاد نے بھی انہیں سخت ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"تو کیا کروں' شوٹ کردوں' اسے یا پھانسی پر چڑھادوں؟" انہوں نے ضبط و برداشت کی آخری حدوں کو عبور کرتے ہوئے تلخی سے کہا۔

"جان چھڑاؤ اپنی' شادی کرکے اس کی....." شہرزاد کو اس بے وقت کی راگنی پر کوفت ہوئی۔

"فار گاڈ سیک ہارون! یہ کوئی موقع ہے ایسی باتیں کرنے کا....." وہ بری طرح جھنجلا گئیں۔

"باتیں تو ابھی بہت ہوں گی ہمارے سوشل سرکل میں' میڈیا تک خبر پہنچے دو ذرا۔" ان کا چہرہ اس سے پہلے اتنا بدصورت نہیں لگا تھا شہرزاد کو۔

"واٹ دا ہیل ہارون' اگر کوئی اچھی بات نہیں کرسکتے تو منہ بند رکھو اپنا....." ٹینا بیگم نے بھی بدلحاظی کے سارے ریکارڈ توڑے۔ وہ اس صورت حال میں بھی انتہائی نک سک سے تیار تھیں۔ شہرزاد سیڑھیاں اترتے ہوئے ان کی تیاری نوٹ کرچکی تھی۔ ہارون رضا نے انہیں جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شہرزاد کو دیکھ کر لحاظ کرگئے۔ ویسے بھی ٹینا بیگم کی اس بیٹی کا سراپا انداز انہیں اپنی حد میں رہنے پر مجبور کردیتا تھا۔

"السلام علیکم!" شہرزاد نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر انہیں بادل نخواستہ سلام کیا۔

"والسلام" وہ بھی مختصر اجواب دے کر سگار پینے لگے۔

"تھینکس گاڈ' شیری! تم آگئیں' چلو ذرا میرے ساتھ۔" انہوں نے ہینڈ بیگ سے اپنے بے حد قیمتی گاگلز نکال کر بڑی نفاست سے ٹشو پیپر سے اس کا شیشہ صاف کیا۔ ان کی بات پر ہارون رضا ایک دم بے چین ہوئے۔

"اب کہاں جارہی ہو صبح صبح چھاپہ مارنے؟" ان کی مسکراہٹ طنزیہ اور لہجہ آگ لگانے والا تھا۔

"قریشی لاء ایسوسی ایٹس کے آفس۔" انہوں نے بڑی تمکنت سے کسی راج ہنس کی طرح گردن اٹھا کر جواب دیا۔ اس وقت سیاہ رنگ کے سادہ سوٹ پر ہلکے بادامی رنگ کی شال اوڑھے وہ خاصی باوقار لگ رہی تھیں۔

"واٹ؟" وہ انتہائی خفگی اور بے زاری سے کھڑے ہوئے۔

"اور وہ جو بابر خاقان آیا بیٹھا ہے ڈرائنگ روم میں۔" بے حد کٹیلی نظروں کے ساتھ انہوں نے اپنی بیگم کو دیکھا' جو انہیں اس وقت جوتے کی نوک پر بھی رکھنے کو تیار نہیں تھیں اور کسی زمانے میں ٹینا بیگم کی اسی ادا پر فریفتہ ہو کر انہوں نے اپنے تین جوان بچوں کی موجودگی میں نہ صرف ان سے شادی کی بلکہ جوش جذبات میں ایک ماربل فیکٹری بھی حق مہر میں لکھ دی تھی' جس پر وہ اب اکثر پچھتاتے تھے۔

"یہ بابر خاقان' یہ لڑے گا میری بیٹی کا کیس.....؟" انہوں نے سلگتی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا اور چیخ کر بولیں۔

"ہاں' اچھا خاصا تو ہے....." خود پر قابو پاکر وہ ذرا تحمل سے گویا ہوئے۔

"یہ اچھا خاصا ہے؟" انہوں نے طنزیہ انداز میں اپنی بھنویں اچکائیں۔ "مجھ سے بات کرتے ہوئے بیس دفعہ انکا ہے یہ ڈفر' کورٹ میں جاکر کیا خاک دفاع کرے گا رومی کے کیس کا۔"

"تو پھر بلوایا کیوں تھا اسے۔" ہارون رضا کا مزاج بگڑا۔

"مجھے کیا پتا تھا اتنا ایڈیٹ ہوگا تمہارا بابر خاقان' چائے پلا کر فارغ کرو اسے۔" ٹینا بیگم نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"جب سب کچھ تمہیں خود ہی کرنا تھا تو میری نیند کیوں برباد کی صبح صبح۔۔۔" ان کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا اور ویسے بھی وہ مزاجاً" خاصے تنک مزاج تھے تب ہی تو ان کی اور ٹینا بیگم کی ہر وقت ٹھنی رہتی تھی۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ تم اپنے جیسا نمونہ اٹھا کر لے آؤ گے میرے پاس۔" شہرزاد نے اس فضول بحث پر کوفت بھرے انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹائم تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔

"سیف الرحمٰن جیسے اسٹرونگ سور سز تو ہیں نہیں میرے پاس۔۔۔" ان کے طنزیہ انداز پر ٹینا بیگم کے چہرے پر خون چھلکا۔

"وہ تو پوری ایک لاء فرم ہائر کرلے گا کھڑے کھڑے تمہاری بیٹی کے لیے۔" ہارون کی طرف سے اس قدر براہ راست حملے کی توقع نہیں تھی انہیں اور شہرزاد کی موجودگی میں تو یہ فقرہ ایک کوڑے کی طرح ان کے اعصاب پر برسا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے بھی کسی "کام" کے بندے سے ہی رابطہ کرنا چاہیے' تم جیسے تو محض اپنا اور دوسروں کا ٹائم ہی ویسٹ کرسکتے ہیں۔" ان کی جوابی کارروائی نے ہارون رضا کو مشتعل کیا۔

"شٹ اپ۔۔۔" وہ ایک دم دھاڑے۔ شہرزاد نے ناگواری سے ہارون رضا کی طرف دیکھا۔ ان کی خوابیدہ آنکھیں غصے کی زیادتی سے مزید سرخ ہوئیں اور ویسے بھی "عادی" پینے والوں کی طرح ان کی آنکھوں میں گلابی پن تو ویسے ہی جھلکتا تھا۔ اس وقت تو وہ کسی کوبرے کی طرح دہک رہی تھیں۔

"یو شٹ اپ۔" وہ اسی طنطنے سے گویا ہوئیں' جوان کے مزاج کا حصہ تھا۔

"گو ٹو دا ہیل۔۔۔" وہ بے زاری سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔

"اپنے اس گدھے کو بھی لے جاؤ ساتھ' جسے ہانکنے کے لیے لے آئے تھے صبح صبح۔" ٹینا بیگم نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

"مام پلیز۔۔۔ کول ڈاؤن۔" شہرزاد نے بے تاثر انداز میں انہیں مخاطب کیا۔ وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکلیں۔ پورٹیکو میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھیں' ابھی ان کی نظر اس "ڈینٹ" پر نہیں پڑی تھی' جو آج ہی شہرزاد باہر سے تمغے کی طرح سجا کر لائی تھی۔

☆ ☆ ☆

مری ایکسپریس وے پر اس وقت بے تحاشا رش تھا۔ ایک گھنٹہ ٹریفک جام میں پھنسنے کے بعد محمد ہادی کی گاڑی جیسے ہی شہر میں داخل ہوئی' اس نے سکون کا سانس لیا۔ مری میں' عام دنوں میں ہی گاڑیوں کا ہجوم رہتا تھا لیکن ویک اینڈ پر تو یہ صورت حال خاصی گھمبیر ہو جاتی تھی۔ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی' دوسری طرف مسز عالیہ قریشی تھیں۔

"جی ماما۔۔۔" اس نے فوراً" ہی کال اٹینڈ کی۔

"گھر پہنچ گئے ہو تم۔۔۔؟"

"نہیں' پندرہ سے بیس منٹ لگیں گے مزید۔" اس نے کلائی میں بندھی گھڑی دیکھ کر اندازہ لگایا۔

"چلو پھر پہنچتے ہی گل خان کو کہنا' لنچ باکس سے سارے سالن نکال کر فریز کردے۔" ان کے محبت بھرے انداز پر وہ مسکرایا۔

"اور کوئی حکم؟" وہ شرارتی انداز سے گویا ہوا۔

"نیکسٹ ویک اینڈ بھی ضرور آنا' میں اپنے ہاتھوں سے کوکنگ کرکے دوں گی تمہیں۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"ان شاء اللہ' اب فون بند کریں۔ سامنے ٹریفک وارڈن کھڑا ہے' چالان کردے گا میرا۔" اس نے جلدی سے فون بند کیا اور سی ڈی پلیئر چلایا۔ اپنی پسند کا میوزک سنتے ہوئے وہ جیسے ہی اپنے گھر کے سامنے پہنچا' اس کا دماغ بھک کر کے اڑ گیا۔

کوئی سیاح اپنی گاڑی عین اس کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑی کر کے جا چکا تھا۔ کوفت اور بے زاری کا اس پر بڑا بھرپور حملہ ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف گاڑی کھڑی کی اور سامان باہر نکالا' ماما نے اچھا خاصا بڑا ٹفن اس کے ہمراہ کر دیا تھا۔

وہ جیسے ہی اپنے گھر کے چھوٹے گیٹ سے سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگا' اس کی نظر میر ہاؤس پر پڑی' جہاں کرکٹ کا میچ زوروں پر تھا۔ در شہوار گینگ نے ایک طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔ وہ اتنا کھیل نہیں رہی تھیں جتنا شور مچا رہی تھیں۔

"ان لڑکیوں کو بھی سکون نہیں ہے۔" وہ بے زاری سے سیڑھیاں اترنے لگا۔

"اوہ چھکا.....!" ساتھ والے لان سے ایک دم شور برپا ہوا۔

اس سے پہلے کہ ہادی سر اٹھا کر شاہد آفریدی کی جانشین کو دیکھتا' ایک بھاری بھرکم سی گیند اُڑتی ہوئی آئی اور میزائل کی طرح اس کے ہاتھ میں پکڑے ٹفن سے ٹکرائی اور ٹفن ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے لان میں جا گرا۔ سرسوں کا ساگ' کھیر اور حلیم تینوں کے ڈبے زمین بوس ہو کر اب آپس میں شیر و شکر ہو چکے تھے۔

"اوہ نو....." ہادی کا صدمے سے برا حال ہوا۔ ماما کی سارے دن کی محنت اس وقت مٹی میں مل چکی تھی۔

"مارے گئے۔" در شہوار' طوبیٰ اور نمیرہ دیوار سے جھانکتے ہوئے یہ منظر دیکھ چکی تھیں۔ اسی لمحے ہادی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

"ذرا نیچے تشریف لائیں۔" اس کی پیشانی کی عمودی لکیریں گہری ہوئیں۔ اس نے اپنے اندر کے ابلتے ہوئے لاوے کو بمشکل دباتے ہوئے ہاتھ سے در شہوار کو نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

"سوری' ٹائم نہیں ہے ہمارے پاس۔" وہ منڈیر سے جھانکتے ہوئے شوخی سے گویا ہوئی۔

ایک آن دیکھی غصے کی آگ نے ہادی کے وجود کا احاطہ کیا۔ اسے لگا جیسے اس نے مزید ضبط کی کوشش کی تو یہ آگ اس کے سارے وجود کو جلا کر بھسم کر دے گی' وہ کچھ سوچ کر پلٹا اور اب تیز تیز چلتے ہوئے اس کے قدم میر ہاؤس کی طرف تھے۔

در شہوار کی سمجھ میں پہلے کچھ نہیں آیا مگر جیسے ہی اس نے ہادی کو اپنے گیٹ کی طرف جاتے دیکھا' اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ ہرنی کی سی تیزی سے قلانچیں بھرتی ہوئی نیچے اتری۔

"بھاگو' وہ سڑیل آ رہا ہے ہمارے گھر....." در شہوار کی بات پر ان دونوں کو کرنٹ لگا اور اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی سی سرعت سے اندر کی طرف بھاگیں لیکن آج شاید ان کے ستارے گردش میں تھے۔

محمد ہادی جیسے ہی ان کے گیٹ پر پہنچا' برہان کی لینڈ کروزر وہاں آ کر رکی' انہوں نے حیرانی سے سامنے کھڑے لڑکے کو دیکھا' جس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے تمتما رہا تھا۔ وہ انتہائی مناسب لفظوں میں اپنا شکایت نامہ جمع کروا کر دوبارہ گھر پہنچا تو سامنے ٹفن کی بربادی کا منظر دیکھ کر اس کا خون دوبارہ سے کھول اٹھا۔

ہال کمرے میں تاجدار بیگم نے ایک دفعہ پھر عدالت سجا رکھی تھی۔ در شہوار' طوبیٰ اور نمیرہ ایک لائن میں سر جھکائے کھڑی تھیں اور تاجدار بیگم کے ساتھ بیٹھے برہان لالہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان تینوں کو پنکھے سے لٹکا دیتے۔

Downloaded From http://paksociety.com

"توبہ توبہ! اقرب قیامت کی نشانیاں ہیں' اب گھر کی جوان جہان بچیوں کی شکایتیں لے کر لڑکے آئیں گے اڑوس پڑوس سے۔" تاجدار بیگم انتہائی غصے سے انہیں گھورتے ہوئے بولیں۔

"پرابلم کیا ہے تم لوگوں کے ساتھ.....؟" برہان دبی آواز میں غرائے۔

"جی ایم سوری لالہ' ہم نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا ایسا۔" درشہوار نے ان کی ملامتی نظروں سے گھبرا کر جواب دیا۔

"ضرورت کیا تھی بھلا مسٹنڈوں کی طرح یہ گیند بلا کھیلنے کی۔" تاجدار بیگم چڑ کر بولیں۔

"اتنی شرم آرہی تھی مجھے' اپنے گھر کی خواتین کا ذکر کسی غیر مرد کے منہ سے سن کر۔" برہان غصے سے ٹہلنے لگے۔

"منہ توڑ دینا تھا اس شکایتی ٹٹو کا۔" درشہوار کی زبان پھسلی۔

"تم تینوں کی ٹانگیں نہ توڑ دوں' تاکہ ارد گرد کے لوگوں کی زندگیاں سکون سے گزریں۔" وہ اپنے غصیلے جذبات پر قابو پا کر ٹھہر ٹھہر کر بے لچک لہجے میں بولتے ہوئے ان تینوں کی روح فنا کر گئے۔

"میری تو زندگی عذاب کر رکھی ہے ان لڑکیوں نے' آج تو صاف صاف بات کروں گی ان کے داجی سے' نور محل میں رکھیں انہیں پاس' پتا چلے انہیں بھی انسانوں کی طرح کیسے رہتے ہیں۔" تاجدار بیگم کی دھمکی نے ان تینوں کا رہا سہا سکون بھی برباد کر دیا۔

"کیا سوچتا ہوگا وہ بھلا مانس' شتر بے مہار کی طرح چھوڑ رکھا ہے اپنے گھر کی خواتین کو۔" برہان غصے سے ٹہلنے لگا۔

"اور جو ہم سوچتے ہیں اس کمینے کے بارے میں' اسے پتا چلے تو گولی مار لے خود کو۔" درشہوار نے دل میں سوچا۔ یہ شرانگیز جملہ وہ کم از کم برہان لالہ کے سامنے بولنے کا رسک نہیں لے سکتی تھی' اتنی تو عقل تھی اس میں۔

"دوبارہ تم تینوں میں سے کوئی مجھے سامنے والے لان میں نظر آیا تو نور محل نہیں' بڑی حویلی بھجوا دوں گا بابا سے کہہ کر۔" برہان کے دھمکی آمیز انداز پر ان تینوں نے دہل کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بڑی حویلی جانے کا تصور ہی ان تینوں کے لیے بڑا خوفناک تھا۔ ایک تو ملتان کی گرمی اور اوپر سے اپنے فارم ہاؤس کے پاس بنی حویلی کے آس پاس کوئی چرند پرند بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے بڑی حویلی ان سب کے لیے کسی قید خانے سے کم نہیں تھی۔

اسی وقت انابیہ چائے کی ٹرے لیے ہال کمرے میں داخل ہوئی' اس نے کن اکھیوں سے سامنے کرسی پر بیٹھے برہان کو دیکھا۔ سرمئی کلر کے کرتا شلوار میں وہ قمیص کی آستینوں کو کہنیوں تک موڑے' گھنی مونچھوں کے نیچے خفا خفا سے لبوں کے ساتھ بہت شاندار لگ رہے تھے۔

"چائے....." وہ اتنی آہستگی سے بولی تھی کہ برہان بمشکل ہی سن پائے۔

"میرا موڈ نہیں ہے۔" وہ درشتی سے کہتے ہوئے کھڑے ہوئے اور کسی سے بھی مخاطب ہوئے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ اس بے رخی پر انابیہ کا دل ایک دم ٹوٹا اور آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔

"بے دردی پیا' بڑا ظلم کیا....." درشہوار نے ہلکا سا گنگنا کر چائے کا کپ اٹھایا۔

"الائچی نہیں ڈالی اس میں؟" اس نے پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے ہی برا سا منہ بنایا۔ طوبیٰ اور نمیرہ نے بمشکل اپنی ہنسی کا گلا گھونٹا۔

"چٹکی بھر زہر دال دو اس میں' ہماری تو جان چھوٹے اس سے....." تاجدار بیگم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں اور

Downloaded From http://paksociety.com

کھا جانے والی نگاہوں سے اپنی اکلوتی دختر نیک کو گھورتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئیں' ان کے جانے کے بعد وہ تینوں کھلکھلا کر ہنسیں۔

"اس شکایتی ٹٹو کو تو چھوڑوں گی نہیں میں۔۔۔" درشہوار نے بلند آواز میں اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

"چغل خور نہ ہو تو۔۔۔" طوبیٰ نے تاجدار بیگم کا چائے کا کپ اٹھایا۔

"ویسے چھکا شاندار لگایا تھا تم نے' اس کے لنچ باکس کے تو بخیے ادھڑ گئے۔" نمیرہ گلا پھاڑ کر ہنسی۔

"شرم کرلو تم تینوں۔۔۔" انابیہ نے خود کو سنبھال کر ملامتی نگاہوں سے ان تینوں کی طرف دیکھا۔

"اب نہیں آتی تو کیا کریں۔۔۔" نمیرہ' طوبیٰ کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسی۔

"ویسے بیا آپ سوچیں' اس بے دردی پپا کے ساتھ گزارہ کیسے کرتا ہے۔" درشہوار نے شرارتی نظروں سے اسے اپنے بھائی کے حوالے سے چھیڑا۔ انابیہ کا چہرہ شرم سے گلابی ہوا۔

"فضول باتیں' جتنی مرضی کروالو تم لوگوں سے۔" انابیہ نے ہنس کر بات ٹالی۔

اسی لمحے برہان دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے' ایسا لگا جیسے کسی نے پھونک مار کر ہر چیز کو پتھر کا کر دیا ہو۔ ان تینوں کی مسکراہٹیں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوئیں۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی تینوں کو سخت نظروں سے گھورا۔

"رزلٹ آگیا ہے تم تینوں کا۔۔۔" درشہوار کو ایسے لگا جیسے کسی نے کمرے میں صور پھونک دیا ہو۔

"اچھا کب؟" درشہوار نے خشک حلق کو تر کر کے پوچھا۔

"جس وقت آپ دوسروں کے چھکے اڑا رہی تھیں' شاہ میر کی کال آئی ہے ابھی۔" ان کے طنزیہ انداز پر ان تینوں نے سر جھکا لیا۔

"کیسا رہا؟" نمیرہ نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا' حالانکہ برہان کے چہرے پر چھائی ناراضی کے بعد اس سوال کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔

"جیسے پیپر زدیے تھے' ویسا ہی رہا۔۔۔" برہان تلخ انداز میں گویا ہوئے۔

"لالہ' پلیز بتائیں ناں۔" درشہوار نے بے صبری سے ان کی بات کاٹی۔

"الحمدللہ تم نے اور طوبیٰ نے کیمسٹری میں اور نمیرہ صاحبہ نے پاک اسٹڈیز میں جھنڈے گاڑ دیے ہیں' مبارک ہو۔ بڑا شان دار رزلٹ آیا ہے۔" برہان کے طنزیہ لہجے پر انہیں لگا جیسے میرا ہاؤس کی چھت ان کے سر پر آن گری ہو۔ وہ سب اپنی جگہ پر منجمد ہو گئیں۔ ان سب کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔

"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" انابیہ نے مسکراتے ہوئے ان کے زخموں پر مزید نمک چھڑکا' وہاں رکھی چائے کی ٹرے اٹھائی اور کمرے سے نکل گئی' جب کہ وہ تینوں حواس باختہ چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

رومیصہ نے چوبیس گھنٹوں میں زندگی کا انتہائی تلخ اور رونگٹے کھڑا کر دینے والا روپ دیکھا تھا۔

حوالات کے پیچھے کھڑے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے اعصاب شکنجے میں کس دیے ہوں۔ اس غیر متوقع خوفناک واقعے نے اس کے حواس شل کر دیے تھے۔ وہ شدید قسم کی ذہنی اضمحلال کا شکار تھی۔ اس حادثے نے اس کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وہ تو آزاد فضاؤں کا پرندہ تھی' جسمانی قید تو دور کی بات وہ تو اپنے خیالات پر بھی کسی قسم کی بندش پسند نہیں کرتی تھی' لیکن قسمت نے اُسے عجیب طریقے سے سلاخوں کے پیچھے لا پٹخا تھا۔ وہ شدید پریشانی میں ہیجانی انداز کے ساتھ مسلسل ٹہل رہی تھی۔

آنکھوں میں پھیلی سرخی اور وحشت اس کی بدترین ذہنی کیفیت کی غماز تھی' خشک ہونٹ' بے رونق جلد اور لب بھینچے' سر جھکائے ـــــ کھڑی تھی ـــ اس کا سارا طنطنہ اور سارا غرور چند گھنٹوں میں ختم ہو گیا تھا۔

اس کے لیے سب سے بڑی صدمے کی بات یہ تھی کہ اس حادثے میں اس کے ساتھ موجود اس کی دوست کنزہ کو اس کے والد بریگیڈیئر وقار درانی نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے نہ صرف چند گھنٹوں میں ضمانت پر رہا کروالیا تھا بلکہ ایف آئی آر سے اس کا نام تک نکلوا دیا تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ٹینا بیگم کے تعلقات بھی خاصے ہائی لیول پر تھے لیکن جسٹس محمود کی فیملی کے ساتھ پنگا لینا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ٹینا بیگم ابھی ابھی شہزاد کے ہمراہ پولیس اسٹیشن پہنچی تھیں' اگرچہ ایس پی نیاز جنجوعہ کی کال کی وجہ سے انہیں بھی اسپیشل پروٹوکول دیا جا رہا تھا اور پھر اس تھانے کے انچارج کے پاس آنے والی فون کالز سے ڈیوٹی پر موجود آفیسرز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف بھی خاصی تگڑی پارٹی ہے۔ ٹینا بیگم کا بات کرنے کا انداز بھی کچھ ایسا تھا کہ اگلا ایک لمحے کو جواب دینے سے پہلے ضرور سوچتا تھا۔

سیاہ رنگ کے تنگ ٹراوزر کے ساتھ شارٹ شرٹ پہنے انہوں نے چھوٹا سا اسکارف گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ سر پر قیمتی گاگلز ٹکائے' ہائی ہیل کے ساتھ ٹک ٹک کرتی وہ جب سیف الرحمٰن سے گفتگو کرتے' پولیس اسٹیشن کے اس حصے کی جانب آئیں جہاں رومیصہ قید تھی تو انہیں اپنی بیٹی کا اجڑا حلیہ' زرد رنگت اور وحشت زدہ آنکھیں دیکھ کر ایک دم دھچکا لگا۔

"واٹ دا ہیل یار' نکالو اسے باہر' یہ کیا حالت کر رکھی ہے میری بیٹی کی۔" وہ دبنگ لہجے میں ایک دم چیخیں۔

"مام۔۔۔ فار گاڈ سیک' مجھے بچالیں۔" رومیصہ کی آنسوؤں میں ڈوبی ممکمین آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی تو ٹینا بیگم کے مضبوط اعصاب ایک دم ڈھے گئے۔ رومیصہ کے ساتھ ان کے اکھ اختلافات سہی لیکن اسے اس حالت میں دیکھنا ان کے لیے کسی بڑے امتحان سے کم نہیں تھا۔

"سیفی فورا" پہنچیں آپ' اس باسٹرڈ نے میری بیٹی کو اتنی گندی جگہ پر قید کر رکھا ہے' اس کی ہمت کیسے ہوئی۔" ان کے لہجے میں چھپی صدمے کی کیفیت اب غم و غصے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

اگلے ایک گھنٹے میں ٹینا بیگم اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے رومیصہ کی ضمانت کروانے میں تو کامیاب ہو گئی تھیں لیکن اس عرصے میں انہیں بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کیس ان کی بیٹی کے گلے پڑنے والا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ رومیصہ کی گاڑی تھی' جس کے ساتھ ٹکرا کر روحیل محمود کو حادثہ پیش آیا تھا اور جسٹس محمود کی فیملی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ اس وقت گاڑی رومی نہیں' کنزہ وقار چلا رہی تھی۔

"آپ لوگوں نے کنزہ وقار کا نام کیوں نکالا ہے ایف آئی آر سے؟" ٹینا بیگم درشتی سے گویا ہوئیں۔

"انہوں نے ایف آئی آر میں صرف آپ کی بیٹی کا نام ہی لکھوایا تھا۔" ایس ایچ او نے نظریں چرا کر کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے' یہ مان لیا' لیکن اس وقت پیٹرولنگ پر موجود پولیس آفیسرز یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ گاڑی کون ڈرائیو کر رہا تھا۔"

"دیکھیں' وہ کہتے ہیں' انہوں نے اس چیز کی طرف دھیان نہیں دیا۔" ایس ایچ او کی بات پر ٹینا بیگم جھنجلا سی گئیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

"ان سے کہیں 'پولیس ڈپارٹمنٹ چھوڑ کر کوئی ٹھیلہ لگا کر بیٹھ جائیں' اگر وہ ان چیزوں پر دھیان نہیں دیں گے تو کون دے گا؟"

"دیکھیں مسز سہگل' آپ اچھی طرح جانتی ہیں' ہم لوگ بے بس ہیں' اور وہی کرنا ہوتا ہے جس کی آرڈرز ملتے ہیں۔ آپ پلیز کوئی اچھا وکیل ہائر کر کے اپنی بیٹی کا دفاع کرلیں۔" ایس ایچ او نے نرمی سے انہیں مشورہ دیا' ویسے بھی ٹینا بیگم کے اختیارات کا اندازہ انہیں تھی ہو گیا تھا۔

"مام' یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں' ہمیں نکلنا چاہیے۔" شہرزاد نے میز پر رکھا اپنا سیل فون اٹھایا اور فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہوئی۔

ٹینا بیگم پولیس اسٹیشن سے نکلیں تو اچھی خاصی فکر مند تھیں۔ شہرزاد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی بیک مرر سیٹ کیا' رومیصہ خوف زدہ انداز میں بالکل سکڑی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

مام کو کافی کالز آرہی تھیں اور چونکہ شہرزاد انہیں اچھی طرح سمجھا کر لائی تھی' اس لیے رومی کے ساتھ ان کا رویہ خاصا بہتر تھا۔ انہوں نے جیسے ہی اپنی کال بند کی' شہرزاد نے رومیصہ کو مخاطب کیا۔

"تم کیا پہلے سے جانتی ہو روحیل محمود کو؟"

"نہیں۔" وہ اضطراری کیفیت میں اپنے ہاتھوں کے ناخن چبا رہی تھی' شہرزاد کو ہلکی سی گھن محسوس ہوئی۔

"پھر' وہ تمہارے پیچھے کیوں آیا؟" وہ حیران ہوئی۔

"میرا جھگڑا ہو گیا تھا اس کے ساتھ کلب میں۔" اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

"تمہیں ضرورت کیا تھی کلب جانے کی۔" ٹینا بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی بول پڑیں۔ ان کی دخل اندازی شیری کو سخت ناگوار گزری تھی۔

"مام پلیز۔" شہرزاد کے تنبیہی لہجے پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"وہ بدتمیزی کر رہا تھا میرے ساتھ۔"

"پھر تم نے اس سے کیا کہا۔۔۔؟"

"غصے میں آکر تھپڑ مار دیا تھا۔" اس نے ہکا سا جھجک کر کہا اور ٹینا بیگم نے غضب ناک نگاہوں سے اسے گھورا لیکن خاموش رہیں۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" شہرزاد بالکل پر سکون انداز میں اس طرح پوچھ رہی تھی جیسے وہ اسے کسی فلم کی کہانی سنا رہی ہو۔

"پھر وہ ہمارے پیچھے آگیا' اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔" رومی کا لہجہ بھرا گیا۔

"اوہ نو۔۔۔ پھر؟" وہ تھوڑی سی بے چین ہوئی۔

"وہ مجھے اور کنزہ کو فالو کرتے ہوئے اچانک ہی ہماری گاڑی کے سامنے آگیا اور ٹرسٹ می شیری' ہم نے جان بوجھ کر ہٹ نہیں کیا اسے' وہ خود اپنی غلطی سے ٹکرایا تھا۔" رومیصہ نے گھبرا کر اپنی بہن کو صفائی دی۔

"کنزہ جانتی ہے اسے پہلے سے۔" اس نے کچھ سوچ کر اگلا سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ اسکول میں کلاس فیلو رہ چکا ہے وہ اس کا۔" رومیصہ نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

"اور تم اس کے باپ کی کمینگی دیکھو' کیسے اپنی بیٹی کو مکھن میں سے بال کی طرح نکال کر لے گیا۔" ٹینا بیگم کا

Downloaded From http://paksociety.com

بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کنزہ اور اس کے باپ کو شوٹ کر دیتیں' جن کی اس حرکت نے رومیصہ کا کیس خاصا کمزور کر دیا تھا۔ دوسری صورت میں کوئی نہ کوئی بچ نکلنے کی راہ نکل ہی آتی۔

"اب تم کیا کہتی ہو؟" ٹینا بیگم نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ڈونٹ وورری مام' ان شاء اللہ کوئی راہ نکل آئے گی۔" شہرزاد کے پرسکون انداز پر ٹینا بیگم کے اعصاب بھی کچھ ریلیکس ہوئے۔

☆ ☆ ☆

سرمئی بادلوں کی ٹولیاں' بڑے مست انداز سے مری کے پہاڑوں پر سے گزر رہی تھیں۔ قدرے تیز اور خنک ہوا انہیں اپنے بانہوں میں لیے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ لان کی دیوار کے ساتھ لگے پودے عجیب سرمستی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔

میر ہاؤس میں اس وقت خلاف معمول بڑی خاموشی طاری تھی۔ تاجدار بیگم اپنی ملازمہ صندل کو چھوڑنے نور محل گئی ہوئی تھیں اور شارقہ بیگم صبح سے انابیہ کے ہمراہ ملازمین سے اسٹور کی تفصیلی صفائی کرنے میں مگن تھیں۔ اس وقت سب ہی کی شامت آئی ہوئی تھی۔ پرانا کاٹھ کباڑ' غیر استعمال شدہ برتن' اور پرانے اخبارات کے بنڈل سب ہی کچھ وہاں بکھرا ہوا تھا۔

"اللہ معاف کرے' دنیا جہاں کا کباڑ جمع کر رکھا ہے یہاں۔" شارقہ بیگم نے گرد سے بچنے کے لیے دوپٹا ناک پر رکھا ہوا تھا۔

"آدھی ردی تو ان رسالوں اور اخباروں کی ہے۔" ملازمہ رشیدہ نے ایک بنڈل لا کر زمین پر رکھا۔

"استغفراللہ..... یہ کیا ہے؟" شارقہ بیگم منہ بنا کر پیچھے ہٹیں۔

"در شہوار' اور طوبیٰ کے ڈائجسٹ اور فیشن میگزین۔" انابیہ نے تھوڑا سا جھک کر کہا۔

"شکر ہے' میری نمیرہ کو ایسا چسکا نہیں۔ ویسے تو ساری بات تربیت کی ہوتی ہے۔" ندرت امی اللہ جانے کس کونے سے نکل کر سامنے آگئی تھیں۔

"ہاں' تب ہی پوزیشنیں لے لے کر پنڈی بورڈ کی چھت پھاڑ رکھی ہے اس نے۔" ان کی سوکن جل کر بولیں۔

"ان شاء اللہ' رزلٹ آنے والا ہے' دیکھ لیجئے گا' اچھے نمبروں سے پاس ہوگی۔" انابیہ کو ندرت امی کی لاعلمی پر رشک آیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی انہیں نہیں بتا سکی کہ رزلٹ آچکا ہے کیونکہ اس کی اپنی بہن ایک مضمون میں اڑ گئی تھی۔

"رشیدہ' اٹھاؤ یہ سب' اور پھینکو ردی میں....." شارقہ بیگم کے اگلے حکم پر انابیہ بوکھلا گئی۔ وہ جانتی تھی کہ در شہوار اور طوبیٰ کی ان رسالوں میں جان تھی اور انہوں نے اپنی پسندیدہ تحریروں والے شمارے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔

"امی' در شہوار بہت شور مچائے گی۔" انابیہ نے محتاط انداز میں کہا۔

"مچاتی رہے....." انہوں نے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ "ویسے خیر تو ہے' یہ لڑکیوں کی بولتی کیوں بند ہے آج۔" انہیں گھر میں پھیلے غیر معمولی سناٹے کا اچانک احساس ہوا۔

"در شہوار کے روم میں ہیں شاید....."

"پھر کوئی نئی کھیر پک رہی ہوگی وہاں' ان کو کون سا سکون ہے۔" ان کے جل کر بولنے پر انابیہ کو ہنسی آگئی۔

"میں ذرا دیکھوں' خاقان صاحب نے دوپہر میں فون کرنے کا کہا تھا۔" ندرت امی' اپنی سوکن شارقہ بیگم کو

Downloaded From http://paksociety.com

سُنانے کے لیے دانستہ اونچی آواز میں بولتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
"اس عورت کا گھٹیا پن ساری زندگی ختم نہیں ہوگا۔" شارقہ بیگم کو غصہ آگیا۔
"آپ چھوڑیں انہیں' جاکر کچن دیکھیں' تائی اماں آنے والی ہوں گی۔" انابیہ نے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کی۔
"تم یہ ساراکباڑ اٹھواؤ' ورنہ گھر آتے ہی جٹھانی صاحبہ کا موڈ آف ہوجائے گا۔"
وہ بڑبڑاتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئیں۔ انابیہ نے سکون کا سانس لیا اور سب سے پہلے ان ڈائجسٹوں کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس کے بعد اسے تعزیتی اجلاس میں شرکت کرنا تھی جو اس وقت درشہوار کے کمرے میں بڑی دھوم دھام سے منایا جارہا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرہاؤس کے فرسٹ فلور پر واقع درشہوار کے کمرے میں اس وقت واقعی "شام غم" منائی جارہی تھی۔ کمرے میں زیرو واٹ کا زرد بلب جل رہا تھا اور کارپٹ پر سفید چادریں بچھا کر ان پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ سائیڈ میز پر اگربتی دہک رہی تھی' جس نے کمرے کی فضا کو اپنی خوشبو سے معطر کر رکھا تھا۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے وہ تینوں سیاہ رنگ کے سوٹ پہنے غم کا اشتہار بنی بیٹھی تھیں۔ سی ڈی پلیئر میں حامد علی بیلا کی آواز میں "کافی" کے بول کمرے کے ماحول میں اداسی کے مزید رنگ بھر رہے تھے۔

مائے نی میں' کنوں آکھاں۔۔۔
درد چھوڑے داحال نی۔۔۔
دکھاں دی روٹی' سولاں دا سالن۔۔۔
آہیں دا بالن' بال نی۔۔۔
مائے نی میں' کنواں آکھاں۔۔۔

سفید رنگ کی چاندنیوں کے عین درمیان میں درشہوار کے لیپ ٹاپ پر ایف ایس سی کے رزلٹ کی ویب سائٹ کھلی ہوئی تھی' جسے وقفے وقفے سے اس امید پر چیک کیا جارہا تھا کہ شاید امتحانی نتائج میں کوئی معجزانہ تبدیلی آجائے۔ یہ "شام غم" ان تینوں کی کمپارٹ آنے کے غم میں منعقد کی گئی تھی۔
"تم مانو یا نہ مانو' اس کمینے کی بددعا لگی ہے ہمیں۔" درشہوار نے رنجیدہ لہجے میں انکشاف کیا۔
"کس "کمینے" کی؟" نمیرہ نے منہ بنا کر ایسے پوچھا' جیسے اس کے پاس کمینوں کی پوری لسٹ موجود ہو۔
"ایک ہی تو ہے' وہ خبیث' ہمارا ہمسایہ' چغل خور۔" درشہوار تڑپ کر بولی۔ بربان لالہ کی شام میں کی ہوئی بے عزتی کا دکھ بھی تازہ تھا۔
"اللہ کرے وہ بھی فیل ہوجائے اپنے سارے سبجیکٹس میں۔" طوبیٰ نے دکھی دل سے بددعا دی۔
"بے وقوف لڑکی! وہ اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرکے آیا ہے جاب میں' بددعا تو کوئی ڈھنگ کی دے دو۔۔۔" نمیرہ نے منہ بناتے ہوئے تصحیح کی۔
"اللہ کرے اس کی شادی ہوجائے کسی بھینگی لڑکی سے' اور وہ ساری زندگی یہی سمجھتا رہے کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے جبکہ وہ اس کے دوست کو لائن مار رہی ہو۔" طوبیٰ کی اگلی بددعا پر نمیرہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔
"دانت تو ایسے نکال رہی ہو جیسے بورڈ میں ٹاپ کیا ہو۔" طوبیٰ نے جل کر بالکل تائی اماں کے اسٹائل میں طعنہ دیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"تم اپنے کمپیوٹر کا "کی بورڈ" رکھو یہاں 'میں ابھی "ٹاپ" جاتی ہوں۔۔۔" نمیرہ بول کر ہنسی۔
"ایسے تھرڈ کلاس جوک کرنے کے بجائے اپنے فیل ہونے کی وجوہات ڈھونڈو۔"
"سچی بات تو یہ ہے' مجھے تو بابائے قوم قائداعظم کی آہ لگی ہے' وہ جو چودہ کے بجائے اٹھارہ نکات لکھے تھے ناں' وہ ہی گلے پڑ گئے میرے۔" نمیرہ نے اپنے فیل ہونے کی سب سے بڑی وجہ ڈھونڈ ہی لی۔
"اور مجھے کیمسٹری کی میم ذکیہ کی تمجن کی پورا سال نقلیں اتاری تھیں میں نے 'عینک پہن پہن کر۔" طوبیٰ نے بھی رنجیدگی سے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ ان دونوں کی دیکھا دیکھی' درشہوار بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"آپس کی بات ہے' تم لوگ مانو یا نہ مانو' مجھے اس خبیث ہادی کی آہیں لے ڈوبی ہیں۔" درشہوار نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھ کر بالکل شمیم آرا اسٹائل میں آہ بھر کر مزید اضافہ کیا۔
"کتنا سوچا تھا یونیورسٹی جائیں گے' ڈیشنگ اور اسمارٹ لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر اپنے خاندان کا نام روشن کریں گے' لیکن افسوس صد افسوس دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔" درشہوار کی اداکاری عروج پر تھی۔
"پیاری بہن! اتنے سرد موسم میں ٹھنڈی آہیں بھر کر مزید ٹھنڈک میں اضافہ مت کرو۔ میری تو پہلے ہی چار پسلیاں ہیں' خدانخواستہ نمونیا نہ ہو جائے۔"
طوبیٰ نے منہ بناتے ہوئے درشہوار کی وارڈروب سے ایک شال نکال کر اوڑھی۔
دروازے پر ہلکی سی دستک نے اس لمحے ان تینوں کو بےزار کیا۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر ارسل اندر داخل ہوا۔ ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس نے انتہائی حیرانی سے کمرے کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا۔
"یہ کس فلم کا سیٹ لگا رکھا ہے یہاں۔۔۔" اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔
"دل جلے کا۔" طوبیٰ نے جل کر جواب دیا۔

"چلو پھر اس خوشی میں شاہ میر سے بات کرو' کیونکہ تم تینوں کے نمبر بند جا رہے ہیں۔" ارسل نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔ طوبیٰ کو کرنٹ لگا' وہ جانتی تھی کہ اس موقعے پر اس کا فون زخموں پر مزید نمک چھڑکنے کے لیے آیا ہوگا۔
"بھئی بات کرو نا' سکتہ کیوں ہو گیا ہے۔" ارسل کی آنکھوں کی شوخی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ اس کال کے سیاق و سباق سے واقف تھا۔
"ہاں ہاں' بات کرو طوبیٰ' میرا پوچھیں تو کہہ دینا "ٹرینکولائزر لے کر سو گئی ہے۔" درشہوار نے جلدی سے کشن آنکھوں پر رکھ لیا۔ اس نے دل ہی دل میں اسے سو گالیاں دیتے ہوئے کال اٹینڈ کی۔
"فرمایئے۔۔۔؟" وہ منہ کر بولی۔
"سنا ہے' تندیٔ باد مخالف نے سارے ہی عقاب اُڑا دیے ہیں۔" دوسری طرف اس نے بڑے معنی خیز انداز میں قہقہہ لگایا۔
"گرتے ہیں شاہ سوار ہی میدان جنگ میں۔۔۔" طوبیٰ نے بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔
"لیکن یہ شاہ سوار تو ایسے گرے ہیں کہ گوڈے گٹے ہی تڑوا لیے۔۔۔ چچ چچ چچ۔۔۔" شاہ میر کی شرارتی آواز اس کے تن بدن میں آگ لگا گئی۔
"تمہیں کیا تکلیف ہے۔۔۔؟" اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹا۔
"میں نے تو افسوس کے لیے فون کیا ہے اور ایک درخواست بھی دی ہے اپنے "ٹو آئی سی" کو کہ میرے گھر میں خواتین کی ایک کثیر تعداد باجماعت فیل ہو گئی ہے' اس سلسلے میں ایک تعزیتی اجلاس میں شرکت کے لیے مجھے تین

Downloaded From http://paksociety.com

دن کی چھٹی دے دی جائے۔" دوسری طرف اس کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔
"اللہ کرے چھٹی کے بجائے تمہیں انڈیا کے بارڈر پر بھجوا دیں۔" طوبیٰ جل کر بولی۔
"تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو' تو یقین مانو سات سمندر پار تیرتا ہوا چلا جاؤں۔" شاہ میر نے اسے شوخی سے مزید چڑایا۔
"دفع ہو جاؤ تم' اپنی منحوس شکل لے کر......" اس نے غصے میں فون بند کر دیا۔
"کیا ہوا؟ کیا کہہ رہا تھا؟" ارسل نے انجان بن کر پوچھا۔
"ایک خبیث انسان اپنی خباثت ہی دکھا سکتا ہے۔ بائے گاڈ' درشہوار' اتنا کمینہ اگر میرا بھائی ہوتا تو میں پہلی فرصت میں خودکشی کر لیتی۔" طوبیٰ نے کہیں کا غصہ کہیں اتارا۔
"میں بھی سیریسلی یہی سوچ رہی ہوں' آج برہان لالہ نے اور اب میرو بھیا نے بہت مایوس کیا ہے مجھے۔" اس نے اپنی تیکھی ناک چڑھا کر طوبیٰ کے ساتھ یک جہتی کا عظیم مظاہرہ کیا۔
"سنا ہے' رزلٹ آگیا ہے تم لوگوں کا۔" ارسل کے لبوں پر پھیلی جاندار مسکراہٹ ان تینوں کا دل جلا گئی۔
"ہاں آپ کی کسر رہ گئی تھی' آپ بھی پوری کر لیں۔ فیل بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں' ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے ہم نے' جو آپ لوگ ہاتھ منہ دھو کر باجماعت پیچھے پڑ گئے ہیں ہمارے۔" درشہوار بازو چڑھا کر میدان میں اتر آگئی۔
"ارے رے...... میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" ارسل ایک دم بوکھلا گیا۔
"ارادہ تو یہی لے کر آئے تھے نا۔" درشہوار نے ناک چڑھا کر کہا تو وہ ہنس پڑا۔
"ارادہ تو میرا یہ تھا کہ دکھی لوگوں کا غم غلط کرنے کے لیے مال روڈ سے جا کر گرما گرم ہاٹ اینڈ سار سوپ پیا جائے۔" ارسل کی بات پر ان تینوں نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔
"کیا ہو گیا ہے' ایک ہینڈسم بندے کو اتنا گھور کیوں رہی ہو۔" اس نے مصنوعی پریشانی سے پوچھا۔
"یقین نہیں آرہا' اتنا رحم دل' فیاض اور کھلے دل کا بندہ میر ہاؤس میں ہی رہتا ہے۔" درشہوار کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرایا۔
"میرا بھائی ہے تو ادھر ہی رہے گا نا میرے ساتھ۔ ویسے اللہ کا شکر ہے' میرے بھائی میں دکھی انسانیت کا خاصا جذبہ ہے میری طرح۔"
نمیرہ نے ہمیشہ کی طرح دوسروں کا کریڈٹ لینے کی کوشش کی جو اسے اچھی خاصی مہنگی پڑی کیونکہ درشہوار کا کشن اس کا دماغ اچھا خاصا ہلا کر اس کے ٹھکانے پر واپس لاچکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بڑی دیر کی مہربان آتے آتے......"
دہاج بڑے معنی خیز انداز میں سیل فون پر بات کرتے ہوئے کچن میں داخل ہوئے۔ برتن دھوتی صندل کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنا دوپٹا ٹھیک کیا اور بظاہر خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے پانی کا نل چلا دیا اور جلدی جلدی پلیٹیں دھونے لگی۔
وہ نور محل ہرگز نہیں آنا چاہتی تھی' لیکن اس کی مجبوری تھی کہ اس کے والدین اور باقی بہن بھائی بھی میر ہاؤس کے خاندانی ملازم تھے اور وہاں انکار کی تو قطعاً' کوئی گنجائش نکلتی ہی نہیں تھی۔
"ہم بھی ڈھونڈ ہی رہی تھیں' تمہیں یہ نظر ہماری......" وہ ہلکا سا گنگناتے ہوئے فریج کھول کر کھڑے ہو گئے' لیکن صندل کو ان کی نظریں اپنے وجود کے آرپار اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

"یہ ایپل دھو دو۔۔۔" وہ غیر محسوس انداز میں اس کے بالکل پاس آن کھڑے ہوئے۔ صندل گھبرا کر پلٹی اور ان کے چوڑے سینے سے ٹکرا گئی۔
"ارے رے، سنبھل کر۔"
صندل نے بوکھلا کر ان کے ہاتھ سے سیب پکڑا اور جلدی جلدی دھونے لگی۔ وہاج نے بڑی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا گھبرایا ہوا روپ ان کی نہ جانے کون سی حس کی تسکین کرتا تھا۔
"بہت خوب صورت ہاتھ ہیں تمہارے' روئی کے گالوں کی طرح نرم۔" ان کے ذو معنی انداز پر صندل کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ان کا شمار اگر اس کے مالکوں میں نہ ہوتا تو وہ اب تک ان کا منہ توڑ چکی ہوتی۔
"یہ لیں۔" اس نے سیب دھو کر پلیٹ میں رکھے اور انتہائی بے زاری سے ان کی طرف بڑھائے۔
"دیکھو مگر پیار سے۔" وہ ہلکا سا گنگنائے' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے' تاجدار بیگم بڑے عجلت بھرے انداز میں اندر داخل ہوئیں۔
"تم یہاں ہو اور میں پورے گھر میں تلاش کر رہی ہوں تمہیں۔"
"آپ یہ خالی برتن اٹھا کر کیوں لا رہی ہیں' فارحہ مر گئی ہے کیا اور باقی ملازمین کہاں ہیں؟" ان کا موڈ ایک دم خراب ہوا۔
"وہی بے چاری لا رہی تھی' لیکن مجھے کچھ کام تھا صندل سے۔" انہوں نے لاپروائی سے کہتے ہوئے ٹرے شیلف پر رکھ دی۔
"جی بی بی جی۔" صندل فوراً" مڑی تو اس کا ہراساں چہرہ تاجدار بیگم سے چھپا نہ رہ سکا۔
"یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں تمہارے چہرے پر۔۔۔" ان کے مشکوک انداز پر وہاج گڑبڑا گئے۔
"ہوائیاں تو اڑیں گی' ہڈحرامی کی عادتیں جو پڑی ہوئی ہیں ان لوگوں کو' وہاں تو نوکروں کی ایک فوج ہے اور یہاں کام کرنا پڑے گا۔" وہاج نے منہ بناتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"خیر تمہارا ور علی کا خاندان کام چور تو نہیں' سارا گھر سنبھالا ہوا ہے انہوں نے۔" تاجدار بیگم نے کھلے دل سے تعریف کی۔
"اچھا' اچھا' زیادہ سر نہ چڑھائیں اسے' اچھی طرح سے سمجھا دیا ہے نا اسے' میری چیزوں کا کیسے خیال رکھنا ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں گویا ہوئے۔
"ہاں ہاں سمجھا دیا ہے۔ تم بھی تھوڑا ہاتھ ہولا ہی رکھنا' بچی ہے' جلدی گھبرا جاتی ہے۔۔۔" وہ لاپرواہ انداز میں کچن کے کیبنٹ کھولنے لگیں۔
"بے فکر رہیں' ایسا خیال رکھیں گے کہ میرا ہاؤس کو بھول جائے گی یہ۔" وہ مزے سے سیب کھانے لگے۔ اسی وقت کچن کا دروازہ کھلا اور داجی کی شکل دیکھ کر وہاج نے ہاتھ میں پکڑا سیب جلدی سے پلیٹ میں رکھ دیا۔
"تم عورتوں کی طرح کچن میں گھسے کیا کر رہے ہو۔" داجی کا سخت لہجہ ان کے ہاتھ پیر پھلا گیا۔
"کچھ نہیں داجی' تھوڑا امی سے بات کر رہا تھا۔" انہوں نے بوکھلا کر صفائی دی' ویسے بھی داجی کے سامنے تو وہ بھی بھیگی بلی بن جاتے تھے۔
"ساری باتیں چھوڑو اور حویلی پہنچو' تھوڑی گڑبڑ چل رہی ہے وہاں۔۔۔"
"ملتان؟" انہوں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔
"ظاہر ہے۔۔۔ بڑی حویلی ملتان میں ہے تو وہیں جانا ہو گا یا اسے اٹھا کر لے آؤ گے ادھر۔۔۔" داجی کی جھاڑ نے ان

Downloaded From http://paksociety.com

کی طبیعت ایک لمحے میں درست کردی' کچھ دیر پہلے کا سارا انشہ اڑنچھو ہوگیا۔
"آپ بے فکر رہیں' کل ہی چلا جاؤں گا۔" انہوں نے اپنی طرف سے پھرتی دکھائی۔
"کل نہیں' آج اور ابھی جانا ہوگا۔"
"اوہ اچھا... میں ... ٹکٹ کنفرم کروالوں۔" انہوں نے وہاں سے کھسکنا چاہا۔
"سب کچھ کنفرم ہوچکا ہے' منشی ٹکٹ لے کر ایرپورٹ پہنچ جائے گا' کچھ ضروری ڈاکومنٹس بھی ہیں اس کے پاس۔" انہوں نے سنجیدگی سے مزید کہا۔ "اور سنو' سارے معاملات نبٹا کر آنا' یہاں کوئی آگ نہیں لگی ہوئی' جسے بجھانے کو اگلے ہی دن دوڑے آؤ۔" داجی کی بات پر صندل کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔
"جی ٹھیک ہے۔" انہوں نے خفت زدہ انداز میں سر جھکایا۔
"اور تاجدار! تم ذرا آؤ میرے کمرے میں' کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" انہوں نے تاجدار بیگم کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔
"کیوں نہیں بابا جان۔" انہوں نے فوراً" تابعداری کا مظاہرہ کیا اور ان کے پیچھے چل پڑیں۔
میر وہاج نے مڑ کر صندل کی طرف دیکھا' جو اس وقت خاصی پرسکون انداز میں کھڑی تھی' وہاج کے اس طرح گھورنے پر وہ بوکھلا کر واش بیسن میں پڑے برتن دھونے لگی۔
"ذرا آگر پیکنگ کرو' باقی کام بعد میں کرلینا۔" ان کے اگلے حکم پر صندل کی روح فنا ہوئی۔
"جی اچھا۔" وہ دل ہی دل میں جل تو جلال تو پڑھتی ہوئی ان کے بیڈ روم میں داخل ہوئی' سامنے فارحہ بھابھی کو دیکھ کر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا اور جلدی سے میر وہاج کی الماری سے کپڑے نکال کر اٹیچی میں رکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"تم بڑی بھابھی ہو اس کی۔ سمجھاؤ بے وقوف کو' دو دو جوان بیٹیوں کا باپ ہے وہ۔"
میر حاکم علی کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے کو سن کر تاجدار بیگم پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ان کے تو گمان کی آخری سرحدوں پر بھی نہیں تھا کہ وہ ان سے کیا بات کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلا کر لائے ہیں۔
نور محل کا سب سے بہترین کمرہ ان کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شاہ بلوط کی لکڑی کا بھاری فرنیچر' ایرانی قالین' دیواروں پر خوب صورت پینٹنگز اور چھت پر لگا قیمتی فانوس ان کے کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔
اس وقت وہ آج کا تازہ اخبار پکڑے بھاری بھرکم صوفے پر بیٹھے تھے' جب کہ تاجدار بیگم ان کے سامنے والے سنگل صوفے پر سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ وہ میر حاکم کی سگی بھتیجی تھیں اسی لیے سب سے زیادہ ان کے قریب بھی تھیں۔
"بابا جان! آپ کیوں ٹینشن لے رہے ہیں؟" وہ تھوڑا سا جھک کر بولیں۔
"تنگ آگیا ہوں میں اس کے آئے دن کے اسکینڈلز سے' بندہ اپنی عمر اور جوان اولاد کا ہی لحاظ کرتا ہے' گھر میں دو دو بیویاں ہیں اس کی۔" ان کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوئیں۔
"ہاں خاقان کو سوچنا چاہیے اس بات پر' ساری زندگی یہی طور طریقے تو نہیں رہ سکتے۔" انہوں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔
"اس کے سوچنے سمجھنے والی حس تو عورتوں کے معاملے میں آکر ختم ہوجاتی ہے' ایسی بھی کیا شوقین مزاجی' بندہ

Downloaded From http://paksociety.com

اپنے خاندان کی عزت اور وقار کو ہی داؤ پر لگادے۔" وہ غصے میں آکر ٹہلنے لگے۔

"تمہیں اس لیے کہا ہے کہ تمہاری بات پھر بھی سنتا ہے اور تھوڑی بے تکلفی بھی ہے' تم بڑی بھابھی اور ماں کی جگہ پر ہو' میں اس لیے بات نہیں کرنا چاہتا کہ ہمارے درمیان جو لحاظ کا پردہ ہے' وہ سلامت رہے۔" انہوں نے قدرے خشک انداز سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"جی بابا جان! میں کوشش کروں گی اس سے بات کرنے کی۔" تاجدار نے انہیں تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔

"کوشش نہیں کرنی' سمجھانا ہے اس بے وقوف کو' تھوڑا عقل سے کام لے' اب دیکھو ذرا! یہ اخبار بھرا پڑا ہے اس کی رنگین داستان سے' استغفراللہ' اب یہ وقت بھی آنا تھا کہ میر حاکم کا بیٹا' ایک تھرڈ کلاس گلوکارہ کی زلفوں کا اسیر ہو جائے۔" ان کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہوا۔

"واقعی' یہ تو بڑی غلط بات ہے۔۔۔" تاجدار بیگم اپنے سسر کی نبض شناس تھیں اور ان کا موڈ دیکھ کر ہی بات کرتی تھیں۔

"اور اس سے کہو انابیہ کی رخصتی کا کچھ سوچے اور تم بھی بات کرو برہان سے' کیا ٹھان کر بیٹھا ہے وہ دل میں؟" وہ اپنے مخصوص دوٹوک انداز میں گویا ہوئے۔

"برہان ابھی دو سال کی مہلت مانگ رہا ہے۔" انہوں نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"دو سال بعد کون سے سینگ اگ آئیں گے اس کے سر پر؟ "تب" بھی تو شادی کرنی ہے تو "اب" کیوں نہیں؟" وہ ایک دفعہ پھر ٹہلنے لگے' تاجدار بیگم نے دیکھا' اس بڑھاپے میں بھی ان کی چال میں خاصی مضبوطی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں' میں بات کروں گی برہان سے۔" انہوں نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

اتنا تو وہ بھی جانتی تھیں کہ برہان کو سمجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں بالکل اپنے دادا جی پر تھا۔ تب ہی تو دونوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ اسی وقت میر حاکم کے سیل فون پر کال آگئی۔

"تم جاؤ' اس ٹاپک پر پھر بات کریں گے۔" ان کے اگلے حکم پر تاجدار بیگم نے سکون کا سانس لیا' ورنہ آج تو سسر جی کے تیور ان کے بھی ہاتھ پیر پھلا رہے تھے۔ وہ جلدی سے ان کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

☆ ☆ ☆

ٹینا ہاؤس پر لگتا تھا کسی آسیب کا سایہ ہو گیا تھا۔

نیند اس گھر کے مکینوں سے روٹھ گئی تھی اور در و بام پر وحشت میں مبتلا کر دینے والے سناٹے کا راج تھا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ شہرزاد کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی' لیکن نیند آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

جسٹس محمود کے بیٹے کی اس اچانک موت نے دونوں گھروں کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ روحیل کا خاندان کسی صورت بھی انہیں بخشنے کو تیار نہیں تھا۔ آنے والے لمحوں کا خوف کسی آکاس بیل کی طرح سب کو جکڑنے کے لیے تیار تھا۔

شہرزاد ٹہلتی ہوئی لاؤنج کی طرف نکل آئی' کاؤچ پر نیم دراز ٹینا بیگم کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو اس نے دور ہی سے بھانپ لیا تھا۔ وہ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی' ٹینا بیگم نے اسے دیکھ کر فون بند کر دیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"کیا ہوا مام۔۔۔؟" شہرزاد کو ان کی آنکھیں گیلی ہوتی محسوس ہوئیں۔

"محمود احمد تو زخمی شیر کی طرح پورے شہر میں دندناتا پھر رہا ہے اور کسی کی بات سننے کو تیار نہیں۔"

"ظاہر ہے مام' ان کے ینگ بیٹے کی اچانک ڈیتھ ہوئی ہے اور یہ بڑا ایموشنل سا ری ایکشن ہے۔" شہرزاد خاصی حقیقت پسند تھی' اپنی رائے کا اظہار وہ بڑے مضبوط اور ہموار انداز میں کرتی تھی۔

"میں مانتی ہوں لیکن یہ ایک حادثہ تھا اور وہ یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں۔" انہوں نے اسی بگڑے بگڑے انداز میں کہا۔

"ہمیں کورٹ میں یہ بات ثابت کرنا ہوگی۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"اس بے وقوف لڑکی نے تو اچھی خاصی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔" ٹینا بیگم ٹھیک ٹھاک آزردہ تھیں۔

"ہمیں کنزہ کے فادر سے بات کرنی چاہیے۔" شہرزاد نے محتاط انداز میں کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ ہماری بات سنے گا' اسی کی کیئرلیسنگی کی وجہ سے سارا الزام میری بیٹی پر آرہا ہے' ایک نمبر کا خبیث انسان ہے وہ۔" انہوں نے غصے میں ایک گھٹیا قسم کی گالی دی۔

"ہمیں کنوینس کرنا چاہیے انہیں' اس طرح تو رومی بری طرح سے پھنس جائے گی۔" شہرزاد کی بات پر وہ تلخ انداز میں مسکرائیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے' وہ الو کا پٹھا مان جائے گا' جبکہ اسے پتا بھی ہے کہ گاڑی اسی کی بیٹی ڈرائیو کر رہی تھی۔"

"لیکن وہ اتنا بڑا کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟" وہ تنک کر گویا ہوئی۔

"جھوٹ بولنے کے لیے کون سا اہل جوتنے پڑتے ہیں' اس نے تو پولیس کی نفری تک کو چند گھنٹوں میں اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ پتا نہیں کیا بنے گا اس کیس کا' سچ پوچھو تو مجھے سخت ٹینشن ہو رہی ہے۔" شہرزاد کو ان سے بے تحاشا ہمدردی محسوس ہوئی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا' وہ رومیصہ کے معاملے میں کتنی فکرمند تھیں۔

"آپ نے کسی سے بات کی؟" شہرزاد چاہتے ہوئے بھی سیف الرحمن کا نام اپنے لبوں پر نہیں لا سکی۔

"ہاں۔۔۔" انہوں نے تھکے تھکے انداز سے اپنے بالوں کا گول مول سا جوڑا بنایا۔

"پھر؟" شہرزاد نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"لیکن جسٹس محمود کے ہاتھ بھی چھوٹے نہیں ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے رومی کی ضمانت بھی کینسل نہ ہو جائے۔"

"بی ریلیکس۔۔۔ ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا' آپ جائیں اور تھوڑا ریسٹ کریں' اس معاملے کو صبح دیکھتے ہیں۔" شہرزاد نے نرمی سے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا' وہ بھی شاید ذہنی طور پر بری طرح سے تھک چکی تھیں۔ اس لیے اس کی بات مان کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

کچھ دیر وہ یونہی لاؤنج میں ٹہلتی رہی۔ اس کے اپنے اعصاب بری طرح تھک چکے تھے۔ وہ اس کیس کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر چکی تھی۔ کہیں سے بھی نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ کاؤچ پر لیٹ گئی' دماغ میں لامتناہی سوچوں کا ہجوم تھا۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی کے ساتھ ہی اس کا دل بھی بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔ "ہم زاد" کالنگ کے الفاظ کم از کم اس وقت بُرے نہیں لگے تھے اسے۔

"کیسی ہیں آپ" وہ اپنے مخصوص بھاری مگر اپنائیت سے بھرپور لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا۔

"آپ کو اگر پتا چل جائے کہ آپ جھوٹ بولتے ہوئے کتنی ہونق لگتی ہیں' تو یقین مانیں' آپ زندگی میں کبھی

Downloaded From http://paksociety.com

ایسی کوشش نہ کریں۔" اس کے ہلکے پھلکے انداز پر شہرزاد کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری۔
"چلیں آئندہ کوشش کروں گی کہ ایسا نہ کروں۔" اس نے بھی فوراً" ہی ہتھیار ڈال دیے' ویسے بھی وہ اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔
"اس گاڑی والے کو ٹکر تو بہت زور سے ماری تھی آپ نے؟" اس کی اگلی بات پر شہرزاد کو کرنٹ لگا اور وہ فوراً" اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"آپ کی گاڑی تھی کیا وہ؟"
"ہماری ایسی خوش قسمتی کہاں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔
"اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی وہیں کہیں آس پاس تھے۔" اس نے فوراً" اندازہ لگایا۔
"ہم زاد تو ہمیشہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔" اس کا معنی خیز انداز شہرزاد کو ہلکی سی کوفت میں مبتلا کر گیا۔ "آپ ہیں کون آخر"
"اس بات کو کبھی فارغ ہو کر ڈسکس کریں گے' یہ بتائیں رومیصہ والے پرابلم کا کیا بنا؟" اس کی اگلی بات پر اسے پھر شاک لگا۔
"آپ کو کس نے بتایا؟" اس کے منہ سے پھسلا۔
"آپ نے شاید ٹی وی نہیں دیکھا' جسٹس محمود کی فیملی سارے چینلز پر یہی تو رونا رو رہی ہے۔" اس کی اطلاع شہرزاد کو دہلا گئی۔
"کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ؟" اس نے ہلکا سا جھک کر پوچھا۔
"اپنے دنیا جہاں کے کرپٹ بیٹے کی موت کو کیش کروانے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں وہ۔" ہم زاد کے منہ سے نکلنے والی اگلی بات پر وہ بری طرح چونکی۔
"آپ جانتے ہیں روحیل محمود کو؟"
"کون نہیں جانتا؟" وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔
"بہت نیگٹیو ریپوٹیشن تھی اس کی اپنے سوشل سرکل میں' ایک نمبر کا ڈرنکر' جوئے باز' فلرٹ اور اپنے باپ کے سورسز کا منفی استعمال کرتا تھا' ساری دنیا جانتی ہے یہ بات۔" وہ شہرزاد کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اسے مزید پریشان کر گیا۔
"لیکن رومی نے اس کا مرڈر نہیں کیا' وہ ایک حادثاتی موت تھی۔" اس نے ہلکا سا جھک کر اپنی بہن کی صفائی دی۔
"میں جانتا ہوں۔" اس کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ شہرزاد کے اندر توانائی کا ایک جہان بھر گئے۔
"لیکن دنیا نہیں جانتی۔" وہ مایوسی سے گویا ہوئی۔
"تو یہ ثابت کرنا تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہونا چاہیے' رومیصہ سہگل' بیرسٹر شہرزاد کی چھوٹی بہن ہے' کسی عام لڑکی کی نہیں۔" وہ اسے شہ دینے والے انداز میں بولا تھا۔
"مطلب؟" وہ سمجھ تو گئی تھی' لیکن پھر بھی انجان بن گئی۔
"یہ کیس تو آپ کے کیریر کا اسٹارٹ ہے' آجائیں میدان میں' بہت سی چیزیں مل جائیں گی۔" وہ اسے ایک نئی راہ سجھا رہا تھا۔
"لیکن میں نے ابھی لائسنس کے لیے اپلائی نہیں کیا۔"

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

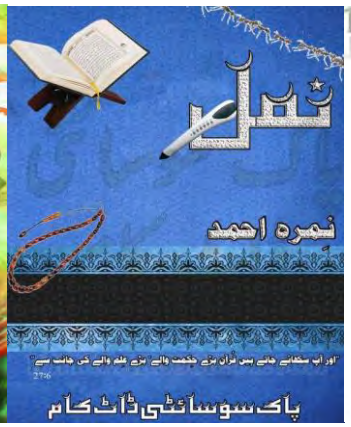

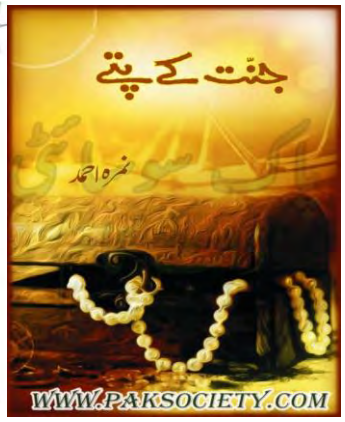

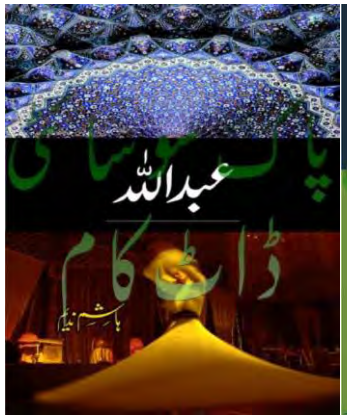

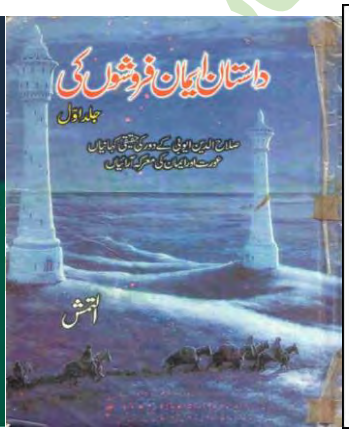

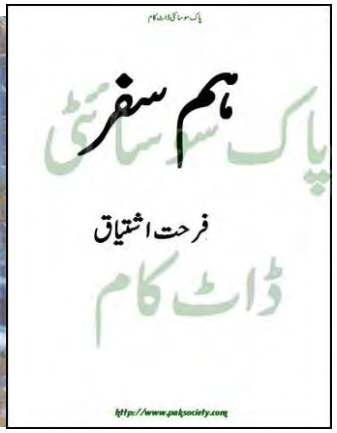

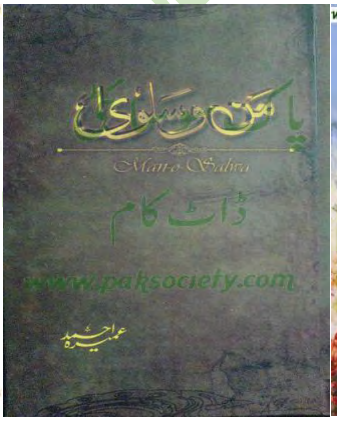

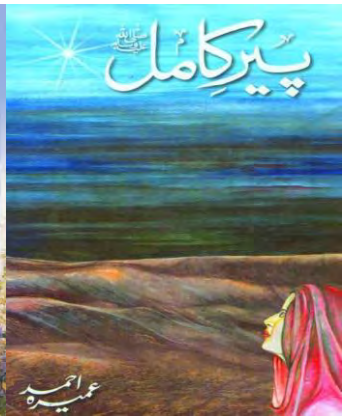

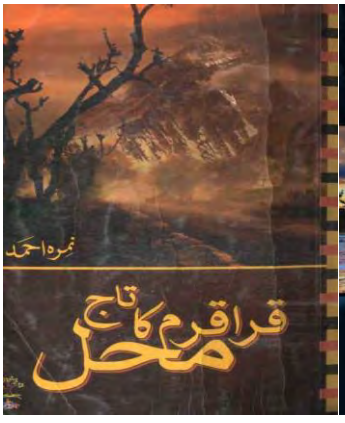

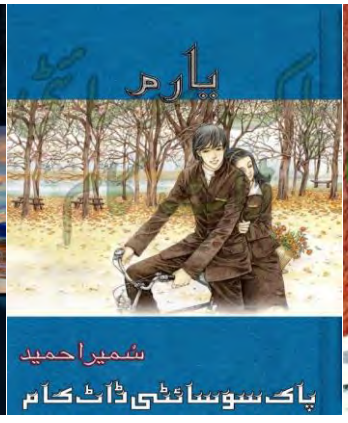

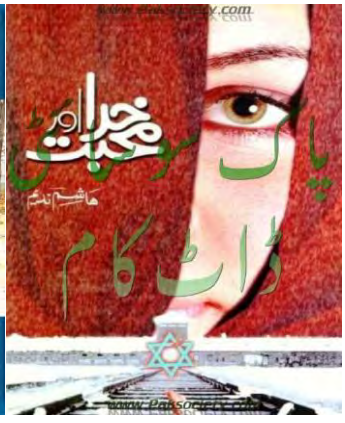

Downloaded From http://paksociety.com

"کیا مشکل ہے' اپنے ڈاکومنٹس اسکین کر کے بھیجیں مجھے' ایک ہفتے میں مل جائے گا۔" وہ ہنسا۔
"لیکن اس کا تو ایک باقاعدہ پروسیجر ہوتا ہے' ایک مہینے کا ٹائم لگتا ہے شاید؟"
"جب پاکستان میں' ایک بندہ اپنے سور سز استعمال کر کے ایک اہم کیس میں سے اپنی بیٹی کا نام نکلوا سکتا ہے تو شہرزاد سہگل اپنا ایک لائسنس کیوں نہیں بنوا سکتی' جبکہ اس سے کسی کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔" شہرزاد کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ اس کی معلومات بالکل پکی اور ہوم ورک مکمل تھا۔
"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ... صبح تمام سے بات کروں گی۔" وہ کافی حد تک متفق ہو گئی تھی۔
"میری آفر صبح تک برقرار ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔
"پہلے اپنے سیل فون سے بات کرنے کا حوصلہ تو پیدا کریں' پھر آفرز بھی دے دیجئے گا۔" شہرزاد کے اس طنز پر وہ ہنسا۔
"اگر اپنے نمبر سے بات کرنے سے آپ کو خوشی ہو سکتی ہے تو نیکسٹ کال اسی سے کریں گے۔"
"اس کا مطلب ہے' نیکسٹ کال کبھی نہیں آئے گی۔" شہرزاد کے جوابی حملے پر اس کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا جان دار تھا۔
"ہم زاد... سب کچھ ہو سکتا ہے' لیکن بزدل نہیں۔" وہ بڑے مزے سے بولا۔
"چلیں' اگلی کال بتا دے گی۔" شہرزاد نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا' وہ اسے جو نئی امید دلا چکا تھا' اسے آج رات اس پر تفصیل سے سوچنا تھا۔ کم از کم اسے یہ مشورہ خاصا معقول اور مناسب لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہادی یار! اچھا نہیں کیا تم نے اس گینگ کے ساتھ۔"
سعد رات کے اس وقت محمد ہادی کے ساتھ مال روڈ پر مٹر گشت کر رہا تھا' دونوں کے ہاتھوں میں کشمیری چائے کے ڈسپوزیبل کپ تھے۔ ہادی اسے اپنی صبح کی کارروائی بتا چکا تھا' جو سعد کو بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔
"تمہیں کس چیز کا غم ستا رہا ہے؟" ہادی نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا۔
"اچھی خاصی زندگی "رنگین" بنی ہوئی تھی۔ نسوانی ہنسی کی آوازیں' جیسے کلیساؤں میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ دل کو چھو لینے والی شرارتیں' جس سے کم از کم مجھے تو زندگی حسین لگنے لگی تھی۔" سعد چلتے چلتے رکا اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔
"تو تمہارا کیا خیال ہے' اتنی سی شکایت پر باز آجائیں گی وہ؟" ہادی استہزائیہ انداز میں گویا ہوا۔
"تم نہیں جانتے ہو میرا ہاؤس کے مرد کتنے کھڑوس ہیں' سوائے ارسل کو چھوڑ کر' اس میں پھر بھی کچھ انسانیت نظر آتی ہے مجھے۔" سعد کی معلومات پر اسے حیرانی ہوئی۔
"تم نے تو لگتا ہے میرا ہاؤس کے مردوں پر مقالہ لکھ رکھا ہے۔" ہادی ایک دفعہ پھر چلنے لگا' مال روڈ پر رات کے اس وقت بھی خاصا رش تھا' باربی کیو' آئس کریم' کافی اور فرنچ فرائز کی دکانوں پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔
"تمہاری اس شکایت پر ان بے چاروں پر اچھا خاصا "بین" لگ گیا ہو گا اور کیا پتا گھر میں نظر بندی کے احکامات بھی آگئے ہوں' کبھی تو شام میں اتنی ویرانی تھی لان میں۔" سعد نے منہ بنا کر چائے کا خالی کپ ڈسٹ بن میں ڈالا۔
"مبارک ہو' ایسا کچھ نہیں ہوا۔" ہادی کی طنزیہ مسکراہٹ پر اس نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"تینوں محترمائیں' ایک جلوس کی شکل میں آرہی ہیں سامنے سے۔ یہ شکلیں تمہیں لگتی ہیں گھر میں ٹک کر بیٹھنے والی۔" ہادی کی بات پر اس نے بے تابی سے سامنے دیکھا' وہ واقعی ارسل کے ساتھ ہنستی مسکراتی ادھر ہی آرہی تھیں۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے آئس کریم کے کپ پکڑ رکھے تھے' ارسل کی بھی ان پر نظر پڑ گئی تھی اور اس نے سعد کو دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ ہلایا۔

"کیسے ہو سعد؟" ارسل نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا' جبکہ ان تینوں کے چہروں پر بڑی واضح بے زاری پھیلی تھی۔

"فائن آج کل نظر نہیں آرہے جوگنگ پر؟" سعد ایک دم باچھیں پھیلا کر بولا۔ ارسل کا والہانہ انداز اسے بتانے کے لیے کافی تھا کہ ہادی کی شکایت کے اثرات اس تک نہیں پہنچے۔

"آج کل ایگزامز کی وجہ سے اسلام آباد والے گھر میں ہوں۔" اس نے مسکرا کر وضاحت کی۔

"اس سے ملو' یہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے ہادی' فارسٹ آفیسر کے طور پر جوائننگ دی ہے اس نے میرے ہی آفس میں" سعد نے جھٹ سے تعارف کی رسم نبھائی' ارسل بڑی خوش دلی سے ہادی سے ملا تھا۔

"تم لوگ چلو میں آرہا ہوں۔" اس نے پیچھے مڑ کر ایک طرف پر کھڑی درشہوار' طوبیٰ اور نمیرہ سے کہا' جو اس کی بات مان کر فوراً ہی چل پڑی تھیں' لیکن جاتے جاتے درشہوار' ہادی کو گھورنا نہیں بھولی تھی۔

"آئیں نا' کہیں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔" ارسل نے آفر کی۔

"میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے' آپ خواتین کو چھوڑ آئیں گھر' پھر کسی دن بیٹھتے ہیں کہیں۔" ہادی کا مہذب انداز ارسل کو اچھا لگا تھا' تب ہی تو وہ جلدی سے اختتامی کلمات کہہ کر ان تینوں کے پیچھے چل پڑا۔

"تمہیں کیا تکلیف تھی۔ بیٹھنے دیتے' بندے کے تعلقات بڑھتے ہیں۔" اس کے جاتے ہی سعد اس پر برس پڑا۔

"یار! اچھا تھوڑی لگتا ہے رات کے اس وقت خواتین اکیلی جائیں اپنے گھر۔" ہادی کی بات پر سعد نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ویسے تم ان کی شرارتوں پر شکایتیں لگانے پہنچ جاتے ہو' اب بڑی پریشانی ہو رہی ہے تمہیں۔"

"وہ الگ بات ہے' لیکن یوں آدھی رات کو گھر کی عورتوں کو اکیلے بھیجنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا' تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" وہ بے نیازی سے اسے چھیڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"بہت ہی عجیب انسان ہو تم" سعد تیز تیز چلتا اس کے برابر آن پہنچا۔

"کہہ سکتے ہو۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"کبھی محبت کی ہے کسی سے؟" سعد نے سردی کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہاتھ رگڑے۔ ہادی چلتے چلتے رکا اور حیرانی سے اسے یوں دیکھا' جیسے اس کے خرابیٔ دماغ کا یقین آگیا ہو۔

"نہیں" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا اور تیز تیز چلنے لگا' جیسے اس موضوع پر مزید بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

وہ دونوں مال روڈ کی خاک چھان کر دو گھنٹے بعد گھر پہنچے تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی داخلی دروازے کو کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' سامنے لگا پرچا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سعد نے حیرانی سے ہادی کی طرف دیکھا' جو آگے بڑھ کر اس پر لکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شاید کوئی حدیث ہے۔" ہادی نے کاغذ پر نظریں دوڑائیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

"کیسی حدیث؟" سعد حیران ہوا۔
"رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" (بخاری، مسلم) اس نے مسکراتے ہوئے بلند آواز میں پڑھتے ہوئے وہ پرچا دروازے سے اتارا جو کہ ٹیپ سے چپکایا گیا تھا۔
"اس کا مطلب؟" سعد نے الجھن بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا' وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا۔
"مطلب یہ ہے کہ شکایت لگانا بھی چغل خوری کے زمرے میں آتا ہے۔" ہادی کی وضاحت پر سعد کو ساری بات سمجھ میں آگئی' وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔
"میں نے کہا تھا نا یہ گینگ کبھی باز نہیں آئے گا۔" ہادی منہ بناتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوا۔
"ویسے کہا تو بالکل ٹھیک ہے ان بے چاریوں نے' چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔" سعد نے جھٹ سے ان کی طرف داری کی۔
"کسی دن یہ بے چاریاں ایسا سبق سکھائیں گی تمہیں' لگ پتا جائے گا۔" ہادی کے منہ بنانے پر وہ مسکرایا۔
"اچھا' اب اپنا دل مت جلاؤ' جا کر سو جاؤ' پہلے ہی رات بہت ہوگئی ہے' شب بخیر۔" سعد مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

انابیہ کی زندگی عجیب دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔
اسے اپنی زندگی میں دو مردوں سے بے تحاشا محبت تھی اور اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے دونوں کی ہی چاہت اور توجہ حاصل نہیں ہو پائی' پہلا مرد اس کا باپ میر خاقان علی' جنہوں نے ساری زندگی اپنی پہلی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو اپنی توجہ کے قابل نہیں سمجھا' ان کی دلچسپیاں ہمیشہ گھر سے باہر رہی تھیں' ندرت بیگم سے دوسری شادی کرنے کے بعد بھی ان کے مزاج میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔
دوسرا شخص اس کا تایا زاد کزن برہان محتشم تھا' جس کی محبت اس کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئی تھی' لیکن اسے برہان کی طرف سے ہمیشہ بے رخی کا تحفہ ہی ملا تھا۔ اس کی بے تحاشا چاہت بھی برہان کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکی۔
"شاید تمہیں اس بات کا احساس ہی نہیں' کوئی چوبیس گھنٹوں میں' چوبیس ہزار دفعہ تمہارا نام محبت کی تسبیح کے دانوں پر پڑھتا ہے' تمہاری ایک نظر اس کے اندر سرشاری کا ایک جہان بھر دیتی ہے' اس کی آنکھوں میں امیدوں کے جگنوؤں کے قافلے آن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ تمہاری بے رخی میں لپٹی ایک نظر کسی کو ان دیکھی دلدل میں دھنسا کر اس کی زندگی کو بدصورت بنا دیتی ہے ________ محبت کے سفر میں اکیلا ہونے کا احساس دنیا کے ہر احساس سے زیادہ جان لیوا ہوتا ہے' لیکن شاید تم اس بات کو کبھی نہ جان سکو۔" انابیہ نے ایک لمبا سانس بھر کر اپنی ڈائری بند کر دی۔
محبت کے سفر میں یہ ڈائری اس کی بہترین دوست تھی' جس کے سینے میں اس کی ساری خوشیاں اور دکھ سموئے ہوئے تھے۔ وہ بڑی اعلا ظرفی کے ساتھ اس کے سارے کمزور لمحوں میں بیان کی گئی سچائیوں کو اپنے اندر دفن کیے ہوئے تھی۔
"بھائی کو بلیو کلر بہت اچھا لگتا ہے۔" درشہوار کے منہ سے نکلنے والے اس جملے کے بعد انابیہ کی الماری نیلے رنگ سے بھر گئی تھی۔
"خدا کا خوف کرو بیا' کبھی کبھی تو تمہیں دیکھ کر میرا دل کرتا ہے ایک گانا زور' زور سے گاؤں....." ایک دن طوبیٰ

Downloaded From http://paksociety.com

غصے سے الماری بند کر کے اس کے بالکل عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔
"کون سا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"میں نیل کرائیاں نیلکاں' میرا تن من نیلو نیل۔۔۔" طوبیٰ کے ایک دم جل کر بولنے پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔
"جب تمہیں محبت ہوگی تو پھر پوچھوں گی۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی "عشق کا عین" بند کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔
"اللہ بچائے ایسی محبت سے" اس نے شرارت سے کانوں کو ہاتھ لگایا' جلدی سے انابیہ کا سوٹ نکالا اور واش روم کی طرف بڑھی۔
"یہ میرا سوٹ کس خوشی میں پہن رہی ہو۔" اس نے منہ بنا کر پوچھا۔
"ویسے ہی۔۔۔ میرا بھی دل کر رہا تھا آج نیلو نیل ہونے کو۔۔۔" وہ شرارتی انداز میں گویا ہوئی۔
انابیہ ماضی کی خوش گوار یادوں کو جھٹک کر کھڑی ہوئی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور طوبیٰ کیمسٹری کی کتاب منہ پر رکھے گہری نیند سوئی ہوئی تھی' کمپارٹ آنے کے بعد وہ اور درشہوار اکثر ہی رٹے لگانے میں مگن نظر آتی تھیں۔
انابیہ کو اچانک یاد آیا' دوپہر میں اس کی ایک سہیلی نے بڑے محتاط انداز میں اسے آج کا اخبار دیکھنے کی تلقین کی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے چین ہوگئی اور دبے قدموں کے ساتھ سیڑھیاں اتر کر ہال کمرے میں آگئی۔ سامنے لکڑی کے بنے ریک میں صبح کے اخبارات ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک اخبار بڑی احتیاط سے نکالا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔
سامنے کے صفحات میں اسے کوئی خاص خبر نظر نہیں آئی تھی' اس نے درمیان کے صفحات پر سرسری نگاہ ڈال کر جیسے ہی اسے پلٹا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں کے گرد جالا سا بن گیا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وہ اس خبر کو پڑھنے لگی۔
"کیوں کرتے ہیں آپ ایسا؟" انابیہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ اس اخبار میں چھپنے والی اپنے والد میر خاقان علی کی تصویر کو دیکھنے لگی' جس میں وہ بڑے بے تکلفانہ انداز سے ایک ابھرتی ہوئی گلوکارہ کے ساتھ کسی فنکشن میں بیٹھے تھے۔
وہ بہت سالوں سے ان کی اس قسم کی دلچسپیوں کے بارے میں سنتی آرہی تھی' لیکن اس کے باوجود اسے ہر دفعہ پہلے سے بڑھ کر ہی تکلیف ہوتی۔ میر خاقان علی حکومت میں ہوں یا نہ ہوں' لیکن ان کی چھوٹی سے چھوٹی خبر بھی میڈیا میں خاصی اہم سمجھی جاتی تھی۔ انہیں خبروں میں رہنے کا فن آتا تھا۔ اس عمر میں بھی ڈیشنگ پرسنالٹی کے حامل تھے۔ باقاعدگی سے جم جانے' ایکسر سائز کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کئی سال چھوٹے ہی لگتے۔ انہیں اچھا پہننے کا جنون تھا' ان کی الماری برینڈڈ کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔
دراز قد' متناسب جسم اور کنپٹیوں پر ہلکی ہلکی سفیدی کے ساتھ ساتھ ان کے بولنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔
اخبار کی اس خبر میں میر خاقان کے سابقہ اسکینڈلز کو بھی کافی اچھالا گیا تھا۔ انابیہ کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ اسے پہلی دفعہ اپنی والدہ شارقہ بیگم اور ندرت امی کی لاعلمی پر رشک آیا۔ وہ دونوں ہی زیادہ ملنے جلنے والی نہیں تھیں اور سونے پہ سہاگہ انہیں ٹی وی اور اخبارات سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے یہ خبر ابھی تک ان تک نہیں پہنچی تھی۔
"میری ہم عمر تو ہوگی یہ لڑکی۔" انابیہ دل ہی دل میں اس گلوکارہ کی عمر کا تعین کرنے میں مگن تھی' اسے پتا ہی

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں چلا' کب دروازہ کھول کر برہان اندر داخل ہوئے اور انہوں نے اپنا لیپ ٹاپ کا بیگ میز پر رکھتے ہوئے دیوار گیر گھڑی پر ٹائم دیکھا۔

"یہ نیوز پیپر پڑھنے کا کون سا ٹائم ہے؟" ان کے طنزیہ انداز پر وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی اور گود میں رکھا اخبار اچھل کر برہان کے قدموں میں جا گرا۔ برہان کی نظر میر خاقان کی تصویر پر پڑی اور انہوں نے فوراً" عجلت بھرے انداز میں اخبار اٹھایا۔

"ویسے ہی دیکھ رہی تھی۔" انابیہ نے بڑی مہارت سے اپنے آنسو اندر دھکیلے۔

برہان نے تاسف بھرے انداز میں اس خبر کو پڑھتے ہوئے دوسری نظر انابیہ پر ڈالی' وہ سر جھکائے اپنے جوتے کی نوک سے قالین کو رگڑتے ہوئے انہیں ذہنی طور پر بہت مضطرب لگی اور یہ بالکل فطری بات تھی۔ کسی بھی بیٹی کے لیے اپنے والد کے رنگین معاشقے کی خبر کو ہضم کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

"جن چیزوں کو ہم بدل نہیں سکتے' ان کے ساتھ سمجھوتا کرنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار میز پر رکھتے ہوئے قدرے نرمی سے کہا' انابیہ کو جھٹکا لگا' وہ ان سے اس انداز کی توقع ذرا کم ہی رکھتی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا' وہ ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انابیہ کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ اپنے والد کے حوالے سے پہنچنے والی آدھی تکلیف تو برہان کے نرم لہجے نے ہی کم کر دی تھی۔

"سمجھوتا کرنے کے لیے بھی تو پہاڑ جتنا حوصلہ چاہیے۔" اس کے منہ سے بلا ارادہ ہی پھسلا۔

"میرا نہیں خیال' پہاڑوں پر رہنے والی کوئی لڑکی کم ہمت یا کم حوصلہ ہو سکتی ہے۔" ان کی اگلی بات نے انابیہ کو ایک دم ہی آسمان پر پہنچایا۔

"میں اتنی بھی بہادر نہیں ہوں' جتنا آپ سمجھتے ہیں۔" ان کی اپنے اوپر جمی نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے سر جھکا لیا اور محبوب کے سامنے سر جھکانے میں کتنا لطف آتا ہے' وہ ابھی ڈھنگ سے اس سے محظوظ ہو بھی نہ پائی تھی کہ برہان کے سیل فون کی گھنٹی نے سارا مزا کرا کر کر دیا۔

"ہیلو۔۔۔" انہوں نے بڑے محتاط انداز میں بات کی۔

"السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟" رات کے سناٹے میں سیل فون کے تیز والیوم کی وجہ سے باہر آنے والی کھنکتی آواز نے انابیہ کے کان کھڑے کر دیے۔ اس نے برہان کے چہرے پر پھیلی بے ساختہ مسکراہٹ سے بمشکل نظریں چرائیں۔

"فائن۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟ واپسی ہو گئی آپ کی؟" وہ لیپ ٹاپ اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے' ساتھ ہی وہ انابیہ کے دل کا سارا سکون بھی اپنے ساتھ چرا کر لے گئے۔

انابیہ نے بے ساختہ وال کلاک کی طرف دیکھا' رات کے دو بجے آنے والی یہ کال کتنی اہم تھی' اس کا اندازہ اسے برہان کے چہرے پر پھیلی جگمگاہٹ سے ہو گیا تھا اور دل کی اس ویرانی میں اندیشوں کے کئی ناگ نہ جانے کن کونے کھدروں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ انابیہ کے وجود پر ایک مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔

وہ کچھ دیر پہلے میر خاقان کے حوالے سے چھپنے والی اس تلخ خبر کو بھول کر اب اس انجان کھنکتی آواز کے زہریلے پن کو اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

دور تا حد نگاہ کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا' جنگل کی اس رات یہ دل دہلا دینے والا سناٹا اور تاریکی چھائی

Downloaded From http://paksociety.com

ہوئی تھی۔ دور آسمانوں پر چاند کی مدھم روشنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر زمین پر عجیب و غریب سے نقش و نگار بنا رہی تھی۔

وہ جنگل میں راستہ بھول چکی تھی اور اس وقت خوف زدہ انداز میں دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کوئی ہیولہ اس کے تعاقب میں ہو اور ذہن میں اس سوچ کے ابھرتے ہی ریڑھ کی ہڈی میں خوف سرائیت کرنے لگا۔

"مجھے یہاں سے بھاگنا چاہیے۔" اس سوچ کے آتے ہی وہ ننگے پاؤں اندھا دھند بھاگنے لگی۔

اسی وقت ویران جنگل میں ایک الو کی کریہہ چیخ کی آواز سن کر اس کے سارے وجود میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ اسے لگا جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔ اس کا گلا خشک ہو گیا اور پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ اسی وقت درختوں کے جھنڈ سے ایک بڑے پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ پر اس نے بوکھلا کر مڑ کر دیکھا' وہ ایک موٹا تازہ کریہہ شکل کا الو تھا جو بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ فضاؤں میں عجیب سا شور بلند ہوا اور اسے لگا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے' وہ اپنی جان بچانے کے لیے پاگلوں کی طرح بھاگی۔

"رک جاؤ۔" اس خوف ناک آواز کے تعاقب میں اس نے بے اختیار اوپر کی طرف دیکھا' جنگل میں موجود درختوں کی شاخوں سے کئی رنگ برنگی کھوپڑیاں لٹک رہی تھیں۔ یہ آواز انہی میں سے کسی ایک کی تھی۔

"کون ہو تم؟" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"روحیل محمود جسے مار دیا تھا تم نے۔" کوئی بلند آواز میں دھاڑا تھا۔ اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا' وہ خوف ناک قسم کا پرندہ منظر سے غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ پر روحیل محمود اس کے تعاقب میں تھا' اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سفید رنگ کے کفن میں اس کی زندہ لاش دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کی گردن باہر نکلی ہوئی تھی اور سر سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔

"بائے گاڈ... میں نے تمہیں نہیں مارا۔" وہ بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کر بری طرح گری اور تب تک وہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"لیکن تمہاری وجہ سے وہ حادثہ ہوا' اب میں تمہیں بھی ویسے ہی ماروں گا۔" اس نے بہت برے طریقے سے رومیصہ کو بالوں سے پکڑا اور اس کا سر پنچ کر زمین پر مارنے لگا' رومیصہ کے حلق سے نکلنے والی چیخوں نے "ٹینا ہاؤس" کے در و بام کو دہلا دیا۔ پورے گھر میں بھاگنے دوڑنے کی آوازیں سن کر رومی کی آنکھ کھلی۔

"کک کیا ہوا رومی؟" سب سے پہلے شیری اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر بوکھلائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی۔

اتنے سرد موسم میں بھی رومی کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ خوف زدہ انداز میں شیری کے ساتھ آ کر لپٹ گئی اور بلند آواز میں رونے لگی۔ "خدا کی قسم' میں نے اسے نہیں مارا۔" کانپتی ہوئی آواز میں وہ ایک ہی فقرہ دہرائے جا رہی تھی۔

"ریلیکس ایزی' میری جان' کچھ نہیں ہوا۔" شیری نے اسے اپنے ساتھ لگا کر دلاسا دینے کی کوشش کی۔

ٹینا بیگم سیاہ رنگ کے نائٹ ڈریس میں گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئیں' انہوں نے سخت پریشانی سے اندر کا منظر دیکھا' انہیں ایک لمحے میں سمجھ میں آ گیا تھا کہ رومیصہ خواب میں ڈر گئی ہے اور اس کی چیخوں نے سبھی کو دہلا دیا تھا۔

"مام! ٹرسٹ می' میں نے نہیں مارا اسے۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی' ایک آنسو اس کی پلک سے ٹوٹ کر

Downloaded From http://paksociety.com

رخسار پر کسی موتی کی طرح ٹھہر گیا۔ ٹینا بیگم نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔ ان کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"میں جانتی ہوں سویٹ ہارٹ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" وہ شل ہوتے دماغ کو سنبھالتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگیں۔

ماں، بیٹی کے درمیان پھیلی سرد مہری کی برف بڑی تیزی سے پگھلنے لگی۔ وہ اپنی ماں سے لپٹی بالکل ننھے بچوں کی طرح رو رہی تھی، ٹینا بیگم کی آنکھیں بھی نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"رومی! یہ پانی پیو اور آیت الکرسی پڑھ کر سو جاؤ۔" شہرزاد خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" اس کا وجود ابھی بھی ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں، کوئی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولی۔

"وہ لوگ مجھے جیل میں ڈال دیں گے۔" رومیصہ شدید قسم کے خوف میں مبتلا ہو چکی تھی۔

"ایسا نہیں ہوگا رومی! ہم سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں، بی بریو۔" ٹینا بیگم نے بھی اسے دلاسا دیا۔

"مام، بائے گاڈ، میں نے اسے نہیں مارا، وہ خود گاڑی سے ٹکرایا تھا، اس کے ہاتھ میں پسٹل بھی تھا، وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔" وہ بے ربط انداز میں اپنی صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"رومیصہ! بس کرو، سب پتا ہے ہمیں، بس آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔" شہرزاد نے اس کا کمبل ٹھیک کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"آپ لوگ چھوڑ کر تو نہیں جائیں گے مجھے۔" وہ ہراساں نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

روحیل محمود کی موت نے اسے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا، وہ آنکھیں بند کرتی تو اس کا خون میں لت پت چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آجاتا۔ اس واقعے نے اسے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلے لیٹنے سے ڈرنے لگی تھی۔

"آئی تھنک شیری، ہمیں یہیں سو جانا چاہیے آج۔" ٹینا بیگم کے سنجیدہ انداز پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کشن اٹھا کر سامنے صوفے پر لیٹ گئی، جبکہ مام رومی کے بستر پر ہی لیٹ گئی تھیں۔

ان تینوں کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ جسٹس محمود نام کا جن ان سب کے حواسوں پر سوار تھا۔ وہ مشکل رات ان تینوں نے بڑی مشکل ہی سے کاٹی تھی۔ صبح چار بجے کے قریب شہرزاد کی آنکھ لگی اور پھر دس بجے جا کر کھلی، کمرہ خالی تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو کر نیچے آئی تو ملازمہ ڈائننگ روم میں ناشتا لگا رہی تھی اور وہ دونوں وہیں موجود تھیں۔ رات بھر کی بے خوابی، ٹینا بیگم اور رومیصہ کی سرخ آنکھوں اور مضمحل انداز سے ظاہر تھی۔

"ہیلو مام! ہائے رومی۔" وہ دانستہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"کیسی ہو؟ میں تو ساری رات نہیں سو سکی۔" مام کی تھکی تھکی آواز اس بات کی گواہ تھی کہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

"کیوں ٹینشن لیتی ہیں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"پتا نہیں، کیسے ہوگا۔" وہ اچھی خاصی مایوس تھیں۔

"میں نے بہت سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کیا ہے مام۔" توس پر جیم لگاتے ہوئے وہ آج اپنے مخصوص پر اعتماد

Downloaded From http://paksociety.com

انداز میں گویا تھی۔ دونوں نے ہی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسا فیصلہ؟" ٹینا بیگم نے حیرانی سے دریافت کیا۔

"یہی کہ رومی کا کیس میں خود لڑوں گی۔" اس کی بات پر رومی کی آنکھوں میں ہلکا سا استعجاب ابھرا۔

"لیکن میں تو بیرسٹر عالیہ سے بات کر چکی ہوں۔" ٹینا بیگم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اٹس اوکے' لیکن میں ان کے ساتھ ان کی اسسٹنٹ کے طور پر ضرور ورک کروں گی۔" اس نے تحمل سے اپنے کپ میں چائے انڈیلی۔

"ہاں... اور اس کیس کا فیصلہ آتے ہی میں رومی کو لندن بھجوا دوں گی۔" ان کی اگلی پلاننگ سنتے ہی شہزاد نے بلا ارادہ رومیصہ کی طرف دیکھا' اسے یقین تھا۔ وہاں سے صدائے احتجاج ضرور بلند ہوگی' لیکن اس سے پہلے ہی ایک اور جگہ سے اعتراض آگیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے محمود احمد' اتنا گدھا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی قاتلہ کو ملک سے باہر جانے دے دے گا۔" ہارون رضا کی اس موقع پر آمد ان تینوں کو ہی سخت ناگوار گزری۔ وہ شاید نہیں یقیناً" اندر داخل ہوتے ہوئے ان کی گفتگو کا کچھ حصہ سن چکے تھے۔

"میری بیٹی نے مرڈر نہیں کیا۔" ٹینا بیگم ایک دم تپ کر بولیں۔

"یہ فیصلہ کرنا' تمہارا نہیں کورٹ کا کام ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوئے۔

"پھر تم بھی اپنی زبان بند رکھو اور عدالتی معاملات میں گھسنے کی کوشش مت کرو۔" ٹینا نے بھی بدلحاظی سے انہیں مشورہ دیا۔

"جانتا ہوں' کس کی شہ پر اتنا اچھل رہی ہو تم..." ہارون کی بدتمیزی پر رومی اور شیری دونوں کا چہرہ سرخ ہوا۔

"فضول کے اندازے مت لگایا کرو۔" ٹینا بیگم نے بھنویں اچکا کر کوفت بھرے انداز سے کہا۔

"سیف الرحمن... وہی ہے نا جو آج کل "اوپر" بیٹھا تمہاری ساری ڈوریں ہلا رہا ہے۔" اپنی بیٹیوں کے سامنے ہارون رضا کا استہزائیہ لہجہ انہیں مشتعل کر گیا۔

"شٹ اپ..." انہوں نے ہاتھ میں پکڑا جوس کا گلاس ایک دم ہی ٹیبل پر پٹخا' جوس چھلک کر میز کی سطح پر پھیل گیا۔

"کیا انٹرسٹ ہے اس کا اس معاملے میں؟ کیوں بھاگتا پھر رہا ہے وہ تمہارے لیے..." ہارون رضا کا زہر آلود لہجہ شہزاد کو سخت ناگوار گزرا۔

"تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے تو ڈائیورس دے دو مجھے..." وہ ایک دم چیخیں۔

"اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑوں گا تمہاری' یہ بات یاد رکھنا تم!" انہوں نے انگلی اٹھا کر ٹینا بیگم کو دھمکی دی۔ اس کے ساتھ ہی شہزاد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔

"آپ دونوں کو جو بھی پرابلم ہے جا کر اپنے بیڈ روم میں حل کریں' یہاں پر خواہ مخواہ کا تماشا مت لگائیں۔" شہزاد کے سرد لہجے پر ہارون رضا کو ایک دم جھٹکا لگا۔ انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"چلو رومیصہ..." شہزاد نے بالکل بے جان انداز میں بیٹھی رومی کا بازو پکڑا تو اسے احساس ہوا' وہ بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ اسے زبردستی گھسیٹتی ہوئی لاؤنج میں لے گئی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ چکی تھی کہ اسے ہارون رضا کے معاملے میں اب کھل کر مام سے بات کر لینی چاہیے' وہ اس شخص کو اب مزید ڈھیل دینے کے حق میں نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

"کیا مصیبت ہے' پریکٹیکل کی کاپی لینے کے لیے خود جانا ضروری تھا کیا۔" مری کے اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے طوبیٰ کا سانس پھول چکا تھا۔ جبکہ درشہوار کینوس شوز پہنے بڑے مزے سے چل رہی تھی۔

"مانو یا نہ مانو' تمہارا وزن بڑھ چکا ہے' تب ہی تو اتنا سانس پھول رہا ہے تمہارا۔" درشہوار کے فقرے پر طوبیٰ نے تپ کر اسے دیکھا۔ جس کا چہرہ اس وقت اسے سخت منحوس لگ رہا تھا' ویسے بھی وہ اپنی اسمارٹنیس کے معاملے میں خاصی حساس تھی۔

"یہ بات اگر تم اس موٹی بھینس نمو کے بارے میں کہتیں تو شاید کوئی یقین کر بھی لیتا۔" طوبیٰ نے نمیرہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"وہ موٹی' اگر اس وقت ساتھ ہوتی تو' تمہارے اگلے دو دانت تو ضرور توڑ چکی ہوتی۔" درشہوار چلتے چلتے رکی۔ وہ دونوں اس وقت اپنی ایک مشترکہ سہیلی کے گھر سے کیمسٹری کی پریکٹیکل کاپی لے کر واپس آرہی تھیں۔ اسی وقت فضاؤں میں مغرب کی اذانیں گونجنے لگیں۔

"نمیرہ تو دانت بعد میں توڑے گی' تائی اماں آج ہماری ایک آدھ ٹانگ ضرور توڑ دیں گی۔" طوبیٰ نے پہاڑوں پر اترتی تاریکی کو دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں کہا' نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں خاصی لیٹ ہو چکی تھیں۔

"تم ہی شامی کباب کھانے بیٹھ گئی تھیں' ورنہ میں تو کافی دیر سے کہہ رہی تھی کہ گھر چلتے ہیں۔" درشہوار نے سارا الزام اس کے سر پر رکھ دیا۔

"ایسی کوئی بکواس تم نے تائی اماں کے سامنے کی تو یقین مانو اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کردوں گی۔" طوبیٰ تڑپ کر بولی۔

"اچھا اچھا بعد میں عاق کر دینا' ذرا ادھر دیکھو۔۔۔" درشہوار نے خوبانیوں کے ایک درخت کی طرف مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔

"خبردار' ان پر بری نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں' ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔" اس نے فوراً ہی آنکھیں ماتھے پر رکھیں۔

"تمہیں پتا تو ہے خوبانیاں میری کمزوری ہیں۔" درشہوار نے پریکٹیکل کی کاپی اسے پکڑا کر کسی پتھر کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھا۔

"درشہوار! بس کرو' ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں۔" وہ جھنجلا گئی۔

"تو دو منٹ کا تو کام ہے' راستے میں مزے سے کھاتے جائیں گے۔"

اس نے ایک بڑا سا پتھر گھما کر درخت کی ایک پھل دار ٹہنی پر دے مارا۔ درشہوار کا نشانہ تو بالکل ٹھیک تھا' لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ بھاری پتھر موٹے تنے کو چھوتا ہوا' درخت سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے ایک باؤلے کتے کو جا لگا۔

وہ کتا مشتعل ہو کر اٹھا اور بھونکتے ہوئے درشہوار پر حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا۔ درشہوار کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

"اوہ میرے خدا طوبیٰ بھاگو۔" اس نے ناگہانی آفت پر بوکھلا کر سڑک پر بھاگنے کے بجائے دائیں طرف بنے واقع جنگل کی طرف دوڑ لگائی۔

"بے وقوف لڑکی' ادھر کہاں جا رہی ہو؟" طوبیٰ نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا' جو تیزی سے ڈھلوانی سطح پر پھسلتی ہوئی نیچے کو جا رہی تھی' جبکہ وہ کتا ابھی تک اس کے تعاقب میں تھا۔ درشہوار تیزی سے دوڑنے لگی' اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سیکنڈوں میں جنگل کی ڈھلوان سطح سے پھسلتے ہوئے ہموار زمین پر جا

Downloaded From http://paksociety.com

گری' اس کے گھٹنے اور بازو پر خاصی چوٹ لگی تھی۔

وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور اس نے بوکھلا کر اپنے پیچھے دیکھا' وہ کتا لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا اس کے پیچھے تھا۔ درشہوار کو اپنی موت بہت قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی' اس نے آناً "فاناً" فیصلہ کیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ایک اور پتھر اٹھایا اور اپنے دفاع کے لیے گھما کر دے مارا' جو کتے کی ٹانگ پر جا لگا اور وہ مزید غصے میں آکر اس کے پیچھے دوڑنے لگا' درشہوار کا رنگ فق ہو گیا۔

"یا اللہ بچانا۔۔۔" اس نے پھر نیچے کی جانب دوڑ لگائی' وہ کتا بھی اس کے پیچھے تھا۔ اسی دوران درشہوار کا ایک جوتا بھی وہیں گر گیا تھا اور وہ اب ایک عدد ننگے پیر کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اسے لگا اس کے بدن سے روح پرواز کرنے لگی ہے۔

"کمینے انسان رکو۔۔۔" وہ کتے کو دھمکیاں دیتے ہوئے ایک بھاری قسم کے درخت کے پیچھے سے نکلتے محمد ہادی سے بری طرح ٹکرائی' جو اس وقت اپنے آفس کے کام سے فیلڈ میں نکلا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' اس کتے نے چھلانگ لگا کر درشہوار پر حملہ کیا' وہ سراسیمہ انداز میں ایک دم زمین پر بیٹھ گئی' وہ کتا اچھل کر اس کے اوپر سے ہوتا ہوا دور جا گرا۔

درشہوار حواس باختہ انداز میں اٹھی' اس کا دوپٹا ایک جھاڑی سے الجھا اور وہ اسے چھوڑ کر بوکھلا کر ہادی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی' اب سین کچھ یوں تھا کہ ہادی کے سامنے وہ جنونی کتا اور پیچھے درشہوار تھی' جس کا سانس پھولا ہوا اور آنکھوں سے آنسو قطار کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ اس صورت حال نے اسے سخت خوف زدہ کر دیا تھا' اوپر سے سورج کے ڈوبتے ہی چاروں طرف ملگجا سا اندھیرا پھیل گیا تھا۔

"پلیز بچائیں مجھے" وہ ہذیانی انداز میں کہتی ہوئی خود پر قابو نہ پا کر رو پڑی۔

وہ کتا ذرا فاصلے پر کھڑا' بھونک رہا تھا' ہادی کو ایک نظر دیکھنے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں ہے' وہ آہستہ آہستہ پھر ان دونوں کی طرف بڑھ رہا تھا' ہادی نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور اپنی جیکٹ کی جیب سے پسٹل نکالا' جو وہ فیلڈ پر جاتے ہوئے جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے اپنے پاس رکھتا تھا۔

وہ پاگل کتا' اب ہادی پر حملہ کرنے کی نیت سے آگے بڑھا۔ اس نے فوراً" ہی نشانہ باندھ کر گولی اس کی ٹانگ میں دے ماری' وہ تڑپ کر زمین پر گرا' اس نے ایک دفعہ پھر اٹھ کر حملہ کرنے کی کوشش کی' لیکن اگلے فائر سے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جبکہ درشہوار آنکھیں بند کیے بُرے طریقے سے رو رہی تھی۔ ہادی کو ہلکی سی بے زاری ہوئی۔

"مر گیا ہے وہ۔۔۔" ہادی نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے جھاڑیوں میں الجھا ہوا اس کا دوپٹا اٹھایا۔ وہ سپید پڑتی رنگت کے ساتھ ساکت و جامد تھی۔

"یہ دوپٹا لیں اپنا۔" ہادی کے سنجیدہ انداز پر اس نے فوراً" چونک کر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ وہ بغیر دوپٹے کے تھی۔ اس نے بوکھلا کر دوپٹا پکڑا اور فوراً" اوڑھ لیا۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے اس کی قمیص کا بازو ایک جگہ سے پھٹ چکا تھا اور جلد پر کئی خراشیں آچکی تھیں۔ دور کہیں بلی کے رونے کی آواز نے جنگل میں عجیب سا ماحول طاری کر دیا۔

اس وقت وہ سرخ آنکھوں' بکھرے بالوں اور گرد آلود کپڑوں کے ساتھ انتہائی خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"نکلیں یہاں سے۔۔۔" وہ نظریں چُرا کر آگے چلنے لگا' یہ موقع کوئی طعنہ دینے کا نہیں تھا' ورنہ اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ دو چار کھری کھری تو ضرور سنا دے' اس لڑکی کو' جو اپنے گھر میں ٹارزن تھی اور اس وقت بھیگی بلی

Downloaded From http://paksociety.com
بنی اس کے پیچھے چل رہی تھی۔
"آہستہ چلیں۔۔۔" درشہوار کے حواس شل ہوگئے تھے۔
"اس سے پہلے کہ کوئی اور جانور کہیں سے نکل آئے' آپ برائے مہربانی تیز قدم اٹھائیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا تلخ ہوا۔
درشہوار سنبھل سنبھل کر چڑھائی چڑھ رہی تھی' ایک پیر میں جوتا نہ ہونے کی وجہ سے اسے چلنے میں مشکل پیش آرہی تھی' اچانک چلتے چلتے ایک نوکیلا پتھر اس کے پاؤں کے ناخن سے ٹکرایا اور درشہوار کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ پر وہ ہلکا سا بوکھلا کر مڑا۔
وہ اپنے پیر پر جھکی تکلیف سے کراہ رہی تھی' ہادی نے سیل فون میں موجود ٹارچ جلا کر تھوڑا سا جھک کر دیکھا' اس کے پاؤں کا ناخن آدھا ٹوٹ چکا تھا اور نوکیلا پتھر اندر گھسنے کی وجہ سے اب خون نکل رہا تھا۔
"اوہ نو۔۔۔" وہ فوراً" زمین پر بیٹھا اور بڑی احتیاط سے اس نے انگوٹھے کے آدھے ناخن میں پھنسے ایک چھوٹے سے پتھر کو باہر نکالا' درد کی ایک بے ساختہ لہر درشہوار کے وجود میں دوڑی اور اس نے لاشعوری طور پر ہادی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آنکھیں بند کیے ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔
"ریلیکس' پٹی باندھنے دیں مجھے۔" ہادی نے اپنی جیکٹ سے رومال نکالا اور کس کر اس کے انگوٹھے پر باندھ دیا' جس سے خون بہنا تو رک گیا تھا لیکن تکلیف کے گہرے احساس کو ضبط کرنے کی کوشش میں درشہوار کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔
"مجھ سے چلا نہیں جارہا۔" آنسوؤں میں بھیگی اس آواز نے ہادی کے قدم روک دیے۔
"تھوڑی ہمت کریں' روڈ پر گاڑی کھڑی ہے میری۔" ہادی کو اس کے مسلسل رونے پر ترس آہی گیا۔
"اتنا درد ہو رہا ہے مجھے۔" وہ گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بمشکل کھڑی ہوئی۔
"ادھر دیں اپنا ہاتھ۔" ہادی نے نظریں چرا کر اپنا بازو اس کی طرف بڑھایا جو اس نے ہلکا سا جھک کر تھام لیا' اب وہ اسے پکڑے انتہائی احتیاط سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ درشہوار کو ایک دم یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکنوں نے ایک اور ہی راگ الاپنا شروع کردیا ہو۔
درشہوار کے اندر کی دنیا سیکنڈوں میں بدلی تھی۔ اس کی ساری شوخی اور شرارت یہیں کہیں اس جنگل میں کھو گئی تھی۔ وہ اس سے نظریں چرائے بس سر جھکائے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ ہادی کو یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہوئی۔ جیسے ہی دونوں تھوڑا اوپر پہنچے' طوبیٰ حواس باختہ انداز میں درشہوار کی تلاش میں نیچے اتر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔
"تھینکس گاڈ' تم زندہ ہو' یقین مانو ایک سو ایک دفعہ آیت الکرسی پڑھ کر پھونک چکی ہوں تم پر۔" طوبیٰ بے چین انداز میں اس کی طرف بڑھی۔
"شکر کریں فاتحہ نہیں پڑھنی پڑی' ورنہ آپ کی کزن کے آج ارادے تو ایسے ہی تھے۔" ہادی سنجیدگی سے بولا تھا۔
"آپ کہاں سے آگئے اچانک؟" طوبیٰ حیران ہوئی۔
"اپنی روزی روٹی کے چکر میں گھوم رہا تھا جنگل میں' مجھے کیا پتا تھا آپ لوگوں نے اب انسانوں کو چھوڑ کر جانوروں کو تنگ کرنا شروع کردیا ہے۔" اس نے ایک طرف کھڑی اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا' سڑک پر لگی روشنی میں طوبیٰ کی نظر درشہوار کے پاؤں پر پڑی۔
"اوہ مائی گاڈ! یہ تمہارے پاؤں کو کیا ہوا' کیسے چوٹ لگ گئی۔" وہ بوکھلا کر اس کے پاؤں پر جھکی اور اس کا جائزہ

Downloaded From http://paksociety.com

لینے لگی۔
''خدانا خواستہ' تمہاری زبان پر تو چوٹ نہیں لگ گئی۔'' طوبیٰ اس کی غیر معمولی خاموشی پر گھبرا کر بولی تو ہادی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''محترمہ' یہ تفتیش آپ گھر جا کر' کرلیجیے گا' اس وقت ٹائم کافی ہوگیا ہے۔'' اس کی بات پر طوبیٰ نے گھبرا کر کلائی میں پہنی گھڑی سے ٹائم دیکھا' ساتھ ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جلدی سے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف انابیہ تھیں۔
''کہاں ہو تم دونوں' ٹائم دیکھا ہے' داجی گھر آچکے ہیں۔'' انابیہ کی اطلاع نے اس کی روح فنا کردی۔
''تم پلیز کوئی بہانہ بناؤ' ہم لوگ پچھلے لان کی طرف سے آرہے ہیں۔'' طوبیٰ نے جلدی سے فون بند کیا۔
''پلیز ہمیں گھر تک ڈراپ کردیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا' وہ درشہوار کا بازو پکڑ کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ ''میر ہاؤس'' کے قریب پہنچا ہی تھا کہ طوبیٰ بول پڑی۔
''پلیز' گاڑی اپنے گھر لے جائیں۔'' اس کی اگلی فرمائش پر ہادی کا دماغ بھک کرکے اڑا۔
''وہ کس خوشی میں؟؟''
''ہمارے سامنے والے لان میں داجی کے روم کی کھڑکیاں کھلتی ہیں اور اس وقت وہاں سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں۔'' اس نے ہلکی سی خجالت کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت کی' ہادی کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ماننا پڑی۔
گاڑی جیسے ہی رکی' درشہوار ہلکا سا لنگڑاتی ہوئی نیچے اتری۔ طوبیٰ نے آگے بڑھ کر اس کو سہارا دیا۔ وہ خاصی نڈھال لگ رہی تھی اور اس کا حلیہ خاصا مشکوک لگ رہا تھا اور ایسی حالت میں واقعی کسی بڑے کے سامنے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔
''یار جلدی چلو۔'' طوبیٰ اس کا بازو پکڑ کر لان کی پچھلی طرف چل دی۔ ہادی بھی بلا ارادہ ان کے پیچھے چلا آیا۔ طوبیٰ نے جلدی سے منڈیر پر چڑھ کر چھلانگ لگائی اور اگلے ہی لمحے وہ دوسری طرف تھی۔
درشہوار چلتے چلتے رکی۔ اس کا پاؤں سوج چکا تھا اور اتنی تکلیف کے ساتھ اچھل کر منڈیر پر چڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہادی کو اس کی مشکل سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے دوسری دیوار کے پاس رکھی دو اینٹیں اٹھائیں اور خاموشی سے منڈیر کے پاس رکھ دیں۔
''اس پر پاؤں رکھ کر چڑھیں۔'' ہادی کے نرم لہجے پر درشہوار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی مہربان آنکھوں میں پھیلی نرم جگمگاہٹ اسے اپنے دل کے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دور کہیں ویرانوں میں گھنٹیاں بجی تھیں۔
''فار گاڈ سیک یار' جلدی کرو' کن سوچوں میں گم ہو۔'' طوبیٰ کی جھنجلاہٹ پر وہ ہلکا سا بوکھلائی۔ اس نے بمشکل اپنا پیر ہادی کی رکھی ہوئی اینٹوں پر جمایا اور ساتھ ہی اس کی چاہت نے دل کے کسی کونے میں مضبوطی سے ڈیرہ جمالیا۔ محبت ایک تیز رفتار زلزلے کی صورت میں اس پر حملہ آور ہوئی تھی اور اس نے سیکنڈوں میں درشہوار کے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ گھبرا کر منڈیر پر بیٹھی اور ساتھ ہی اس نے سوچے سمجھے بغیر دوسری طرف چھلانگ لگادی۔

☆ ☆ ☆

صبح سے ہونے والی موسلادھار بارش نے اسلام آباد کے مکینوں کو عجیب سی بے زاری اور کوفت میں مبتلا کردیا

Downloaded From http://paksociety.com

تھا۔ اتنی سردی میں صبح دس بجے سے ہونے والی مسلسل بارش رات کے بارہ بجے بھی جاری تھی۔

آج نور محل میں عجیب سی وحشت طاری تھی' گھر کے سب ہی ملازمین شام ہوتے ہی اپنے کوارٹروں میں دبک گئے تھے۔ اتنے بڑے بنگلے میں آج فارحہ بھابھی اور ان کی ملازمہ صندل ہی تھیں۔ واجی اور میر محتشم بھی شام کو مری کے لیے نکل گئے تھے۔ میر وہاج کو ملتان گئے ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے اور ابھی ان کی واپسی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

صندل نے آج جلدی جلدی سارا کام سمیٹ لیا تھا۔ اس وقت وہ دودھ کا گلاس رکھنے فارحہ بی بی کے کمرے میں آئی۔ جن کی طبیعت پچھلے دو دن سے خاصی خراب تھی۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی رہتیں۔

"صندل' ساری کھڑکیاں اور دروازے اچھی طرح بند کردیے ہیں نا۔" فارحہ بھابھی نے نڈھال انداز میں اس سے پوچھا۔

"جی بی بی جی۔" اس نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

"سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نیند کی ٹیبلٹ نکال کر دو مجھے۔" ان کے رنجیدہ لہجے پر صندل کا دل تاسف کے احساس سے بھر گیا۔

"بی بی جی اتنی گولیاں مت کھایا کریں۔" صندل کو فارحہ بی بی پر خاصا ترس آتا تھا' گھر کے باقی ملازمین کی طرح وہ بھی ان کی ازدواجی زندگی کی تلخیوں سے بخوبی واقف تھی۔ اپنے میاں وہاج کے برعکس فارحہ بھابھی کا رویہ ملازمین کے ساتھ بہت اچھا تھا۔

"کیا کروں' اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔" انہوں نے افسردہ انداز میں کہتے ہوئے پانی سے گولی نگلی۔ دور کہیں آسمانوں پر بادل گرجے تھے۔ ساتھ آسمانی بجلی کی کڑک نے ان دونوں کا دل دہلا دیا۔

"آج تو موسم بہت خراب ہے؟" صندل نے فکر مندانہ انداز میں کہتے ہوئے کمرے کے بھاری پردے آگے کیے۔

"تم بھی لائٹ بند کرکے سو جاؤ اپنے کمرے میں۔" فارحہ نے نرمی سے اسے کہا تو وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ آئی جو اسٹور روم کے ساتھ تھا۔ دو شہوار سے مانگے گئے انجسٹوں میں سے ایک ڈائجسٹ نکال کر اس نے پڑھنا شروع کردیا اور وہ کہانی میں ایسی گم ہوئی کہ ایک دم لائٹ کے جانے پر ہی اسے ہوش آیا' اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ چوکیدار نے ابھی تک جنریٹر نہیں چلایا تھا' وہ کچھ دیر انتظار کرکے اٹھی اور موبائل فون کی روشنی میں اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور موم بتی کی تلاش میں کچن کی طرف قدم بڑھائے۔ اپنی دھن میں جیسے ہی وہ باہر نکلی' سیٹنگ روم کا دروازہ باہر سے کھلا اور وہاج بڑی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ صندل کو سامنے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں عجیب سی پراسراریت چمک ابھری۔ صندل کا دل بری طرح دھڑکا۔

اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے آگے بڑھے اور اس سے پہلے کہ صندل ان کے ارادوں کو سمجھتی' انہوں نے اچانک اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں لے جا کر پٹخا۔ صندل نے چیخنا چاہا مگر اس کی آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ بہت سرعت کے ساتھ وہاج صاحب نے کمرہ اندر سے لاک کیا۔ باہر چوکیدار نے جنریٹر چلا دیا تھا' اس کے شور میں صندل کی گھٹی گھٹی سی چیخیں کمرے میں دم توڑ گئیں۔

(باقی آئندہ ماہ' ان شاء اللہ)

Downloaded From http://paksociety.com

منشا محسن علی

بہار حاضر ہو

"جو کام آپ نے زندگی میں کبھی بھی نہ کرنے کا سوچا ہو وہی کام یہ محبت نامی بلا بڑے دھڑلے سے کروا ڈالتی ہے اور پھر آپ کے پیٹھ پیچھے یقیناً" بلند و بانگ قہقہوں کی گونج کے ساتھ تالیاں پیٹتی ہوگی۔ ایک بار یہ محبت میرے ہاتھ آجائے اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

Downloaded From http://paksociety.com

محبت کو دی جانے والی میری ننھی منی سی دھمکی بڑی شان سے میری طرف پلٹ آئی تھی۔ آفس روم کے درودیوار پر سجی آئل پینٹنگز، شیشے کی میز پر رکھا ملٹی شیڈڈ پیپر ویٹ، ان ڈور سدا بہار پلانٹ... سب نے میری بے بسی پر جیسے قہقہہ بلند کیا اور پھر سے اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ جم گئے۔

میں صدام حسین ہوں، ایک بزنس ٹائیکون جس کے نزدیک محبت کسی بے کار مشغلے کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں محبت کے "منکرین" میں سے ہوں۔ اور میری اسی بات نے محبت کو تشویش دلایا۔ وہ آئی، وارد ہوئی، میں پہلے حیران ہوا، پھر چونکا اور آخری میں بال نوچ ڈالے۔

"صدام حسین! تمہیں کسی افریقن سے محبت ہوجاتی۔ انگریز سے بھی ہوجائے تو مضائقہ نہیں۔ مگر کم از کم اس مینا حفیظ سے نہ ہوتی۔ دل چاہ رہا ہے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا، گنگناتا ہوا، جینز میں ہاتھ ڈالے مال روڈ کی سیر کو نکل جاؤں... اور پھر واپسی کا رستہ بھول جاؤں۔"

مینا حفیظ تو گلے کو آنکھوں سے چٹ کر جانے کا فن جانتی ہے۔ صاحبو... جان رکھو یہ بھی بڑا فن ہے۔ ہماری دوسری مشرقی دوشیزاؤں کو تو یہ فن چھو کر بھی نہیں گزرا ابھی تک نین نشیلے، شرمانے، لجانے، انگلی دانتوں میں دبانے جیسے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ ارے سیکھو کچھ مینا حفیظ سے۔

آیئے! اب آپ سب کا محترمہ مینا حفیظ سے بھی تعارف کرادوں جو ناقابل فراموش شخصیت ہے، آہ، مینا حفیظ سرکاری لائبریری میں لائبریرین کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ خوب صورت بالکل بھی نہیں ہے۔ ویسی ہی ہے جیسی باقی ستر فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔

عام سی، مناسب نین نقش اور میرے ایک خطرناک حد تک غلط اندازے کے مطابق ایسی لڑکیوں سے کبھی محبت نہیں ہوتی کبھی نہیں۔

اس کی کرسی کے عین اوپر دیوار پر اس کی اپنی ہی لکھائی میں ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔

"خاموشی کا احترام کریں۔" "میں معصوم انسان تو خاموشیوں کا احترام کرنے والوں میں سے ہوں، مگر میرا موبائل برائٹ نائٹ کی گھنٹیاں بجاتا اور مینا حفیظ کی لمبی ہیل کی ٹک ٹک میرے قریب آتی۔ میں زمانے بھر کا بے نیاز بنا "آگ کا دریا" پڑھتا نظر آتا۔

"آپ کو خاموشی اچھی نہیں لگتی؟"

"آں، نہیں، نہیں تو، میں تو خاموشیوں کا بہت بڑا فین ہوں۔" زمانے بھر کی معصومیت جانے کیوں مجھ پر ختم سی ہوجاتی... اف صدام حسین دی گریٹ۔

"آئندہ اپنا فون سائلنٹ موڈ پر رکھا کریں۔"

کیچر میں سیدھے لمبے بال جکڑے ہوئے لیڈ پنسل کان پر اٹکا رکھی تھی۔ کالی ذہین آنکھیں صدام حسین دی گریٹ پر جمی تھیں۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"کوشش" وہ چلائی تھی لوگ دیکھنے لگے ہم دونوں معذرت کے سے انداز میں مسکرائے۔

"میرا مطلب ہے آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے یقین دلایا تھا۔ وہ جانے لگی تھی ٹک ٹک...

"سنیں پلیز" میں نے آواز دی، وہ تھمی، پلٹ کر دیکھا خشمگیں نظریں۔

"یس۔"

"یہ آپ کی پنسل! نازک پنسل شاید آپ کے چلانے کا بوجھ نہ برداشت کرسکی۔"

غصے میں تھر تھر کانپتی مینا حفیظ نے پنسل جھپٹی اور اپنے ڈیسک کی طرف بڑھ گئی۔ مقدس خاموشی میں گھڑی کی آواز گونجتی رہی، ہلکی، مدھم، میرا مطالعے کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ میں ہولے سے اٹھا۔ آگ کا دریا، مینا حفیظ کے سامنے میز پر رکھی۔ وہ چشمہ لگائے انگلش اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ "آئی ایم امپریسڈ" مگر یہ کیا؟ مقدس خاموشیوں میں شرارت کا پہر آن براجمان ہوا شریر پہر۔

"سنیں" میں نے آواز دی تھی۔ جنٹس لیڈی

Downloaded From http://paksociety.com

نے کافی کا کپ ڈیسک پر پٹخا۔ عصیلی نظریں میں ڈر سا گیا تھا۔

"اب کیا ہے؟" ڈپٹ کر پوچھا گیا تھا۔ میرا دل چاہا کاش مینا حفیظ بھی کوئی شرماتی لجاتی مشرقی ناری ہوتی جو کم از کم یوں تو نہ کرتی اور میں معصوم صدام ابن حسین اس کی آنکھوں کے ایٹم بموں سے محفوظ رہتا۔

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ نکلے۔" (صاحبو آگے خود شعر مکمل کرلیں مجھے شاعری سے کوئی شغف نہیں۔)

"اب بتائیں بھی کیا کہنا ہے؟" غصے سے چہرے نے رنگ بدلے 'نیلا' پیلا' لال۔

"مس مینا حفیظ! آپ "دی نیوز" الٹا پڑھے جارہی ہیں۔" یہ کہہ کر میں مکمل اطمینان اور سکون سے خاموشیوں کے مقدس ماحول سے باہر نکل آیا تھا۔

پیچھے دیکھو تو خاموشیوں کے مقدس پہر میں شرارت کے قہقہے پھوٹ پڑے ہیں۔

☆ ☆ ☆

آج مینا حفیظ "دی نیوز" سیدھا پڑھ رہی تھی۔ خطرناک حد تک جان لیوا سنجیدگی سے مجھے دیکھا اور چابیوں کا گچھا ڈیسک پر پٹخ دیا گیا۔

"الماری نمبر 13 'چابی نمبر 26 ۔"

اس پل مجھے مینا حفیظ روحانیت کے اعلا درجے تک پہنچی ہوئی لگی تھی۔ کیسے جان لیا کہ مجھے کون سی کتاب چاہیے۔

"واہ آپ کو کیسے پتا' مجھے کون سی کتاب چاہیے؟" میں نے روحانیت کا درجہ ماپنے کی کوشش کی تھی۔

کاجل سے سجی آنکھیں جیسے طنز سے کھلکھلائی تھیں۔ "آپ پچھلے دو ماہ چار دن سے قرۃ العین حیدر کی آگ کا دریا ہی پڑھ رہے ہیں' جو آپ کی موٹی عقل میں نہیں آرہی۔"

بھری لائبریری میں مجھے شرمندہ کردیا گیا۔ ڈیسک سے چابیوں کا گچھا جھپٹتا میں تن فن کرتا الماری نمبر 13 کی طرف آگیا تھا۔ سارا وقت میں کتاب بند کیے لگاتار مینا حفیظ کو گھورتا رہا' گھورتا رہا' وہ ٹھٹکی' سنبھلی' ہیل کی ٹک ٹک میرے قریب آئی۔

"آپ مجھے گھور رہے ہیں؟"

شکر ہے مینا حفیظ کے پاس وہ "چھو منتر" نہیں ہے' جس سے اگلا بندہ پلک جھپکتے ہی جل کر بھسم ہوجاتا ہے۔ شکریہ پیارے اللہ جی اس حفاظت کے لیے۔

میں نے سنجیدگی سے سر اٹھایا۔ "جی نہیں میں تو آپ کی بیک وال پہ وہ آئل پینٹنگ دیکھ رہا ہوں۔ جس میں ایک جنگل دکھایا گیا ہے اور چند بن مانس اچھل کود رہے ہیں۔ جانے کس احمق نے بنائی ہے۔"

"آپ مجھے احمق کہہ رہے ہیں؟" پھر سے لیڈ پنسل کان کی اوٹ سے اچھلی۔ نیچے جا گری۔

میں ہکا بکا مینا حفیظ کو دیکھ رہا تھا۔ "اس کا مطلب وہ واٹر کلر والی تصویر بھی آپ نے بنائی ہے' جس میں ٹیڑھے میڑھے چاند اور پانچ تارے بنے ہیں؟"

وہ غصے میں لال پیلی آگے بڑھ گئی۔ "آئی ہیٹ یو۔"

مینا حفیظ کی گری ہوئی پنسل میں نے اٹھا کر اپنے کان میں اٹکائی۔ دوبارہ اسے بلا کر پنسل واپس کرنے کی خطرناک غلطی میں نہیں کرسکتا۔ اب تو وہ پکا ہرے کچھوے والا پیپر ویٹ گھما کر دے مارتی' جو اس کے ڈیسک پر پڑا نظر آتا تھا۔ میری تحقیق نے انکشاف کیا کہ جنگلی جانور' بن مانس' کچھوے اس کے خاصے پسندیدہ ہیں اور لائبریری کی آنکھیں اور کان رکھتی دیواروں کی تحقیق نے ایک اور انکشاف کردیا۔

"صدام حسین کو مینا حفیظ سے کچھ کچھ محبت ہونے لگی ہے اور کچھ کچھ سی محبت بعد میں بہت کچھ ہوجایا کرتی ہے۔" (دیواروں کی باتوں سے ماخوذ)

فروری کی بارش نے جانے کب سے گرد و غبار میں اٹی سوئیٹ پی کی بیلوں کو غسل کروادیا تھا۔ ہر چیز نکھر گئی تھی۔ وہ بیگ تھامے سیدھی چلتی جارہی تھی۔ مینا حفیظ ناک کی سیدھ میں چلتی تھی اور میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میں گاڑی قریب لایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"آیئے آپ کو ڈراپ کردوں۔" میں نے دانت نکالے اس نے دانت بھینچے تھے۔

"فری ہونے کی کوشش کررہے ہو؟" میرا دل چاہا گاڑی کی سیٹ کا فوم پھٹے اور میں اس میں دھنس جاؤں۔

"میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں' سمجھے۔" شہادت کی انگلی سے مجھے دھمکایا گیا تھا۔

مجھے جی بھر کے تاؤ آیا تھا۔ "میں بھی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں' سمجھیں۔" یہ کہہ کر میں گاڑی بھگا لایا تھا۔ وہ وہیں کھڑی حیرت سے کچھ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ گو تم بدھ کی نواسی کہیں کی۔ منہ پھاڑ کر مجھ جیسے شریف لڑکے کو کہہ دیا۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں تو کیا میں ایسا ویسا لڑکا ہوں۔ ہونہہ ہونہہ

سویٹ پی کی بیلوں پہ فروری کی بارش جم جم کر برستی رہی۔ زمین پر پانی کے بلبلے بنتے' بگڑتے رہے اور میں نے اپنی محبت کا بلبلہ اس وقت پھوڑا جب وہ ادبی ناولز کا ڈھیر اٹھائے بمشکل سانس لیتی سامنے سے گزری تھی۔

"آئی لو یو' مینا حفیظ۔"

آآآآ — علی پور کا ایلی' راجہ گدھ' اداس نسلیں' الکھ نگری ایک ایک کرکے گری تھیں میں نے بھی ایک ایک کرکے اٹھالیں۔

مینا حفیظ سکتے سے نکلی مجھ پر چلائی۔ "آر یو میڈ؟" کان میں انکی پنسل اچھلی اڑ کر گر پڑی میں اٹھانے کو جھکا اور ساری اٹھائی ہوئی کتابیں گرا بیٹھا۔ خیر دوبارہ اٹھانے کی غلطی قطعاً نہیں کی اور اسے صرف اتنا کہا۔ "یس' آئی ایم میڈ۔" یہ کہہ کر لائبریری میں رکا نہیں۔ بلکہ تیز تیز چلتا "احاطہ سکوت" میں گہرا سکوت پھیلا کے باہر آگیا۔ "میرا پیغام محبت ہے' جہاں تک پہنچے۔"

☆ ☆ ☆

"آپ پچھلے چار ماہ سے برابر مجھے پرپوز کررہے ہیں اور آپ کو غلط فہمی بھی ہے کہ آپ مجھ سے طوفانی قسم کی محبت میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ آپ کی حیثیت اور میری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے میں ہر بار کی طرح آپ کا پروپوزل ریجیکٹ کرتی ہوں۔" کافی کے بھاپ اڑاتے کپ کے کناروں پر انگلی پھیرتے اس کا جواب مجھ تک پہنچا تھا۔

میرا دل چاہا اس کا کچھوے والا پیپر ویٹ اٹھا کر اپنے سر میں دے مارو ں زخمی محبت

"میں انسانوں کے وجود کا قائل ہوں حیثیت' مرتبے میرے نزدیک ثانوی چیزیں ہیں۔" میں نے ہمیشہ کا جواب اس تک پہنچایا اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھے دیکھتی رہی' دیکھتی رہی۔

میں نے کچھ الفاظ کا اضافہ کیا ۔ "میں آپ کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔" میں نے کافی لمک کر کہا تھا۔

گو تم بدھ کی نواسی کو میرا لہکنا ذرا نہ بھایا تھا۔

"میرے لیے جان دے سکتے ہو؟" یوں لگا ارد گرد برف باری شروع ہو اور مینا حفیظ برف کے بجائے میرا سنو مین بنانے چلی ہو

"جان کے علاوہ کچھ مانگ لو نا۔" جانے ٹائی کی گرہ کیوں تنگ ہونے لگی ہے۔

"اگر جان ہی چاہیے ہو تو؟" مینا حفیظ پہلی بار مسکرائی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار یہ میرا اندازہ تھا اور یہ الگ بات ہے کہ میرے لگائے گئے سارے اندازے غلط ہی ہوتے ہیں۔

"دے دوں گا۔" اس کی جادوئی مسکراہٹ نے مجھ میں جاں بھر دی تھی' واؤ

"جان نہیں چاہیے۔" خونخوار حسینہ نے کافی کا کپ اٹھا کر لمبی سی چسکی لی تھی' اڑتی ہوئی بھاپ۔

"اس! تو پھر؟" میں نے سوالیہ نظریں اس پر ٹکادی تھیں۔ وہ سوچتی رہی۔ پھر بولی تھی۔

"میں تم سے بہار کی تعریف چاہتی ہوں۔ زندگی کے الگ الگ شعبوں سے' پیشوں سے وابستہ لوگوں سے تم بہار کی تعریف طلب کرکے لے آؤ میرے

Downloaded From http://paksociety.com

لیے۔" مینا حفیظ نے یہ شرط رکھی تھی۔ میں حیران تھا اور آج تک ہوں' وہ کتنی عجیب اور مختلف سی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو صدام حسن کو کبھی اس سے محبت ہی نہ ہوتی۔ اس نے میرے سامنے ایک سوال رکھا ہے جو ہزار جواب رکھتا ہے۔

"بہار کے لیے اٹھائے گئے سوالوں کے جواب بہار میں ہی ملا کرتے ہیں۔"

اور میں نے بہار کا سوال سب سے پہلے حالی روڈ کے مصور کے سامنے رکھا تھا۔ مصور نے برش کان کی گرفت میں اٹکایا' مجھے لگا کہیں مینا کی پنسل کی طرح مصور کا برش بھی نہ لڑھک جائے۔

مصور نے جواب دیا تھا۔ "بہار رنگوں کے عروج و زوال سے گندھی ایک پہیلی ہے جو تخلیق کے دائروں میں گھومتی پھرتی ہے۔ رنگ بہار کا اشارہ ہیں۔" میں نے یہ مصور کا قول "بہار بک" میں نوٹ کرلیا تھا۔

پھر میں نے بہار کا سوال پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھی ایک کہانی کار سے پوچھا تھا۔ وہ پہلے تو ہنستی رہی اور اپنے الجھے بالوں کا گھونسلہ دائیں بائیں گھماتی رہی۔ پھر خواب ناک آواز میں بولی تھی۔

"میں اپنی کہانی کے کرداروں کے ساتھ ہنستی روتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے اچھے ساتھی ہیں اور جب میں ان کی کہانی مکمل کرلیتی ہوں تو وہ لمحہ بہار ہوتا ہے۔" اس دن کہانی کار خاتون نے مجھے چار کپ چائے کے پلائے تھے۔ مجھے چائے کے وہ "چار" کپ آج بھی یاد ہیں۔

وائلن بجاتے عیسائی لڑکے نے بہار بک میں بہار کا جواب لکھا۔ "اور میں اس وقت راحت محسوس کرتا ہوں' جب میرے وائلن کی آواز کسی کو خوشی دیتی ہے' کیا یہ بہار سے کم ہے؟"

بہرحال میں یہ نہیں بھول سکتا کہ ابتدا میں اس نے کوئی خوف ناک ساز بجاکر مجھے ڈرایا ضرور تھا۔ ناٹی بوائے۔

تندور میں روٹیاں لگاتی رزق حلال کی شیدائی حلیمہ بی کا جواب مجھے بڑا پسند آیا تھا۔ "وے پتر' جان رکھ 'جے تیرے دل وچ ایمان دا بوٹا لگا اے' تاں' او وقت بہار دا اے۔"

بہار کے سوال نے مجھے چینی پروفیسر فوکاک کے سامنے کھڑا کیا۔ ان کے بال بہت چمک دار اور سیاہ تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذہانت سے بھرپور تھیں۔ وہ لحظہ بھر کو سوچتے رہے' پھر بولے۔

"صدام! ہر وہ ساعت بہار ہے جب تک معلم طالب کو ایمان داری سے علم سکھاتا رہے۔" یہ کہہ کر پروفیسر فوکاک نے اپنی چمک دار سیاہ بالوں والی وگ شان بے نیازی سے اتار کر گلوب پر لٹکادی۔

میں ہکا بکا دیکھتا رہا' کیونکہ میں ان سے کم و بیش تین بار ان کے بالوں کی تعریف کرچکا تھا۔ یہ شرمندگی اور میرا تو جیسے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہونہہ۔

بہار میں ہی بہاروں کے جواب لے کر میں مینا حفیظ کے پاس پہنچ گیا تھا' بہار بک سے میں بہار کے جواب اسے سنا رہا تھا۔ اور وہ ہنستی ہوئی چھوے والا اپنا نادار و نایاب پیپرویٹ گھما رہی تھی۔

سویٹ پی کی بیلوں پر بہار کی تتلیاں منڈلا رہی ہیں۔ مینا حفیظ نے مجھے دیکھا ہے۔

"تمہارے لیے بہار کیا ہے؟" مقدس خاموشیوں میں بہاریں میری مدد کو آن پہنچی ہیں۔

"مینا حفیظ کا اقرار صدام حسین کے لیے ساعت بہار ہے۔" وال کلاک کی ٹک ٹک گونج رہی ہے۔

مینا حفیظ نے آگ کا دریا مجھے تھمادی ہے۔ "تو پھر تمہیں ساعت بہار مبارک ہو۔ میں راضی ہوں۔"

میں بہار زادہ اس بہار زادی کی خطرناک حد تک ڈراوئی پینٹنگز کی تعریفیں کررہا ہوں۔

"محبت بہار کا پہلا پھول ہے۔ اس پر کبھی خزاں کا موسم نہیں ٹھہرتا۔"

"آپ سب کو بہار مبارک۔ آؤ صدا لگائیں سب مل کر بہار حاضر ہو۔"

Downloaded From http://paksociety.com

ناولٹ

مرمریں سرد رات اپنے جلو میں رنگ، ساز اور گیت لیے کسی رقاصہ کی مانند محو رقص تھی۔ رنگ و بو کا ایک سیلاب اس کے ہر توڑے کے ساتھ فضا میں پھیلتا جاتا تھا۔ اس کی مدماتی خوشبو وہاں موجود ہر شخص پر خوشی اور انبساط کے پرے لٹا رہی تھی۔

وہ شادیانی کی رات تھی۔ لاہوریوں کو ایبٹ آباد کی سردی کا لطف آگیا تھا۔ خوشبودار قہوے 'سبز چائے' مٹھائی اور ڈرائی فروٹس سے باراتیوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔

"یار! عاشر کی تو ساری سسرال ــــ حسین ہے۔ کیا مرد کیا خواتین۔" عاصم کے کہنے پر میں نے ذرا غصے سے اس سے پوچھا۔

"ہم کیا کسی سے کم ہیں۔"

"ویسے ایمان کی بات ہے ایک تو لگ رہا ہے ان کے جوڑ کا۔ عاشر تو یوں بھی اسی خاندان کا ہے۔ باقی ہم سب تو ایویں ہیں۔" وہ شدید متاثر تھا۔

"بھلا کیا ضرورت تھی ہم سب کو بارات پر لانے کی"۔ ساغر جلبلایا۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ عاشر کی گھوریوں سے بے پروا ہو کر ہم چاروں ایک میز کے گرد بیٹھے پستے بادام چر رہے تھے۔ بالآخر اس کا گروپ

عطیہ خالد

محبت بادل، بارش اور ہم

مسیج آیا۔

"بے غیرتو! میں اکیلا اسٹیج پر سوکھ رہا ہوں۔ جب تک دلہن نہیں آتی تم لوگ نہیں مر سکتے میرے ساتھ۔" میں نے مسیج پڑھ کر سنایا۔

"نہیں۔" ساغر نے صاف انکار کیا۔

"مر تو سکتے ہیں مگر جر نہیں سکتے۔" عاصم نے فوراً جواب لکھ بھیجا۔

"دیکھ لوں گا تم سب کو۔" اس نے ہمیں دیکھتے بظاہر مسکراتے ہوئے مسیج کیا۔

عاشر اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ اس کے کزنز وغیرہ سب لڑکی والوں کی طرف سے شریک تھے۔ اس لیے بارات میں انکل آنٹی ہم سب شیدائیوں کو بصد اصرار لائے تھے۔ اور ہم سب کو بے حد لطف آرہا تھا۔

ہماری خوش گپیاں جاری تھیں کہ اسی دوران دلہن

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

کے آنے کا شور مچ گیا۔ ہم عاشر کو ہاتھ ہلاتے شرافت سے آخری میز کے گرد کرسیوں پر چلے گئے۔

چھوٹی چھوٹی بچیاں ایک ترتیب سے ایک جیسے لباس میں ملبوس علاقائی گیت گاتی ہوئی آئیں۔ پیچھے خواتین کے جھرمٹ میں دلہن تھی۔ خالصتاً" زنانہ محفل تھی۔ ہم سب رخ موڑے باتوں میں مصروف رہے۔

دفعتاً" مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں پگھلی ہوئی سفید چمکتی چاندی پھیل گئی ہو۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں نے اس سے قبل کوئی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی مگر ایسی لڑکی بہرحال نہیں دیکھی تھی جس کی شبیہہ عکس بن جائے اور دل اس عکس کو تصویر بنا لینے کی خواہش کرنے لگے۔

وہ اپنا لمبا لہراتا دوپٹا دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں تھامے سٹیج سے اتر رہی تھی۔ ادھر ادھر آجا رہی تھی۔ وہ ادھر آرہی تھی۔ کبھی کسی سے جھک کر کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے اپنی پیشانی پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ میری نظریں اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔

یہ میں بھلا کب سے اتنا بے اختیار ہو گیا تھا۔ میں نے خود کو واپس محفل میں لانے کی کوشش کی۔

صد شکر کہ کھانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ورنہ ساغر اور عاصم کی نظروں سے میرا بچ پانا ناممکن تھا۔ دلہن کے بھائی ارسلان اور عمران میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہمیں بے تکلفی سے کھانے کا کہہ گئے تھے۔ وہ نہ بھی کہتے تو ہم بے تکلفی کا ریکارڈ توڑنے والوں میں سے تھے۔

مانا کہ کھانا بے حد لذیذ تھا اور ہم تھے بھی باراتی۔ لیکن عاصم اور آصف کو دیکھ کر میرا اور ساغر کا خون کھول رہا تھا۔ ان کا پہلا اور آخری مقصد حیات اس وقت کھانا تھا۔

خدا خدا کر کے کھانے کا سلسلہ ختم ہوا۔

جیسے ہی بینڈ نے رخصتی کا ساز بجانا شروع کیا ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نیچے گاڑیوں کا انتظام دیکھنے پہنچ گئے۔ اب عاشر کے دوسرے کزنز کو بھی ہمارے ساتھ جانا تھا۔

دلہن کو بڑی سی اجرک پہنائے ارسلان اور عمران سہارا دے کر لا رہے تھے۔ عاشر اور انکل کے ساتھ دیگر مرد رشتہ دار نیچے پارکنگ تک آچکے تھے۔ کچھ خواتین ابھی اوپر ہی تھیں۔ آنٹی کو لینے میں اوپر آیا تو وہ ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ آنٹی اسے پیار کر رہی تھیں۔

"اچھا بیٹا! اب اجازت دو۔ کل ملاقات ہوگی۔"

"کیا کوئی روتے ہوئے اتنا خوب صورت لگ سکتا ہے۔" بے اختیار میرا دل چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو چن لوں۔

"یہ آپا کا سوٹ کیس۔"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی سبز آنکھیں اٹھائیں۔ ایک لمحے کے لیے ان آنکھوں نے اٹھ کر میری ہستی کو زیر کر لیا۔

سب گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ پندرہ منٹ کی مسافت پر وہ دوسرا ہوٹل تھا۔ جہاں ہماری رہائش تھی۔ دلہن کو آنٹی کمرے میں لے گئیں۔ اور اس کی کزنز جو ساتھ آئی تھیں گیت گانے لگیں۔ ہم نے عاشر کو گھیر لیا۔ میرا دل اس ہنگامے اور دلچسپ محفل سے دور بھٹک رہا تھا۔ آنسوؤں سے بھری سبز آنکھوں میں۔ جیسے ہی عاشر اپنے کمرے میں گیا اور باقی تینوں اپنے اپنے بستروں پر ڈھیر ہوئے' میں چپکے سے باہر نکل آیا۔

عاشر کے سسرال والوں کے ہوٹل سارے شمالی علاقہ جات میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس شہر میں بھی ان کے کئی ہوٹل تھے۔ جس ہوٹل میں شادی ہوئی اور جس میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے' یہ بھی ان ہی کے تھے۔ دونوں شہر کے کنارے نسبتاً" اونچی پہاڑی پر واقع تھے۔

پورے چاند کی روشنی میں ایک بے حد حسین رات کھلی ہوئی تھی۔ بل کھاتی' لہراتی' پتھروں سے مزین پتلی سی سڑک پر چلتا ہوا میں نیچے سامنے خوابیدہ

Downloaded From http://paksociety.com

شہر کے حسین منظر کو تک رہا تھا۔ دور دور جلتی ہوئی روشنیاں جگنوؤں کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ شہر کے دائیں طرف موجود برف سے ڈھکی پہاڑ کی سفید چوٹیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ جیسے اس پہر اپنے سب راز افشاں کرنے پر آمادہ ہوں۔ اور بائیں طرف سڑک کے ساتھ ایستادہ پہاڑ پر چنار اور صنوبر کے چھتنار اور اونچے اونچے درخت' صناع کی صناعی پر محو حیرت تھے... ساکن اور مؤدب... دست بستہ محو راز و نیاز...

میرا پرانا رفیق' میرا دوست' چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے رازدار تھا میرا۔ میرے دل کے بھیدوں سے واقف' دھیرے دھیرے لب دبائے میرے ساتھ چلتا ہوا۔ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

"آج کسی کا خیال ساتھ لائے ہو شاید!"

"ہاں! خیال بھی اور جمال بھی..."

"کیسی لگی وہ! اس کی تلاش میں سرگرداں تھے ناں تم؟"

"تم سے بھی زیادہ شفاف' اجلی' دلکش اور دلنواز!"

"پھر مل گئی تم کو تمہاری حوا۔" چاند کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"ہاں میرے دوست۔" میں نے اعتراف کر لیا۔

"خوش رہو۔" اس نے چپکے سے دعا دی اور ایک بادل کی اوٹ میں ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"تم نے تو کہا تم مجھ سے محبت کرتے ہو' میرے بغیر جی نہیں پاؤ گے' پھر اب؟ کہاں ہو تم مجھے کیوں نکال باہر کیا اپنی زندگی سے..."

"پتا نہیں اس کا یہ دورہ کتنا لمبا چلنے والا ہے؟" نیلم نے تاسف سے وشمہ کی طرف دیکھا جو بول بول کر دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ سارہ کو دوا لانے کا اشارہ کرتی ہوئی وہ آہستہ سے اس کی طرف بڑھی۔

"ارے تمہیں تو بخار ہے وشمہ۔ سارا بدن بھٹی کی طرح جل رہا ہے۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے قریب ہو کر اس کا ہاتھ سہلایا۔ خلاف توقع اس نے اپنی آنسو بھری براؤن آنکھوں سے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے سسکی لی اور اس سے لپٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اتنے میں سارہ دوا لے کر آ پہنچی تھی۔

"یہ لو دوائی کھالو۔" نیلم نے نرمی سے اس کے ریشمی بالوں کو سنوار کر دوا اس کے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

"اب اسے سونے دینا۔ خبردار جو تم نے اماں کو اس کمرے کی طرف پھٹکنے بھی دیا۔ مجھے اپنے گھر کی مجبوری نہ ہوتی تو کبھی اسے اس حال میں چھوڑ کر نہ جاتی۔ ویسے ہی وہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ "اپنی بہن کی وجہ سے تم نے سارے گھر کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا ہے۔" میرا بس چلے تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤں۔ لیکن اس کی چیخیں..."

"آپا! آپ فکر نہ کرو۔ میں یہیں ہوں اس کے پاس۔ اور یہ دوا خشم ہے وشمہ کی۔"

نیلم نے ڈاکٹری نسخہ اپنے گلابی چرمی بیگ میں رکھا اور تاسف سے اس سونے کو دیکھنے لگی جو اب پیتل میں ڈھل چکا تھا۔ چاند کی چودھویں سا حسن' اب چاند گرہن کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ ان تینوں بہنوں میں سب سے خوب صورت' طرحدار تھی۔ ہر بات میں آگے' ہر انداز میں الگ۔ کیا یہ وہی وشمہ تھی جس کی زندگی بہار کا دوسرا نام تھی۔ جو ہر دن کو زندگی کا آخری دن سمجھ کر گزارتی تھی۔ اور اب... اب تو وہ جیسے اپنی زندگی کے آخری دن کے انتظار میں ہی تھی... صرف اس لیے کہ... اسے محبت کے نام پر دھوکا ملا۔

☆ ☆ ☆

"شائنہ! پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟" کیپٹن شارق نے پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟" شائنہ نے ذرا چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔

"ارے بھئی! آپ کو تو مجھ سے بھی زیادہ جلدی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی فارس کی شادی کی۔ تو اب تک تو آپ کو اسماء سے بات کر لینی چاہیے۔" کیپٹن شارق نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر کہا۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ فارس کی ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی شادی کر دی جائے۔ اسپیشلائیزیشن ہوتا رہے گا وقت کے ساتھ ساتھ۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" ڈاکٹر شائنہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھی اپنے بال برش کر رہی تھیں۔

"جی جناب! میرا بھی دل چاہتا ہے۔ لیکن میں اسماء سے بات کرنے سے پہلے ایک بار فارس سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے اس کا کہیں اور خیال ہو۔"

"پوچھ کے دیکھ لیجیے۔ مناسب بھی یہی ہے۔" کیپٹن صاحب نے دوبارہ کتاب پر نظریں جمالیں۔

"فارس جب سے ایبٹ آباد سے واپس آیا ہے کچھ خاموش ہے۔ مجھے تو قدرے الجھا ہوا بھی لگا؟"

وہ پرسوچ انداز میں بولیں۔ بیوی کی بات سن کر کیپٹن صاحب کچھ دیر کو خاموش ہو گئے۔ وہ خود کو بھی محسوس کر رہے تھے کہ وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور چپ چپ سا تھا۔

"اگر تم نے بھی اس بات کو محسوس کیا ہے تو فارس سے بات کر لو۔ ہو سکتا ہے دوستوں میں کوئی بات ہو گئی ہو۔"

"کل میرا آف ہے۔ میں اس سے بات کروں گی۔" انہوں نے برش رکھ کر چوٹی گوندھنی شروع کر دی۔ انہیں بال باندھ کر سونے کی عادت تھی۔

صبح ناشتہ کے بعد کیپٹن صاحب آفس کے لیے اٹھ گئے۔ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے دوست کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لی تھی۔ فارس تسلی سے چائے پی رہا تھا۔ شائنہ بھی چھٹی کی وجہ سے تسلی سے بیٹھی فارس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں۔

"فارس! آپ کو کب نکلنا ہے اسپتال کے لیے؟" انہوں نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"ایک گھنٹہ ہے میرے پاس، آپ نے جانا ہے کہیں؟"

"جانا تو کہیں نہیں۔ بس تم سے بات کرنی ہے۔" وہ مسکرائیں اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

"خیریت؟ کیا بات ہے ماما؟" فارس اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"فارس بیٹا! میں تمہاری خالہ اسماء سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔"

"کیسی بات ماما؟" فارس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہماری بہو کو اب ہمارے گھر آجانا چاہیے ناں بیٹا جی۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"اوہ! اچھا! ابھی اس ذکر کو جانے دیں۔ ابھی اس ذکر کا وقت نہیں۔ ابھی تو میری پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔"

"کیوں بھئی! دو ماہ بعد تمہارا ہاؤس جاب ہو جائے گا۔ اب تو وقت آگیا ہے میری جان، میں تو کب سے اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔"

"ماما! میرا ابھی موڈ نہیں ہے۔ میں اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"موڈ بناؤ گے تو بنے گا ناں۔ تمہارے پاپا بھی یہی چاہتے ہیں۔"

"کیوں کیپٹن صاحب سے میری آزادی برداشت نہیں ہو رہی۔ حسد کرنے لگے ہیں مجھ سے؟" وہ شرارت سے بولا۔

"کیا؟" شائنہ مصنوعی غصے سے بولیں۔ "بتاؤں گی تمہارے پاپا کو کہ کیا خیالات ہیں صاحبزادے کے ان کے متعلق۔"

"ضرور... ضرور..."

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کسی اور کو پسند کرنے لگے ہو۔ ایبٹ آباد میں کوئی پری وری تو نہیں نظر آگئی۔"

"اگر ایسا ہے بھی تو سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ شرارت کے موڈ میں تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن جلدی۔ ہمیں اپنے گھر میں رونق چاہیے۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"اچھا ماما! آج تو مجھے ایک ضروری کام سے ایبٹ آباد جانا ہے۔ واپسی پر بات کریں گے۔" وہ بولا۔

"ارے پھر ایبٹ آباد؟ ابھی چند روز قبل تو تم وہاں سے واپس آئے ہو۔ اب پھر؟"

"ماما' اس وقت تو میں عاشر کی شادی پر گیا تھا۔ اب ایک بالکل دوسری نوعیت کا کام ہے۔"

"کس وقت جانا ہے؟"

"ابھی تو ہسپتال جاؤں گا۔ پھر تقریباً" گیارہ بجے واپس آؤں گا۔ آپ میرا بیگ ریڈی کروا دیجیے گا۔ وہاں کافی سردی ہے۔ میرا لانگ کوٹ بھی رکھوا دیجیے گا۔"

وہ شائنہ کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے خدا حافظ کہہ کر وہ وہیں بیٹھ کر سوچ رہی تھیں کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسماء کا فون تھا۔

☆ ☆ ☆

شادی کے اگلے دن آغا فاران صاحب نے ہم سب کو ڈنر کے لیے بلایا تھا۔ ان کے قدیم طرز کے وسیع اور شان دار ڈرائنگ روم میں ہم سب بیٹھے تھے۔ نیلے اور سرمئی رنگ کے امتزاج سے سجا ڈرائنگ روم بے حد آرٹسٹک تھا۔ بارہ سنگے کا حنوط شدہ سر تو بے حد نایاب تھا۔

ہم سب جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ دائیں طرف موجود فوٹو فریمز دیکھ کر ساغر بولا۔

"فارس! مجھے تو لگتا ہے تو اسی خاندان کا ہے۔"

عاصم بھی بولا۔ "واقعی فارس تو بالکل آغا صاحب جیسا ہے۔"

"کیا فضول بات کر رہے ہو تم لوگ۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ عاصم کی عادت تھی اتنی سنجیدگی سے کسی دوسرے پر اپنا خیال تھوپتا کہ اگلے کو مانتے ہی بنتی۔

"ارے یار! ان لوگوں کا کوئی بھائی بچپن میں اغوا تو نہیں ہوا" عاصم کہاں باز آنے والا تھا۔

عاصم کی لن ترانی ابھی اور آگے تک جاتی لیکن ملازم نے کھانا لگنے کی اطلاع دے دی۔ اس کے پیچھے ارسلان اور عمران بھی ہمیں بلانے چلے آئے۔ ارسلان کی بھی اپنے والد سے کافی مماثلت تھی۔ جبکہ عمران قدرے مختلف تھا۔ لیکن دونوں میرے ساتھ چلتے ہوئے میرے بھائی لگ رہے تھے۔ میں نے اس بات کو محسوس کیا۔ آغا فاران احمد ڈرائنگ ہال کے منقش دروازے پر کھڑے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ عاشر کے ابو بھی وہیں موجود تھے۔ عاشر' ساغر اور عاصم وغیرہ کو انہوں نے ہاتھ ملا کر کندھے تھپتھپا کر خوش آمدید کہا اور مجھے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک دم اپنے سینے سے لگا لیا ان کے انداز میں بہت گرم جوشی تھی۔ میرا پورا وجود جیسے کپکپا گیا۔ ان کی گرمجوشی کے مقابل پر میں نے خود کو بالکل سرد محسوس کیا۔

یہ ایک مغربی طرز کا ڈائننگ ہال تھا۔ قدیم طرز تعمیر سے مزین عمارت میں ایسا ڈائننگ ہال اچھوتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میز انواع و اقسام کی نعمتوں سے پر تھی۔ مجھے آغا جان نے اپنے دائیں طرف بٹھا لیا تھا اور اصرار کر کر کے میری پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈلواتے رہے۔ مگر میری بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی۔ ان کے سوالات کا غیر حاضر دماغی سے جواب دیتا رہا۔ شاید انہوں نے میری لاتعلقی محسوس کر لی تھی۔ اس لیے وہ بھی خاموش ہو گئے۔ جبکہ باقی سب عمران اور ارسلان کے ساتھ چٹکلے چھوڑتے رہے۔

"یار! لگتا ہے ان کو بھی تجھ میں اپنا بچھڑا ہوا بیٹا نظر آرہا تھا۔"

ڈنر کے بعد باہر نکلتے ہی عاصم بولا۔ عاشر تو ثانیہ بھابی اور انکل' آنٹی وغیرہ کو گاڑی میں لے کر ہوٹل چلا گیا تھا۔ ہم لوگ ٹہلنے کے ارادے سے پیدل نکل آئے تھے۔ لیکن مجھے اپنا یوں بار بار زیر بحث لایا جانا بہت ناگوار گزرا۔

"شٹ اپ عاصم! کیا فضول مذاق ہے یہ۔"

میں خلاف مزاج درشتی سے بولا تو ساغر نے بات بدل دی اور بولا۔

"یار! میں نے ایک پان کی دکان تلاش کی ہے۔

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From http://paksociety.com

انتہائی زبردست پان ملتے ہیں وہاں۔ لاہور میں کبھی ایسا لذیذ اور خوشبودار پان نہیں کھایا۔"

یوں ہم سب اس کے بتائے راستے پر پان کھانے کے لیے چل پڑے۔

☆ ☆ ☆

"وشمہ! تم نے سمیر کرمانی سے بات کی؟" اماں نے بھنویں اچکا کر اس سے پوچھا۔

"کہا تو تھا آپ سے۔۔۔ کرلوں گی۔۔۔"

"وہ روز تمہیں پک کرنے آجاتا ہے، تم اس سے سیدھے سیدھے بات کیوں نہیں کرتیں؟ ڈرتی ہو اس سے۔" اماں کے تیور بگڑنے لگے۔

"اماں! آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔۔۔"

"یہاں وفا کرتا کون ہے۔۔۔ مرد تو بالکل نہیں۔۔۔"

اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں وشمہ! تم اس سے بات کر کے تو دیکھو۔"

"موقع محل دیکھ کر ہی بات کروں گی ناں۔۔۔ ایسے کیسے سیدھا سیدھا کہہ دوں کہ کوئی کوٹھی بنگلہ میرے نام لگادیں۔" وہ چڑ گئی۔

"موقع محل دیکھا نہیں جاتا، پیدا کیا جاتا ہے۔" اماں بھی چڑ گئیں۔ "ابھی تمہارے قبضے میں ہے طوطے کی جان۔"

"ویسے آپا! کیا کیا کہتا ہے طوطا؟" سارہ نے وشمہ کی طرف جھک کر پوچھا۔

"وہی جو تم کہتی ہو کہ مجھ میں اس کی جان بند ہے۔" وہ جو چڑی بیٹھی تھی، کھل اٹھی۔ اتنے میں اس کا موبائل گنگنایا۔

"ارے وہ بس مجھے پک کرنے آنے ہی والے ہیں۔ میں جلدی سے تیار ہو جاؤں۔"

کچھ دیر بعد نیلے رنگ کی ساری کا بارڈر سنبھالتی، دوسرے ہاتھ سے سلکی براؤن بالوں کو سنوارتی وشمہ، سمیر کرمانی کے دل پر بجلیاں گراتی اس کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھی بھورن پی سی کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

آج اس کا ارادہ تھا کہ بات کرنے کے لیے ماحول بنالے ورنہ اماں نے اس کے کان کھا جانے تھے۔

وہ سمیر کرمانی سے مری میں ملی تھی۔ وہیں بقول سمیر کرمانی 'اسے وشمہ کو دیکھتے ہی محبت ہو گئی تھی۔ وشمہ کو بھی سمیر کرمانی سے محبت ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ اماں نے ساری زندگی ایک خوش باش، آزاد خیال زندگی گزاری تھی۔ انہوں نے زمانے اور زمانے کی چال کی کم ہی پروا کی تھی۔ ابا اماں سے عمر میں کافی بڑے تھے، لیکن چونکہ جائیداد والے تھے اس لیے اماں نے ان سے شادی کرلی تھی۔ وہ تینوں بہنیں ابھی چھوٹی ہی تھیں جب ابا فوت ہو گئے۔ اماں کو شادی کے بعد بھی آزادی پیاری رہی اور بیوگی کے بعد بھی۔ ان کے جوان ہونے پر ان کے لیے بہت سے رشتے آئے لیکن اماں تو کوئی صاحب جائیداد ہی اپنی بیٹیوں کے لیے چاہتی تھا۔ نہ انہیں شکل و صورت سے مطلب تھا، نہ پڑھائی لکھائی سے۔ خود اپنی جائیداد انہوں نے بیچ بیچ کر کھائی تھی۔ اب بس مشکل سے ہی ان کا گزارا ہو رہا تھا۔ بیٹیاں جوان ہو گئی تھیں تو آس تھی کہ داماد دولت مند ہوں گے۔ ان کی زندگی کو پر آسائش بنادیں گے۔

سمیر کرمانی کی بے تحاشا دولت نے اماں کو وشمہ سے پہلے ان کا گرویدہ کردیا تھا۔ اور انہوں نے وشمہ کو مجبور کرنا شروع کردیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے کچھ اپنا نام لگوالے۔

"صرف ایک کوٹھی؟ بخارہ تھا یہ دل تم سے ملنے سے پہلے۔ مگر مگر، قریہ قریہ بھٹکنے والی بنجارے کو تم نے اپنا اسیر کرلیا ہے۔ آمادہ کرلیا ہے ایک جگہ ٹھہر جانے پر، ایک گھر بنانے پر۔ تمہاری تو ہر تمنا پوری کرنا میرا فرض ہے۔ تم پر تو کرمانی اپنا پورا بزنس امپائر قربان کر سکتا ہے۔ تم حکم کر کے تو دیکھو!" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ وشمہ نے ایک دلبرانہ قہقہہ لگایا۔

"اماں بس یہ چاہتی ہیں کہ میرا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ ابا بھی نہیں ہیں اور ہمارا کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔ اس لیے بس۔۔۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔ مائیں ایسے ہی فکر مند

Downloaded From http://paksociety.com

ہوتی ہیں۔" سمیر کرمانی' نے محبت بھرے الفاظ کا جال وشمہ کے اطراف بچھا ڈالا تھا۔ جس میں وہ اپنی مرضی سے جانتے بوجھتے ہوئے پھنسنے کے لیے تیار تھی۔

"سب کام تھرو پراپر چینل ہوں گے۔ ہم نکاح کریں گے اور نکاح کے بعد میں تمہیں مری میں موجود اپنے کوٹھی میں رکھوں گا۔ تمہیں میری مجبوری کا خیال رکھنا ہوگا۔ بس جب تک حالات سازگار نہ ہوں میں تمہیں اپنی فیملی سے نہیں ملواسکوں گا۔"

"لیکن ملواتو دیں گے نا؟"

"تمہیں نہیں ملواؤں گا تو اور کسے ملواؤں گا؟ بیوی بننے جارہی ہو تم میری۔ عزت ہو میری۔ اگر ہمارے یہاں خاندان میں ہی شادی کا رواج نہ ہوتا تو میں ایسے چھپ کر نکاح بھی نہ کرتا۔ تمہیں شان سے بیاہ کر لے کر جاتا۔"

"نکاح کے بعد گھر والے مان جائیں گے؟"

"کیوں نہیں مانیں گے.... نکاح کے بعد ان کا زور کہاں چلے گا مجھ پر؟" طائر جب خود ہی ایسا معصوم ہو تو بھلا صیاد کو کسی احتیاطی تدبیر کی کیا ضرورت تھی۔ بڑے مگن انداز میں اس نے گاڑی کوپی سی کی داخلی دروازے پر روکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز ہم سب لاہور آگئے تھے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اپنا کوئی حصہ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ یہی بے چینی مجھے پھر ایبٹ آباد لے آئی تھی۔ اور اب بے چینی جھنجلاہٹ میں بدل رہی تھی۔

"بس صبح واپس....."

ہوٹل پہنچنے تک میں فیصلہ کرچکا تھا۔ مزید ارافغانی پلاؤ اور گرلڈ چکن کا ڈنر کرتے ہوئے میں نے اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوگیا۔ نیند بھی کافی بستر آئی۔ صبح میں اپنی پراڈو میں ہنڈ کیری رکھ کر پلٹا ہی تھا کہ دوسری طرف گاڑی سے نکلتے ہوئے ارسلان سے بری طرح ٹکرا گیا۔

"اوہ معاف کرنا' ارے بھائی فارس! آپ یہاں؟ آپ کب آئے؟ گھر کیوں نہیں آئے؟"

اس نے ایک ساتھ ہی اتنے سارے سوال پوچھ لیے۔

"بس یار! ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ جلدی واپس جانا تھا اس لیے گھر نہ آسکا۔" میں نے جان چھڑانے کا سا انداز اپنایا۔

"چلیں بابا جان سے ملواؤں۔ وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔" وہ خلوص بھری سادگی سے بولا۔

"یار! مجھے آج بہت جلدی ہے۔ میں اس وقت گھر نہیں جاسکتا۔"

"گھر جانے کا کون کہہ رہا ہے۔ بابا جان کا آفس یہیں ہے۔ ہمارے اس ہوٹل میں شیئرز ہیں۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً" کھینچتا ہوا بولا۔

چند لمحوں بعد ہم گراؤنڈ فلور پر موجود ایک خوب صورت آفس میں موجود تھے۔

"دیکھیے بابا جان! فارس بھائی یہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔"

اور آغا فاران صاحب نے جیسے ارسلان کی بات سنی ہی نہیں' وہ میز کے پیچھے اپنی کرسی دھکیل کر تیزی سے آگے آئے۔

"السلام علیکم۔ خوش آمدید۔ مرحبا۔"

ان کی آنکھوں کی چمک اور معانقہ کا انداز ان کی خوشی کے اظہار کے لیے کافی تھا۔ گلے لگانے کے بعد انہوں نے مجھے خود سے علیحدہ کرکے کندھوں سے تھاما۔ جیسے بھرپور انداز میں کوئی باپ اپنے دیرینہ بچھڑے ہوئے بیٹے کو دیکھتا ہو اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ میری پیشانی دمک اٹھی تھی۔

وہ مجھے ساتھ لیے لیے آفس میں موجود صوفوں کی طرف بڑھ گئے۔ اور مجھے بٹھا کر بولے۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

ارسلان جو شاید اب تک کی کاروائی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا بولا "دیکھا فارس بھائی! میں نہ کہتا تھا' بابا جان آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"ارسلان! شاندار سی چائے منگواؤ اور خیرو سے کہنا اخروٹ کا حلوہ بھی لے کر آئے۔"

ارسلان انٹر کام پر پیغام دینے لگا۔

"اور ہاں صہبا کو بھی کال کردو۔"

میں جو ان سے اجازت طلب کرنے کا ارادہ کر رہا تھا صہبا کا نام سن کر بیٹھ گیا۔ ارسلان نے کسی چیک پر سائن لینے تھے مگر آغا جان نے اس کو انکار کر دیا۔

"ہوتے رہیں گے کام۔ دیکھ نہیں رہے آج ہمارا بیٹا آیا ہے۔"

میں ان کا بیٹا کہاں سے ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچا۔

"السلام علیکم" کی آواز کے ساتھ ہی جیسے کمرے میں روشنی ہو گئی ہو۔ میں بے اختیار پذیرائی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"آؤ! آؤ صہبا بیٹا! یہ ہیں ڈاکٹر فارس احمد۔ ثانیہ کی شادی پر دیکھا ہو گا تم نے انہیں۔"

صہبا نے اپنی ساری چاندنی لیے' میرے اندھیرے کو روشن کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ وقت اسی ایک لمحے میں ٹھہر گیا۔

"اور فارس بیٹا! یہ میری لاڈلی صہبا حسن۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کیا ہے اور اب ہمارے ہوٹل مینج کر رہی ہے۔" تعارف کے ساتھ وہ کمال اعتماد کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتی خود بھی بیٹھ گئی۔

"صہبا کو بھی بہت شوق تھا میڈیکل میں جانے کا۔" آغا جان بولے۔

"اچھا! تو پھر کیا وجہ ہوئی نہ جانے کی؟" میں نے قدرے بے ربط سا جملہ بولا اور نظر اٹھا کر اس ماہ رو کو دیکھا۔

"انجکشن لگانے سے ڈر لگتا ہے۔"

آغا جان بڑی سنجیدگی سے بولے اور پھر وہ اور ارسلان قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ وہ بھی دھیرے سے ہنسی۔ موتیوں کی طرح قطار میں سجے دانت عنابی ہونٹوں کے درمیان قدرے نمایاں ہو گئے۔ کیا کوئی اس دلکشی سے ہنس سکتا ہے۔ اس کا گلاب سا کھلا چہرہ' ماحول کو معطر کرنے لگا۔

"کیا اسے اپنے حسن بے پناہ کی کوئی خبر ہے؟"

"میں چائے بناتی ہوں" میں اس کی سفید متحرک انگلیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں سے میرے دل کے تار ربط میں تھے۔ وہ اپنی مرضی سے انہیں چھیڑ رہی تھی۔ میں اس محبت آمیز گنگناہٹ کو سن رہا تھا۔

"محبت نے ہمارے درمیان بندباندھ دیا تھا۔"

"ہم محبت کے جادوئی دیس کی طرف عازم سفر تھے۔"

چائے پیتے' باتیں کرتے کافی دیر گزر گئی جب انٹر کام نے اس کو متوجہ کر لیا۔ اسٹاف کے ساتھ ان لوگوں کی ضروری میٹنگ تھی۔ میں اجازت لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"صہبا! تم فارس کو گھر لے جاؤ۔ ہم سب فارغ ہو کر آتے ہیں۔"

"بس مجھے اب اجازت دیجیے۔ مجھے آج ہی واپس پہنچنا ہے۔" میری بات کو تو جیسے انہوں نے ان سنا کر دیا۔

"اچھا فارس بیٹا! آپ صہبا کے ساتھ گھر جائیں۔ بی بی سے ملیں۔"

اور وہ ارسلان کے ساتھ باہر نکل گئے اور میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ صہبا میری کیفیت سے محظوظ ہو کر مسکرا رہی تھی۔

"چلیے فارس صاحب!" اس نے میز پر سے اپنی چیزیں اٹھائیں۔ "آپ اپنی گاڑی کی چابی دے دیں۔ ڈرائیور گاڑی لے آئے گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔"

ایسا ہے تو ایسے ہی سہی۔ میں نے چابی ڈرائیور کے حوالے کی اور اپنے ازلی اعتماد سے مسکرا کر صہبا کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

موسم رنگ بدل رہا تھا — بکھری ہوئی دھوپ کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سفید روئی کے گالے آسمان کو چھوڑ کر دھرتی پر گھر بنانے لگے تھے۔ شور مچاتی' چنگھاڑتی ہوا شرارتی لڑکوں کے ٹولے

Downloaded From http://paksociety.com

کی مانند سیٹیاں بجاتی گاڑی کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے صہبا پر نظر ڈالی تو وہ قدرے گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"آپ پریشان ہیں؟"

"ہم تو اس موسم کے عادی ہیں۔ میں آپ کی وجہ سے پریشان تھی۔ آپ کے لیے یہ موسم اجنبی ہے۔"

"مجھے تو زرہ بھر بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی میں نے اپنے دل کی بات کی۔ "مجھے تو یہ موسم بہت اچھا لگ رہا ہے۔" میں نے گھر کی طرف جانے والا پہلا ہی موڑ درست کاٹا تو وہ حیرانی سے بولی۔

"آپ کو ہمارے گھر کا راستہ یاد ہے؟"

میں نے بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ دبالی۔ اسے کیا کہتا اب کہ یہ موڑ' یہ راستہ تو ایسا تھا کہ میں آنکھیں بند کر کے بھی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ اس منزل کی تمنا ہی تو مجھے یہاں دوبارہ لے آئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں نے گاڑی سرائے مان کے ڈرائیوے پر لا روکی تھی۔ گھر میں بی بی جان نے میرا پرتپاک استقبال کیا۔ میں ان کے لیے قطعاً" اجنبی نہیں تھا۔ میں ان کی اپنائیت پر حیران ان کے پاس بیٹھا رہا۔

دوپہر کھانے کے بعد صہبا کو قہوہ لانے کے لیے کہہ کر آغا صاحب مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ برف باری رک چکی تھی۔ میرا ارادہ اب واپسی کا تھا۔ صبح مجھے ہر صورت ہسپتال پہنچنا تھا۔ اس لیے میں ڈرائیور سے چابی لے آیا تھا۔ ابھی میں ان سے بات کرنے کے لیے موزوں الفاظ سوچ رہا تھا کہ میری نظر سامنے موجود اپنی قد آدم تصویر پر پڑی۔ میں اتنا حیران ہوا کہ مجسمہ بن گیا۔

"یہ تو میری تصویر ہے؟" میں نے خود سے کہا اور بے اختیار اٹھ کر تصویر کے قریب چلا گیا۔

"یہ تصویر میرے چھوٹے بھائی کی ہے۔" آغا صاحب میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "اسی لیے تو میں تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔"

بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"جی!" میں حیرت سے گنگ ہو گیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ دور ہو جاؤں اس تصویر سے۔ اتنی مشابہت... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

تیزی سے میں ڈرائیوے پر آیا۔ اور اپنی پراڈو کی طرف بھاگتے ہوئے میں نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے کے لیے کہا۔ شکر ہے کہ فاطمہ اور نسرین کچن میں موجود تھیں۔ شاور کے بعد میں بھی کچن میں چلا آیا۔

"اماں! کیا پکا ہے آج؟"

"مٹر قیمہ بنایا ہے۔ آلو گوبھی بھی ہے۔ آپ بیٹھو بیٹا! میں ابھی روٹی بنا کر لا رہی ہوں۔"

"اماں! روٹی نسرین پکا دے گی۔ آپ میرے پاس آئیے اور مجھ سے باتیں کریں۔"

میں ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو کھانے کی میز پر لے آیا۔

"اماں مجھے میرے بچپن کی باتیں بتائیں۔ میں کیسا بچہ تھا۔"

اماں کئی بار کی بتائی ہوئی شرارتیں اور باتیں دہرانے لگیں۔ اماں کو ماما نے میری پیدائش پر خاص طور پر مجھے سنبھالنے کے لیے رکھا تھا۔ اب تو انہیں گھر کے ایک باقاعدہ فرد کی حیثیت حاصل تھی۔

"اماں! دیکھیے کیسی عجیب بات ہے کہ نہ میں بابا سے ملتا ہوں نہ ہی ماما سے۔ بلکہ میری شکل کسی بھی رشتہ دار سے نہیں ملتی۔"

"ارے بیٹا! یہ کیا خیال آگیا تم کو آج؟" وہ قدرے گھبرا کر بولیں۔ "نسرین نے تمہارے لیے چائے رکھی یا نہیں میں دیکھ آؤں۔"

ان کا گھبرانا مجھ سے چھپا نہیں تھا۔ جب چائے لے کر بھی وہ خود نہیں آئیں بلکہ نسرین سے بھجوا دی تو میں مزید الجھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگر کوئی حسن و انبساط کو مجسم دیکھنا چاہتا تھا تو آج وشمہ کو دیکھتا۔ جس کے چہرے پر خوشی اور طمانیت

Downloaded From http://paksociety.com

دھنک رنگ اوڑھے براجمان تھی۔ سفید جوڑے پر سرخ کامدار دوپٹہ اوڑھے' بھاری زیورات پہنے اس کی تو چھب ہی نرالی تھی۔ پیشانی پر آویزاں سرخ یاقوت نے تو جیسے سارے چہرے کو متعکس کر رکھا تھا اپنی شعاعوں سے۔ کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک چہرہ اندرونی خوشی اور سرشاری کے احساس سے ایسے سجا ہوا تھا کہ سینکڑوں مشاطاؤں کی فنکاری اس روپ پر قربان تھی۔

نکاح کے بعد وہ' سمیر کرمانی کے ساتھ اس کے مری والی کوٹھی میں موجود تھی۔ سارہ اور نیلم بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اماں کا بھی خوشی سے چہرہ دمک رہا تھا۔ سمیر کرمانی نے کوٹھی اس کے نام کردی تھی اور یہ کوٹھی اتنی قیمت کی تو ضرور تھی کہ اماں یوں شاداں تھیں۔

باہر لان میں نکاح میں شامل ہونے والے دوستوں کی تواضع کی جارہی تھی۔ فضا میں اشتہا انگیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ نیلم نے وشمہ کی پلیٹ تیار کرتے ہوئے کہا۔

"سارہ! تم تو اٹھ کر خود لے لو۔ دیکھو سب ہی کچھ بہت لذیذ لگ رہا ہے مجھے تو۔۔۔"

"ہاں! لگے گا ہی تم کو۔۔۔ ایک ہم ہیں ذرا غور سے دیکھ بھی لیں ان مرغن اشیاء کو تو دو چار پونڈ وزن ابھی بڑھ جائے۔"

وشمہ دل کھول کر ہنسی۔ "آج کوئی پابندی نہیں۔ آج دل بھر کے کھاؤ۔۔۔ ایسے دن بار بار نہیں آتے۔"

"ہماری زندگی میں بھی یہ دن آجائے گا۔" نیلم نے شرارت سے کہا۔

وشمہ نے قہقہہ لگایا۔ "بہت انتظار ہے۔۔۔"

"ابھی تو انتظار ہی کیا جاسکتا ہے۔۔۔" نیلم نے آنکھ ماری۔

"آپ آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو آپا۔۔۔" سارہ نے' اپنی آنکھ کا کاجل انگلی کی پور سے' وشمہ کی کان کی لو پر لگایا۔

☆ ☆ ☆

شدید سردی میں میرا وجود پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ دل و دماغ کی کیفیت متضاد۔ دل کہتا تھا کہ سب چھوڑو۔ بھول جاؤ۔ ان خرافات میں مت پڑو۔ مگر دماغ کہتا تھا کہ "نہیں' کوئی بات ضرور ہے۔"

دروازے کے لاک کو ایک بار پھر دیکھ کر میں بیڈ پر آبیٹھا۔ اور سیاہ رنگ کا وہ چھوٹا سا بریف کیس کھولا۔ ماما ہمیشہ اس کا کوڈ بھول جاتی تھیں۔ بالآخر پاپا نے کوڈ سسٹم ہی ختم کردیا تھا۔ بریف کیس کے کھلنے کے کھٹکے سے جیسے دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

ماما پاپا کی اسناد' ان کا نکاح نامہ میں ایک ایک کرکے چیزیں ایک سائیڈ پر رکھتا جارہا تھا۔ سب سے نیچے ایک براؤن رنگ کا بوسیدہ سا لفافہ تھا۔ اس میں ایک نکاح نامہ تھا۔ "آغا سلمان احمد ولد آغا علی رضا احمد" اور لڑکی کے خانے میں "رانی ولد گلزار احمد"۔ لرزتے کانپتے ہاتھوں سے بریف کیس بند کیا اور اس کو بیڈ کے نیچے کھسکا دیا۔

جنوری کا پہلا ہفتہ چل رہا تھا مگر مجھے تو جیسے آگ لگ رہی تھی۔ میں نے پنکھا تیز کرکے چلا دیا۔ پھر بھی سکون نہ ملا تو چھت پر چلا آیا۔ صرف ٹراؤزر اور بنی شرٹ میں۔

یہ کیا وقت آگیا تھا۔ اپنی پہچان مشتبہ ہوچکی تھی۔ آخر آغا سلمان احمد کا نکاح نامہ ہمارے گھر کیا کر رہا ہے؟ اور یہ رانی کون ہے؟ کیا میں ان کا بیٹا تھا؟ کیا ماما' پاپا نے مجھے گود لیا تھا؟ آغا فاران صاحب کا وہ آخری سوال "کیا تم اپنے والدین کے حقیقی بیٹے ہو؟" رہ رہ کر میرے دماغ میں یہ سب سوال گونج رہے تھے۔ یہ سوالات نہیں تھے۔ یہ ایسے حشرات الارض تھے جو اپنی ٹانگیں پھیلائے اپنی بے شمار آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے میرے دماغ میں گھسے چلے آرہے تھے۔ میں ان کو جھٹکتا' دیوانوں کی طرح بھاگا سیڑھیوں کی طرف۔ نجانے کیسے پیر الجھا اور میں لڑھکتا چلا گیا۔۔۔ ایسا لگا جیسے درد کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگا دیا ہے اندھیرے نے ۔۔۔ مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

ان کا نکاح ہو چکا تھا' اور سمیر کرمانی اسے حاصل تھا' لیکن کچھ تھا جو اسے کھٹکتا تھا۔ وہ کئی بار سمیر کرمانی سے کہہ چکی تھی کہ اب وہ اسے اپنے گھر لے جائے۔ لیکن وہ ہر بار ٹال جاتا تھا۔

"ہماری شادی کو ایک سال ہونے والا ہے' آپ مجھے کب اپنے گھر لے کر جائیں گے؟"

"کئی بار بتا چکا ہوں کہ کوشش کر تو رہا ہوں۔۔۔ تم روز روز مجھے کیوں پریشان کرتی ہو۔"

"آپ کو میری پریشانی نظر نہیں آتی۔؟"

"آتی ہے۔۔۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ پریشان ہونا چھوڑ دو۔۔۔ خوش رہا کرو۔"

"کیسے رہوں خوش۔۔۔ سسرال والے مان نہیں رہے' آپ باپ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔"

"پھر وہی فضول باتیں' کون بھرتا ہے تمہارے دماغ میں یہ سب۔۔۔؟"

"کون بھرے گا؟ آخر کب تک میں یوں زندگی گزاروں گی۔ مجھے بچہ چاہیے۔

آپ وعدہ کریں جلد سے جلد بات کریں گے۔"

"اچھا بابا! کروں گا۔۔۔ چلو تیار ہو جاؤ۔۔۔ ڈنر کے لیے چلتے ہیں۔"

ان کی زندگی بس لنچ' ڈنر' آؤٹنگ کے دائرے میں چکراتی رہتی تھی۔ جیسے وہ کوئی چیز تھی جسے کرمانی استعمال کر رہا تھا۔ کوئی شوپیس' جسے سجاوٹ کی طرح زندگی میں سجایا ہوا تھا بس۔ وہ اپنے شہر جاتا تو کئی کئی ہفتوں بعد آتا۔ اس دوران وہ اسے فون بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ وہ لاہور میں رہتا کہاں ہے۔ بس وہ گلبرگ کا نام جانتی تھی۔ اس نے محبت کی تو شادی کے معاملے میں چھان بین کرنا جرم سمجھا۔ وہ سمیر کرمانی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی کر لیتی تو کیا کرتی۔

اماں سے جب بھی بات کرتی تو اماں کہتیں۔

"نہیں مان رہے گھر والے تو چھوڑو' وہ تو تمہارے ساتھ ٹھیک ہے نا؟ پیسے دیتا ہے' گھر تمہارے نام ہے۔ کل کو چھوڑ بھی گیا تو گھر بیچ دینا۔"

"اماں! میں محبت کرتی ہوں اس سے۔۔۔"

"محبت وقتی جذبہ ہوتا ہے بس۔۔۔" اماں سنگ دلی سے کہہ دیتیں۔

وہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ سمیر سے نکاح کے بعد تو وہ بالکل ہی بے بس ہو چکی تھی۔ وہ سمیر کو زیادہ کریدنے سے بھی ڈرتی تھی' اگر کچھ غلط نکل آیا تو؟ تو جو امید ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔

☆ ☆ ☆

آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو کئی من وزن تھا آنکھوں پر' سر پر' جسم جیسے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ میں پکارنا چاہتا تھا مگر کوئی آواز نہیں نکلتی تھی۔ کیا میں زندہ تھا؟

"ڈاکٹر صاحب! فارس ہوش میں آرہا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب' میرا بیٹا رو رہا ہے۔" یہ آواز ماما کی تھی۔

"فارس' فارس! میرے بچے میرے چاند۔" مجھے ان کے ہونٹوں کا لمس اپنی پیشانی پر اپنے ہاتھوں پر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ مگر کمرے میں اندھیرا سا تھا۔

"ڈاکٹر شائنہ! حوصلہ رکھیں۔ مجھے ذرا فارس کو چیک کرنے دیں۔"

"ہیلو فارس! کیسے ہیں آپ؟" ڈاکٹر صاحب بولے۔

بڑی کوشش کے باوجود کوئی آواز نہ نکلی۔ لیکن آنکھیں کھول لی تھیں میں نے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے بازو ہلائے۔ میرا چہرہ تھپتھپایا۔

"نئی زندگی مبارک ہو فارس!"

وہ بولے۔ پاپا بھی آگئے تھے۔ یہ ان کو کیا ہو گیا تھا۔ ایک دم سے سارے بال سفید۔۔۔ اور ماما بھی بوڑھی اور کمزور لگ رہی تھیں۔ دونوں بے تابانہ مجھے پیار کر رہے تھے۔ میں اپنے ہاتھوں کو کسی قدر ہلا سکتا تھا۔ مگر

Downloaded From http://paksociety.com

باقی کا جسم جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے کھولیں ماما۔ مجھے باندھا کیوں ہے؟" میں نے کہنا چاہا مگر بے ربط سی آوازیں نکلیں۔

اس روز جو میں سیڑھیوں سے گرا تو آٹھ جنوری سن دو ہزار تیرہ تھا اور آج پانچ اکتوبر سن دو ہزار سولہ۔ مجھے تین سال دس ماہ بعد ہوش آیا تھا۔ ایک ماہ میں میں بازو ہلانے کے قابل ہو گیا تھا۔ مگر کمر سے نیچے کا دھڑ ابھی مفلوج تھا۔ میں صحیح طرح نہیں بول سکتا تھا۔ میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ میں زور زور سے روتا۔ میں ایک دم سے اٹھنا چاہتا تھا' چلنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی تک میں کھانا بھی خود نہیں کھا سکتا تھا۔ ڈاکٹرز نے مجھے مزید ایک ماہ ہسپتال میں ہی رکھا۔

ماما' پاپا تو سب کچھ بھلائے میرے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ میرے دوستوں میں اب صرف عاشر ہی لاہور میں تھا۔ وہ ملنے آیا تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں اس روز خوب چیخا چلایا۔ اس کو برا بھلا کہا۔ بڑی مشکلوں سے ڈاکٹر صاحب نے مجھے کنٹرول کیا۔ اگلے روز میں نے گھر جانے کی ضد پکڑ لی۔ ماما نے کہا کہ وہ مجھے سب بتا دیں گی۔ بس میں ڈاکٹر سے 'فزیو تھراپسٹ سے تعاون کروں۔ میرے ہاتھ' میری پیشانی' میرا چہرہ چومتی وہ سخت دل گیر تھیں۔

مزید پندرہ دن میں' میں وہیل چیئر پر بیٹھنے کے قابل ہو چکا تھا۔ باقی ـــ مزید صحت یاب ہونے کے لیے میری دائیں ٹانگ اور کولہے کا آپریشن ہونا تھا۔ لیکن مجھے ڈاکٹرز نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

بے شمار صدقات نکال کر مجھے ماما' پاپا گھر لے آئے۔ میرا کمرہ ویسا ہی تھا سیاہ اور سلور۔ بس ماما نے اسے پھولوں سے بھر دیا تھا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ کمرے میں لا کر ماما نے مجھے سوپ پلایا اور میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا وہ میرے بیڈ کے قریب قالین پر تکیہ رکھے سو رہی تھیں۔ میرا دل بھر آیا۔ میری وجہ سے کس قدر تکلیف اٹھا رہی تھیں وہ۔

"ماما!"

"جی میرا بیٹا!" وہ ایک لمحے میں اٹھ کر آئیں۔ میں ان سے لپٹ کر چھوٹے بچے کی طرح رو پڑا۔

"ماما! یہ سب کیا ہو گیا؟"

"یہ زندگی ہے بیٹا! یہ حالات بھی بدلتے موسموں کی طرح بدلتے ہیں۔ ان سے کیا گھبرانا۔"

"موسم تو اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے۔"

"بس تم ٹھیک ہو رہے ہو۔ اللہ کا احسان ہے۔"

"ماما میں آپ کا بیٹا ہوں؟" میں نے ان کے ہاتھ اپنے لرزتے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"یقیناً" تم میرے بیٹے ہو۔" انہوں نے بیل بجائی۔ تو گل خان فوراً" آ گیا۔ وہ مجھے واش روم لے گیا۔ واپس لا کر بیڈ پر بیٹھا دیا۔ اس سے گیلا تولیہ منگوا کر ماما نے میرا چہرہ پونچھا میرے ہاتھ پونچھے۔ گل خان کو واپس بھیج کر وہ کہنے لگیں۔

"بیٹا! بعض لوگ بچہ کی پیدائش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن وہ اس بچہ کی ذمہ داری نہیں اٹھا پاتے۔ پھر خدائے رحمان جو اپنے بندے سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا' اس بچے کو اپنے سائے میں' اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور اس بچے کو ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے جو اس کے حقیقی والدین نہ ہو کر بھی اس کے ماں باپ بن جاتے ہیں۔"

"مگر؟"

میرا ہاتھ تھام کر وہ بولیں "تسلی رکھو۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ تم آغا سلمان اور رانی کا نکاح نامہ دیکھ چکے ہو۔ وہی تمہارے حقیقی والدین تھے۔ میری جب تمہارے بابا سے شادی ہوئی تو ان کی پوسٹنگ کوئٹہ میں تھی۔ میں ان کے ساتھ ہی چلی گئی' وہیں گھر کرائے پر لے کر اپنا پرائیوٹ کلینک بنا لیا تھا۔ زینب ایک مقامی عورت تھی وہ ہماری گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرتی تھی۔ رانی' زینب کی بھانجی تھی۔ آغا سلمان سیر کے لیے کوئٹہ آیا تو اس نے رانی کو دیکھ لیا اور اس کو ورغلا کر نکاح کر لیا۔ اس کی ماں غریب عورت تھی۔ کچھ نہ کر سکی۔ آغا سلمان' رانی کو ساتھ لے جاتا اور جہاں چاہتا گھومتا پھرتا اور پھر واپس چھوڑ دیتا۔ اب رانی کے لیے سفر مشکل ہو رہا تھا۔ آٹھواں

Downloaded From http://paksociety.com

مہینہ تھا۔ دو' تین مرتبہ زینب اور فاطمہ اس کو میرے پاس چیک اپ کے لیے لائی تھی۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے سفر کرنے سے منع کر دیا۔ ان ہی دنوں آغا سلمان اس کو لے جانے کے لیے آیا۔

وہ مری اسلام آباد کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ماں نے رانی کی حالت کی طرف توجہ دلائی تو وہ غصے میں رانی کو دھکیل کر نکل گیا۔ رانی برداشت نہ کر سکی اور اس کی ماں مارے خوف کے اس کو ہسپتال لے گئی نہ میرے پاس لائی۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی رانی جاں بحق ہو گئی۔ اور اگلے ہی دن آغا سلمان کی جیپ ایک کھڈ میں جا گری۔ آغا سلمان کی بیوی کو اس کے رانی سے نکاح کا علم ہو چکا تھا۔ وہ وقتاً" فوقتاً" اپنے بھائیوں کے ذریعے ان کو خوفزدہ کرواتی تھی۔ آغا سلمان کی وفات کے بعد جب ان لوگوں نے رانی کے گھر رابطہ کیا تو زینب اور فاطمہ نے ان کو یہی بتایا کہ زچگی کے دوران رانی اور بچہ دونوں نہیں بچے۔ اور وہ بچہ لے کر ہمارے پاس آئی اور التجا کی کہ بچے کو کسی محفوظ یتیم خانے میں پہنچا دیں۔

میری شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ بچے کو دیکھ کر میری مامتا تڑپ اٹھی اور میں نے تمہارے بابا کو منا لیا۔ اور ہم سب تمہاری نانی سمیت لاہور آ گئے۔ حقیقت صرف میری امی اور شارق کے والدین کو معلوم تھی۔ تمہاری نانی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی قانونی الجھن پیش نہیں آئی۔ اور یوں قدرت نے تمہیں ہمارا بیٹا بنا دیا۔ ہم کاغذات میں تمہاری اصلی ولدیت لکھوانا چاہتے تھے لیکن تمہاری نانی کے خوف کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ کئی بار تمہیں حقیقت بتانی چاہی مگر تمہاری نانی کے اصرار پر خاموش رہی۔ تمہاری بے ہوشی کے ہر لمحے میں میں نے اس غلطی کی معافی مانگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے رب نے مجھے معاف کر دیا ہے تبھی تو تم کو واپس لوٹا دیا ہے۔

عاشر اور ثانیہ کے ذریعے آغا فاران صاحب کو تمہارا پتا چلا تو وہ یہاں آئے۔ ان کو یقین تھا کہ تم ان کے بھائی کے بیٹے ہو۔ غیر معمولی مشابہت کی وجہ سے وہ ایسا سوچنے پر مجبور تھے۔ وہ یہاں آئے تو فاطمہ نے بھی تصدیق کر دی۔ یوں بھی اب ان سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ کئی مرتبہ تم کو دیکھنے کے لیے آئے۔ دل کے مریض تو وہ پہلے ہی تھے لیکن تمہارے غم نے ان کو مزید بیمار کر دیا۔ تقریباً" ڈیڑھ سال پہلے ان کا بائی پاس ہوا تھا۔ تب سے وہ نہیں آئے۔ البتہ باقاعدگی سے فون کر کے تمہارا حال پوچھتے ہیں۔"

"ماما میری نانی؟" مجھے اپنی آواز جیسے دور کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"بیٹے! اماں فاطمہ ہی تمہاری نانی ہیں۔" ماما نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

"ماما! آغا سلمان اکیلے آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے! نام نہیں لو ان کا' وہ تمہارے تایا جان ہیں۔ اکیلے کیوں آتے' وہ صبا ساتھ آئی تھی۔"

"صبا۔۔۔؟"

"کیسے نہ آتی میرے اتنے پیارے بیٹے کو دیکھنے!" ماں نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

"ہاں کیوں نہ آتی وہ۔" میں نے دل میں سوچا۔

"بہت پسند آئی تھی میرے بیٹے کو۔ مجھے بھی بہت پسند آئی۔ جتنی خوب صورت ہے اتنی ہی سادہ دل اور محبت کرنے والی ہے۔"

"اب جب سے تمہارے تایا کا بائی پاس ہوا ہے' وہ ان کو چھوڑ کر نہیں آتی۔ البتہ کارڈ' خوشبو اور پھول آتے ہیں۔ سب میں نے سنبھال کر رکھے ہیں۔"

انہوں نے اٹھ کر سامنے سیاہ آبنوسی الماری کھول کر ایک بڑا سا چرمی بیگ نکال کر میرے قریب کھول کر رکھ دیا۔

"تم ان کو دیکھو جب تک میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"میں آپ کے سامنے دیکھوں گا۔ آپ کے بغیر مجھے کیا مزہ آئے گا۔"

"پگلا۔" انہوں نے بیگ کھول دیا اور پہلا کارڈ

Downloaded From http://paksociety.com

میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کارڈ پر موتیوں جیسے حروف کندہ تھے۔

"تمہاری محبت کا دیا تو ازل سے میرے دل میں روشن تھا۔ اسی لیے جب میں نے تم کو دیکھا تو پہچان لیا۔"

اور اس گلدستے کے سارے گلاب سرخ تھے۔ میری آنکھوں سے ایک آنسو گرا۔

"کیا محبت روابط کی مرہون منت ہے؟"

کیا محبت شرائط سے وابستہ ہے؟

ہرگز نہیں! محبت خلوص، سادہ دلی اور بے ریائی سے معنون ہے۔ خشک نرگس اور چنبیلی کے پھولوں سے کمرہ بھر گیا تھا۔

صندلیں کارڈ پر سنہرے رنگ سے لکھا ہوا تھا۔

میں محبت کا چمکتا ہوا جگنو اپنی ہتھیلیوں میں چھپا کر رکھتی ہوں۔"

ساتھ ہی صندلیں کاغذ میں لپٹا ہوا سا گفٹ کا تحفہ تھا۔ سنہری ربن کھلا تو ایک کانچ بلوریں پیالہ تھا جس میں چھوٹا سا سفید کارڈ سبز ربن سے بندھا ہوا تھا۔

"میں نے محبت کی دہلیز پر پھول بکھیر رکھے ہیں۔ میری آنکھوں کا نمکین پانی انہیں تازہ رکھتا ہے اور شگفتہ بھی۔"

رنگین پھولوں سے سجے، خوب صورت جذبوں سے گندھے سب کارڈز میں نے دیکھے۔ اور ان سب خشک پھولوں کو سونگھا۔ ان خاموش، رو۔ کھے اور بے رنگ پھولوں سے بڑی گہری محبت چھلک رہی تھی محبت کی مہک ۔ میں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔ آنکھیں موندیں دیر تک میں چمکتے، روشن، محبت سے پر الفاظ کو ان میں چھپے جذبوں کو اپنے گرد محو رقص پاتا رہا۔ کبھی مسکراتا، کبھی آنسوؤں کی نمکین نمی محسوس کرتا، ایک نئے جہان میں تھا میں۔

یہ کیسی محبت تھی ۔۔۔ میں حیران تھا۔ محبت واقعی روابط کی محتاج نہیں ہے۔

مجھے محو پا کر ماما نجانے کب کمرے سے چلی گئی تھیں۔ میں نے بیل بجائی تو وہ اندر آئیں۔ دوپٹہ نماز کے انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پر اور چہرے پر اور سینے پر پھونک مار کر انہوں نے سب چیزیں احتیاط سے سمیٹ کر بیگ میں رکھ دیں۔ اور بیگ میرے سرہانے رکھ دیا۔ وہ ایسی ہی تھیں، بنا کہے میرے دل کی بات جان لینے والی۔

"ماما جانی! مجھے نیند کی دو گولیاں دے دیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! بس تھوڑا سا دودھ پی لو۔"

گولیاں کھلا اور دودھ پلا کر انہوں نے مجھے لٹا دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ میں چند لمحوں میں غافل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"خدا تم کو میری عمر بھی لگا دے، میرے بچے۔"

جب سے وہ آئے تھے میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ان سے مل کر خون کی کشش کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو نے مجھے باندھ لیا تھا۔ اپنائیت کا جو اظہار اول روز سے ان کی طرف سے ہو رہا تھا وہ اب میری سمجھ میں آرہا تھا۔ خون کا جوش مارنا کیا ہوتا ہے۔ یہ سب۔

ماما نے کھانا لگنے کی اطلاع دی تو عمران آغا جان کو سہارے سے باہر لے گیا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ صبا میرے لیے کھانا کمرے میں ہی لے آئی۔ اس کے ہاتھ سے نوالے لیتے ہوئے میں اس کی بھیگی آنکھوں اور لرزتی پلکوں کو دیکھ رہا تھا۔

"بس۔" میں نے پلیٹ بڑھاتے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ اس کے آنسوؤں کو چنتے ہوئے میں نے خود کو کہتے سنا۔

"محبت اتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں ہمیشہ کے لیے سو گیا تھا ۔ تم نے مجھے کیسے مجھے پکارا اور پکارتی رہیں یہاں تک کے اندھیر غاروں میں قید میری سماعتوں نے تمام بند کاٹ ڈالے ۔۔۔ اور تمہاری پکار کو سن لیا۔"

اس نے اپنی سبز آنکھیں اٹھائیں اور سب کہہ دیا۔ وہ بھی جو کہنا تھا اور وہ بھی جو دل میں چھپا کے رکھنا

Downloaded From http://paksociety.com

چاہتی تھی۔

"سنو رو کیوں رہی ہو' میں ٹھیک ہو رہا ہوں۔" مجھے اس کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔

"آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اسی خوشی میں تم رو رہی ہو؟" میں نے شرارت کی کوشش کی۔ اور وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ میں نے برسات میں دھوپ کے منظر کو بہت دلچسپی سے دیکھا۔

وہ لوگ دو دن رہے۔ دونوں کی رفاقت میں تاریکی کا سیاہ رنگ چھٹ گیا۔

اگر یہ خواب تھا تو تعبیر سے زیادہ خوب صورت تھا۔ زندگی کے کینوس پر مسرت کے رنگ چھائے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

"صہبا! میں جلد آؤں گا تمہیں ہمیشہ کے لیے لانے۔" میں نے محبت کی پیشانی پر جگمگاتی ہوئی تحریر پڑھ کر وقت رخصت امید کا جگنو اسے تھمایا۔

☆ ☆ ☆

اور اب مجھے ٹھیک ہو جانے کی جلدی تھی۔ فزیو تھراپسٹ باقاعدگی سے آتا اور مجھے ایکسرسائز کرواتا۔ میں وہیل چیئر پر سارے گھر میں گھوم لیتا تھا۔ ڈاکٹرز میری ہمت دیکھ کر بہت پرامید تھے۔

"ماما! گھر کے سارے آئینے آپ نے ہٹا کیوں دیے ہیں۔ نہ میرے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل ہے۔ مجھے خود کو دیکھنا ہے۔"

"اچھا۔" وہ کچن سے ہاتھ پونچھ کر آگئیں اور مجھے اپنے بیڈ روم میں لے آئیں۔ اس کے آئینے پر بھی انہوں نے چادر ڈالی ہوئی تھی۔ وہ میری کرسی کو بالکل شیشے کے سامنے لے آئیں۔

"بس میرے بچے! یہ یاد رکھنا آج میری محبت' میری مامتا کا امتحان ہے۔"

میرے کندھوں پر انہوں نے مضبوطی سے ہاتھ جمائے پھر ایک ہاتھ بڑھا کر چادر ہٹادی۔ یہ آئینے میں کون تھا۔ یہ تو میرا عکس بھی نہیں تھا۔ کمزور لاغر اور بوڑھا چہرہ۔ جا بجا زخموں کے نشان جو شاید کبھی مندمل ہونے والے نہیں تھے اور سفید اڑے اڑے بال' یہ تھا میرا وہ عکس جو اس کو ماننے مجھے دیا تھا۔ میری صحت مندی' جوانی' نیند کی وادی چاٹ گئی تھی۔ میری وجاہت گہنا گئی تھی۔

"آہ!" میں نے کرب سے آنکھیں بند کرنا چاہیں۔ مگر میرے کندھوں پر میری ماں کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ جو ساڑھے تین سال سے سوئی نہیں تھی۔ اس نے مجھے بکھرا ہوا دیکھا تھا اور ایک ننھے بچے کی طرح سمیٹا تھا۔ میں مسکرا دیا۔ انہوں نے مجھے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ چوم لیا۔

"میرا بیٹا! میرا بہادر شہزادہ' میرا چاند۔" وہ روتے روتے کہہ رہی تھیں۔ میرے ہوش میں آنے کے بعد میرے سامنے وہ پہلی بار آج روئی تھیں۔ مجھے جینا تھا۔ اپنے ماں باپ کے لیے۔

"ماما مجھے باہر لان میں لے چلیں۔"

پاپا نے ہمیں باہر لان میں ویلکم کیا۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

"پاپا! کیا ضروری ہے کہ میرا آپریشن یہیں ہو؟" اندرونی خلفشار سے تنگ آکر میں نے پاپا سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"تم کہیں اور کروانا چاہتے ہو بیٹا۔" پاپا نے پوچھا۔

"ابھی تو فوراً" آپریشن نہیں ہو گا۔ ابھی تم کو مزید مسٹیبل ہونا ہے۔" پاپا نے کہا۔

"بس پاپا! میں یہ جگہ چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں کہیں دور جانا چاہتا ہوں۔" میں نے سامنے رکھی میز کو پکڑ کر اپنی لرزش دور کرنے کی کوشش کی۔

"میں آغا فاران صاحب سے' ان کی پہنچ سے دور جانا چاہتا ہوں۔"

چاہ کر بھی میری زبان سے صہبا کا نام ادا نہیں ہوا۔ ماما نے میرے پیچھے آکر کندھوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا اور نرمی سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہنے لگیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

"ریلیکس بیٹا! وہ پوچھے بنا' اطلاع دیے بغیر نہیں آئیں گے۔"

"نہیں ماما! مجھے یہاں نہیں رہنا' آپ کراچی چلیں۔ دادی جان تو ساجد چاچو کے پاس ہیں۔ وہ گھر خالی پڑا ہے۔ بس آپ وہیں چلیں۔" میں نے ضد کی۔

"ٹھیک ہے' بالکل ٹھیک۔ بس میرا بیٹا ذرا بھی پریشان نہ ہو۔"

گل خان' نسرین کے ساتھ مل کر ماما نے رات تک سارا گھر سمیٹ کر بند کر دیا۔ پیکنگ کر لی۔ اور اگلی شام ہم خاموشی سے کراچی چلے آئے۔ آغا خان ہسپتال میں ماما کی کزن نیلوفر جاب کرتی تھیں جو سائیکاٹرسٹ تھیں۔ خالہ نیلوفر نے ہمیں آرتھوپیڈک سرجن ڈاکٹر جانسن سے ملوایا۔ بہت قابل اور ماہر وزیٹنگ پروفیسر ڈاکٹر تھے وہ۔ ڈاکٹر مارتھا البرٹ فزیوتھراپسٹ' انہی کی زیر ہدایت کام کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے ہفتے میں تین مرتبہ ایکسرسائز شروع کروائی۔

یہ ہجرت مجھے بہت راس آئی۔ میں بہت جلدی ٹھیک ہونے لگا تھا۔ ماما' پاپا نے میری بات مان کر آغا فاران صاحب کی فیملی کو کوئی اطلاع نہیں دی تھی.... صرف ایک بار ماما نے مجھے سمجھایا۔

"محبت کرنے والوں کا امتحان نہیں لیتے۔"

میں نے انہیں امتحان ہی سے تو بچایا تھا۔ ایک ٹوٹا پھوٹا فارس احمد ماں باپ کے لیے تو قابل قبول تھا۔ اور شاید آغا فاران صاحب کے لیے بھی.... مگر "صبا حسن".... میں کیسے اس کو کسی امتحان میں ڈال دیتا۔ دن تو خیر کسی طرح گزر ہی جاتا تھا لیکن جب رات اتر آتی تھی' تو میں کھڑکی کے شیشوں سے ناک چپکائے ماضی میں بھٹکتا۔ میرے اندر ایک سفید موم سے بنی لڑکی کے عنابی ہونٹ بولنے لگتے تھے۔

"میں نے تمہارے دل کو اپنے قیام کے لیے موزوں ترین جانا اور اب وہی میرا ٹھکانہ ہے۔ زندگی کا خیمہ کس ٹھکانے پر جا لگے گا' یہ قسمت طے کرے گی۔"

☆ ☆ ☆

نیلا آسمان مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں خواب دیکھ رہی تھی۔ محبت کی پری مجھ سے ہمکلام تھی۔ میں نے اس کے پیغام کو سن لیا تھا۔ اس پیغام کو الفاظ کے پیرہن کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔ مجھے انتظار کرنا تھا اپنی زندگی کے آخری لمحے تک۔ محبت کو یہی زیب دیتا ہے۔ محبت انہی دلوں میں قیام کرتی ہے جو اس کے بھیدوں کو سمجھ لیتے ہیں اور ان کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔

"بی بی جان! آپ میری فکر کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"میں کیسے چھوڑ دوں فکر۔ آپ باپ بیٹی کو تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔"

"ہماری بیٹی کی قسمت؟" آغا جان بولے۔

"قسمت کیسے؟ کوئی رسم ہوئی تھی اس کے ساتھ؟ زبان دی تھی آپ نے فارس کے ماں باپ کو؟ انہوں نے کہا تھا فارس ٹھیک ہو جائے تو وہ لوگ آئیں گے.... نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم.... کوئی اتنی بات پر بھی بٹھاتا ہے بیٹی کو.... سارا خاندان باتیں بناتا ہے۔"

"خاندان والوں کی پروا نہیں ہے مجھے۔ اپنی بیٹی کی خوشی عزیز ہے مجھے۔" آغا جان کو جلال آ گیا۔

"بچی کے ساتھ بچہ تو نہ بنیں آغا صاحب! چار سال پہلے گنوا دیے اس کے ہوش میں آنے کے انتظار میں۔ ٹھیک ہونے کی امید ہوئی تو جانے کہاں غائب ہو گئے سب۔ اس بات کو بھی سال سے زیادہ ہو گیا اب تو۔

کل چھوٹی بھابھی کی امی اپنے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں جس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس لیے بی بی جان کا غم و غصہ انتہا پر تھا ورنہ وہ آغا جان کے آگے بولنے والی نہیں تھیں۔ ویسے بھی ان کو صبا کے دل کی خبر تھی۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کہانی تو روایتی ہی رہتی شاید' حماں نصیب روایتی کہانیوں کی طرح۔ اگر محبت درمیان میں راستہ نہ بنا

Downloaded From http://paksociety.com

لیتی۔ محبت جو بھنورے کو کلی کا' چکور کو چاندنی کا دیوانہ بنا دیتی ہے۔ محبت ایک مشک فام بھید ہے جو دلوں کو اپنی مشک سے دیوانہ بنالیتا ہے' اسیر بنالیتا ہے۔ وشمہ بھی سمیر کی اسیر تھی لیکن جس دن وشمہ کو یہ معلوم ہوا کہ سمیر کرمانی نہ صرف شادی شدہ بلکہ دو بیٹیوں کا باپ بھی ہے' اس دن وہ نیم پاگل سی ہو گئی۔ اسے اس دھوکے پر دکھ تھا جو سمیر نے اسے دیا۔ وہ اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ اسے پانے کے لیے؟ یا اسے چھوڑ دینے کے لیے؟ اس نے اس سے نکاح کیا تھا' لیکن ایسے نکاح کی حیثیت ہی کیا تھی آخر' نہ وہ معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکتی تھی' نہ وہ ماں بن سکتی تھی۔"

نیلم نے اپنے دل کا سارا بوجھ رات کے اس پہر اتار پھینکا تھا۔ جانے کس احساس تلے' ایک انتہائی اجنبی شخص کو شریک راز' شریک غم کرلیا تھا۔ شاید وہ جواب چاہتی تھی' ایک مرد سے۔

آغا خان ہسپتال' کے نیورو سائیکاٹرک وارڈ میں روتی کراہتی' وشمہ' کی حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ ہر رات رو کر سوتی تھی۔ کبھی سمیر کرمانی کا نام لے کر چلاتی تھی' کبھی اپنی محبت کا رونا روتی تھی۔ اس واقعہ کو اب چار سال ہونے والے تھے جب وہ سب ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

سمیر کرمانی نے حسب روایت دل بھر جانے کے بعد "وشمہ" کو چھوڑ دیا تھا۔ کیسا نکاح اور کون سا نکاح' پر فریب' سیاہ کار' دنیا کا پہ فریب "وشمہ" کی سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ وہ روز روز کی تکرار سے تنگ آگیا تھا یا وشمہ کے بڑھتے ہوئے ڈیپریشن سے کہ وہ وشمہ کو کسی خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔ آئے دن ان کے جھگڑے ہوتے اور پھر ایک دن شدید ڈیپریشن میں وشمہ نے کرمانی کے پستول سے اسی پر گولی چلادی۔

کرمانی تو بچ گیا لیکن وشمہ پاگل ہونے سے نہیں بچ سکی۔ کرمانی نے اسے جانوروں کی طرح پیٹا اور گھسیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا۔ طلاق کے تین لفظ اس نے اس کے منہ پر دے مارے اور اپنے شہر لوٹ گیا۔ وشمہ اس کی خوشبو تک بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جو کوٹھی بظاہر وشمہ کے نام تھی وہ کاغذات بھی جعلی تھے۔

اماں تو پہلے ہی کہتی تھیں کہ وشمہ پاگل ہے۔ اور وہ واقعی پاگل ہی ہو گئی۔ شروع کے چند مہینے تو وہ ہوش سے بالکل بیگانہ رہی۔ آہستہ آہستہ کچھ سنبھلتی بھی تو پھر دورہ پڑ جاتا اور اسے مہینوں اور ہفتوں کے لیے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروانا پڑتا۔

نیلم کی شادی ہو چکی تھی اور سارہ نے پارلر میں جاب کرلی تھی۔ دونوں نے وشمہ سے سبق حاصل کیا اور اماں کو سختی سے تنبیہہ کرنا شروع کردی تھی کہ وہ دولت کا لالچ کرنا بند کردیں۔ نیلم جیسے ہی اپنے گھر کی ذمہ داریوں سے کچھ وقت نکالتی' اس کے پاس اسپتال آجاتی تھی۔

دو' تین دن سے تو وشمہ کی بے چینی حد سے سوا تھی۔ معمول سے کہیں زائد وقت لے رہی تھی' وہ دوا کھانے کے بعد بھی سونے میں۔ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ بہک جاتی تھی' بہت زیادہ چلانے لگتی تھی۔ اور کبھی وہ اتنی خاموش ہو جاتی تھی کہ لگتا تھا وہ گونگی ہو چکی ہے۔ وہ محبت جسے پا کر اس نے کھو دیا تھا' وہ اس کی زندگی ہی لے ڈوبی تھی۔ کوئی آس' کوئی طلب اب اس کے اندر موجود نہیں تھی۔ شاید وہ موت کا انتظار کر رہی تھی' یا شاید اسے قیامت کے آجانے کی توقع تھی۔ سمیر کرمانی اس کی زندگی میں موت کا قرب لے کر آیا تھا۔

اس رات نیلم اس کے سونے کے بعد کینٹین سے چائے لینے کے لیے نکلی تھی کہ سامنے سے واکر کے سہارے آتے' فارس احمد' سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ جس کی فائنل سرجری ہو چکی تھی۔ اور اب وہ کافی بہتر طریق پر چل پا رہا تھا۔ عارضی نوعیت کے یہ پڑوسی چند ملاقاتوں میں ایک دوسرے کے دکھ درد جاننے لگے تھے۔ شائستہ اور فارس دونوں ہی بہت اچھے اخلاق کے مالک تھے۔ جس انداز سے وہ اس کا اور وشمہ کا حال احوال پوچھتے تھے' اس انداز پر نیلم کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ اسے شدت سے ایسے لوگوں کی اپنی

Downloaded From http://paksociety.com

زندگی میں طلب تھی جوان کے لیے آسانی اور راحت کا باعث بنیں۔

فارس احمد' جیسے نوجوان کو واکر کے سہارے چلتا دیکھنا نیلم جیسی حساس لڑکی کے لیے بہت مشکل تھا تو دوسری طرف کمرہ نمبر دو سو نو سے آنے والی آہوں' کراہوں اور سسکیوں کا سلسلہ 'فارس احمد' کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا۔ اب یہ فارس احمد کی حلیم طبیعت اور شائستہ مزاجی کا اثر تھا یا نیلم کی تنہائی اور اعصاب شکنی.... یا پھر قدرت نے یہ سب یوں ہی طے کر رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ساری دنیا سے خفا سر نیہوڑے راج ہنس بیٹھا تھا۔ اس کی سفیدی پھیکی پڑ چکی تھی' پر ڈھلک گئے تھے۔ ہوائیں اس کے آنسوؤں کی نمی رچی ہوئی تھی۔

"تو آپ کی ماما آپ کی طاقت اور حوصلہ ہیں؟" راج ہنس نے رخ موڑے موڑے پوچھا۔

"ہاں! انہوں نے ہی مجھے زندگی کو مثبت رخ سے دیکھنا سکھایا ہے۔ مثبت سوچنا اور مثبت ردعمل دکھانا۔"

"آپ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ تو مثبت تھا ناں۔ بلکہ سب ہی کچھ مثبت تھا۔ ایک حادثے کے سوا۔ میرا اور آپ کا بھلا کیا مقابلہ۔ حادثوں اور غموں میں فرق ہوتا ہے۔ وہ زخم جو دوا سے ٹھیک نہ ہو' وہ زخم بہت تکلیف دیتے ہیں۔" خود ترسی کی کوئی انتہا تھی۔

"بات مقابلے کی نہیں وشمہ! بات اپنے اندر موجود طاقت کو 'تعمیری عمل' کو جگانے کی ہے۔" فارس کا لہجہ بے حد نرم تھا۔ "اپنی شکایات اور محرومیوں پر واویلا کرنے سے کیا حاصل؟" وہ رسان سے بولا۔

کچھ نیلم نے وشمہ کے بارے میں بتایا تھا' کچھ وہ خود وشمہ کی آہوں' کراہوں کی وجہ معلوم کرنے میں متجسس تھا کہ اس نے وشمہ سے دوستی کرنے میں دیر نہیں کی۔ آہستہ آہستہ وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کرنے لگے۔ جب جب وہ کچھ بہتر محسوس کرتی' وہ اس سے باتیں کرنے لگتا۔ وشمہ اس سے اپنی زندگی کے دکھ کہنے سننے لگی۔ فارس کو اندازہ تھا کہ زندگی نے وشمہ کو اتنے بدترین پہلو دکھائے ہیں کہ اب وہ زندگی کے روشن پہلوؤں سے کنارا کش ہو چکی ہے۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی میں اب نام کی بھی روشنی موجود نہیں رہی۔ وہ امید سے اتنی ناامید ہو چکی تھی کہ اس کے الفاظ دکھ اور مایوسی کے لبادوں میں جیسے ہمیشہ کے لیے لپٹ گئے تھے۔

"واہ! واہ! کیا انصاف ہے آپ کا۔ جس کے پاس صرف زخم ہی ہوں وہ واویلا بھی نہ کرے۔" وشمہ کے لہجے میں غصہ در آیا تھا۔

"وشمہ! مجھے تمہاری تکلیف کا اندازہ ہے۔" اس نے وشمہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "لیکن ان تکلیفوں نے تمہیں بہت مضبوط بنا دیا ہے۔ تم زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ اپنی طاقت کو پہچانو وشمہ۔" فارس نے ڈھارس دینے کی ایک اور راہ نکالی۔

"کیا فائدہ؟" وشمہ نے جیسے قسم کھالی تھی کہ وہ اس کو لاجواب کر کے ساری دنیا سے بدلہ لے لے گی۔

"میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جس وشمہ سے میری دوستی ہو چکی ہے وہ بہت بہادر ہے۔" فارس بھلا کیسے ہمت ہار دیتا۔

"آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ میں بہادر ہوں؟ اگر ہوا ہے تو بالکل غلط ہوا ہے۔ میں بہت بزدل ہوں۔" تلخی سے کہتی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

فارس اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں رہی ہوگی۔ دکھ کسی بھی بہادر انسان کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ امید کی آس چھوڑ دینے سے کوئی بھی انسان سوکھی بیل کی طرح جھڑ کر زندگی سے الگ ہو جاتا ہے۔ جب زندگی سکھ کی زمین سے نکل کر کرب کی کھیتی میں اپنی فصل کھڑی کر لیتی ہے تو کٹائی میں صرف آہیں اور سسکیاں ہی آتی ہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا؟" شائستہ نے اسے کتنی ہی دیر سوچوں میں گم دیکھا تو پوچھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"وشمہ کے بارے میں۔۔۔"

"اچھی لڑکی ہے وہ۔۔۔ لیکن بہت حساس ہے۔"

"شاید حالات نے اسے حساس بنا دیا ہے ماما۔۔۔"

"تم اس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟"

"ماما! سمیر کرمانی نے اس کے ساتھ بہت برا کیا۔ اسے سمیر کرمانی سے محبت تھی۔ کیا دنیا میں ہمیشہ محبت کے نام پر دھوکا ہی ملے گا؟"

"یہ دنیا اور اس دنیا کے لوگ کچھ ایسے ہی ہیں بیٹا ۔۔۔ تم کس کس بات پر سوچ سوچ کر ہلکان ہو گے؟"

"سب کے لیے نہیں لیکن ہم ان کے لیے تو فکر مند ہو سکتے ہیں نا، جو اپنا دکھ ہم سے شیئر کرتے ہیں؟"

"ہاں! ہو سکتے ہیں۔۔۔ لیکن ایسے کہ تم اپنی صحت خراب نہ کر لو۔۔۔" شائنہ کو اس کی فکر تھی۔

فارس خاموش رہا۔ شائنہ نے گردن موڑ کر دیکھا کہ وہ بدستور سوچوں میں گم ہے۔

"تم واقعی اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو فارس؟"

اس سوال نے اسے حیران کر دیا تھا۔ "کیا واقعی میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے خود سے پوچھا۔ کیا وہ خالی خولی ہمدردی ہی کر سکتا ہے۔ یا وہ واقعی دو نہیں چار قدم آگے بڑھ سکتا ہے۔

"میں وشمہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جیسے فیصلہ کر لیا اور فوراً اس کا اعلان بھی کر دیا۔ ماما نے پہلے اسے حیرت سے دیکھا پھر وہ مسکرانے لگیں۔

"کیا وشمہ مان جائے گی ماما؟"

"اگر نہیں مانے گی تو اسے منا لینا۔۔۔ ہیرا ہے میرا بیٹا۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"آپ مجھ پر ترس کھا رہے ہیں؟"

"شادی کے سوال پر ہی تمہیں یہ کیوں لگا؟ ترس غیروں پر کھایا جاتا ہے 'اپنوں پر نہیں۔"

"میں کب سے آپ کی اپنی ہو گئی۔" اس کی آنکھیں بار بار چھلک رہی تھیں۔

"جب سے ہم نے اپنی اپنی باتیں ایک دوسرے سے کرنا شروع کیں۔"

"میں تو آپ کو دوست سمجھ کر بات کرتی تھی۔ اب آپ مجھ سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ ترس کھا رہے ہیں مجھ پر۔"

"تم ہمدردی کیوں سمجھ رہی ہو؟ محبت کیوں نہیں"

"کیونکہ محبت کی یہاں کوئی گنجائش ہے نہ صورت دوستی کی حد تک آپ کی بات سمجھ آتی ہے۔ آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔ وشمہ دوست سے بھی محبت ہی ہوتی ہے نہیں ہو سکتی کیا؟"

وشمہ جیسے لاجواب ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ "ہو سکتی ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

اس نے وشمہ کو غور سے دیکھا اور جانا کہ اسے بھی ایک محبت کا یقین ہی چاہیے تھا۔ وہ ایک عورت تھی

Downloaded From http://paksociety.com

اور روز ازل سے محبت کی طالب تھی۔ کسی بھی صورت اور کسی بھی تعلق کے ذریعے۔۔۔ بس محبت کی۔۔۔ اسے بس ایک یقین دہانی چاہیے تھی کہ اس سے صرف "ہمدردی" تو نہیں کی جارہی۔ فارس نے اسے یہ یقین دلا دیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور فارس اس پیاری لڑکی کو یہ یقین ہی تو دلانا چاہتا تھا۔

"میرا یقین رکھو وشمہ! تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

پھر شائستہ اور کیپٹن صاحب سب ہی محبت کا یقین دلانے والے۔ اتنی ساری محبتوں سے مفر ممکن کہاں تھا اس کے لیے۔۔۔ سو چپ چاپ ایک گلابی شام میں وشمہ نے فارس احمد کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔ اس کی بے چینیوں کو 'تڑپ کو قرار آنے لگا تھا۔

صد شکر کہ دوا کھا کر ہی سہی وہ اب سونے لگی تھی۔

فارس خوش تھا یا نہیں۔۔۔ خوش نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہمیشہ کی طرح رات اترتے ہی ایک دلربا لڑکی کا چہرہ اس کے اندر بولنے لگتا تھا۔

"محبت کی آنکھ ہمیشہ نم ہوتی ہے' یہ دلوں پر "الہام" کرتی ہے' ان کو کھارے پانی سے دھو کر نتھار دیتی ہے۔۔۔ اجلا کر دیتی ہے اور پاکیزہ۔۔۔ لیکن محبت دکھ دینے کا نام تو نہیں۔۔۔ محبت ضد کا نام تو نہیں۔۔۔ یہ تو آب جو ہے' جو دلوں کے درمیان بہنے اور بہے جانے کا نام ہے۔"

وہ اپنی بے قراری کو دانشمندی کے پیرہن میں لپیٹنا چاہتا تو وہ مزید بڑھ جاتی۔

☆ ☆ ☆

پیاری صہبا! السلام علیکم!

ملاقات کے بجائے میں نے میل کو رابطے کا ذریعہ اس لیے بنایا کہ آپ کو غور کرنے کا موقع ملے۔ آپ جس روز فارس سے ملنے ہسپتال آئیں میں نے اتفاق سے آپ کی باتیں سن لیں۔

مجھے یقین ہے کہ قدرت نے مجھے وہ باتیں سنوائیں ورنہ بے خبری میں' میں غاصب ٹھہرتی۔ مجھ سے ہمدردی کرنے والا' مجھے غم کی تاریکی سے نکالنے والا' صاحب ظرف' فارس احمد صرف آپ کا ہے۔ آپ کی آہٹوں کا منتظر۔ آپ دونوں کے درمیان نہ کوئی وشمہ ہے نہ کوئی ہوگی۔ ہاں حرف دعا کی صورت۔۔۔ آپ دونوں کی خیر طلب کرتی ہوئی۔

آپ کو یہ میل میں دبئی سے کر رہی ہوں۔ جہاں اپنی والدہ اور بہن سارہ کے ساتھ میں آج ہی پہنچی ہوں۔ ہم دونوں بہنوں کو ایک کال سینٹر میں جاب مل گئی ہے۔ ان کو بھی میل کر دی ہے۔ امید ہے وہ کل آپ کے پاس پہنچیں گے۔" فقط وشمہ

نیلم سے مشورہ کرنے کے بعد سارہ اور وشمہ دونوں نے اپنے کانونیٹ لب و لہجے کی بنیاد پر دبئی کے ایک کال سینٹر میں نوکری کی درخواست کر دی تھی۔ ان کی بہن ٹھیک تھی اس کے سوا ان کو کچھ درکار نہیں تھا۔ وشمہ سے صہبا کے بارے میں جان کر وہ دل سے چاہتی تھیں کہ فارس کی شادی صہبا ہی سے ہو۔ وہ فارس احمد اس کی فیملی کی احسان مند تھیں جن کی بدولت وشمہ زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سرائے مان اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت ایستادہ تھا۔ چاندنی میں تازہ تازہ کیا ہوا سفید پینٹ چمک رہا تھا۔ گول مرمر کے ستونوں پر لپٹی سبز بیلیں خوب گھنی تھیں۔ صنوبر کے درخت ہنوز دربانی پر مامور تھے۔ البتہ اردگرد کے درختوں نے ان چھ سالوں میں گھنے باغ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بڑی بڑی لائٹس آج بھی ان درختوں کو روشن کر رہی تھیں۔ اپنے نئے سیاہ لانگ چیسٹر میں سرمئی مفلر لپیٹے میں اپنی پراڈو سے اترا اور منقش سیاہ گیٹ پر دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ جیسے گھر کے مکین انتظار کرتے کرتے تھک کر ذرا سا ستانے کو مہمان خانے میں ہی بیٹھے ہوں۔

گرم اونی کپڑوں میں دو چھوٹے بچے سب سے پہلے نظر آئے۔ دروازہ کھولنے والے ملازم کے اندر جا کر

Downloaded From http://paksociety.com

اطلاع کرنے سے قبل ہی سارا گھر استقبال کے لیے دوڑا چلا آیا۔

ارسلان 'عمران ان کی بیویاں اور بچے 'سلام' مرحبا' خوش آمدید کے شور میں 'میں آگے بڑھا تو سب سے پہلے آگے بڑھ کر مجھے آغا جان نے بھینچ لیا۔ وہ مجھے لپٹائے لپٹائے رو رہے تھے۔ اور میں بھی۔

"دیکھو بچے! میں زندہ رہا اور انتظار کرتا رہا کہ ایک دن تم آؤ گے۔ تمہارے انتظار نے مجھے مرنے نہ دیا۔ کوئی گلہ نہیں 'میرے بچے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ ہم کو اپنے خون کا انتظار تھا' یہ تمہارا حق تھا۔ اور تم آئے یہ ہماری خوش نصیبی۔ اللہ نے میرے یقین کی لاج رکھی۔ اس کا شکریہ۔"

"آغا جان آپ بیٹھ جائیں' آپ کی طبیعت ....." عمران نے آہستگی سے کہا۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا مجھے۔ میرا بیٹا آگیا ہے۔ اب میں دس سال اور جیوں گا۔ اس کے بچے کھلاؤں گا۔"

"عمران' بھائی کو کمرے میں لے جاؤ۔ یہ فریش ہو جائے۔ دلہن تم لوگ کھانا لگواؤ۔"

عمران مجھے لے کر اوپر آگیا۔ جہاں میرا سامان رکھ دیا گیا تھا۔ میں نہا دھولیا تو عمران مجھے لینے آگیا۔ آغا جان ڈائننگ ٹیبل پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ اپنے دائیں طرف بٹھا کر انھوں نے ایک ایک چیز اصرار سے مجھے کھلائی اور آخر میں سب کے منع کرنے کے باوجود اخروٹ کا حلوہ میرے ساتھ کھایا۔ ارسلان اور عمران کی بیویاں بچوں کو سلانے چلی گئیں۔

ہم سب کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عمران بڑی مشکل سے آغا جان کو منا کر سلانے کے لیے لے گیا کہ اب تو فارس بھائی یہیں ہیں۔ کل باتیں کر لیجیے گا۔

"آپ بھی آرام کرلیں فارس بھائی۔" ارسلان نے مجھ سے کہا۔

"میں کچھ دیر باہر ٹہلنا چاہتا ہوں۔" میں نے قدرے جھجک کر کہا۔

"آپ کا اپنا گھر ہے فارس بھائی! سمندر خان کو معلوم ہے۔ وہ گیٹ کھولے گا بھی اور بند بھی کر لے گا۔ آپ ضرور جائیں۔ لیکن باہر سردی ہے۔ آپ جیسٹر پہن لیں۔" میں جیسٹر پہن کر باہر نکل آیا۔

صہبا' اب تک سامنے نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پیلس سے شہر کی طرف جانے والی سڑک کے دائیں جانب خوابیدہ شہر کا منظر مبہوت کر رہا تھا۔ سرد رات گہری ہو چکی تھی اور بے حد خاموش بھی۔ سڑک کے بائیں جانب سیب اور آلو بخارے اور چنار کے چھتنار درخت ایستادہ تھے۔ ان کے لمبے سائے مبہوت کر رہے تھے۔ صاف' چکنی' شفاف سڑک پر میرا سایہ میرے آگے آگے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میرے عقب میں میرا دوست 'میرا چاند' بھی خاموش تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے پیچھے آتا ہوا ایک سایہ دکھائی دیا۔ وہ صہبا تھی .... یقیناً" میں ٹھہر گیا اور ٹھہرا رہا یہاں تک کہ وہ سایہ مجھ میں مدغم ہو گیا۔

"پانے اور کھونے کے جھگڑوں سے آزاد ہم محبت میں گم ہیں۔" میں نے بے آواز سرگوشی کی۔

چاند کہنے لگا۔ "محبت کے نصیب میں جدائی ہے' غم ہے' درد ہے .... جو یہ درد سہ لیتے ہیں اور یہ جدائی اور غم گزار لیتے ہیں وہ اس کی لذت کو پا لیتے ہیں۔ محبت ان پر بارش کی طرح برستی ہے اور دھوپ کی طرح چمکتی ہے۔ بلاشبہ خوش نصیبی ان پر سایہ فگن ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

ہاجرہ ریحان

زندگی

ہوش سنبھالتے ہی سب سے پہلا شوق جو میرے دل میں سمایا... وہ بس اتنا ہی تھا کہ مرجاؤں۔ اور وقت سے پہلے مرنا اس جہاں میں وقت سے زیادہ زندہ رہنے سے بھی مشکل ہے۔ مطلب یہ کہ میں چاہتی تھی کہ کسی کو یہ بھی نہ لگے کہ میں نے جان بوجھ کر موت کو گلے لگایا ہے یعنی کہ خودکشی کی ہے۔ پھر وہ جو زہر کھا کر، گلے میں دوپٹا باندھ کر یا پھر اسی طرح کی فضول سی حرکت کرکے لڑکیاں مرتی ہیں۔ ایسے میں اکثر کی شکل و صورت کچھ عجیب سی ہوجاتی ہے تو میں ایسا بھی نہیں چاہتی۔ چاہتی ہوں کہ مرتے دم میری ظاہری حالت بھی درست رہے۔ جو دیکھے وہ کہے جیسے بس ابھی ہی آنکھ لگی ہو۔ جیسے کوئی معصوم فرشتہ سو رہا ہے۔ اطمینان اور ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے، کچھ گھر کا ماحول بھی پرسکون ہو۔ سب اپنی اپنی جگہ ہنسی خوشی بسے ہوئے ہوں کیونکہ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرے مرنے پر گھر والے سر پر ہاتھ مار کر کہیں کہ "لو بھلا یہ کوئی وقت تھا مرنے کا۔۔۔؟" جیسے میں نے پیدا ہونے کے لیے غلط وقت۔۔۔ گھر۔۔۔ خاندان چنا تھا، میں اپنے مرنے کے لیے کم از کم ان سب پر نظر ثانی کرکے ہی مرنا چاہتی تھی۔ چلو پیدا ہونا تو میرے ہاتھ میں نہ تھا، مگر یہاں موت کم از کم اپنی موت کو تو میں خود باقاعدہ بہت پلاننگ کے ساتھ اپنانا چاہتی ہوں اور اسی پلاننگ کے سبب ابھی تک جیسے چلی جارہی ہوں، مگر اس شوق کی خبر میں نے زمانے کو لگنے نہیں دی تھی کبھی۔ یہ میرا ایسا راز تھا جو میرے حواس پر مستقل سوار تھا اور اکثر انجانے میں ہی اپنے شوق کی تکمیل کا کوئی بھی سرا پاتی تو متوجہ ہوجاتی اور کچھ یوں انہماک سے اس کو سوچتی کہ خود ہی بھول جاتی کہ آخر اس وقت اس جگہ اور اس قدر میں کیوں کر متوجہ ہوں۔

"مرنا چاہتی ہو تم؟"

اس کا یہ سوال مجھے چونکا گیا تھا، میں نے پہلی بار نظر اٹھا کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کشادہ پیشانی جس پر اوپر چلتے تیز پنکھے کی ہوا سے اڑتے بالوں کی دو چار لٹیں کبھی ادھر تو کبھی ادھر ہوتیں۔۔۔ گہری سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جو شاید نیند کی کمی کے باعث اکثر ڈبڈبائی ہوئی لگتیں اور چوڑے دہانے پر گلابی ہونٹ جو معانقے کے وقت بھینچے رکھتا اور سوال جواب کے دوران ہلکا سا ایک طرف کو خم دیے کرسی پر ہلکے ہلکے جھولتا جاتا، مگر حیرت انگیز طور پر اس وقت یہ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ "اس کو کیسے پتا چلا؟" میں نے دل میں سوچا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ویسے بھی ڈاکٹروں کے پاس اس طرح کے سوال جواب کا وقت بھی کہاں ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی پڑھائی میں شاید سب سے پہلے جذبات سے عاری ہو کر مریض کو دیکھنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ کلینک میں بیٹھے بیٹھے آپ ننھے پودے سے بڑھ کر پورا درخت بن جاتے ہیں۔۔۔ انتظار میں بیٹھے۔۔۔ پہلے آنے والے ایک ایک مریض کی کئی بار گنتی کرتے ہیں۔۔۔ سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹر کے پاس پہنچنے والا ہر مریض جیسے جاتا ہے تو ڈاکٹر کو ہی پیارا ہو جاتا ہے۔۔۔ آپ بار بار گھڑی دیکھتے ہیں اور پھر اللہ اللہ کر کے جب آپ ڈاکٹر تک پہنچتے ہیں تو وہ صرف چند سیکنڈ میں دو چار سطریں کاغذ پر کھینچ کر آپ کو چلتا کر دیتا ہے۔۔۔ میرے ساتھ تو ہمیشہ ہی ایسا کچھ ہوا۔ کئی بار تو دل ہوتا تھا کہ چیخ اٹھوں۔۔۔ ضد کر بیٹھوں۔۔۔

"نہیں جی۔۔۔ میں تو اتنی جلدی نہیں جاتی۔۔۔ کچھ میرے انتظار میں بھی تو باہر بیٹھے دوسرے مریض اپنی گھڑیاں دیکھیں۔" مگر ایسی ضد وہ بھی اس سے۔۔۔ میں سوچ کر ہی لرز جاتی۔

تو ہمیشہ کی طرح میں انتظار میں تھی کہ وہ چند سطریں کاغذ پر کھینچ کر میرے حوالے کر دے گا مگر اس بار اس نے مجھے اسٹیتھو اسکوپ سے پہلے تو خوب جانچا۔۔۔ نبض کو پرکھنے میں بھی کافی سارا وقت لیا اور تھرمامیٹر بھی ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھ کر پورا وقت دے کر منہ سے نکالا اور پھر میرے شب و روز کے بارے میں پوچھنے کے بجائے یہ سوال پوچھ بیٹھا اور اس پہ ستم یہ کہ مسکرا بھی رہا تھا میں گڑبڑا گئی۔ پہلو بدلنے لگی۔ وہ میری گومگو حالت دیکھ کر پھر گویا ہوا۔

"پچھلے ہفتے جو اینٹی بایوٹک لکھ کر دی تھی، تم نے لی ہوتی تو ابھی تمہاری حالت بہتر ہوتی۔ تمہیں بتایا بھی ہے کہ سردی میں اس بیماری کو بہت احتیاط سے لے کر چلنا ہوتا ہے۔ کھانسی وہ بھی اکیوٹ جو وقت کے ساتھ بڑھے گا۔ تمہاری حالت بہتر ہونے کے بجائے بگڑ رہی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کیا چاہ رہی ہو؟"

اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان بال پوائنٹ مسلسل گھوم رہا تھا جو کہ اس کے بے چین ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں آج خود کو اس کی توجہ کا مرکز پا کر کچھ کہہ ہی نہیں پا رہی تھی۔ چپ سی لگ گئی تھی۔ پھر کہتی بھی تو کیا۔۔۔ اقرار جرم ایسا آسان بھی نہیں ہوتا۔

"میں نے کافی احتیاط رکھی اور جو دوائی کلینک سے ملی وہ بھی وقت پر لی تھی، مگر بس اینٹی بایوٹکس نہیں لے پائی۔۔۔ میں۔۔۔ میں کوشش کر کے جلد منگوالوں گی۔"

میں نے باقاعدہ مرعوبیت سے جواب دیا ہی تھا کہ وہ تیز لہجے میں مجھے پھٹکارنے لگا۔

"ہم م م۔۔۔ محترمہ کس کو بے وقوف بنا رہی ہو؟ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دوائی نہیں لوگی تو اپنا نقصان کرو گی۔ ابھی گھر پر ہو کل اسپتال پہنچ جاؤ گی اور پھر جو خرچا ہو گا اس پر گھر والوں سے صلواتیں بھی تم ہی سنو گی۔ تکلیف کی تو خیر ہے۔۔۔ عادت ہی ہے۔۔۔ کیوں؟"

میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ ہم کب سے اپنی ذات کو بڑے خلوص، مان اور وقار کے ساتھ نظرانداز کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر کبھی کبھار کسی کے احساس دلائے جانے پر شرمندگی سے ڈوب مرنے کو سوچنے لگتے ہیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ مریض ڈاکٹر کو پیارے نہیں ہوتے بلکہ اس کی پھٹکار سننے کے لیے اتنا وقت لیتے ہیں۔

"میں اب دوسری اینٹی بایوٹک لکھ کر دے رہا ہوں۔ چار گھنٹے کے وقفے سے لیں اور ایک ہفتے بعد آکر دکھائیں۔ اگر بیچ میں طبیعت زیادہ خراب ہو تو کلینک میں آکر اتنا لمبا انتظار کرنے کے بجائے مجھ سے فون پر رابطہ کیجیے گا۔۔۔ دن میں کسی بھی وقت فون کر سکتی ہیں۔"

اس نے ناراضی اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بہت ہی پیشہ وارانہ انداز سے مجھے ہدایات دیتے

Downloaded From http://paksociety.com

ہوئے میرے ہاتھ میں پرچا پکڑا دیا۔۔۔ میں جان چھوٹنے پر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی' مگر بخار کی شدت اور کمزوری سے چکرا گئی۔ وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے سنبھالتا ہوا پھر سے ڈانٹنے لگا۔

''اتنی خراب طبیعت میں بھی آپ اکیلی ہی آئی ہیں' مانا کہ محلے میں کلینک ہے' مگر آپ کسی کو تو اپنے ساتھ لایا کریں' آپ سے زیادہ آپ کے گھر والوں پر حیرت ہوتی ہے کہ اس حالت میں آپ کو اکیلے آنے ہی کیسے دیتے ہیں۔''

اس نے مجھے واپس بٹھاتے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کمپاؤنڈر کو اندر بلایا تھا جو فوراً ''حاضر ہو گیا۔

''زاہد! ان کو گھر چھوڑ کر آؤ اور کوئی ان کا گھر والا ملے تو میرا پیغام دینا کہ میں نے مریضوں کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت نہیں دی ہوئی۔ اپنے اکیلے مریض اپنی ذمہ داری پر بھیجا کریں۔'' میں اپنی صفائی میں کچھ منمنائی اور نا چاہتے ہوئے بھی زاہد کا سہارا لیے کمرے سے باہر آگئی۔

پورے راستے ڈگمگاتی رہی اور غصہ بھی کھاتی رہی۔ کزن ایسے ہوتے ہیں۔ بیماری میں بھی میرا کوئی احساس نہیں اسے' بدتمیز ایک تو گھر پر بلایا تھا کہ آکر دیکھ لے' مگر نہیں صاف مکر گیا اور حکم دے دیا کہ کلینک پر آکر دکھاؤں۔۔۔ اوپر سے ذلیل بھی کیسے دریا دلی سے کر رہا تھا۔ جیسے اس کا حق ہو۔ غصے کی ایک لہر خود پر بھی چڑھ دوڑی' میں بھی تو ذرا ذرا سی بیماری کو گلے سے لگا کر رکھتی ہوں۔ اب اگر یہ کھانسی ہر سردی میں ہوتی ہی ہے تو کیوں اس کے ناز اٹھاتی ہوں۔۔۔ پڑی رہوں کمرے میں اور چپ چاپ مر جاؤں۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔ کھانسی سے مرنا بھی کوئی مرنا ہوا۔ جیسے شیر چوہے کی موت مر جائے' میں مرنے کے لیے ایسی معمولی سی بیماری کو ناکافی سمجھتی تھی۔۔۔ مطلب کہ بیمار ہو کر ہی مرنا ہے تو کوئی ایسی انوکھی بیماری ہو جس کا نام بھی مشکل ہو اور جو لاعلاج ہو جس کا چرچا پورے شہر میں نہیں تو کم از کم محلے بھر میں تو ہو کہ مجھے ایسی جان لیوا بیماری لگ گئی ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں افسوس

اُمڈ آئے۔ لہجوں میں میرے لیے مٹھاس بھر جائے۔ ایسے میں کسی کو شک بھی نہیں ہو گا اور پھر کھانسی سے اول تو میرے مرنے کے بہت ہی کم چانس تھے دوسرا یہ تکلیف دہ کھانسی کے دورے اور شدید بخار سہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

میں تنگ آکر آخر کار ڈاکٹر یعنی اپنے پھوپھی زاد کے پاس دوڑ جاتی' مگر یہاں اس بار کچھ غلطی یہ ہوئی تھی کہ کافی طبیعت خراب ہونے پر میں اس کے پاس پہنچی تھی اور پھر اچھا خاصا دوائی لیتے لیتے خود سے ہی کسی بات پر ناراض ہو کر دوائی چھوڑ بیٹھی تھی اور اب جو پورے گھر میں اکیلی ہوئی اور طبیعت کچھ زیادہ ہی ناساز ہوئی تو ڈر کے پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی آگئی تھی' جس کا خمیازہ بھی بھگت لیا تھا اور اپنی حد سے زیادہ بے عزتی بھی کروالی تھی۔ چلو اب سکون رہے گا۔ ہم جیسوں کو دن بھر میں ایک بار کسی نہ کسی سے ذلیل ہونے کا ایسا چسکا لگا رہتا ہے جیسے کوئی بڑی بیماری سے بچنے والا ٹیکہ۔۔۔ کچھ بھی ہو ٹیکہ لگوانا ضروری ہے' بے عزتی کا ٹیکہ' ہونہہ!

دو چار گھر چھوڑ کر ہی میرا گھر تھا۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے پر بھی چند منٹ میں ہی گھر آگیا۔ گھر پر کوئی ہوتا تو زاہد اس کا پیغام دیتا۔ میرے پاس گیٹ کی چابی تھی۔ میں شکریہ کہہ کر گھر میں داخل ہو گئی اور چکراتی۔۔۔ ڈولتی۔۔۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گر گئی۔

سب گھر والے ایک شادی میں گئے ہوئے تھے اور میں نے اکیلے کلینک جانے کے ڈر سے ہی اس کو فون کیا تھا کہ مجھے کلینک سے واپسی پر دیکھتا جائے' مگر اس نے بدتمیزی سے انکار کر کے مجھے کلینک میں بلایا تھا۔ ویسے تو اکثر ہی وہ کلینک سے زاہد کو دوڑاتا اور کبھی چائے تو کبھی پانی منگوا لیتا تھا' مگر بیمار دیکھنے کے لیے بھی نہ آتا' یہاں تک کہ بابا جانی بھی موسمی بیماری کی دوائی لینے اس کی کلینک جانے پر مجبور تھے۔

اس پر بھی سب اس سے خوش تھے۔ کیونکہ اس قدر اکھڑ۔۔۔ بدماغ اور بدتمیز صرف میرے ساتھ ہی

Downloaded From http://paksociety.com

تھا۔ خاندان کے باقی لوگ اس کی خوش اخلاقی کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے اور میں اکثر حیران ہوتی' میں جس طرح لوگوں... ان کے رویوں اور حالات کو دیکھتی ہوں اس طرح دنیا ہرگز نہیں دیکھتی' میں آج تک دنیا سے الگ تھلگ... دوسری نہیں بلکہ شاید تیسری سمت میں کیوں سوچتی ہوں؟ اور اسی وجہ سے دنیا کی نظر میں ناکام ہوں... کیا جواز ہے میرے پاس' کوئی حیلہ' بہانہ' اپنی نالائقی' نااہلی اور ناکامی کا' یہ دنیا سے مخالف سمت پر چلنے سے دنیا کی نظر میں آگے نہیں پیچھے جارہی ہوں۔ پھر بھی بضد ہوں کہ اسی طرح مخالف سمت پر منہ کرکے چلتی چلی جاؤں گی' میں سوچتے سوچتے سوگئی تھی۔

رات کے کسی پہر کسی نے دھیرے سے پیشانی پر ہاتھ پھیرا' باباجانی سرہانے بیٹھے مسکرارہے تھے۔

"کیسا محسوس کررہی ہو بیٹا؟"

باباجانی نے کچھ اس اپنائیت سے پوچھا کہ دل بھر آیا' آنکھ سے دو چار آنسو بھی لڑھک گئے۔ باباجانی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور یہ کہتے جلدی سے کمرے سے نکل گئے کہ سوپ بنوارہے ہیں۔

یہ باپ' بیٹی کے آنسوؤں سے اس قدر خوف کیوں کھاتے ہیں؟ میں سوچتے سوچتے اٹھ بیٹھی' اب جو دوسری سمت نظر کی تو ٹھٹک گئی۔ وہ کمرے کے دوسرے سرے پر رکھے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا مجھے بغور دیکھ رہا تھا' میں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

وہ اسی سختی سے بولا' میں اس کے منہ لگنے کی نہ تو اہل ہوں نہ ہی اس وقت ہمت تھی اور مجھے آج شام ہی بے عزتی کا ٹیکہ لگا کر اس نے ہفتے بھر کا کوٹہ پورا کردیا تھا۔ پھر بھی میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"روٹی' کپڑا' اور مکان۔"

وہ جھنجلا کر تیز لہجے میں گویا ہوا۔ "دراصل میں بھرے پیٹ میں ایسے ہی ہری ہری سوجھتی ہے' پڑھی لکھی جاہل ہو تم' کبھی ذرا اپنے اردگرد بھی دیکھو کتنی سخت ہے یہ زندگی' کچھ لوگوں کو دن بھر میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا' کچھ بچے محنت مزدوری کرکے سارا دن سڑکوں پر پھر پھر کر بڑے ہوجاتے ہیں۔ اسکول کی شکل تک نہیں دیکھتے' کہیں بلاوجہ کی دشمنی میں لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں' زندہ جلارہے ہیں اور ایک تم ہو' سب کچھ ملا ہوا ہے پھر بھی' یہ قنوطیت طاری رکھنے سے کوئی بہت ہیروئن نہیں لگتیں تم اور سڑی سی لگنے لگتی ہو۔"

مشکل سے روکے ہوئے آنسو پھر بہہ نکلے۔ وہ سناتے سناتے چپ ہوگیا۔ پھر اٹھ کر میرے سرہانے جس کرسی پر تھوڑی دیر پہلے باباجانی بیٹھے ہوئے تھے آکر بیٹھ گیا۔

"کچھ ماموں جان کا ہی سوچو' وہ بے چارے ویسے ہی ممانی جان کی وجہ سے احساس جرم سے دبے رہتے ہیں' اوپر سے تم یوں بیمار پڑ کر' رو دھو کر اور بھی ان کا احساس جرم بڑھاتی رہتی ہو۔ ہمیشہ سمجھایا ہے کہ تم انوکھی نہیں ہو' ہوتا ہے اکثر ایسا ہی کہ سوتیلی ماں' اصل ماں نہیں بنتی بلکہ اپنے بچوں کے آنے پر تو بالکل ہی سوتیلی بن جاتی ہے' مگر ماموں جان کا اس میں کیا قصور' ان کی نیت تو تم سے صاف ہی ہے نا' وہ بے چارے تمہارا خیال رکھنے کی پوری کوشش تو کرتے ہیں۔ اب تم بھی کوئی چھوٹی بچی تو ہو نہیں' خود اپنا خیال رکھ سکتی ہو۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے ہوئے میرا اسٹیتھو اسکوپ سے معائنہ بھی کررہا تھا' میں سردی محسوس کرکے گردن تک کمبل اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے اچھی طرح سے معائنے کے بعد مجھے سوپ کا پیالہ پکڑا دیا جو تھوڑی دیر پہلے ملازمہ دے گئی تھی۔

بات صرف اتنی ہی سی تو نہیں تھی۔ اس نے تو دو چار لفظوں میں میری پوری زندگی ہی سمیٹ دی تھی۔ باباجانی نے دوسری شادی کہنے کو میری خاطر کی تھی۔ ماما کے آنے سے مجھے ماں کیا ملتی' مجھ سے تو باباجانی بھی دور ہوگئے۔ پہلے کم از کم باباجانی تو مجھے میسر تھے۔ خیر کسی ڈر و خوف کے مجھے گلے تو لگالیتے تھے' گود میں

Downloaded From http://paksociety.com

بھی لیتے تھے' اکثر اسکول بھی چھوڑنے یا لینے آجاتے تھے' مگر ماما کے آتے کے ساتھ ہی بابا جانی سمٹ گئے۔

ایسے میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں بابا جانی کی دوسری شادی کو کس طرح جانچوں' وہ تو کہتے ہیں کہ دوسری شادی انہوں نے امی جان کے مرنے کے دوسرے ہی سال اس لیے کی کہ ان کی آٹھ سالہ بچی یعنی مجھے ماں کی اشد ضرورت تھی' مگر ضرورت میری تو کبھی بھی پوری نہ ہو سکی بلکہ شاید تشنگی اور بڑھ گئی۔ پانی کے قریب ہونے پر بھی پیاس برقرار رہی۔

میں نے اپنے ہوش سنبھالتے ہی ماما کو سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے میری تربیت آتے کے ساتھ ہی چند ہی دنوں میں مکمل طور پر کر دی تھی اور تربیت یہی تھی کہ کچھ بھی ہو میں ماما سے کسی بھی قسم کی کوئی امید نہ رکھوں۔ مجھے یاد ہے شروع میں تو بابا جانی بہت کوشش کرتے کہ ماما مجھے برداشت کر لیں' مگر دوسرے بھائی بہنوں کے آتے اور ان کے ہوش سنبھالنے تک بابا جانی نے بھی ہار مان لی تھی اور جس وجہ سے ماما اس گھر میں آئی تھیں۔ کہیں کسی کونے میں جا دبکی تھی۔

ویسے تو مجھے بھی گھر میں آرام' تحفظ' تعلیم' روپیہ پیسہ سب ہی تقریباً" ماما کے بچوں جتنا ہی میسر تھا' مگر پھر بھی۔ میری کوئی ذمہ داری نہیں لیتا تھا' میں گھنٹوں گھر سے باہر رہوں۔ باہر کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں' بیمار ہو جاؤں' کسی مشکل میں پھنس جاؤں' کوئی ذمہ دار نہ تھا نہ ہی مجھے کسی کو پکارنے کی اجازت ہی تھی۔ یہاں تک کہ بابا جانی بھی میری پکار پر اکثر خاموش ہی رہتے۔ بھرے ہوئے گھر میں بھی تنہا تھی۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی اکیلی تھی۔ اوپر سے کئی سردیوں سے یہی ہونے لگا۔ میری کھانسی بڑھ جاتی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا علاج کرواتی جاتی۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ کوئی ہو جو محبت سے دوائی دے۔ بخار میں تپتی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھے یا پھر کبھی آکر بس دو چار منٹ پاس بیٹھ کر حال چال ہی پوچھ لے۔

ایسے میں پھوپھی جان ہی تھیں جن سے میں دل کا حال احوال کہہ سن لیتی تھی' مگر ماما کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔ ابھی پچھلے دنوں ہی پھوپھی جان نے بابا جان کو میرا دھیان رکھنے کے لیے دو چار لفظ ہی کہے تھے کہ ماما کا پارہ چڑھ گیا تھا اور بابا جانی دونوں کے درمیان صلح صفائی ابھی تک نہیں کروا سکے تھے۔ شاید اسی لیے ابھی تک پھوپھی جان مجھ سے ملنے نہیں آئی تھیں۔ ورنہ ہر سردی میں وہ ایسے وقت میں میرے پاس رہنے آجاتی تھیں۔۔۔ اسی وجہ سے اس بار تنہائی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہارا فون کہاں ہے؟"

اس نے میرے سوپ پی کر فارغ ہوتے کے ساتھ ہی پوچھا' میں نے سائیڈ ٹیبل کی طرف دیکھا تو وہ اٹھ کر بکھری ہوئی دوائیوں' بسکٹ کے ڈبوں اور دیگر چیزوں کے درمیان میرا فون ڈھونڈنے لگا۔ فون ملا جو کہ چارج نہ کیے جانے پر بند پڑا تھا۔ تب ہی آج ایک بار بھی بابا جانی نے فون کر کے میرا حال احوال نہیں پوچھا تھا' اس نے مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھ کر چارجر ڈھونڈ کر فون دوبارہ اسٹارٹ کر دیا تھا جو اپنی مخصوص دھن سناتا زندہ ہو گیا۔

دل میں کسک جاگی۔ ایسے ہی کاش کوئی مجھ پر بھی مہربانی کر دے' میں کب سے بہت سی بے جان چیزوں کے درمیان خود بھی بے جان ہوئی پڑی ہوں' کوئی مجھے بھی اسی طرح میری مطلب کی توانائی سے میرا سرا جوڑ کر مجھے زندہ کرنے کی سعی کر لے' شاید میں بھی اسی طرح دھن سناتی' گنگناتی جاگ اٹھوں' زندہ ہو جاؤں۔ واقعی میرا مسئلہ کیا ہے؟ موت؟ زندگی؟ یا پھر بس' وجود مجھے کہیں بھی کوئی میرے اس وجود۔۔۔ میرے ہونے کا احساس تو دلائے۔۔۔ کبھی کوئی اس طرح میرے کسی کونے میں کئی صدیوں سے بے جان پڑے ہونے پر مجھے تلاش تو کرے کیا مجھ سے' میری زندگی سے کسی کو کچھ بھی حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں' کیا واقعی کسی کو میری کوئی ضرورت نہیں۔۔۔؟

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور راہ داری میں کبھی کبھار کوئی گزرتا ادھر بھی نظر کر لیتا۔ تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹک کر کمرے میں' اسے اور مجھے بغور دیکھتا اور پھر

Downloaded From http://paksociety.com

آگے بڑھ جاتا۔

"امی نے مجھے منع کیا تھا کہ تم سے اب نہ ملوں۔۔۔"

اس نے دو ایک بار کسی کو گزرتے کمرے میں نظر ڈالتے، دیکھتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر سسک اٹھی پھوپھی جان کیا اب وہ بھی مجھ سے بدلے لیں گی؟ اماں کی بدتہذیبی اور بابا جانی کی خاموشی کی سزا مجھے دیں گی؟ پھوپھی جان کو معلوم بھی ہے کہ میں بیمار ہوں پھر بھی انہوں نے اس اکھڑ کو اور بھی بدلحاظ ہو جانے کا کہہ دیا۔ گو میں اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی پھر بھی اس کی بات نے مجھے ایسا دکھ دیا تھا کہ میں لڑکھڑاتی زبان سے پوچھ بیٹھی۔

"تو کیا؟ تو کیا اب تم مجھ سے کبھی نہیں ملو گے؟"

میرے سوال پر مجھ پر ایک نظر بے نیازی سے ڈالتا وہ فخریہ سا مسکرا اٹھا۔

"دراصل میں اس معاملے میں پہلے تھوڑا بے وقوف بن گیا۔ مجھ پر واردات تو کئی روز ہوئے گزر چکی تھی، مگر میں سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مانتا نہیں چاہتا تھا میں تم سے کئی بار سوال کر چکا تھا تم سے تمہارا مسئلہ جاننے کی کوشش کرتا تھا، مگر اپنا ہی مسئلہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اور پھر تم بھی تو اپنی ہی دُھن میں اس قدر مگن تھیں کہ تمہیں کبھی تمہاری ذات کے باہر کوئی نظر ہی نہیں آیا، تم نے اپنے وجود کو ایسی دھند بنا لیا کہ جس میں ہاتھ بھر کے فاصلے پر کھڑے ساتھ چلتے کو بھی دیکھ نہیں پاتیں۔"

وہ سانس لینے رکا اور میں نے پہلو بدلا، وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میری کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کچھ نہیں بھی آ رہا تھا، مگر میں دم بخود اس کو سنتی چلی جا رہی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ وہ بات ختم کیے بغیر ہی اٹھ کر چلا جائے۔ آج پہلی بار وہ مجھ سے اس طرح اتنی دیر کے لیے مخاطب ہوا تھا اور شاید آخری بار بھی۔

"شیریں؟"

واقعی یہ دھند تھی۔ دور تک کچھ دکھائی نہیں دے، رہا تھا کہ اس کی پکار مجھ تک پہنچی۔ دھند اچانک چھٹ گئی اور پھر سب کچھ بہت واضح ہو کر نظر آنے لگا۔ وہ ابھی بھی میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ مجھ سے مخاطب تھا، مجھے نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتا ہوا، مجھے پکارتا ہوا۔

"شیریں! جب امی نے مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا تو میں تمہاری دھند میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ اپنا مسئلہ سمجھ نہیں پایا تھا، میں نے امی کو صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر امی کی ممانی جان سے ان بن ہو گئی اور امی نے مجھے سختی سے تم سے یا اس گھر میں کسی سے بھی رابطہ رکھنے سے زندگی میں پہلی بار منع کیا تو جانتی ہو شیریں! مجھے احساس ہوا کہ جس دھند میں تم تھیں اس نے اندھا مجھے بھی کر رکھا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں ڈر گیا۔ حقیقت تمہارے بغیر مجھے بہت بے معنی سی لگنے لگی اس لیے میں بپھر گیا اور کافی دن کی سوچ بچار کے بعد امی سے باقاعدہ بحث پر اتر آیا، پہلے پہل تو ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تم اکیلی پڑ جاؤ گی، دکھی ہو جاؤ گی، مر جاؤ گی انہوں نے ہر مسئلہ کا حل پہلے سے سوچ رکھا تھا اور حل بھی کیا تھا، وہی، میں نہیں تو کوئی اور۔۔۔ اور اگر کوئی "اور" تو پھر مجھے تمہارے سامنے آنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں گڑبڑا گیا۔ تھک ہار کر سچ کا سامنا کیا، کسی ماہر وکیل کی طرح اپنا مسئلہ بیان کیا، ان کو سمجھایا، مگر آخر کار وہ بھی میری ماں ہیں۔ پتا ہے انہوں نے کیا کہا؟"

وہ رک کر مجھے دیکھنے لگا، مگر میں تو خود ہی اس قدر محو تھی کہ بس سر نفی میں ہلا کر رہ گئی تھی۔

"امی نے کہا کہ ہاں اب آئے ہو تم پہاڑ کے نیچے اور پھر کہنے لگیں کہ شیریں کو بھی جلد سیدھا کرتی ہوں، ہر وقت مرنے مارنے کی باتیں کرتی رہتی ہے، بہت مرنے کا شوق ہے نا اسے اب جلد اس کی موت کا سامان کرتی ہوں۔ میں تو کہتا ہوں، تیار ہو جاؤ شیریں! تمہارا برا وقت آنے والا ہے۔"

وہ آخری جملہ شرارت سے مکمل کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

میں زیر لب مسکرا اٹھی بالآخر۔۔۔ میرے وجود کو بھی توانائی کا سرا ملا اور اب میں اپنی مخصوص دھن گنگناتی زندہ ہو گئی ہوں۔

☆

Downloaded From http://paksociety.com

مصباح علی سید

کارزارِ دعا

جائے نماز پر سر نہوڑے بیٹھے اسے کتنے پل بیت گئے تھے۔ دعا کے لیے ہاتھ پھیلے تھے۔ ریشمی ہونٹ مسلسل ورد کے بعد اکڑنے شروع ہو گئے۔ کانچ سی پتلیاں ہتھیلیوں پر جمی رہ گئیں۔ آنکھوں میں بنتی پھیلتی گلابی لکیروں نے نمی کو اکسایا۔ بس پہلا قطرہ بمشکل نکلتا ہے' پھر سیل رواں اڈنے کے لیے بے قرار تھا۔ یہاں تک کہ ستواں ناک کے دونوں جانب نرم گالوں پر لکیریں چمکنے لگیں۔ اور دامن بھیگتا گیا۔ تیرتی سانسوں کے بیچ دل بے قرار بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آمنہ نے کتنی بار سمجھایا۔

"نماز پڑھ کر ایسے مت اٹھ جایا کر' نماز دل کو نرم کرتی ہے' بندگی' یقین باندھتی ہے' اور دعا تو قبول ہی تب ہوتی ہے جب تصور میں یقین اور بندگی مضبوط ہوں۔۔۔"

"ہونہہ۔۔۔" وہ بدبدائی "میں اور میری دعاؤں کا اثر۔" زخمی مسکان نارنجی ہونٹوں پر ابھرتے ہی معدوم ہو گئی۔

"ایسے نہیں کہتے' کم عقل۔" انہوں نے اسے ڈپٹا۔ "اللہ تعالیٰ سمیع البصیر ہے' اسے زیادہ پتا ہے' کب'

مکمل ناول

Downloaded From http://paksociety.com

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

کیسے دعا قبول کرنی ہے۔"

تنزیلہ کو اب ان باتوں میں ذرا دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا دل چوبیس گھنٹوں میں تیئس گھنٹے پچپن منٹ یہی کہتا تھا "جب قسمت لکھ دی' دعا کیا کرے گی؟

البتہ پانچ منٹ کے لیے دل کی دھڑکن ساکن ہو جاتی' ذہن ماؤف بہت امید سے تاروں سے جھلملاتے آسمان پر آہستہ آہستہ نگاہ جاتی' کسی امید' خوف' التجا جیسی۔ ابلتے آنسوؤں سے نم گوشوں کو نرم ہوا کے جھونکے سکھا دیتے۔ پھر وہی بے یقینی۔

"نہیں قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا' لیکن اللہ جی' میری ہی قسمت میں کیوں؟ ہر تیسرے شخص کی طرح دن میں ہزاروں شکوہ (بھلا سوچو اللہ نے امتحان میں کیا پہاڑوں' سمندروں کو ڈالنا ہے' جنت میں عیش انسان کرے گا تو آزمائش جیسی قیمت اسے ہی دینا ہو گی) شکوہ کناں ہوتے ہی پل بھر کے لیے آنکھیں میچتے لمحے دعا نکلتی۔

"اے اللہ! یا تو اسے ملا دے یا پھر دل سے نکال دے۔"

کتنی عجیب بات ہے' جس چیز کو سمیٹ کر اس نے اپنا دل بنا رکھا تھا وہ تن سے کیسے نکل سکتا تھا؟

☼ ☼ ☼

بہت چھوٹی عمر میں ان دونوں کا مضبوط بندھن بندھ گیا تھا۔ تب نکاح کا مطلب بھی پتا نہ تھا۔ تایا' تائی کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ تایا موقع پر چل بسے' تائی نے البتہ ہسپتال تک سانس کھینچ لی۔ آخری ٹوٹی جوڑتی سانسوں میں آمنہ کا ہاتھ پکڑ کر آنسوؤں کے بیچ بھیگتی آواز میں کہا تھا۔

"آمنہ! اللہ کے بعد میرا رازی تیرے حوالے' بڑا ہو گا تو اسے اپنا بیٹا بنا لینا۔"

"بھابھی! رازی آج بھی میرا بیٹا ہے' کیوں فکر کرتی ہے۔"

"نہیں آمنہ! خدا کے واسطے' مجھے یقین دے' تو اسے مالکل اپنے بیٹے کی طرح پالے گی' جیسے تنو' ویسے.... وہ مجھے بہت پیاری ہے' کاش میں.... جیتی اور.... خود۔" انہوں نے ہچکولے لینے شروع کیے۔ ڈاکٹر نرسیں جمع ہو گئے مگر وہ آمنہ سے مخاطب تھیں۔

"بتا آمنہ! تو رازی اور تنو کا نکاح۔"

"بھابھی! ایسی باتیں نہ کر.... تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"بتا ناں.... بتا۔" وہ ہاتھ پکڑے اصرار کر رہی تھیں۔ آمنہ نے سر ایک دو بار ہلاتے تسلی دی۔

"تو بے فکر رہ بھابھی! رازی میرا ہی بیٹا ہے' اور دونوں کا نکاح بھی...."

ابھی لفظ زبان تلے تھے' صغریٰ کے چہرے پر اطمینان پھیلتا گیا۔ اکلوتی اولاد کو تحفظ ملا' روح کو امان مل گئی۔

☼ ☼ ☼

دس سالہ تنزیلہ' بارہ سالہ رازی کا تایا' تائی کی برسی پر نکاح کر کے آمنہ نے اپنے الفاظ پورے کر دیے۔ وہ صغریٰ بھابھی کے سامنے سرخرو ہو گئیں۔ اس عمر میں بچے اپنے تعلق کی نزاکت سے بے پروا ساتھ ساتھ کھیل کود' پڑھ لکھ جوان ہو گئے۔ ماں باپ کی کمی نے رازی کو چڑچڑا' بدتمیز' اکھڑ بنا دیا تھا۔ بات بے بات جھگڑا' کھانے پینے میں عیب۔

"مرغی کیوں پکائی' بدبو آتی ہے' کریلے زہر جیسے لگتے' کدو پھیکا تو چاول کچے' روٹی جلی ہوئی لگتی' دو چار نوالے لے کر ناک منہ چڑھا کر برتن پٹخ اٹھ جاتا۔ آمنہ اس کا ہاتھ پکڑتی رہ جاتیں مگر وہ اتنی بے رحمی سے جھٹکتا کہ ان کا بازو جوڑ سے ہل جاتا تھا۔ اسکول سے روز شکایات آنے لگیں۔

کسی کی کتاب کھو دی' کسی کا قلم توڑ دیا' کسی کا سر پھاڑ دیا اور تو اور صرف چودہ برس کی عمر میں پاؤں اڑا کر ماسٹر کو گرا دیا۔ شکایت بھیج کر احسان کو بلایا گیا۔ وہ آئے دن کی شکایات سے عاجز تھے۔ تھپڑ مارتے گالیاں بکتے گھر تک لائے۔ اور پلنگ پر دھکا دیا۔ آمنہ نے سینہ تھام لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"اے ہے کیا ہوا۔۔۔ کیوں مارتے ہو بچے کو۔"

"جانے کب سدھرے گا' یہ بد بخت۔" احسان نے ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ "اور تم نے۔"

انہوں نے اگلے دانت جماتے قہر آلود نگاہ آمنہ پر ڈالی جو پر جوش سی اٹھی تھیں' ساری کانپ گئیں۔ غالباً" آمنہ کا ان کے نکاح پر بے جا ضد اور پھر کروا کر دم لینا' انہیں رہ رہ کر غصہ دلاتا۔ بہت سمجھایا مگر نہیں مانیں۔ کیا کسی دیورانی' جیٹھانی میں محبت ہوگی' جتنی صغریٰ اور آمنہ میں تھی۔ شروع سے ایک گھر میں رہیں۔ کسی بات پر اختلاف' جھگڑا نہیں۔ چند سال بعد پوری رضامندی سے اپنے اپنے باورچی خانے الگ کر لیے۔ پھر بھی ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹانا۔ دونوں بھائیوں کی مشترکہ دکان تھی۔ پورے حساب کتاب سے معاملات درست چل رہے تھے کہ بڑے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پیچھے رہ جانے والی ان کی اولاد جان سے عزیز بن گئی۔ آمنہ کو اپنی بات کا بھرم بھی اس قدر عزیز تھا کہ مان کر نہ دیں۔

"میں نے صغریٰ کے نکلتے دم زبان دی تھی' مکروں گی نہیں۔"

"زبان دے دی تھی تو منہ میں تلوار کیوں لٹکالی نیک بخت' کیوں بچی کے پیچھے پڑی ہے۔" وہ بارہا کہتے۔

"انہیں بڑا ہو جانے دو بھلی مانس' جانے وقت پر کون کیسا نکلے' ہمارا بچی کا معاملہ ہے۔"

"کون کیسے؟ یہ کیا مطلب ہوا۔" وہ تنک گئیں۔ "اچھی تربیت کروں گی' اچھے ہی بنیں گے۔"

"چلو مان لیا اچھے۔۔۔ اور اگر اس اچھا' اچھی میں ایک زیادہ اچھا بن گیا' دوسرے کو ناپسند کیا؟"

"ایسے ہی ناپسند کیا۔" وہ چھری سبزی میں پٹخ کر گھومیں "اور میاں" یہی تو وجہ ہے نکاح کرنے کی' نا پسندیدگی کی کوئی صورت چھوڑیں گے' تب ناں۔۔۔ اندھا' کانا' گورا کالا' نصیب سمجھ کر برداشت کریں گے' تو کے ابا۔۔۔ مگر تم میں تو ذرا دوراندیشی نہیں۔۔۔"

"ہاں۔" وہ ناگواری سے بولے "تمہیں تو پہاڑ کے اندر تک دکھائی دیتا ہے' کیا کہنے تمہاری نگاہ کے۔"

وہ پیچھے ہٹنے والی نہ تھیں ہر بات پر دلیل۔

"اگر رازی داماد ہو گا تو' ہماری نظر میں اس کی محبت الگ ہی رہے گی' غیر کی اولاد بن کر بھاری نہیں پڑے گا' ہماری اکلوتی اولاد بیاہ کر کہیں اور چلی گئی تو کیا رازی کی دلہن ہم بڈھا بڈھی کو برداشت کرے گی' ہماری اکلوتی بیٹی ہے' ہمیشہ گھر میں سامنے نظروں کے رہے گی میاں' سسرال' سمدھیانے کے جھنجھٹ بھی نہیں' پھر رازی بھی احسان مندی میں دب کے رہے گا' تمہاری چھوٹی عقل میں کچھ آتا ہی نہیں۔"

آمنہ نے آخر منوا کر ہی دم لیا۔ نکاح ہو گیا۔

آمنہ کی دوراندیشی سال بعد ہی رنگ بدل کر سامنے کھڑی تھی۔ پیار محبت کرنے والا پیارا سا رازی بالکل ہی بدلنے لگا تھا۔ بس ابتدا احسان صاحب سے ہوئی تھی۔

وہ صبح سے گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔۔۔ بہت سے دوست اکٹھے کر کے خوب چوکے' چھکے۔ اگلے دن اس کا اردو کا ٹیسٹ تھا اور اردو اس کی انتہائی کمزور' ٹیوشن رکھ لی فرق نہ پڑا۔ وہ گھر کھانا کھانے آئے تھے' اسے کھیلتا دیکھ کر کلس گئے۔ کلائی پکڑ گھر لائے' کمرے میں بند کر دیا۔

"انسان بن کر اپنا ٹیسٹ تیار کر' جب دیکھو کھیل رہا ہے۔"

ڈپٹ کر باہر نکلتے چچا کی پشت کو اس نے نخوت سے گھورا۔ دل میں آیا ساری کتابیں پھاڑ کر' ان کی پشت پہ دے مارے مگر کر نہ سکا۔ دو چار رٹے لگائے' رٹوں کے دوران ہی سلاخوں والی کھڑکی سے نیچے برآمدے میں بیٹھی تنویر پر نگاہ گئی۔ سہیلی کے ساتھ گیند بے کھیل رہی تھی۔ تن من سلگ گیا۔ ایک تو لڑکے اس کا نام لے لے کر چھیڑتے تھے' اوپر سے اس کی بے فکری۔

"اپنی بیٹی ہے ناں' تبھی تو اسے کھیلنے سے منع

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں کرتے' اس کی پڑھائی کی فکر نہیں' صرف میری ہے' ہونہہ۔" اس نے ضد باندھ لی "ٹیسٹ تیار کرتی ہے میری جوتی۔"

اگلے دن آدھے نمبروں والا ٹیسٹ گھر آیا۔ پھر کیا تھا احسان کی جوتی اور اس کی کمر۔

"بے حیا تو سیدھے طریقے سے نہیں مانے گا۔"

آمنہ بھاگ کر آگئیں۔

"کیوں مارتے ہو اسے' پڑھ لے گا۔ ماسٹر کم بخت کو بھی اس سے ضد ہے' جان کر نمبر کم دیتا ہے' جلتا ہے اس کی ذہانت سے۔"

"اس بھوسے کی ذہانت سے جلے گا؟"

انہوں نے ایک اور گھونسا لگا دیا۔ آمنہ نے اسے اپنے ساتھ پچکارتے ہوئے لپٹایا۔ میاں کو خفگی سے دیکھتے اس سے رسان سے بولیں۔

"کیوں ہونے لگا بھوسا' پڑھے گا لکھے گا' اک دن بڑا افسر بن جائے گا... ہیں ناں۔" انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ ذرا اونچی کی' آنکھوں میں جھانکا "میرا رازی تو سب سے اچھا ہے' ہے ناں۔" وہ خاموش رہا' گردن جھٹک کر جاتے چچا کو اس نے آنکھیں سکیڑے گہری نگاہ سے دیکھا۔ کوئی خفگی' شکوہ ان میں تیرتا تھا۔ آمنہ نے اسے چمکارتے ہوئے ساتھ لگالیا۔

"رازی! تو کیوں ایسے کرتا ہے' اپنے چچا کی بات مانا کر' وہ تجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔" وہ ایسے دانت کچکچا رہا تھا جیسے دانتوں میں نبولی آگئی ہو۔

"ہونہہ پیار' تب ہی سب کے سامنے مارتا ہے' وہاں نہ بیٹھ' اس سے نہ کھیل' پڑھ لے' پڑھ لے' پتا نہیں مجھے پڑھا کر کیا لے گا۔"

"دیکھ رازی!"

انہوں نے پیار سے اس کے ماتھے کے بال پیچھے کیے' بوسا لیا۔ "تیرا چاچا چاہتا ہے' تو سب سے اچھا' لائق بنے' سب تجھ پہ رشک کریں' تیری زندگی قابل گزرے۔"

"اچھا تو چاچا یہ چاہتا ہے۔"

اس نے سوچا اور قابلیت سے ہی چڑ ہوگئی۔ ان کے سامنے ہر ایسا کام کرتا کہ وہ اندر تک کلس جاتے۔ خود کو بہت روکنے کے باوجود بھی ہاتھ اٹھ جاتا اور بعد میں خود ایک جانب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے' روتے پریشان ہوتے۔

"یا اللہ میں کیا کروں' لوگ کیا کہیں گے' ایک بھتیجا' وہ بھی نکھٹو' آوارہ۔" جب بیٹی کے مستقبل کی فکر ہوتی تو ہول اٹھتے۔

✲ ✲ ✲

رشتے تعلق کے جذبے سے لڑکے عاری ہو سکتے ہیں لیکن لڑکی کی فطرت میں ہی رشتوں کا تقدس' محبت گندھی ہوتی ہے' تعلق احساس بن کر دھڑکنے لگتا ہے' لوگوں کی زبانوں' اشارے کنارئیے' ہنسی ٹھٹھول نے رشتے میں جذبات پرو دیے۔ بچپن میں سمجھ نہ تھی پھر جیسے جیسے بڑی ہوئی وہ اکھڑ مغرور اچھا لگنے لگا۔ اس کے بھاری قدموں کی چاپ سن کر سارا خون چہرے پر سمٹ جاتا' حیا کی لالی سے گال دہکنے لگتے اور

جب بھولے بھٹکے مخاطب کرتا تو دل کی دھڑکن اس قدر بے ہنگم ہو جاتیں اس کی بات صحیح سے سمجھ میں بھی نہ آتی۔ اپنی ہی دھک دھک کانوں کے پردے پھاڑ دینے کو ہوتی تب وہ چلا کر بولتا۔

"اے بہری! تجھے میری بات سنائی دیتی ہے یا نہیں" سٹپٹا کر پوچھتی تھی۔

"ک ک کیا... کیا کہا تم نے...؟"

"کچھ نہیں...." اس کا غصہ' خفگی لہجے میں رچ گئی۔ گردن جھٹک بڑبڑایا "اپنی پاگل میرے متھے مار دی۔"

جسے چاہا جائے' جو دل کے طاقچے میں براجمان ہو اس کے لہجے کی درشتی بھی سکون دیتی ہے۔ اس کا کھرا لہجہ فرحت آگیں لگتا ہے' وہ اس فرحت میں کھو جاتی' خیالوں' گمانوں میں جانے کس دنیا کی سیر پر نکل جاتی۔ ہاں تکلیف تب ہوتی جب ابا اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے' برا بھلا کہتے' یا مار پیٹ قطعاً برداشت نہ ہوتی تھی۔ ایسا

Downloaded From http://paksociety.com

لگتا تھا کوئی اس کے اپنے من پر چابک برسا رہا ہو۔ ابا سے کہنے کی ہمت نہ تھی۔ البتہ اس کا قدرے اچھا موڈ دیکھ کر ڈرتے جھجکتے سمجھاتی ضرور تھی۔

"رازی! تو ابا سے فوراً" معافی مانگ لیا کر' ان کی مرضی کے خلاف نہ چلا کر' وہ تیرا برا نہیں چاہتے۔"

ایک اور چاچا کی حمایتی۔ اس نے تند نگاہوں سے گھورا اور باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

تپتی سنہری دوپہر تھی۔ دھوپ کی تمازت میں سب سائے ڈھونڈ رہے تھے۔ کالج سے آتے رازی کو شرارت سوجھی۔ کریم بخش کے بیل کی زنجیر کھول دی اور وہ بھی انتظار میں تھا۔ کھیت روندتا بھاگا' ساتھ والے گاؤں سے پکڑ کر لائے۔ ہانپتے کانپتے کریم نے احسان سے شکایت لگائی۔ وہ اب بچہ نہیں تھا۔ اٹھارہ انیس سالہ گڑیل نوجوان تھا۔ پھر بھی احسان کا ڈنڈا اور رازی کی ٹانگیں بازو۔ بدن نیل و نیل ہو گیا تھا۔

"کسی کے سامنے نظر ملانے کے قابل چھوڑے گا بھی یا ذلیل کر کے دم لے گا' بے غیرت۔"

انہوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔ آمنہ نے بہت شور ڈالا' ہاتھ پکڑ پکڑ کر روکا مگر انہوں نے کھا جانے والی ایسی نگاہوں سے گھورا۔ ان کی جرأت نہ ہوئی مزید آگے آنے کی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

تنزیلہ خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ تقریباً" آدھی رات کے وقت وہ چوری سے کھانا لے کر گئی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلا' بلب جلا' اس نے تیوری چڑھا کر دیکھا تھا۔ پھر نخوت سے رخ پھیر لیا۔ وہ اس کے قریب ٹرے رکھتے ہوئے مقابل بیٹھ گئی۔ خاموش — روٹھا اس نے بھینچے ہونٹوں پر زبان پھیری' پھر کاٹنے لگی۔ اس کی نگاہ سیاہ بالوں سے بھری مضبوط کلائیوں پر چھپے تازہ نیلوں پر ٹھہر گئی' سفید جلد پر گہرے نیلے داغ۔ دھڑکتے دل کے ساتھ بہت جھجکتے ہوئے وہ اپنی مخروطی انگلیاں اس کی کلائی تک لے گئی تھی۔ پوریں ابھی مس بھی نہ ہوئی تھیں۔ وہ پھنکارتے ہوئے دھاڑا۔

"چل اٹھ' یہاں سے جا' میرے سامنے نہ آیا کر' کچھ نہیں لگتا میں کسی کا۔"

ایک سخت ہاتھ مار کر ٹرے فرش پر الٹ دی تھی۔ کچے فرش نے مسالہ دار گرم شوربہ تیزی سے اپنے اندر جذب کر لیا۔

دو کانچ سی پتلیاں لبالب بھری جھیل میں ڈوب گئیں۔ پانی کے شدید دھندلکے میں وہ بمشکل اٹھی۔ دوپٹے کا پلو لبوں پر رکھ کر سسکیوں کا گلا گھونٹا' تیزی سے باہر نکلی اور اس کی چوکھٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کر پھر بہت دیر روئی تھی۔ محبت بھی عجیب شے ہے' انسان کو سب کچھ بخش کر زبان چھین لیتی ہے' وہ بھی گنگ ہوئی آنسو بہاتی' جتنے آنسو نکلتے دل پر اتنا ہی بوجھ بڑھتا گیا۔ اسی بھاری دل کے نرم گوشے میں کچھ دھڑکنے لگا تھا۔ شاید کچھ لفظ تھے۔ اسے پہلی بار ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر ابھی ابھی ہونٹ بنے ہوں۔ پہلے کپکپائے اور پھر کچھ ضدی انداز میں طلب گار بن گئے۔ اس نے ماں کو ہمیشہ ہاتھ اٹھائے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھا لیے۔ دل کے ہونٹ زور و شور سے اس کے طلب گار بن گئے۔ دعا' دعا اور کبھی نہ ختم ہونے والی مقبول دعا بن گئے۔

جانے کس پہر اس کی آنکھ لگی۔ قبلہ رخ لیٹی وہیں سو گئی۔ تہجد کی اذان پر وہ کسمساتے ہوئے سمٹی' آنکھ کھلی لب ہلتے محسوس ہوئے۔ شاید کچھ ورد کر رہے تھے۔ کچی زمین کی تپش چاند کی کرنوں نے بہت حد تک ماند کر دی۔ اک مسحور سی خنکی کا احساس تھا۔ اس نے پہلو بدلنا چاہا۔ کوئی کپڑا اس کے ساتھ لپٹتا محسوس ہوا۔ اس نے بازو پھیلا کر اپنے جسم پر محسوس کیا۔ اس پر ایک چادر لپٹی تھی۔ اس کا دماغ پوری طرح بیدار ہوا۔ وہ سمٹ کر اٹھ بیٹھی' چادر کو بغور دیکھا۔ نیلی پتیوں والی گلابی چادر۔ وہ تو رازی کے بستر کی چادر تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

"تو کیا رات کو وہ خود اسے اوڑھا گیا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ رازی؟ اس کو رات میں پیاس بہت لگتی تھی۔ وہ پانی پینے باہر نکلا۔ دروازے کے ساتھ دو کے ہندسے کی طرح وہ سکڑی لیٹی تھی۔ پہلے اسے حیرت ہوئی پھر غصہ آیا۔ جی چاہا ٹھوکر مار کر اپنے راستے سے ہٹا دے لیکن برداشت کرتا نظر انداز کر گیا۔ کمرے میں واپس آکر اس کی بے چینی مزید بڑھنے لگی۔ کبھی لیٹا' کبھی بیٹھا' آخر تنگ آکر اٹھا اپنے بستر کی چادر جھاڑ کر اسے اوڑھا دی اور واپس آکر سو گیا۔ وہ بھی اس کی چادر میں پرسکون سمٹ گئی تھی اور اب آنکھ کھلنے پر اس چادر سے نادیدہ لمس محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پورے استحقاق سے اسے اپنے گرد لپیٹا اس میں رچی رازی کی خوشبو' اس کا احساس خود میں سموتی پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

دکھ اور سکھ میں ایک قدر بے حد مشترک ہے' سب سے پہلے حواس چھینتے ہیں' نیند روٹھ جاتی ہے' اس کی خوش نما خیالوں کی رو بھٹک بھٹک کہاں سے کہاں پہنچ رہی تھی۔ وہ اٹھی وضو کیا۔ نفل پڑھے اور پورے خشوع سے شکرانہ ادا کیا تھا۔

آمنہ' احسان کے سامنے ہمیشہ اس کی ڈھال بنی تھیں' کسی صورت اس کی غلطی مان کر نہ دیتیں۔ کتنی بار اپنی آنکھوں سے اسے غلط کام کرتے دیکھا مگر نظر انداز کر گئیں۔ احسان کے سامنے ویسے ہی ڈٹ کر کہتیں۔

"میرا رازی ایسا کر ہی نہیں سکتا' رازی ایسا تھوڑا ہے۔۔۔ پاگل نہیں ہے وہ' ضرور دوسرے لڑکے نے ہی پنگا لیا ہو گا پھر ٹانگیں تو ٹوٹیں گی' نائیوں کے لڑکے تو ہوتے ہی لڑاکا ہیں' باپ کے استرے سے زیادہ ان کی زبان چلتی ہے' جھوٹ بول رہا ہو گا وہ کمینہ' رازی بھلا کیوں اس بلڈوزر کو دھکا دینے لگا' خوامخواہ تھوڑی کسی کی کتاب پھاڑے گا' ضرور اسی نے پہلے چھینی ہو گی' مانیٹر کو تو ویسے ہی اس سے اللہ واسطے کا بیر ہے' خود تو کالا' سوکھا' لمبا تڑنگا' جلتا ہے میرے بچے کے رنگ و روپ سے' اس بڈھے کریم کو تو سدا سے جھوٹ بولنے کی بیماری ہے' توبہ استغفار اپنی عمر کا بھی لحاظ نہیں' بلاوجہ میرے رازی کا نام لگا دیا' یہ کیوں کھولنے لگا کسی کا بیل' ایسا ہی عزیز تھا تو گود میں لیے بیٹھتا' راستے میں کیوں باندھ رکھا تھا اور وہ ماسٹر دو گز پڑی چیز دکھائی نہیں دیتی' موٹے شیشوں کی عینک لگائے چڑھائے پھرتا ہے' قدم اٹھانے سے پہلے گر جاتا ہے حسب قسمت گر گیا ہو گا' نام میرے بچے کا لگا دیا' خدا واسطے کا بیر لگا رکھے ہیں میرے لال سے' اللہ پوچھے گا ان کذابوں کو۔"

جتنی اس کی طرف دار بنتی اس سے زیادہ پچکارتی تھیں پھر سمجھا بجھا سلا دیتیں۔ لیکن انسان انسانوں سے جھوٹ بول سکتا ہے' دھوکا دے سکتا ہے مگر اپنے رب سے نہیں۔ وہ راتوں میں چھائے سناٹے میں اٹھتیں۔ اور رازی کی ہدایت کے لیے دعائیں مانگتیں۔

راتوں میں اٹھ کر یوں پکارنے کی عادت انہیں پچھلے مہینے سے ہوئی تھی۔ غالباً" چھوٹی موٹی غلطیوں کو وہ کبھی خاطر میں نہیں لائی تھیں۔ جوانی کی شرارتیں کہہ کر ٹال دیں مگر پچھلے مہینے سامنے گلی کے منصور نے جو کچھ بتایا ان کے ہوش اڑ گئے۔ گاؤں سے خاصے فاصلے پر پیراڈائز کا ڈیرہ تھا۔ نشے' فحاشی میں بدنام۔ منصور نے بتایا کالج اوقات میں اس نے کئی بار رازی کو اس رستے پر دیکھا ہے۔

"تیرا وہم ہو گا۔ کوئی اور ہو سکتا ہے رازی نہیں۔"

"خالہ! میں اندھا ہوں یا رازی کو نہیں پہچانتا۔"

آمنہ نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے "خدا کے واسطے اپنے چاچا کو نہ بتانا' میں خود اس کی خبر لوں گی۔"

اور تیسرے دن کی بات ہے' کپڑے دھوتے ہوئے اس کی شلوار کی جیب سے سگریٹ کی بھری ڈبی نکل آئی۔ آمنہ زمین میں دھنسنے کو تھیں کہ عقب سے اس کی گمبھیر آواز ابھری۔

"چاچی! یہ گیلی تو نہیں ہوئی۔"

Downloaded From http://paksociety.com

اس نے لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا' وہ ساکت سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"آج آگیا ہو گا اس کا باپ' اسے دکھاؤں گا' بڑا چاچے کے آگے کہتا پھرتا ہے اس کا بیٹا بڑا پار سا ہے۔۔۔ غلام حسین کے سامنے اس کے ہاتھ سے چھینی ہے' اسے بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔" ڈبی پکڑ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ آمنہ ٹھنڈے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"کس کی بات کر رہا ہے؟"

"منصور کی' یاروں کے ساتھ مل کر یہ حرکتیں کرتا ہے اور چاچا۔" اس کے منہ میں یک لخت کڑواہٹ ابھری۔ "ہر بار اس کی مثال دیتا ہے' وہ اچھا ہے' ایسا ہے' ویسا ہے۔۔۔ یہ ہیں حرکتیں اس کی۔۔۔ ہونہہ۔" اس نے جیب پر ہاتھ مارتے کہا۔ وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر دھیرے سے تصدیق کی۔

"سچ کہہ رہا ہے ناں تو۔۔۔ کہیں تیری تو۔" ان کا اشارہ ڈبی کی طرف تھا۔

"اوہ رہن دے چاچی۔۔۔!" اس نے ہاتھ جھٹکا۔ "چاچا کا ڈنڈا کم گرم ہے جو اس سے منہ ساڑوں گا۔" وہ پھیکا سا مسکرا کر گردن جھٹک باہر نکلا تھا اور ان کی بے یقین دل میں اک سکون اتر آیا۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ منصور نے اپنے دفاع میں شکایت کی کوشش کی تاکہ رازی کو اپنی ہی پڑ جائے۔ وہ احسان اس سے لاپروا ہو گئے' وہ باہر والوں سے ہو گیا۔ بلاجواز ضد اپنا ٹھکانا بدلنے لگی تھی۔ بند مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح پھسلتا وقت کبھی کانچ ریزوں سے ہتھیلیاں چیر کر گزرتا تھا۔ اب ایک تسلسل سے پھسلنے لگا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ ایک سے دن رات' کہیں کسی نے رازی کی کوئی شکایت نہ لگائی تھی' کالج میں آئے دن توڑ پھوڑ میں وہ پیش پیش ہوتا تھا' وہاں بھی خاموشی' سیاسی سرگرمیوں میں بڑھتی اس کی دلچسپی بھی مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے' رازی خود بخود سدھر جائے؟ وہ تو ایسا بھٹکا مسافر تھا جسے دکھائی دینے کے باوجود قطبین کھوئے محسوس ہوتے تھے۔

اس کا ہاتھ پکڑ پکڑ پگڈنڈی پر چڑھایا جاتا اور وہ اپنی ضد سے پھسل پھسل اترتا اور اب اچانک بغیر رہنمائی کے بھلا کیسے چلنے لگا۔ احسان اندر تک چونکے مگر ظاہر نہ کیا۔ مبادا پھر سے سرکشی عود آئے۔ گھر میں بھی گردن جھکائے داخل ہوتا' قدموں کی آہٹ تک زمین جذب کر لیتی۔ جو پکا کھا لیا' پسند نہ آیا ظاہر نہ کیا' وہی جو راتوں کو خوامخواہ ادھر ادھر پھرتا تھا' شام ڈھلے گھر' ہر وقت کے خرچے یک لخت سمٹ گئے۔ یہ تبدیلی معمولی نہیں تھی۔ جو آمنہ پر ظاہر نہ ہوتی۔ محسوس ہوا مگر پوچھنے سے گریز' جانے دماغ میں کیا چل رہا ہو جب مسلسل کئی دن گزر گئے تو رب کا شکر ادا کیا۔

"شکر ہے مالک! جو مزاج میں تبدیلی لاتا ہے۔"

اکثر اوقات احسان کو جتا جاتیں۔

"میں نہ کہتی تھی' وقت پر سب کو عقل آجاتی ہے' مگر تم لاٹھی سے لانا چاہتے تھے۔"

"او' نیک بخت' میں دشمن نہیں ہوں اس کا' میں چاہتا ہوں اس کے بازوؤں میں اتنا دم ہو کہ مجھے کندھا دے سکے' مٹی ڈال سکے مجھ پر۔۔۔"

"ایسہ! مرنے مارنے پر اتر آیا کرو ہمیشہ۔" وہ ناک چڑھا کر بولیں۔ "جب دم نکلتا ہے ناں میاں' کندھا اور مٹی آپو آپ مل جاتی ہے' میں کہہ رہی ہوں بچہ بال رہا ہے' بجائے بڑے میاں خوش ہونے کے باتیں شروع۔" چولھے سے ہانڈی اتار کر توا چڑھاتے خفت بھرے انداز میں کہا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ٹھنڈی آہ بھری۔

"بدل تو رہا ہے مگر بہت دیر اور بہت سست روی سے' بڑی امیدیں تھیں اس سے۔" ان کے تلخ لفظ پر انہوں نے ہاتھ اٹھایا۔

"بس میاں! یہ لفظ مت کہو۔۔۔ تمہارے غصے سے بگڑا ہے وہ' اب دیکھنا ایک دن تمہاری ساری امنگیں پوری کرے گا۔"

"اللہ کرے۔"

Downloaded From http://paksociety.com

وہ پاؤں پھیلاتے چارپائی پر لیٹ گئے۔ کمرے میں صغنوں کو پلٹتے رازی نے ساری باتیں سنیں اور چاچی کے توصیفی جملے اندر تک شانت کر گئے۔

زندگی ریل کی طرح سیدھی سپاٹ پٹڑی پر سفر ضرور کرتی ہے مگر منزل تک پہنچنے کے لیے کانٹے کا آنا اور جنکشن پر پٹڑی بدل کر موڑ کاٹنا از حد ضروری ہے۔ ان کی زندگی کی چھک چھو میں بڑا جنکشن آیا تھا۔ عام معمول کی سبزی ترکاری لاتے احسان کی سائیکل ویگن سے ٹکرائی۔ بہت تیز رفتار ڈرائیور تھا سنبھلنے کا موقع نہ ملا وہ اچھل کر بہت دور گرے۔ ہاتھ پاؤں چہرہ سب پر چوٹیں آئیں سب چوٹیں ایک طرف اور کولہے کی ہڈی کی چوٹ ایک طرف۔ ڈاکٹروں نے فوراً" آپریشن کے ذریعے راڈ ڈالنے کا کہا تھا۔ آمنہ کے ہوش اڑ گئے۔ اچھا خاصا خرچا تھا۔ کچھ جمع پونجی تھی کچھ زیور۔ وہ ہاتھ میں ہار پکڑے اس کے وزن کا اندازہ لگا رہی تھیں۔

"پرانا بنا ہے' ٹانکے ہی ٹانکے... کیا رقم ملے گی چند ہزار۔" ان کی خود کلامی پر وہ عقب سے بولا۔

"امی کے بھی تو ہوں گے' وہ ڈال کر شاید کافی ہو جائے۔"

وہ اچھا خاصا چونکی تھیں۔ آج تک کبھی ماں کا ذکر کیا' نہ کسی اور چیز کا اب اچانک انہوں نے اپنی حیرانی ظاہر نہیں ہونے دی' سنبھل کر مسکرائیں۔

"تیری ماں کے زیور تیری دلہن کے لیے رکھے ہیں۔"

"تو پھر دلہن سے پوچھ کر لے لو۔"

حیران در حیران... اس کے یوں کہہ کر چلے جانے پر وہ تو حیران تھیں ہی چوکھٹ پر قدم رکھتی تنو ساری کی ساری منجمد ہو گئی۔ آج تک اس کے کسی رویے' کسی انداز سے قطعاً" محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنے اور اس کے رشتے سے واقف ہے۔ اب لہجے کا ٹھہراؤ اتنا قطعی تھا جیسے وہ رشتے سے مطمئن بھی ہو۔ آن میں ہی نیلا آسمان تنو کے لیے مضبوط ہو گیا جیسے سے بھی زیادہ مضبوط بادلوں کے سفید دھبوں سے چھن کر گرتی پگھلی چاندی جیسی شعاعیں وجود کو زندگی بخشتی تھیں۔ چاندی کی مورتی کا بدن کرنوں کا عکس بن گیا۔ اس عکس میں محبت کی شفاف روشنی میں پھوٹتی سفید ملائی جیسے رخساروں پر ملال پھیلا۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا صحن عبور کر ہسپتال کے لیے نکل گیا تھا پاس سے گزرتے صرف اک نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ سادہ بے ضرر سی صرف اک نگاہ اور وہ اتنی سی لو سے ہی پگھل کر بہنے لگی' وجود نرم گرم موم میں بدل گیا۔ دوپٹہ لپیٹتی جھینپ کر اندر غڑاپ ہو گئی۔ اس لمحے ان کے قدموں تلے زمین بھی تیز تیز دھڑکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہسپتال کے وارڈ میں آتے جاتے' دوائیں لاتے اسے فکر مند ہوتے دیکھ کر احسان کو وہ اپنے بے حد قریب محسوس ہوا تھا۔ پہلی بار انہیں اس پر ذمہ دار بیٹے کی طرح فخر محسوس ہوا۔ اتنی تکلیف میں بھی کہیں سکون اترا تھا۔ اپنی سختیوں پر خود ہی شرمندہ تھے۔

"کاش رازی یہ جان جائے' میں اس سے محبت کرتا ہوں' اسے کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ اسپتال سے گھر آ گئے تھے۔ ڈاکٹرز نے بہت سی ہدایات کے ساتھ انہیں مکمل آرام کا کہا اور اچھی خوراک کی نصیحت کی۔ خاص کر وزن اٹھانے سے پرہیز بتایا تھا۔ گھر آنے کے بعد ان کا ہر ممکن خیال رکھنا۔ اٹھنے بیٹھنے میں مدد کے علاوہ بھی پاس بیٹھا رہتا تھا مگر خاموش۔ چپ ہسپتال میں پھر کوئی بات ہو جاتی' کسی ملنے والے کا بتا دیتا مگر گھر میں خاموشی کی چادر اجنبی پیرہن کی طرح درمیان میں لپٹی رہتی وہ خود سے بھی نہ بلاتے۔ اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے پاس ہے' لوگوں سے لڑنا بھڑنا چھوڑ دیا ہے۔

☆ ☆ ☆

بیرونی دروازے کے عقب میں بنے غسل خانے

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

سے وہ تولیے سے بال رگڑتا نکلا تھا۔ گیلا تولیہ تار پر پھیلایا' سرمئی کرتے کی آستین لپیٹتا اپنے دھیان میں برآمدے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مونڈھے پر سامنے والی خالہ' چچی کے برابر بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ چاچا کی تیمارداری کے لیے اکثر ہی کوئی ہمسائی آنی بیٹھی ہوتی۔ موضوع گفتگو دوائیاں' ٹوٹکے۔ وہ سر کے اشارے سے سلام کرتا اندر کمرے میں بڑھ گیا۔ شیشے کے آگے کھڑا بالوں کو سنوار رہا تھا۔ تب خالہ کی آواز پر ہاتھ تھم گئے۔

"تجھے فکر کی کیا ضرورت' اتنا کڑیل جوان تو ہے رازی' اسے کہہ دکان کھولے' آخر لڑکے مانگتے کس لیے ہیں۔"

اس کے کان خود بخود چچی کے جواب پر لگ گئے۔

"وہ تو بہت ضد کر رہا ہے کھولنے کی مگر میں ہی منع کرتی ہوں۔ اب گھر پر مرد کا ہونا بھی ضروری ہے' کوئی نہ کوئی آجاتا ہے تیرے بھائی سے ملنے' بس تھوڑے دن کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چچی کے بات سنبھالنے پر اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا اور اپنی بے فکری پر قدرے افسوس' وہ ابھی بھی کچھ کہتے ہوئے مٹھی کھولے ان کے آگے کر رہی تھیں۔

"ہاں' یہی بالیاں' تم ہی تو کہہ رہی تھیں ایسی بنوانے کا تو یہی رکھ لو۔"

اس نے گردن اٹھا کر باہر کی جانب جھانکا' ان کی ہتھیلی پر سونے کی بالیاں چمک رہی تھیں۔ نگاہ ان کے خالی کانوں پر گئی' دل پر پھر مکا سا لگا' خفیف منہ کھل گیا۔

"جو سنار قیمت لگائے مجھے دے دینا' ویسے بھی بھاری چیزیں اب پہنی نہیں جاتیں۔" بالیاں ان کی ہتھیلی سے اٹھاتے خالہ کے چہرے پر تاسف ابھرا۔

"ہم عورتوں کے پاس یہی ہوتی ہیں مشکل میں کام آنے کے لیے' حق ہا' چلو بہن! میں جلدی پیسے بھجواؤں گی۔"

کچھ دیر بیٹھ کر وہ تو چلی گئیں مگر وہ شرمساری میں بھیگ گیا' جی میں آیا بھاگ کر جائے ان کی مٹھی کھولے' بالیاں چاچی کے کانوں میں ڈال دے' لیکن وہ خالی نظریں دیواروں پر پھیرتے بے بسی سے مٹھیاں بھینچنے لگا پھر کچھ سوچ کر اثبات میں سر ایک دو بار ہلایا۔

وہ صبح سویرے نہا دھو کر' صاف ستھرا ان کے پاس آ کھڑا ہوا' کچھ دیر نگاہیں ادھر ادھر پھیرتا رہا' کان کی پشت کھجائی' نگاہ ان کی چارپائی کے پاس رکھی تپائی پر دواؤں کے ڈھیر سے سرک کر کمرے کی ایک ایک چیز پر گئی' مہینے بھر میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب کان کی لو اس کی پوروں سے رگڑ کھا رہی تھی۔ وہ کھنکھار کر بولا۔

"وہ' چابیاں دے دیں۔"

احسان چپ رہے۔ بس اک گہری نگاہ اس پر گئی پھر کچھ توقف سے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا' چابیوں کا چھنکتا گچھا نکال اس کے سامنے دھر دیا۔ قدرے جھجکتے ہوئے وہ گچھا اٹھانے کے لیے جھکا تھا۔

"مال ہے یا آئے گا؟"

اس کے مختصر استفسار پر وہ اندر تک متحیر تھے مگر سہ لفظی جواب دیا۔ "دیکھنا پڑے گا!"

اس کے سر خم کرنے پر تحیر کی جگہ اندر تک طمانیت پھیل گئی۔ اپنے بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہونے پر ہر ماں باپ فخر سے پھول جاتے ہیں' زمین پر پاؤں خود بخود مضبوط جمے اور قیمتی محسوس ہوتے ہیں۔ اس لمحے احسان کو اپنا وجود بھی سنار کے ہیرے کی طرح محسوس ہوا وہ پھیل کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ بازو سمتوں میں بچھا لیے' نگاہ کچی چھت کو پکڑے مضبوط لکڑ کی کڑیوں اور شہتیر پر رک گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ چابیاں جیب میں ڈال ہولے سے "اللہ حافظ" کہہ باہر نکلا۔ برآمدے کے وسط میں پہنچا تھا غیر ارادی نگاہ اس کے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی پر رک گئی۔ سرمئی سرمئی چادر میں ملفوف اس کی کامنی سی پشت ہلتی دکھائی دی۔ چادر بہت اچھی طرح سے سر پر جمی تھی۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھ چادر کے اندر سے جھانکتے تھے۔ دلکش سفید انگوٹھوں سے تسبیح کے سیاہ دانے

Downloaded From http://paksociety.com

ٹکے نظر آتے تھے۔ یقیناً" وہ دعا مانگ رہی تھی۔ دن کے اولین لمحوں میں تسبیحات اس کا معمول تھا اور اب ہاتھ دعا کے لیے اٹھے تھے۔ چند مہینے پہلے کا منظر ایک لخت اس کی آنکھوں میں آن کھڑا ہوا۔

اسے دکان پر جاتے کئی روز ہو گئے تھے۔ شام کو سارا حساب لا کر چاچا کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ خاموشی سے رجسٹر پڑھتے پھر تکیے کے نیچے رکھ دیتے۔ نئے مال کے لیے وہ جتنی رقم دیتے وہ بلا چوں چرا اس رکھ لیتا۔ نہ انہوں نے زیادہ پوچھ گچھ کی نہ اس نے بات پھیلائی۔ البتہ مبہم کن انکھیوں سے اسے کمرے میں آتے' دوائیں دیتے' کھانا رکھتے دوپٹہ سنبھالتے بڑی نرم نگاہوں سے دیکھ کر نظریں جھکا لیتا تھا۔

☆ ☆ ☆

دن سورج سے گرتی اجلی شفاف کرنوں کی طرح ٹک ٹک اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آنے والا دن سورج کی روشنی میں شفافیت بھر جاتا۔ اس کا نرم گرم احساس زندگی کی علامت کو جلا بخشتا ہے۔ اک دن آمنہ نے احسان سے کہا تھا۔

"میاں! تمہارا حادثہ اللہ کی طرف سے بڑا مبارک نکلا۔"

احسان نے شکوہ کناں نگاہ اٹھائی' وہ سنبھلیں۔

"اپنے رازی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں' ماشاءاللہ ایک مہینے میں کیسا سنبھل گیا' دکانداری خوب چمکالی میرے بچے نے۔"

انہوں نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا "ہوں۔۔۔"

"میں تو کہتی ہوں آمنہ کے ابا' کوئی اچھا سا دن دیکھ کر ان کی شادی کے فرض سے فارغ ہوں۔"

"تم نے کبھی رازی سے ذکر کیا شادی کا۔" ان کے رازدانہ استفسار پر آمنہ کے سارے چہرے پر مسکان پھیل گئی۔ معمولی سا اثبات میں سر ہلایا اور اس دن اس کا یہ کہنا "پھر دلہن سے پوچھ کر لے لو۔" اندر تک مسرور کر گیا تھا۔

ان کی طبیعت اب خاصی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ٹانگ میں اگرچہ لنگ آ گیا تھا مگر چھڑی کے سہارے قریبی دکانوں پر جاتے' ضروری سودا سلف لے آتے۔ اندر باہر کے چھوٹے موٹے کام نپٹا دیتے۔ آج وہ بجلی کا بل جمع کروانے کی غرض سے نکلے تھے۔ گلی کے نکڑ پر تھے جب انیس بیس سالہ لڑکا ان کے پاس آ کر رکا۔ خاصا گھبرایا' ہانپتا کانپتا۔ کچھ دیر سانس بحال کی پھر مخاطب ہوا۔

"چاچا۔۔۔ چاچا وہ رازی۔۔۔"

"کیا ہوا۔۔۔ خیر تو ہے' کیا ہوا میرے رازی کو؟"

"چاچا! رازی کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔" بوڑھے ہاتھوں کی گرفت چھڑی پر کانپ گئی۔

"اس نے ساتھ والے حمید کا سر پھاڑ دیا ہے' اگر خون نہ رکا وہ مر جائے گا اور رازی کو پھانسی۔۔۔ سب دکاندار ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔"

آخری جملہ اس نے ٹھہر ٹھہر کے آہستگی سے کہا تھا۔ احسان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ پتلیاں پھیلنے لگیں۔ وہ زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔ لگ رہا تھا زمین لرز رہی ہو اور سورج کی تیز شعاعیں نارنجی آگ کے گولے ان پر برسانے لگی ہوں۔ بھلے وہ شروع سے ضدی' اکھڑ تھا مگر اتنا تو کبھی نہیں رہا کہ معاملہ پولیس تک پہنچ جائے اور اب تو سدھر گیا تھا۔

"اف میرے اللہ!" خاکستر زمین پر بیٹھتے ہی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

پھیکی چاندنی میں وہ جامد' ساکت جاگتی رہی' سانس تسلسل سے چل رہی تھی۔ آج نیند صرف اس کی ہی کی نہیں روٹھی تھی۔ بلکہ وہ بھی بے چین تھا' کبھی کروٹ بدلتا کبھی بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ جاتا پھر زور سے گردن جھٹک کر گرنے کے انداز میں لیٹتا' دھم سے گرنے پر چارپائی کے جوڑ چیختے چلاتے اور ایسے میں اگر نگاہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے پار لیٹی تنو پر جاتی تو سکون درہم برہم ہو جاتا۔ ہلچل بڑھ جاتی۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے سے پہلے وہی انا' ضد فصیل بنا کھڑی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی۔

احسان چاچا بڑی ہمت کے ساتھ نمبردار کے پاس گئے تھے۔ بہت منت سماجت سے اس کے ساتھ جاکر راضی کو تھانے سے بازیاب کرلائے تھے۔ مگر اس ملزم پر نگاہ غلط ڈالنا بھی گوارہ نہیں کی۔ پرانا غصہ خفگی پھر سے عود آئی۔ اور تو اور آمنہ جو صبح سے اس کی فکر میں برآمدے میں بیٹھی رو رہی تھیں۔ بین ڈال کر محلہ اکٹھا کرلیا' اب اس کی آمد پر منہ دوپٹے سے پونچھتی اٹھیں' اندر کمرے میں جاکر لیٹ گئیں۔ اس نے ان کا پہلی بار اظہار ناراضی دیکھا تھا۔ کچھ سمجھ نہ پایا۔ ایک دو بار ان کی چوکھٹ تک گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہونٹ کچلتا واپس آگیا۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ صرف شرمندگی تھی۔ ایک تو چار کا ہندسا ہماری ساری زندگی کا مدار ہے۔ چار نوالے کھالو' چار لفظ پڑھ لو' چار لوگوں میں عزت رہ جائے' بھلے ساری دنیا میں بے عزتی ہو مگر چار بندوں میں رہ جائے' وہاں بھی چار کی کسک اٹھ رہی تھی۔

"چار بندوں میں بے عزتی ہوگئی' کیا کہیں گے' اب نوبت تھانے کچہرے تک آگئی' اس نے ہمیں چار دن بھی سکون نہ لینے دیا' حق ہا!" (وہی چار)

وہ بہت دیر ان کی ڈانٹ کا منتظر رہا' شاید آئیں' ڈانٹیں' مگر آمنہ نے کبھی خفگی سے دیکھا نہیں تھا۔ اب کیا ڈانٹتیں' وہ مایوس ہوگیا۔ رات کا کھانا جوں کا توں پڑا رہا۔ جو جہاں تھا وہاں سے نہ نکلا۔ یہاں تک کہ اس کی تو بھی۔

"وہ تو میری پیاس پر بے چین ہوجاتی تھی اور آج میں صبح سے بھوکا ہوں' چاچا کی مار میری پشت کے بجائے اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی' نادیدہ نیل دکھتے تھے اور آج میں تھانے سے آیا ہوں' سپاہیوں کے ٹھڈے گالیاں سن کر۔۔۔ سارا دن گزار کر آکے پوچھنا تو کیا نظر ملانا تک گوارہ نہیں کیا' کیا آج درد نہیں ہو رہا' مجھے کوئی کیوں نہیں پوچھتا' کیا ہوا' کیوں ہوا' پولیس نے کیا سلوک کیا' آج کسی کو میری کسی بات سے فرق نہیں پڑ رہا' میری اہمیت' محبت سب ملیامیٹ ہوگئی۔۔۔ کیوں' آخر کیوں؟"

وہ برآمدے میں بچھے تخت پر ہی لیٹ گیا تھا اپنے کمرے میں اسے شدید گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ برآمدے کی دیوار کے عین دوسری جانب وہ اپنے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی کے نیچے بچھی چارپائی پر لیٹی کہنی کی اوٹ سے آسمان تک رہی تھی۔

صبح کا پہلا پہر تھا۔ مؤذن کی آواز پر وہ چونکا' ساری رات کے سلگتے من نے وجود میں کانٹے اگا دیے تھے۔ وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ احسان چاچا حسب عادت دروازہ کھولے لیٹے تھے۔ زیرو کے بلب کی مدھم نیلی روشنی کمرے کی تاریکی کو قدرے کم کر رہی تھی' مدھم روشنی میں کسی کی روندھی آواز بھی تھی۔ وہی عورت کی پرانی عادت منہ پر دوپٹہ رکھے روتے ہوئے مسلسل بولنا۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے کی جانب آیا' چاچی کہہ رہی تھیں۔

"مجھے معاف کردے تنو کے ابا! میں ہی غلط تھی' ہر جھوٹ پر راضی کا ساتھ دیا' اس کی غلطیوں کی پردہ پوشی کی' بھول گئی تھی یہ اسی اکھڑ' ضدی' بددماغ اکرم کی اولاد ہے' خون تو اسی کا ہے۔ کیسے ذرا ذرا سی چیز پر صغریٰ بھابی کو تڑپاتا تھا' مارنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ یہ بھی تو اسی کا جایا ہے' میں سمجھی میری محبت' خلوص' تربیت اس کا اندر بدل دیں گی' مگر نہ اصل تو اصل ہے' اس منصور نے تو بہت پہلے ہی مجھے بتایا تھا اس کی غلط محبت کا' سگریٹ کی ڈبی بھی نکلی تھی اس کی جیب سے' مگر مجھ کم عقل کو کتنے آرام سے اس نے جھانسہ دے دیا۔"

"آہ!" احسان کے تأسفانہ سانس پر وہ منہ سے دوپٹہ ہٹاتا ناک پونچھ پھر سے رونے لگیں۔

"میں پاگل تھوڑا تھا جو اس پر سختی کرتا تھا' ڈرتا تھا کہیں اکرم جیسا نہ بن جائے' وہ لاڈ میں بگڑا تھا اور تو کیا سمجھتی ہے' وہ ایکسیڈنٹ سے مرے تھے۔"

وہ زخمی سانس بھرتے ہوئے رکے اور آمنہ نے

Downloaded From http://paksociety.com

دوپٹا ہٹا کر حیرانی سے میاں کو دیکھا' رونا دھونا بھول گئیں۔

"کیا مطلب؟"

"کیا مطلب ہونا بھلی مانس' اس دن کی لڑائی بھول گئی میاں بیوی کی' بہانے سے صغریٰ بھابھی کو لے گیا تھا' چلتی ٹرین کے سامنے جان کے سائیکل چڑھائی تھی' وہ تو رازی کو بھابھی نے پرے پھینک دیا تھا۔ آنکھوں دیکھا لوگوں نے بتایا تھا۔"

آمنہ کا پورا منہ کھل گیا اور باہر کھڑا رازی جیسے زندہ درگور ہو گیا۔

"اب کیا لوگوں سے کہتا' بڑا بھائی حرام موت مرا' اس خوف کے مارے میں ان کے نکاح کے حق میں نہیں تھا' ہے تو اسی اکرم کی اولاد۔۔۔ آج ثابت بھی کر رہا ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔۔۔" آمنہ نے سینے پر ہاتھ مارا "بھابھی صغریٰ کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا۔۔۔ تب ہی رازی کے لیے پریشان تھی۔" رازی کا نام لیتے ہی اپنا رونا پھر سے یاد آ گیا دوپٹا پھر سے منہ پر' ہچکولے لیتے رونے لگیں۔

"ہائے میری بے جا ضد اور خوش فہمی نے ہماری اکلوتی بچی کا مقدر جلا دیا' میں تو سمجھتی تھی پیار سے سدھر جائے گا' گھر کا بچہ ہے' اپنی بچی بھی اپنے پاس رہے گی' کیا خبر تھی اکھڑ کی اولاد اکھڑ ہی نکلے گی' آج لڑائی فساد کر کے تھانے کا منہ بھی دیکھ آیا' کل کلاں کسی کو قتل کر' جیل چلا جائے گا اور قاتل کی بیوی کا دھبہ ہماری بچی کی پیشانی پر' آہ! اب کیا اعتبار رہ گیا' جانے کس لڑکی کا چکر ہے' بڑا تیار ہو کر وقت پر نکلتا تھا جس پر دعائیں اثر نہ کیں تو کے ایا' جس میں شرم لحاظ نہیں' اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں' اگر کل ہماری بچی کو کہیں آگے پیچھے کر دیا یا اپنے باپ کی طرح۔۔۔ ہائے میں نے یہ کیا ظلم کیا تو پر' تو۔۔۔ تو عزت سے مر جا یہی بہتر ہے۔۔۔"

درد سے رازی کی آنکھیں بھنچ گئیں' اب مزید سننے کی سکت نہیں تھی' دل ایسے پھٹا جیسے خوب ہوا بھرا غبارہ' ٹھاہ۔۔۔ غبارے کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے اور اسے یہ آواز اپنے سارے وجود کے چیتھڑے اڑاتی سنائی دی تھی۔ چاچی کے زار و زار رونے پر بھی وہ اندر نہیں گیا' اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہا' اسے صفائیاں دینے کی عادت نہیں تھی۔ پاؤں زمین میں دھنسے تھے' آنکھیں ساکت' ماں باپ کی موت کا کیسا عجب راز اور پھر اپنی بے اعتباری سب یک لخت سامنے آ گیا دماغ ہوٹر بجاتا تھا۔

"چاچی اتنی بے اعتبار' اتنی مایوس ہو گئیں مجھ سے' ہر لڑکھڑاتے قدم پر اپنا کندھا پیش کرنے والی چاچی' جھوٹ' غلطی پر ڈھال بننے والی چاچی' اس وقت ہاتھ کھینچا جب میرا قصور بھی نہ تھا۔ سچا تھا میں' مجھ سے ایک بار بھی نہ پوچھا میں نے کیا کیا' کیسے لڑائی شروع ہوئی۔ بغیر صفائی کے پیشی لگائی سزا سنا دی' دار چڑھا دیا' میرا ہونا' نہ ہونا ضروری بھی نہ سمجھا۔"

☆ ☆ ☆

اس روز جھگڑا رازی نے نہیں بلکہ حمید (ہمسایہ کاندار) نے کیا تھا۔ اس نے اپنی دکان کے آگے اتنا پانی چھڑکا کہ وہ سارا بہہ کر احسان کی دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"اوئے۔۔۔ یہ کیا کر رہا ہے' میری گاہکی خراب ہو گی۔"

رازی نے جیسے ہی دیکھا اپنی کرسی چھوڑ باہر نکل آیا تھا۔ حمید اس کی روز بروز چمکتی دکانداری سے حسد کا شکار تھا تلخی سے بولا۔

"پانی تو ڈھلوان میں جاتا ہے' اپنے لنگڑے چاچے سے کہہ کر تھڑا اونچا کروا لے۔"

اس کی بدزبانی پر اس کے تیور چڑھ گئے۔

"بندہ بن۔۔۔ زبان سنبھال کے بات کر۔۔۔"

"تو بندہ بن' بڑا آیا گھورنے والا' اس نے گالی نکال کر کہا تھا "تیرا چاچا صوبے دار لگ گیا ہے۔"

رازی نے آنکھیں نکالتے اس کا جبڑا اپنی سخت

Downloaded From http://paksociety.com

گرفت میں لے لیا' اس کا چہرہ سرخ' آنکھیں ابل پڑیں۔

"آئندہ مجھے یا میرے چاچے کو گالی دی تو تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

"اوہ تیری۔" وہ پھر سے گالیاں بک رہا تھا۔ دونوں میں زور دار لڑائی ہوئی۔ بیچ بچاؤ کے دوران رازی نے اس کا گریبان یک لخت جھٹکے سے چھوڑا اور وہ پانی سے ـــــ ریٹ کر گرا۔ پتھر لگنے سے سر پھٹا' خون ہی خون اس کے باپ نے شور مچا' پولیس بلوائی اور بیان دیا۔

"رازی نے حمید کا سر پتھر مار کر پھاڑا ہے' قتل کی دھمکی دی ہے' کسی لڑکی کا چکر ہے۔" رازی کی سخت مزاجی سے سب ہی واقف تھے۔ کسی نے بھی اس کے حق میں گواہی نہ دی۔ تھانے حاضری اسے ملزم کے بجائے مجرم بنا گئی۔ بھلے ساری دنیا اسے مجرم کہے مگر چاچی' نہیں یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"کیا چاچی کو میرے کردار پر شک ہے؟" وہ من من بھاری قدموں سے تخت پر آگرا۔

"کیا میں تنو کے لیے دھبہ ہوں' چاچی اپنے فیصلے پر پچھتاتی ہے' شرمندہ ہے' یہ کیا کہا چاچی نے ـــ ایسا سوچ بھی کیسے لیا' کیا میں اتنا بے اعتبار' بے غیرت ہو گیا کہ اپنے نام برسوں سے جڑی بیٹھی اپنی عزت کو آگے پیچھے گردوں گا اور خود کسی اور لڑکی۔ کسی کی اٹھی لمحے بھر کی نگاہ میں برداشت نہیں کر سکتا' اس اپنی تنو کو آگے پیچھے اف۔" اس کا دل تھم سا گیا ابھی تو یہ دل اس کے لیے پوری شدت سے دھڑکنے لگا ہے' طلب گار بنا ہے' اسے سوچنا' دیکھنا سرور دینے لگا اور اب میں مجرم بن گیا۔"

ہر گزرتا پل اسے بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔

آج کی صبح بھی اس گھر کے مکینوں کی طرح تھکی تھکی خشک سی تھی۔ خلاف معمول وہ بنا تیار ہوئے باہر نکل گیا۔ آمنہ اسے ناشتے کے لیے آوازیں دیتی رہ گئیں۔ شاید اس نے سنا نہیں یا پھر جان کر ان سنی کر گیا۔

وہ کچھ دیر پہلے ہی اٹھ کر باہر آئی تھی۔ اور بیرونی دروازے کی جانب اٹھتے اس کے تیز قدم دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں رت جگے کی سرخی تھی تپش زدہ آنکھوں سے اس کی پشت کا سایہ بھی دروازے پر غائب ہوتا نظر آیا۔ اک تاسف پوری جان میں اترا۔ خالی نگاہ سے ماں کو دیکھا' وہ چولہے میں دہکتی لکڑیوں کو دھنکنی سے کرید رہی تھی۔

رات چوکھٹ پر آن ٹھہری' در و دیوار پر سرمئی لیپ نے سیاہ لبادہ سجا دیا۔ سارے دن کے تھکے ماندے پنچھی درختوں کی شاخوں کو ٹٹولتے اپنے گھونسلوں کو تلاش کر رہے تھے۔ سب اپنے ٹھکانوں پر تھے۔ نہیں پلٹا تو رازی۔

رات کی سیاہی میں گیدڑوں کی آوازیں ہولناکی مچانے لگیں۔ احسان کی سوچ' فکر کا روپ دھار گئی۔ اور فکر نے سارے گاؤں میں ان کی دوڑیں لگوا دیں۔ آمنہ جلے پاؤں کی بلی بنی کبھی دروازے تک جاتیں' کبھی صحن میں چکراتیں اور تنو ـــ گم صم ویران اماوس کے چاند کی طرح اس کے کمرے کی چوکھٹ سے سر ٹیکتی زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ سو طرح کے وسوسے دل کو ضرب لگاتے تھے۔

"بہت برا لگتا ہوں میں چاچا کو' اگر کبھی چلا گیا تو پلٹ کر دیکھوں گا بھی نہیں۔"

بہت پہلے کے کہے جملے ایک کے بعد ایک سماعت پر چابک برسا رہے تھے۔ "اگر چاچی اس گھر میں نہ ہو' میں ادھر قدم بھی نہ رکھوں۔"

"ہاں' ہاں' تو مجھے بری لگتی ہے' بہت بری' سو بار بری لگتی ہے۔" ایک بار بے طرح برسا تھا۔ "اس لیے کہ تو احسان چاچا کی بیٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے' احسان چاچا کی بیٹی ہوں' پر تیری بھی تو کچھ لگتی ہوں نا۔۔۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"اسی لیے تو بری لگتی ہے' تیری فکر میں وہ مجھے مارتا ہے' نہیں ہے میرے دل میں چاچا کی محبت اور نہ تیری۔"

"پھر اماں کی خاطر خود کو بدل لے۔ ان سے تو محبت ہے ناں۔"

"تو چاچی کو بیچ میں مت لایا کر' چاچی کا مقام ہی کچھ اور ہے۔"

وقتاً" فوقتاً" اس کی بڑھتی آوازیں سماعتوں کا گھیرا تنگ کرنے لگیں۔ ہاں ایک بار یوں مجھی کہا تھا۔

"جس دن چاچی مجھ سے روٹھ گئی نا' میری دنیا روٹھ جائے گی اور میں دنیا سے۔ کبھی پلٹ کر بھی اس دنیا کو نہیں دیکھنے والا۔"

اس کی ۔۔۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ دل کی دھڑکن پسلیاں توڑ دینے کو تھی۔ اس نے کانوں پر ہتھیلیاں جمالیں۔

"تو کیا رازی سے اماں ناراض ہو گئی تھیں' کیا اماں نے اسے کچھ کہا؟ قریب تھا اس کا دل پھٹ جاتا۔ وہ بے قراری سے اٹھی اس کے کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دیکھی' کہیں کچھ غیر معمولی نہیں تھا۔ نہ کوئی خط' نہ پیغام۔ اس کا سارا سامان جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ ماں کے پاس آ گئی۔ کچھ دیر سپاٹ نگاہوں ان کے چہرے کو کھوجتی رہی پھر یک لخت ان کے قدموں میں آ گری۔ گھٹنوں پر سر رکھ بے حد روئی۔

"کیوں رو رہی ہے۔ تو اپنے ماں باپ کے پاس ہے۔"

"حالانکہ مجھے ہونا اس کے پاس چاہیے تھا۔"

اس نے رندھی آواز کے ساتھ سر اٹھایا' آنسو ہونٹوں کے کناروں تک آ گئے "کیوں گیا ہے وہ' کیا کہا تھا اسے۔"

"کہنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی۔!" ان کا لہجہ سپاٹ تھا "بن کہے ہی جان گیا۔۔۔ بہت دل دکھا ہے اس کی طرف سے' لیکن اتنا بھی نہیں کہ اس کے بغیر جی سکوں گی۔"

انہوں نے اپنے دوپٹے سے ناک پونچھی۔

"اب نہیں آئے گا وہ۔" اس نے کہتے ساتھ پھر سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"آجائے گا۔" ململ کے دوپٹے سے آنکھیں رگڑ کر صحیح کر کے اوڑھا۔ "میرا دل کہتا ہے وہ آجائے گا اور میرے دل کی بات اس تک تو خود بخود پہنچ جاتی ہے۔"

وہ کچھ دیر ماں کے پاس یونہی بیٹھی رہی پھر ایا کو مایوس سا آتا دیکھ کر اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اپنے بستر کی چادر کھسکائی۔ نیلی پتیوں والی گلابی چادر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھیرتے پھیرتے اس پر چہرہ ٹکا لیا۔

"خدا کے واسطے رازی واپس آجا' میرا یوں امتحان نہ لے' میں نے تجھے شعوری کوشش سے نہیں چاہا' جانے کب' کیسے اور کیوں؟ لیکن خدا کے لیے آجا' میرے بوڑھے ماں باپ پر ترس کھا۔" ہولناک رات ڈوبنے لگی' جگر جگر کرتا چاند پھسلتا امرود کے پتوں میں گم ہو گیا تھا۔ صبح کا اجالا پھیلا آسمان پر سفیدی تھی۔

☆ ☆ ☆

احسان صبح سویرے ہی دکان پر گئے۔ اردگرد کے دکانداروں نے بتایا۔

"تمہاری دکان تو کل سے بند ہے' رازی کو تو ادھر دیکھا ہی نہیں۔"

یہاں' وہاں' دوست احباب انہوں نے سب چھان مارا تھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا وہ کہاں گیا۔ بے شک گھر سے خفا نکلا تھا مگر پلٹ کر نہیں آئے گا' ایسا قطعاً" محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ دن ڈوبا تارے ابھرے پھر آخری تارہ بھی ڈوب گیا' تلاش جاری تھی وہ سوئی بن گیا۔ بدن میں پیوست ہوتی گھاؤ لگاتی سوئی۔ تھانہ' ہسپتال کوئی جگہ نہ چھوڑی مگر وہ کہیں ہوتا تو کھائی دیتا۔ تقریباً" چار پانچ دن بعد احسان نے اپنی دکان کھولی۔ ایک بڑا سا رقعہ جو شاید کسی نے شیلٹر کے نیچے سے کھینچا تھا ان کے پاؤں میں الجھا۔ انہوں نے

Downloaded From http://paksociety.com

مڑا تڑا کاغذ بمشکل اٹھایا' کھولا جیسے جیسے پڑھتے گئے دل تھمتا گیا' آنکھوں میں دھند لکا بڑھنے لگا۔ آخری سطروں میں ٹوٹ ٹوٹ کر لکھا تھا۔

"چاچا! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں' سب کچھ' مگر چاچی کی عدم اعتمادی نہیں' بھلے تم ساری رات بدن پر کوڑے برساتے رہتے مگر چاچی کے چند لفظ اس درد پر بھاری ہو گئے' مجھے ماں کی ممتا کا تو علم نہیں بس 'ممتا' ماں' محبت' سب کچھ چاچی ہی تھی اور ایسے لمحے میں بے اعتبار ہو گئیں جب میرا قصور بھی نہ تھا' کیا انہیں یقین ہے' ان کا رازی کسی اور لڑکی کے چکر میں پڑ سکتا ہے' یا وہ مجھے تنو کے لیے دھبہ سمجھ رہی ہیں۔۔۔ تو۔"

دھبہ لفظ پر کاغذ ایسے پھول کر اکڑا تھا جیسے کوئی قطرہ گرا ہو اور سیاہی پھیلتی گئی۔

"اگر وہ چاہیں گی تو یہ دھبہ مٹ جائے گا' دور بہت دور چلا جاؤں گا' جہاں اس دھبے کا عکس بھی نہ رہے' مانا میں بہت برا' اکھڑ' اجڈ ہوں مگر اتنا بے غیرت نہیں کہ اپنی تنو' اپنی عزت کو آگے پیچھے کر دوں گا' مجھے ڈھونڈ کر چاچا اپنی صحت اور وقت ضائع مت کرنا' بس معاف کر دینا' تم نے بہت محنت کی مجھ پر مگر سب اکارت گئی۔"

چاچی سے معافی کا طلب گار ان کا اپنا۔۔۔ رازی۔

خالی سطروں پر بہت سی جگہ گول گول قطرے اکڑ کر پھولے ہوئے تھے۔ احسان نے وہ کاغذ ہونٹوں پر لگایا اور سنبھلتے ہوئے کاؤنٹر کو مضبوطی سے تھاما تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے بینچ پر بیٹھتے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

رازی کے خط نے سب کو چپ لگا دی تھی۔ لفظ ختم ہو گئے گم صم پتھرائی آنکھیں اک دوجے سے سوال کرتیں شکوے بلبتیں۔ جلد ہی انہیں دکانداروں سے اس دن کے جھگڑے کا پتا بھی چل گیا تھا۔ ساری غلطی حمید کی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا رازی تو چلا گیا۔ البتہ آمنہ نے خود کو خوب پیٹا' سینہ کوبی کی' چہرے پر تھپڑ مارے۔

"ہائے رازی' میرے دل میں تو پہلی بار تیرے لیے میل آیا تھا اور تو نے پہلی بار ہی پکڑ لی' مجھ سے شکوہ تو کرتا' لپٹ کر روتا جھگڑتا' مجھے کیا پتا' اس دل میں تیری کتنی ممتا ہے۔"

انہوں نے خود اس کی تلاش شروع کی' ہر رشتے دار' ملنے ملانے والے کے ہاں پتا کر کے آئیں مگر بے سود۔ گھڑیال کی ٹک ٹک پورا سال تنزیلہ کو اپنے دل پر چابک کی طرح محسوس ہوتی رہی نسوں میں اتری سوئی تیرتی دل میں پیوست ہو گئی تھی بس ابھی تک دل پھٹا نہیں تھا۔ وہ بالکل چپ سنسان' ویران' وحشت زدہ سی لگنے لگی تھی۔ شروع میں اس کی دعاؤں میں شدت تھی' منتیں مرادیں' وظائف سب کچھ۔ پھر دعاؤں کی تاثیر پھیکی محسوس ہونے لگی حالانکہ لفظ دعا تو خود بہت پر تاثیر ہے لیکن وہ یہی سمجھتی تھی "دعا کا کوئی فائدہ نہیں اماں' وہ اگر دعا سے ٹھیک ہوا ہو تا تو ٹھیک ہی رہتا پلٹتا کیوں' وہ خود ہی ٹھیک ہوا تھا اور خود ہی روٹھ گیا۔۔۔ اب اگر اسے آنا ہو گا تو آجائے گا۔"

وہ جتنی مضبوط بنی کہہ رہی تھی' اتنی رہی نہ تھی' اس ایک سال میں گھل کر برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ اناری رنگ پر کسی نے گیندے کا لیپ چڑھا دیا تھا۔ ابھری ابھری سیاہ بڑی آنکھیں تاریک کھائیاں لگنے لگیں۔ قد ویسا ہی تھا لمبا مگر بدن بہت سوکھ گیا تھا۔۔۔ ملنے ملانے والے دیکھ کر ٹھٹک جاتے۔

"اے آمنہ' لڑکی کا علاج ولاج کروا' اسے کوئی پرچھاواں ہو گیا ہے۔"

کوئی سوکھے کی مریضہ کہتا اور اگر کسی کے سامنے غلطی سے کھانس لیتی تو دمہ کی ٹی بی کی ساری علامتیں بیٹھے بیٹھے نکال دیتا۔ یہ صرف اللہ یا اس کے ماں باپ جانتے تھے' کون سی دیمک اسے اندر اندر چاٹ رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

رات کا آخری پہر تھا۔ اسے شدید بخار چڑھا اتنا کہ اس کے قریب گزرنے پر بھی تپش کی لپٹیں آتی تھیں۔ آمنہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ٹھنڈے پانی میں دوپٹہ بھگو بھگو اس کے سر پر رکھا۔ تنور سا بھڑکتا تھا پانی کی نمی سے چھنک گیا۔ احسان الگ پریشان تھے۔ رات اچھی بھلی سوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے منہ سے نکلتی گھٹی گھٹی آوازوں پر آمنہ اٹھیں، وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھی اور اس کا جسم جل رہا تھا۔ آمنہ نے اسے اٹھا کر پانی پلایا۔ احسان پریشان۔ وہ ادی مگر بخار بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ نمی تیرتی تھی۔ قطرے باہر نکلنے سے پہلے ہی لو سے جھلس کر سوکھ جاتے۔ آمنہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹالیا۔ "کیا ہوا، خواب میں ڈر گئی۔"

ماں کے سینے میں دبکی کیا بتاتی خواب میں اسے رازی نظر آیا ہے پورے سال بعد، وہ بھی شدید زخمی۔ اس کے بدن سے خون رستا تھا، لوگ اٹھائے کہیں لے جا رہے تھے۔ اس کی لرزتی پلکوں پر آنسو اور کپکپاتے ہونٹوں پر تتو۔ وہ مجھے پکار رہا تھا، اپنی تتو کو۔ کہاں جائے، کہاں تلاش کرے یہ سب ماں کو کیسے بتائے۔ بس ان کے ساتھ لپٹی ہولے ہولے نفی میں سر ہلاتی رہی۔

"اماں! کچھ نہیں ہوا، تھوڑا سا سر میں درد ہے۔ اور بس۔"

"میں تیری ماں ہوں تتو۔"

انہوں نے اس کے بال سہلاتے جلتی پیشانی چومی "بہت اچھی طرح جانتی ہوں، یہ کون سا درد ہے، مجھے معاف کر دے تتو، وہ میری وجہ سے گھر چھوڑ گیا، تجھے چھوڑ گیا، لیکن میرا اللہ جانتا ہے میں نے اسے کبھی بیگانی اولاد نہیں سمجھا، مگر وہ غیر بن کر چلا گیا۔"

انہوں نے نرمی سے کہتے اس کے دونوں گال چٹا چٹ چومے۔

"تتو اگر ہم اسے ڈھونڈ نہیں سکتے تو کیا ہوا، اس کے لیے خیریت کی دعا تو کر سکتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ پلٹ آئے۔"

"سال سے اوپر تو ہو گیا، اسے پکارتے ہوئے اماں۔" وہ لمحہ بھر توقف سے بولی "اب میں اسے نہیں مانگتی، صرف اللہ سے یہ مانگتی ہوں کہ اس کا خیال میرے دل سے نکال دے.... یا پھر" اس نے ہونٹ کا کونا چبایا "یا پھر میری جان نکال دے۔"

"مت کہا کر ایسے۔" انہوں نے اسے اچھا خاصا ڈپٹا اور پھر خود بھی بہت دیر تک روتی تھیں۔

تاروں سے جھلمل کرتی راتیں، کرنوں سے غسل کرتا دن اس کے لیے ہر چیز بے معنی تھی۔ بخار اتر گیا درد بھی ہٹ گیا بس اک گھن لگ گیا تھا جو ہڈیوں سے کھرچ کھرچ گوشت کھاتا جا رہا تھا۔ خاکستری تھال میں سورج سے جدا ہوئے۔ کھنکتے سکے گرتے جا رہے تھے۔ دل کو کسی حد تک یقین آ گیا تھا شاید وہ اب نہیں آئے گا، کبھی نہیں۔ انتظار فضول، سوئی نے دل کے اندر جگہ بنالی تھی۔ اس کی چبھن معمول بن گئی۔ اس کی لمبی نماز و قیام مزید طویل ہو گئے۔ البتہ دعا سے رشتہ بیگانہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آسمان کو سیاہ بادلوں نے گھیر کر قطروں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ بے جان ہوا تھم گئی تھی بوندوں کے اترنے کے خوف سے آمنہ صحن سے چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔ چارپائی دیوار سے لگائے اس کے پاس سے گزریں، وہ نماز سے فارغ ہو جلدی جلدی جائے نماز سے اٹھ رہی تھی۔ آمنہ بہت عرصے سے غور کر رہی تھیں کہ وہ نماز پڑھتے ہی فوراً جائے نماز لپیٹنے کی کرتی ہے۔ انہوں نے متاسفانہ اسے دیکھا۔

"مایوسی کفر ہے تتو، انسان میں تکبر بھر دیتی ہے، کیا تو اللہ سے مایوس ہو کر کسی اور پر توکل کرنے لگی ہے؟"

اس کے ہاتھ تھم گئے آدھ لپٹی جائے نماز پر دھم سے بیٹھ گئی۔

"میں تکبر نہیں کرتی اماں، میں تھک گئی۔"

Downloaded From http://paksociety.com

تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا آج پھر آواز میں نمی اتر آئی' آنکھوں میں قطرے سے ڈبڈبائے۔ آج آمنہ کو اس پر قطعاً" ترس نہیں آیا تھا بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ یہ جو گم صم سی ہو گئی ہے' سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے آج خود رو لے کچھ تو دل ہلکا ہو۔ اسی لیے ان کا انداز تیز ہو گیا اور پاس بیٹھ گئیں۔

"تھک گئی؟ تو اپنے رب سے مانگتے ہوئے تھک گئی' ماں باپ سے مانگتے ہوئے تو بچے نہیں تھکتے' رد' دھو' ضد کر مانگتے رہتے ہیں' دیں' نہ دیں' ڈانٹ ڈپٹ' یا پچکاریں لیکن بچے باز نہیں آتے اور وہ جس کی ممتا شفقت کی حد نہیں' جو ماں باپ سے بڑھ کر چاہنے والا ہے تو اس سے مانگتے تھک گئی۔"

آمنہ جانے اسے کیا کیا کہتی یک لخت اٹھی تھیں۔ وہ برآمدے کے کونے میں خاصی اوٹ سے تھی۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا سوائے اماں کے لفظوں کے وہ تاسف سے کچھ دیر زمین کو تکتی رہی سرخ آنکھوں میں گردبار اٹھے نگاہ بھاری ہو گئی بس پہلا قطرہ بمشکل نکلتا ہے پھر تو اتر پانی بہنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ پھیلے تھے ہونٹ کپکپا کر اکڑ گئے۔

"اے اللہ! تجھ سب خبر ہے میرے دل کا کون خبردار ہے' کوئی پل' کوئی لمحہ ایسا آیا' جب دل نے دھڑک دھڑک تجھ سے فریاد نہ کی ہو' ہاں بس اماں ابا کے سامنے ظاہر کرنا چھوڑ دیا تاکہ انہیں تکلیف نہ ہو' لیکن دیکھ آج پھر میرے ہاتھ پھیلے ہیں۔"

اس کے دعا کے لیے اٹھے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آنسوؤں کا پانی ہتھیلیوں پر اکٹھا ہونے لگا۔ لمبی سسکی بھرتے ہی نگاہ آسمان پر اٹھی۔ آن واحد میں ہی بہت زور سے نکلا" اے اللہ مجھے اپنی تقدیر پر راضی ہونا سکھا دے' اگر وہ میری تقدیر میں لکھا ہے تو ملا دے' ورنہ اس کا غم بھی دل سے نکال دے۔"

اس کے ہاتھ جانے کتنے گھنٹوں سے اٹھے تھے۔ بادل رگڑ کھا کر برسنے لگے تھے وقت تو گیا اسے گردوپیش محسوس نہ ہوتا تھا۔ پرندوں نے کیوں شور مچایا اور پھر امرود کے پتوں میں کہاں' کیوں دبک گئے۔ آمنہ کیوں اٹھیں' کہاں' کتنی دیر کے لیے گئیں۔ اس کی لرزتی پلکوں نے بصارت کو مقفل کر رکھا تھا سیاہ نوکیلے سروں سے پانی پھوٹتا' لبوں کی کپکپی کو اس کی گمبھیر آواز نے جامد کر دیا۔

"بس کرو تو' تمہاری ان ہی دعاؤں اور آنسوؤں نے مجھے مسلسل بے قرار رکھا ہے۔" اس نے پٹ سے سیاہ باڑھ اٹھائی۔

بڑے معجزات سنے تھے لیکن کبھی نہ ہونے والا معجزہ آج ساکن کر گیا۔

وہ پہلے سے بہت نکھر گیا تھا۔ وجیہہ سراپا' خوش لباسی' چہرے کی تازگی اس کی خوش خوراکی کی غماز تھی۔ لیکن بھوری آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے اس کے وجود کی تھکاوٹ بیان کر رہے تھے۔ وہ پرسکون تھا بھی نہیں۔

☆ ☆ ☆

اس دن بہت ارادہ باندھ کر گھر سے نکلا' رقعہ شیلٹو کے نیچے سے پھینک کر ایک سمت چلتا رہا۔ اس نے تہیہ کر رکھا تھا اب کبھی ان راستوں پر چل کر نہیں آئے گا۔ کسی نہر میں کود جاؤں گا' نہر کنارے کھڑے ہو کر کوشش کی' لیکن پاؤں مٹی کے ساتھ ایسے چپکے تھے جیسے کسی غیر مرئی چیز نے جکڑ لیے ہوں' پھر ریل کی پٹڑی کے ساتھ چلنے لگا" ابا نے بھی تو یہی کیا تھا سو میں ان کی اولاد ہوں" لیکن اس پٹڑی پر ٹرین آئی ہی نہیں اور آتی بھی کیسے۔ جن کے ساتھ دھڑکتے دلوں کی دعائیں شریک سفر ہوں وہ مسافر کچھ لمحوں کے لیے بھٹک تو سکتا ہے لیکن راہوں کی دھول بن کر اڑ جائے' یہ ممکن نہیں۔ اس نے بہت کوشش کی خود کو دھول بنانے کی پر دعا کا حصار بہت مضبوط تھا۔

وہ تھک کر اسٹیشن پر بیٹھ گیا آتے جاتے مسافروں کو دیکھتا۔ پھر ایک ٹرین آئی اس میں چڑھ سوار ہو شہر پہنچ گیا۔ شہر کسی کے استقبال کو نہیں بڑھتا۔ وہاں

Downloaded From http://paksociety.com

لوگوں کا ہجوم تھا۔ اجنبی لوگ' اجنبی ماحول' رشتے دار' کسی عزیز کا اتا پتا نہ تھا۔ ساری رات سڑکوں کی دھول اڑاتے گزری۔ صبح بھوک کی بے چینی تھی' بے سائبانی کا عالم۔ اک ڈھابے پر رکا جیب میں کچھ روپے تھے وہ دیے ناشتہ کیا۔ برتن واپس کرتے وقت مالک سے استفسار کیا تھا۔

"آپ کو کسی ملازم کی ضرورت ہے؟"

اس نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا' گرد آلود ملگجے کپڑے' لیکن شکل سے اچھے گھرانے کا لگتا تھا۔ اس نے تحیر سے بھنوئیں جوڑیں پھر ناک چڑھائی۔

"میرے پاس پہلے ہی اضافی ملازم ہیں' ان کی تنخواہ پوری نہیں ہوتی' جا اپنا رستہ ناپ۔"

یہ پہلا جواب تھا پھر ایسے کتنے اور کہاں کہاں جواب ملے' جو اپنوں کی محبتوں کو دھتکار دیتا ہے' اسے دنیا دھتکارتی ہے اور ایسے ہی دھکے کھاتے ایک سرائے والے نے اپنے چائے کے کھوکھے پر اسے رکھ لیا۔ معمولی تنخواہ' دو وقت کا کھانا' سونے کے لیے بینچ۔ بس اور بدلے میں وہ سارا دن چائے بیچتا' سرائے کی چارپائیاں درست کرتا اور باقی کام گم صم روبوٹ کی طرح پہلی بار اسے تب تنو یاد آئی جب ڈھیر ابلتے انڈوں کا دیگچہ اتارتے گرم پانی پاؤں پر گر گیا۔ دونوں پاؤں بری طرح جھلس گئے تھے۔

"اوئی اللہ.... رازی!"

اسے چائے کا کپ تھماتے اچانک کپ چھلک گیا۔ تنزیلہ کی آنکھیں خوف اور تکلیف سے پھیل گئیں۔ آج تک کبھی کوئی چیز ہاتھ سے نہ پھسلی تھی۔ اور آج ہاتھ لرز کر چیز گری بھی تو کس پر اور انتہائی گرم۔ وہ بے حد پشیمان تھی۔ پھر تیزی سے باورچی خانے میں گئی کچے آلو کے ٹکڑے جلدی جلدی کوٹے اور اس کے ہاتھوں پر لیپ کرنے کے لیے لائی اور دور سے ہی اس کی ہتھیلی کی پشت پر پھونکیں مارتی پیالہ لیے آگے بڑھی۔

"یہ لگوالو' جلن کم ہو جائے گی۔"

اس نے ہاتھ قریب کیا ہی تھا کہ وہ گھورتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بچہ نہیں ہوں میں' چائے کے چھینٹوں سے جھلس کر مر جاؤں گا' اپنا لیپ اپنے پاس سنبھال کے رکھ۔"

جلے ہاتھ سے پیالہ ہٹاتا یہ جا' وہ جا۔ اس کی بے رخی تنزیلہ کی آنکھوں میں مرچوں کی طرح لگی تھی۔ اور آج اس تکلیف سے اس کی اپنی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ سسکاری بھر تا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اک تنو کی یاد تھی' جو اس قدر جلن میں فرحت بھرے احساس کی طرح گزری۔

"آج لیپ نہیں کرو گی تنو' مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔"

"میرا فکر مند ہونا تمہیں پسند نہیں تھا ناراضی' اسی لیے تو چھوڑ گئے۔"

اس کے اندر کہیں تنزیلہ کی آواز ابھری۔ "اب میری دعائیں تمہارا لیپ کرتی ہیں' ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تم.... رازی۔"

مالک نے پاؤں کی خبر تو کیا لینی تھی۔ اس کی لفظوں اور گالیوں سے خوب دھنائی کی۔ انڈے ٹوٹنے سے اچھا خاصا نقصان ہو گیا تھا۔

"اندھا ہو کر کام کرتا ہے' تیرے باپ کا مال نہیں ہے (گالی)۔" دل پشیمانی کی دلدل میں اتر گیا بنا علاج کے ہی زخم بھرنے لگا تھا۔

شطرنج کی بچھی بساط پر وقت کا بازی گر اپنی چال چلتا گیا۔ سرائے پر کام کرتے اسے سال سے اوپر ہونے کو تھا۔ سر جھکائے کام سے کام۔ مالک پرانے کپڑے اسے دے دیتا' وہ پہن لیتا' معمولی سی تنخواہ سے انتہائی ضروری چیزیں خرید لیتا۔ پرانے کپڑے' پرانی جوتی' بچا کھانا اسے اب ان چیزوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ مالک اس کی پر سرار زندگی پر حیران تھا۔ نہ کبھی کہیں ملنے گیا نہ کوئی ملنے آیا۔ عید' بقر عید' تہوار سب یونہی سرائے پر اور تو اور بیمار ہونے پر بھی کوئی آرام نہیں۔ کتنی بار پوچھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"ٹھیک ہے تو کہتا ہے اماں' ابا گزر گئے' بہن بھائی تھے نہیں۔ مان لیا' آخر تو اتنا بڑا بھی تو ہوا ہے' درخت پر لٹک کر تو ہوا نہیں ہو گا' کہیں تو پلا بڑھا ہو گا۔۔۔"

"تھے مہربان رشتہ دار۔۔۔" بہت سوچ کر مدھم الفاظ میں جواب دیا تھا "لیکن اب کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں۔۔۔ مر گئے؟"

اس کے چونکنے سے لگتا تھا جیسے لمحہ بھر کے لیے سانس رکی ہو۔

"اللہ نہ کرے۔"

"پھر۔۔۔؟" مالک کا اصرار' اس نے درد بھری آہ کھینچی۔

"چھوڑ دیا۔"

"تو نے' یا انہوں نے؟" سوال پر سوال وہ چڑنے لگا۔ مگر یہاں مالک تھا' چاچا نہیں جو اس کے غصے کی پروا کرتا۔

"شاید دونوں نے۔"

مدھم بڑبڑاہٹ کے ساتھ گندے برتنوں کا ٹب اٹھا کر نل پر جا بیٹھا اور دھونے لگا تھا۔

مالک کو اس کی نرم مزاجی اور فرمانبرداری سے انسیت ہو گئی تھی۔ دل میں ایک ارادہ پنپنے لگا تھا۔ اس کی ایک معذور بیٹی تھی۔ جس کا جوڑ خاندان تو کیا باہر بھی ملنا مشکل تھا۔ خوبرو لڑکا جس کی اپنی مرضی تو کیا زندگی بھی نہیں۔ اگر اسے گھر داماد بنا لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ بیٹی کو رکھوالا مل جائے گا اور اسے گھر۔ بہت سوچ کر' اپنی بیوی کے مشورے سے اس سے بات کی۔ وہ سنتے ہی حیران رہ گیا۔

"مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں؟"

"کہا ناں' نہیں کرنی تو بس نہیں کرنی۔"

"کوئی تو وجہ ہو گی' دیکھ یہاں میلے کچیلے کپڑوں میں بینچ پر زندگی گزار رہا ہے' مجھے تجھے اپنے گھر لے جاؤں گا' صاف ستھرا رہنے' کھانے کو ملے گا' زندگی بن جائے گی تیری اور کیا چاہیے۔"

"میں جیسا ہوں' مجھے ایسی زندگی قبول ہے۔"

اس نے انتہائی قطعیت سے کہا تھا۔ کچھ بھی تھا ہزار رنجشیں' کلفتیں سہی مگر وہ تنو کے حق میں خیانت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ حالانکہ اس کا مصمم ارادہ تھا کبھی نہ پلٹنے کا پھر بھی تنزیلہ اس کے اردگرد تھی ضرور۔

اس کے اٹل فیصلے پر مالک کا اصرار بڑھنے لگا اور پھر اصرار میں شدت آ گئی۔ وہ اسے تنگ کرنے پر تلا۔ ایک دن صاف کہہ دیا۔

"اگر میری بات پسند نہیں تو پھر اپنا بندوبست کہیں اور کر لے۔"

اس کا خیال تھا وہ زور زبردستی سے مان جائے گا۔ وہ انا پرست راضی تھا۔ زور زبردستی چاچا کی برداشت نہ تھی کسی غیر کی کیا کرتا۔

"لعنت اس چھابڑے نما سرائے پر" اس نے وقت بھی نہ دیکھا۔ اسی وقت سرائے چھوڑ دیا۔ عصر کے لمبے ہوتے سائے مغرب میں مدفون ہو گئے۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتا جا رہا تھا۔ ڈھلوان میں جاتی سڑک پر بچھی ٹنکریوں کے علاوہ کوئی دوسرا ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ چوراہے سے لنک روڈ کی جانب مڑا تھا۔ شاید کسی غلط فہمی یا معمول کی دہشت گردی کی زد میں آ گیا۔ نارنجی آگ اس کے پیٹ کو چیرتے ہوئے گزری۔ تکلیف کی شدت سے آنکھیں ابلیں' قدم لڑکھڑائے اس کے گرد اس کا اپنا خون بکھر رہا تھا۔ موت بہت قریب تھی۔ تب پوری شدت سے اسے اپنا گھر' چاچا' چاچی اور اپنی تنو یاد آئی' اس نے آخری خواہش تنو کو دیکھنے کی کی تھی۔ لبوں نے بے ساختہ اسے پکارا' آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا تھا' وہ ایک ہسپتال میں تھا۔ وارڈ میں بہت سے مریض تھے۔ سب کے پاس کوئی نہ کوئی تیمار دار موجود تھا اور اس کے پاس پولیس والا بیٹھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی بیان لینا شروع کر دیا۔ ٹوٹا پھوٹا بیان ریکارڈ کر کے چلتا بنا۔ اب

Downloaded From http://paksociety.com

وہ وہاں تنہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ہاتھ میں اسٹیتھسکوپ۔ اور پین پکڑے دوسرے میں فائل چہرے پر ملائمت بھری مسکراہٹ سجائے ڈاکٹر علی اسے سب میں مختلف لگے تھے۔ چالیس کے پیٹے میں سنجیدہ بردبار' خوبرو' اسے چیک کرنے کے بعد۔ اسٹیتھسکوپ اوورآل کی لمبی جیب میں ڈالا اس کا حال احوال پوچھتے نسخہ لکھ دیا تھا۔ ہر بار چیک اپ کے دوران مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس کی زندگی کے متعلق ایک دو باتیں پوچھ لیتے اتنی سی ہمدردی سے وہ ساری دنیا میں اپنے لگے تھے۔ ڈسچارج ہونے کے بعد وہ ہمت کر کے ان کے کمرے میں گیا تھا۔

کھانے کا وقت تھا اُن کی مسز ڈاکٹر سمیعہ ان کے روبرو بیٹھی کسی بات پر مسکرا رہی تھیں۔ اسے یوں اچانک دیکھ کر خفیف سی ناگواری ان کے ماتھے پر ابھر کر معدوم ہوئی پھر میاں کو دیکھا جو حسب عادت چہرے پر ویلکم کا بورڈ سجائے مسکرا رہے تھے۔

"ہاں بھئی رازی میاں' کیا حال ہے۔ درد شرد تو نہیں ..... ڈسچارج ہو گئے ہو ناں؟" ان کے تمام سوالات کے جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموش۔

"کوئی پرابلم ہے؟ آؤ بیٹھو' کیا بات ہے۔"

ان کی حوصلہ افزائی پر وہ چند قدم آگے آیا۔ دیوار کے ساتھ لگے بینچ پر بیٹھ گیا۔ خاصا جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب' آپ سے ایک بات کرنا تھی؟"

"ہاں' ہاں کرو۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہلکا سا سکڑے۔ ڈاکٹر سمیعہ نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے استفہامیہ ابرو چڑھائے۔

"وہ..... آپ کے اسپتال میں کوئی جاب' بھلے چھوٹی موٹی ہو' میں سب کرنے کو تیار ہوں۔" اس کے عجلت بھرے انداز پر انہوں نے گہری نگاہ سے اسے دیکھا پھر دھیما سا مسکرائے۔

"کتنا پڑھے ہوئے ہو؟"

"ایف اے۔"

"ہوں۔" سوچنے ہوئے کہا پھر توقف سے بولے۔

"دیکھو رازی' فی الحال تو تمہیں بہتر ہونے میں چند دن اور لگیں گے اور اس وقت یہاں کوئی ایسی نوکری بھی نہیں' اپنا اسسٹنٹ بھی میں نے نیا رکھا ہے' ایسا ہے' تم اپنا کانٹیکٹ دے جاؤ' جیسے ہی ضرورت ہوگی پہلے تمہیں کال کروں گا۔"

اس کا دل نہ ٹوٹنے کے خدشے سے انہوں نے ایسا کہا تھا۔ ورنہ خوب جانتے تھے اسپتال میں کہاں یوں نوکریاں نکلتی ہیں۔

"فی الحال تو میرے پاس نمبر نہیں ہے' لیکن میں پھر چکر لگالوں گا۔"

وہ مایوسی و امید کے ملے جلے لہجے میں کہتے ہوئے اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھا تھا کہ ڈاکٹر سمیعہ کی آواز آئی۔

"اچھا ٹھہرو۔" وہ رکا۔ وہ خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب گھومیں۔ لمبا چوڑا' خوش شکل' صحت مند نوجوان' اک جانچتی نگاہ ڈال کر بھنوؤں سے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر علی بھی متعجب ہوئے۔

"کیا کیا کر سکتے ہو؟"

"کچھ بھی۔"

اس کے عاجزانہ جواب پر وہ استہزائیہ ہنسیں۔

"کچھ بھی میں تو سب کچھ آتا ہے' جھاڑو' پونچا' کپڑے' برتن' ناچنا' گانا' ڈھول پیٹنا' کیا سب کر لیتے ہو۔"

جہاں ڈاکٹر علی مسکرائے وہاں رازی نے گردن جھکالی۔ مگر وہ اپنے انداز میں لوٹیں۔

"دیکھو بھائی ..... ایک بزرگ کے لیے کیئر ٹیکر کی ضرورت ہے۔"

"اوہ ....." ڈاکٹر علی مطمئن ہو کر پھر سے دھیرے دھیرے جھولنے لگے۔ ڈاکٹر سمیعہ کے والد خاصے امیر انسان مگر بڑھاپے کی مشکل ترین منزل پر تھے۔ کمر

Downloaded From http://paksociety.com

کے مہوں کی تکلیف' بلڈ پریشر' شوگر کے سبب اکثر وہیل چیئر پر آجاتے۔ اکلوتی شادی شدہ بیٹی' گھر اور جاب کی مصروفیت' سمیعہ کی اولاد بھی نہیں' گھر میں مکمل سناٹا بوڑھے کو مزید بیمار کردیتا ہے۔ دونوں میاں بیوی کا ان کے لیے وقت نکالنا بے حد مشکل ہوجاتا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ملازم چھٹی پر۔ اوپر سے بابا کی پراپرٹی کے آئے دن کے مسئلے۔ ایسے میں رازی ایک بہترین حل تھا۔ انہوں نے نگاہوں سے اسے سراہتے ہوئے کہا۔

"مصروفیت کی وجہ سے ہمارے پاس ٹائم کی قلت ہے' ان کی دواؤں' غذا کا خیال' واک بس یہ کام... باقی ملازم بھی موجود ہیں' بتاؤ کرلوگے؟"

"جی... ہاں جی!"

اس کی اتنی تن دہی پر وہ صاف گوئی سے بولیں۔

"اور ہاں' کبھی کبھی ایسے کام بھی کرنے پڑجاتے ہیں' جو کرنے سے اولاد بھی گھبراتی ہے۔" وہ گہری نظروں سے اس کا رویہ جانچ رہی تھیں' جو سپاٹ تھا۔ "صفائی وغیرہ' اکثر ملازم اسی وجہ سے بھاگ جاتے ہیں۔ ...اب بتاؤ کرلوگے۔"

اس کی پرامید نگاہیں لمحہ بھر کے لیے بجھی تھیں۔ لمحے کے چوتھے حصے میں اس نے سوچا۔ ایکسیڈنٹ کے بعد۔ چاچا کے ساتھ بھی اٹھنے بیٹھنے کے مسائل تھے' وقت کے ساتھ بڑھ گئے ہوں گے' میں مضبوط' جوان ہوں' اس وقت انہیں میری ضرورت ہوگی۔ ہنہ' انہیں تو شاید کبھی میری ضرورت نہیں تھی' بے اعتبار' دھبہ۔" اس سے پیشتر وہ مزید سوچتا اس کے دماغ نے ہی نفی کردی۔ اپنی سوچ ان دونوں پر ظاہر بھی نہ ہونے دی۔

"کیوں' کیا سوچنے لگے؟"

"ہوں' ہاں' کچھ نہیں۔" وہ چونکا "میں کرلوں گا سب۔"

خاصا بڑا جدید طرز کا بنگلہ تھا۔ کئی ملازمین' وہ اسے آغا عثمان کے کمرے میں لے گئیں۔

ابتدائی تعارف کے بعد اسے' بہت سی ہدایت دے' خود دروازے سے نکل کر جانے کس کمرے میں گم ہو گئی تھیں۔ پھر ان سے ملاقات صرف ناشتے کی میز پر ہی ہوتی جب وہ جلدی جلدی ناشتہ کرکے اسپتال نکلنے کے چکر میں ہوتے تب رازی اور آغا عثمان لان کی ہوا خوری کے بعد اندر داخل ہوتے۔

"ہاں بھئی رازی' سب صحیح چل رہا ہے' آغا جانی آپ خوش ہیں۔"

ڈاکٹر علی نشو سے منہ تھپتھپاتے' نشست چھوڑ رسمی سی بات کرتے' ڈاکٹر سمیعہ اپنا بیگ ٹٹولتے کوئی بات پوچھ لیتیں' یہ اس گھر کا معمول تھا۔ البتہ اس کی صحبت میں آغا جی کی صحت قدرے بہتر ہوگئی تھی' مزاج کا چڑچڑا پن جاتا رہا جو ڈاکٹر علی' ڈاکٹر سمیعہ کے لیے اطمینان کا باعث تھا۔ ایک ڈیڑھ سال میں ہی اس نے اپنا اعتماد خوب قائم کرلیا تھا۔

آغا عثمان شہر کے اچھے خاصے صاحب جائیداد تھے۔ صدر مارکیٹ میں کئی منزلہ پلازہ تھا جس کی دیکھ ریکھ کرائے وصول کرکے پہنچانے کی ذمہ داری ایک منیجر پر تھی۔ آج کل کچھ ایسا تھا وہ کرائے تو لاتا ساتھ کسی بڑے نقصان کی خبر بھی ہوتی بہت سا کرایہ نقصان کی نظر ہونے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اتوار کی شام تھی۔ دونوں میاں بیوی لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے برابر منیجر خاصا متفکر بیٹھا کسی بات کی تفصیل سنا رہا تھا۔ تب ہی رازی آغا عثمان کی وہیل چیئر پکڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ شام کے اوقات میں وہ اکثر انہیں باہر لے جانے لگا تھا۔ ایک دو گلیوں کے چکر لگوا کر گپ شپ کر گھر آجاتے۔ ان کے کہنے پر وہ ان کی چیئر چلاتا منیجر کے پاس لے آیا۔ وہ بات کرتے کرتے رکا' قدرے کھڑے ہوکر سلام کیا پھر ڈاکٹر سمیعہ سے کلام کا سلسلہ جوڑ لیا۔

"بس میم' بہت پریشان ہیں دکان دار' نقصان بھی تو بہت ہوا ہے' کرائے کہاں سے دیتے۔ بڑی مشکل

Downloaded From http://paksociety.com

سے میں نے یہ تھوڑے تھوڑے کرائے نکلوائے ہیں ان سے۔"

وہ چند نیلے نوٹ ان کی جانب بڑھا رہا تھا۔ انہوں نے اضمحلال سے نوٹوں کو دیکھا پھر میاں سے مخاطب ہوئیں۔

"آپ کسی طرح وقت نکالیں' دکان داروں سے مل لیں۔"

منیجر کے چہرے پر گڑبڑاتے تاثر پیدا ہوئے ہی تھے کہ ڈاکٹر علی کا جواب آیا۔

"یار! میرے پاس وقت کہاں ہوتا ہے' تم جانتی تو ہو۔ ویسے بھی نقصان مالکان کو بھرنا پڑتا ہے۔" انہوں نے چائے کی چسکی لیتے میگزین کے اوراق پلٹتے اچٹتی نگاہ منیجر پر ڈالی۔

"آپ دیکھ لیجیے گا۔"

وہ خوب چمک کر بولا۔ "جی' جی تنخواہ کس بات کی لیتا ہوں۔"

اس کے فرماں برداری سے ہلتے سر کو رازی کی آواز نے بریک لگائی تھی۔

"آپ آغا جی کے پلازے کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہوں۔" اس نے تاسفانہ سر ہلایا۔ "بہت زیادہ آگ لگنے سے نقصان ہو گیا ہے۔"

"وہ تو معمولی سا شارٹ سرکٹ تھا' وہ بھی اگلی دو دکانوں پر' باقی دکان دار کرایہ کیوں نہیں دے رہے۔" اس کے جملوں پر سب نے چونک کر پہلے اسے پھر جوابی نگاہ منیجر پر اور وہ سٹپٹا کر بولا۔

"تمہیں کیا پتا۔"

"سر' میں وہیں ہی تھا سامنے میڈیلین مارکیٹ سے آغا جان کی دوائیں لے رہا تھا' فائر بریگیڈ کے آنے سے پہلے ہی دکان داروں نے آگ بجھا دی۔ میڈیا کو تو عادت ہے ایک کی دس کرنے کی' ورنہ دس بیس ہزار کا نقصان تھا' اب ایسا بھی نہیں ساری مارکیٹ کرایہ نہ دے۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے' میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

وہ تمام حلاوت بالائے طاق رکھ اس پر چڑھ دوڑا' بالکل ویسے ہی جب ہمارے پاس الفاظ دلیل ختم ہو جائیں تو آواز کی بلندی سے کام چلاتے ہیں' اس کی بھی آواز اونچی تھی۔ ڈاکٹر علی نے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا اور رازی کو اشارے سے اندر بھیجا تھا۔

وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے رازی سے پوری تفصیل سن رہے تھے۔ ڈاکٹر سمیعہ درمیان میں بولیں۔

"اسی دن ذکر کرنا تھا۔"

اس نے عادتاً شانے اچکائے "میرے نزدیک وہ کوئی بڑی بات نہیں تھی' بازاروں میں چھوٹے موٹے واقعے ہوتے رہتے ہیں۔"

باہر کی باتیں گھر آکر بتانا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ آغا عثمان کو ایک دو بار پہلے بھی منیجر پر شک گزرا تھا مگر توجہ نہیں دی۔ اس دن اس کی بوکھلاہٹ' پھر رازی پر غصہ۔۔۔ بہت کچھ سمجھا گیا اسے رخصت کر کے رازی سے بازپرس کی اور پھر ڈاکٹر علی نے خود جانچ کی' رازی سچا نکلا۔ دکان داروں نے کرایہ بھی پورا دیا۔ نقصان بھی خاص نہ تھا۔ اس کی تنخواہ میں اضافہ کرتے ہوئے پلازہ کی ذمہ داری آغا جی نے اسی کو سونپ دی۔

وہ اس گھر میں فرد کی حیثیت سے رہنے لگا تھا۔ ٹھاٹھ والی مگر بے حد مصروف زندگی میں بھی اس کی حسیات پر تنو کی یاد کا حصار تھا۔ کمرے کی کانچ سے بنی دیوار گیر کھڑکی سے دکھائی دیتے سفید دھندلے بادلوں میں اپنی مرضی سے تنو کی شکلیں بناتا کبھی ہنستی باتیں کرتی' اور کبھی آنکھ کے کناروں پر جھلملاتا موتی نکالتے۔ درد کی لہر سے ہونٹ خود بخود مچل جاتا۔ وہ اپنے سیاہ کرتے کی آستین کہنیوں تک موڑے ہوئے' ان کے داہنی طرف بیٹھا پورے انہماک سے ٹالسٹائی کی ٹرانسلیشن سنا رہا تھا۔ اس کے کسرتی بازو کرسی کی ہتھی پر جمے تھے۔ اس رومانوی قصے کا صفحہ پلٹتے چند لمحوں کے توقف میں اس کی سوچوں کی ناؤ تنو کی آنکھوں میں بسی نمی میں الجھ گئی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

"کیا سوچنے لگی؟" آغا عثمان کھنکھارے۔
"کچھ نہیں۔" وہ سٹپٹا کر صفحہ تلاشنے لگا تھا مگر انہوں نے کتاب پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اسے رکھو... تم سے ایک بات کرنی ہے۔"
"جی... میں سن رہا ہوں۔"
"وہ ادھر ایک فائل رکھی ہے' اٹھا کر لاؤ۔"
سامنے شیلف کی جانب اٹھتے اشارے پر وہ گیا اور فائل اٹھا کر انہیں تھمائی اور بیٹھ گیا' انہوں نے فائل بغور دیکھ کر اس کے سامنے رکھ دی۔
"رازی میاں یہ پلازہ کی دو دکانوں کے کاغذات جو میں نے اپنے وکیل سے تمہارے نام ٹرانسفر کروا دیے ہیں۔"
"جی..." اس کے منہ سے پھسلا "جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"
"کیوں تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔"
اس نے منہ' الجھی نگاہ سے نفی کی "نہیں کیونکہ آپ کی بیٹی ہے' داماد ہے' یہ ان کا حق ہے۔" وہ تکیہ درست کرواتے ہوئے قدرے اوپر ہوئے "میرا یہ گھر میری بیٹی کے نام ہے' میرا داماد جو میرا بھتیجا ہے' اس کا اسپتال میں نے بنوا کر دیا تھا' اور بھی پراپرٹی ہے' میرے بچے بہت اچھے' قابل ہیں' میرے مرنے کے بعد یقیناً مجھے یاد بھی کریں گے لیکن بیٹا۔" ان کی نقاہت بھری آواز میں یک لخت تاسف سما گیا "ان کی بے حد مصروف زندگی شاید انہیں اتنا وقت نہ دے کہ میرے پاس کچھ سامان بھیج سکیں۔"
"سامان..." وہ الجھا "کیسا سامان آغا جی۔"
"رازی میاں سامان' یہ سامان نہیں جائیداد' گاڑیاں' فرنیچر' بینک بیلنس' اس سامان کی بات کر رہا ہوں جو مرنے کے بعد پہنچتا ہے' اعمال' نیکیاں' صدقہ' خیرات' جو ابدی زندگی کو خوشحال کرتا ہے' تم ایک اچھے' نیک اور سچے ہو' ذمہ دار شخص ہو۔"
"ہونہہ ذمہ دار۔" اس کے رخساروں پر پھیکی سی مسکراہٹ لہرا کر غائب ہوئی "کاش یہ چاچا سن لیتے۔"
"اور میں یہ تمہیں اس لیے دے رہا ہوں' کہ تم محنتی' دیانت دار انسان ہو' اگر میں تمہارے لیے کچھ کروں گا تو تم میرے لیے دعا کرو گے' تم احسان فراموش نہیں ہو۔"
"لیکن آغا جی...!" اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پہ ایک طرف پر رکھی۔ "یہ آپ کی اولاد کا حق ہے اور یقیناً" ڈاکٹر صاحب کو یہ بات پسند نہیں آئے گی۔"
"علی میرا داماد ہی نہیں بیٹا بھی ہے' اسے میں جانتا ہوں۔"
آغا عثمان کے مطابق واقعی ڈاکٹر علی کو اعتراض نہیں ہوا تھا لیکن ڈاکٹر سمیعہ کو خاصا ناگوار گزرا۔ باپ کی جائیداد نوکر کے سپرد۔
"اس لیے کہوں وہ اتنا اچھا کیوں بنتا جا رہا ہے' آپ جو لٹو ہو رہے ہیں اس پر بھلا کوئی یوں بھی اپنی جائیداد کسی غیر کے نام کرتا ہے۔"
"سمیعہ! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔"
ڈاکٹر علی نے نرمی سے مداخلت کی "یہ چیزیں چچا جان کی ہیں' انہیں رکھنے اور دینے کا اختیار ان کے پاس ہے۔" انہوں نے شرمسار ہو کر کن انکھیوں سے چچا کو دیکھا کہیں بیٹی کی بات بری تو نہیں لگی مگر وہ ٹیک لگائے مان سے علی کو سن رہے تھے' رازی اس وقت دوائیں لینے مارکیٹ گیا تھا۔
"ہمارے پاس بہت کچھ ہے... اور ویسے بھی چچا کی نیت اسے بخشنے کی نہیں صدقہ جاریہ کی ہے' آپ کو قطعاً" اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"
ڈاکٹر سمیعہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔ پھر کتنے دن رازی کو پرشکوہ' تنقیدی نگاہ سے دیکھا اور ڈاکٹر علی نرم نگاہوں سے بیگم کو درگزر کی تنبیہہ کرتے رہے۔ لیکن فی الوقت آغا عثمان نے اسے دکانوں کے کاغذات سونپنے تماشائی انداز اپنایا۔
"اور یار! اپنے چچا سے کب ملوا رہے ہو' میں ان سے بات کرتا ہوں' اپنی تو کو رخصت کروا لاؤ یار۔"
اس کی گھنی بھنوئیں قدرے جڑیں' نگاہ اٹھی۔ اک

Downloaded From http://paksociety.com

سرد آہ سانس کے ذریعے سارے بدن میں پھیل گئی۔
"بتایا تو ہے' میں ان کی بیٹی کے لائق نہیں ہوں' پسند نہیں کرتے مجھے۔"
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے' تم ایک قابل مرد ہو' ممکن نہیں تمہیں کوئی ناپسند کرے اور پھر ان کا خون۔" وہ خاموش رہا۔ "دیکھو' جو کچھ تم بتاتے ہو' اتنا بھی غلط نہیں' اپنی سگی اولاد کے لیے بھی سخت رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے' غلط تم کر رہے ہو' بڑھاپے میں انہیں چھوڑ کر اور اس بے چاری کا نہیں سوچتے جو تمہارے نام سے منسوب ہے' کیا حالت ہوگی اس کی۔"
اس کی بے تاثر نگاہیں کانچ کی بڑی سی کھڑکی سے نظر آتے لان میں جا ٹھہریں۔ آسٹریلین نرم گھاس پر جمی بید کی سنہری کرسیوں پر دونوں میاں بیوی خاصے خوشگوار موڈ میں کافی پیتے کن اکھیوں سے مالی کو کیاریاں سنوارتے دیکھ رہے تھے شاید اسی پر کوئی تبصرہ ہو۔ انہیں بہت کم اکٹھے بیٹھا دیکھا' ان کے چہروں پر پھیلی مسکراہٹ ان کی کامیاب ازدواجی زندگی کی غماز تھی۔ امنگوں کی رو بہکنے سے پہلے ہی اسے گود میں رکھی فائل کا خیال آیا۔
"جب انہیں پتا چلے گا تو جانے کیا رویہ ہوگا۔"
"رازی میاں کہاں کھو گئے" آغا عثمان مخل ہوئے "یہ جو تم بیٹھے بیٹھے کھونے لگے ہو' اسی لیے کہہ رہا ہوں' تنو کو رخصت کروا لاؤ' زندگی سہل ہو جائے گی۔"
"آں' ہاں' یہ فائل کہاں رکھوں' میرے پاس کبھی اتنا قیمتی سامان نہیں رہا۔" اس نے یکسر موضوع بدلا۔
"اپنے کمرے کی دراز میں لاک کر لو' بینک میں رکھوا دو' کہیں بھی' لیکن سنبھال لو۔"

☆ ☆ ☆

دل کی دہلیز سے قطع نظر انداز زندگی وقت کی ندی پر تیرتی رہی۔ چند دن لگے تھے ڈاکٹر سمیعہ کا رویہ بہتر ہونے میں۔ آغا عثمان کی گاڑی اب رازی کے استعمال میں رہنے لگی تھی۔ آغا جی کی طبیعت یک لخت بگڑ جاتی وقت بے وقت ہاسپٹل پہنچانا پڑتا' ڈرائیونگ جلد ہی سیکھ لی سو سہولت ہو گئی تھی۔ وہ وقت دیکھے بنا فوراً پہنچا دیتا۔ سو اسی وجہ سے سمیعہ کا رویہ بدل گیا۔
لندن میڈیکل ایسوسی ایشن کی جانب سے بلغاریہ میں ایک سیمی نار تھا' ڈاکٹر علی' ڈاکٹر سمیعہ کا وہاں جانا بے حد ضروری تھا۔ آغا جی کی طبیعت خراب ضرور تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیتے۔ رازی کو بہت سی ہدایات اور متعلقہ ڈاکٹر سے مشورے کے بعد وہ چار روز سیمی نار میں بلغاریہ جا چکے تھے۔ انہیں گئے دوسرا دن تھا جب رات کو اچانک ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ بلڈ پریشر' شوگر دونوں ہائی ہو گیا۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ نیم غشی میں بار بار سمیعہ اور علی کو پکار رہے تھے۔
"بلاؤ انہیں.... رازی میری حسرت ہے۔ شروع

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

سے' آخری لمحے میرے پاس... میرا علی ہو' مگر وہ نہیں ہے... بلاؤ اسے بلاؤ میری طبیعت کا بتاؤ اسے۔"

ایمرجنسی کی جانب بڑھتے انہوں نے آخری بات تھکے سانسوں سے کی تھی۔ حواس باختہ رازی کی آنکھیں ایمرجنسی کے بند دروازے کو دیکھ دیکھ تھک گئی تھیں۔ اس نے بارہا کال ملائی مگر مطلوبہ نمبر بند ہونے کے مخصوص جملے سننے کو ملتے رہے۔ وہ سیمی نار میں شرکت کے وقت موبائل آف کیے بیٹھے تھے چند گھنٹوں کی قطع تعلقی زندگی پر محیط ہو گئی۔ ایمرجنسی سلائڈنگ دروازہ کھلتے ہی مایوس چہرہ لیے ڈاکٹرز باہر تھے۔ حوصلے کی تھپکی رازی کے کندھے پر دے کر چلے گئے۔ لمحے بعد آغا عثمان اسٹریچر پر ابدی نیند سوئے اس کے سامنے تھے۔ رابطہ ہونے پر دونوں پہلی ملنے والی سیٹ پر وہ دو دن بعد واپس آ سکے تھے ڈاکٹر سمیعہ صدمے سے بے حال تھیں۔

"جن ہتھیلیوں پر چڑھ چڑھ ہم اونچے مقام تک پہنچتے ہیں' ان ہاتھوں کو جھک کر چومنا تو درکنار پلٹ کر دیکھنا بھی غیر اہم سمجھتے ہیں' کتنا غیر اہم سمجھا ان کی بیماری کو اور سیمی نار کتنا اہم تھا ہمارے لیے' ہم چلے گئے۔ بہت بدنصیب ہوں آخری وقت پر بھی پاس نہیں تھی' رازی آخری لمحے کچھ تو کہا ہو گا۔"

بہت دیر سے چپ چاپ بیٹھا رازی ڈاکٹر علی کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"بار بار آپ کو بلا رہے تھے۔"

ڈاکٹر علی نے سر اسیمگی سے نگاہ اٹھائی خالی ہاتھوں کو گھورتے ہوئے' بہت سا پانی آنکھوں سے انڈا ہونٹ مبہم سے پھیلے تھے۔

"ہونہہ' چچا جان اکثر مجھے ڈانٹتے ہوئے کہتے تھے' تم پر اس لیے سختی کرتا ہوں علی' تاکہ تم اتنے مضبوط بن جاؤ میری آنکھوں کو بند کرنے کے لیے کسی اور کی ضرورت نہ پڑے... آہ!" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "دیکھو رازی۔" انہوں نے اپنے ہاتھ دیکھے "آج میرے ہاتھ کتنے مضبوط ہیں' مگر میں بدنصیب ان کی آخری خواہش بھی پوری نہ کر سکا' تین سال کا کمزور سا تھا جب ماں باپ رخصت ہوئے' انہوں نے پالا' جوان کیا اپنی اولاد تو سب پالتے ہیں مجھ لاوارث بھتیجے کو صرف پالا ہی نہیں اپنی اکلوتی بیٹی بھی دے دی اور میں ان کی آخری رسومات میں شامل نہ ہو سکا' میرا گلٹ اندر سے مجھے مار دے گا رازی۔"

ڈاکٹر علی' سمیعہ کا دکھ اپنی جگہ مگر رازی کے اندر بہت سے چھناکے یکے بعد دیگرے ہوئے تھے۔ اس کا ذہن کئی برس پیچھے چل پڑا۔

"اوہ نیک بخت اس لیے سمجھاتا ہوں اسے' اس کے بازوؤں میں طاقت ہو گی تو مجھے کندھا دے گا۔"

انسانی دماغ عجب ہے بعض اوقات ساری زندگی بتا کر بھی اپنی غلطیوں کا ادراک نہیں ہوتا اور کبھی کبھی لمحہ سب سمجھا جاتا ہے کچھ ایسی حالت اس کی بھی تھی۔

"جانے چاچا کی طبیعت کیسی ہو گی' بوڑھے تو تھے ہی' چوٹ لگنے سے لنگ بھی آ گیا تھا' کتنی ضرورت تھی انہیں میری' کتنا یاد کیا ہو گا' ڈھونڈا ہو گا' بڑھاپے میں میں نے انہیں دکھی کیا۔"

ایک مہینہ احتساب کی پٹڑی پر چلتے چلتے پاؤں زخم رسیدہ ہو گئے تھے

☆ ☆ ☆

وہ آج صبح سے ہی خاصا چپ چپ تھا' کچھ دیر ڈاکٹر علی کے پاس بیٹھا رہا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو پھر ان کے استفسار پر بولا تھا۔

"دراصل میں اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہوں' ویسے بھی میری اب اس گھر میں ضرورت نہیں رہی۔"

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر علی کچھ کہتے ڈاکٹر سمیعہ بول پڑیں۔

"کیسی بات کر رہے ہو رازی تم' تم ابا کو بے حد عزیز ہو گئے تھے' آخری وقت میں میرے باپ کو تم نے سنبھالا اور پھر وہ تم پر ایک ذمہ داری ڈال کر گئے تھے' اس کا کیا ہو گا۔"

Downloaded From http://paksociety.com

وہ چپ رہا۔ "آپ وہ کاغذات لے لیں' کسی اور کو مینیجر رکھ لیں۔"

"ہونہہ ـــ" اسے گہری نگاہ سے دیکھتے ان کے ہونٹ پھیلے تھے۔ "ابا کو تو صرف تم پر اعتبار تھا خیر تم جاؤ اپنی فیملی سے ملو' بلکہ انہیں یہاں لے آؤ' میں انیکسی ٹھیک کروا دیتی ہوں' جب تک چاہو' یہاں رہو' ایک اور مشورہ دوں گی۔"

اس نے استفہامیہ نگاہ اٹھائی۔ "تم ان دکانوں میں اپنا کوئی بزنس شروع کرلو اور باقی جو کچھ ابا اور تم میں طے ہے' وہ تمہارا فرض ہے' پورا کرو اسے۔"

"آپ یہ اپنی خوشی سے کہہ رہی ہیں۔" لہجے میں استعجاب تھا۔ وہ مسکرائیں اثبات میں سر ہلایا۔

"بے حد خوشی سے۔"

☼ ☼ ☼

کاٹن کے سرمئی کلف لگے سوٹ پر کلون لگایا۔ نک سک سے تیار ہو کر کف کے بٹن بند کرتے آئینے میں اس نے اپنا سراپا بغور دیکھا تھا۔ خوش شکل تو پہلے ہی تھا۔ خوش خوراکی' خوش لباسی اور آسودہ حالات زندگی نے اس کے کسرتی بدن میں مزید وجاہت بھر دی۔ اسے لمحہ بھر کے لیے اپنا آپ دیکھنا اچھا لگا پھر مسکرا کر سامنے سے ہٹ گیا۔

اس کی گاڑی کے ٹائر تنگ گلی کے نکڑ پر چرچرائے تھے۔ کچھ دیر بارش ہونے سے گلی میں کیچڑ سا تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے چھڑی کے سہارے سے سنبھل سنبھل کر گلی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ دیکھتے ہی چونکا۔ اپنا آپ شرمندگی میں گڑ گیا۔ چمچماتی کار کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلتے رازی کو کتنے راہ گیر پہچان کر چونکے۔ وہ سب کی پروا کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا ان کا بازو تھام لیا۔ احسان لمحہ بھر کے لیے لڑکھڑا گئے انہیں یقین نہیں تھا۔ جیسے کوئی خواب' واہمہ' سانس روکے' پلکیں جھپک بغور دیکھا وہ بازو کھول زور سے لپٹ گیا۔ تیز چلتے تنفس میں معافی مانگتا رہا۔ اور جب گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر چاچی نے کھولا' تحیر سے پتھرا گئیں۔ وہ بے ساختہ ان سے لپٹا تھا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے' انہوں نے جھٹکے سے اسے الگ کیا' بے یقین نگاہوں سے تکتے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ "اپنی صفائی میں کچھ مت کہنا' میری نگاہ میں تو کبھی میلا تھا ہی نہیں' یہ بوڑھی آنکھیں تیرے دیدار میں کھلی تھیں' تو آ گیا بات ختم ـــ"

وہ خاموشی سے جائے نماز پر بیٹھی تھی رِم جھم بوندیں کب موسلا دھار بنیں اور تھم بھی گئیں۔ وہ ہر چیز سے لاتعلق ہوئی بیٹھی تھی پھیلے ہاتھ' پلکوں کی جھالر گری ہوئی۔ وہ دبے قدموں اندر آکر برآمدے کے اس کونے میں بیٹھ گیا جہاں وہ اوٹ میں بیٹھی تھی۔ اس نے مضبوطی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

"تمہارے پھیلے ہاتھ اور آنسوؤں میں بہت طاقت ہے تنو' میں کبھی نہ آنے کے پکے ارادے سے گیا تھا' لیکن پہلے لمحوں میں ہی کمزور پڑ گیا اور پھر کمزور پڑتا گیا' دل کہیں لگا ہی نہیں' بے چینی' بے قراری مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی' بڑی طاقت ہے تمہاری دعاؤں میں تنو۔"

تنزیلہ کو اپنی ہتھیلیوں پر اس کی گرم پوریں سرکتی محسوس ہو رہی تھیں۔ "مجھے صاف کردو تمہیں دکھ دے کے سکھ مجھے بھی نہیں ملا۔"

دونوں کی بے یقین نگاہیں اک دوجے پر تھیں۔ دونوں ہی ظاہری' باطنی بدل گئے تھے' نگاہیں گڑی رہ گئیں۔ اک اک آنسو دونوں کی آنکھ سے ٹپکا اور تنزیلہ کی ہتھیلی پر آگرا' اس کی چمک کسی نادر ہیرے کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔

Downloaded From http://paksociety.com

آسیہ مظہر چوہدری

چیتر سدا راں

سیاہ افق پر سجے ان گنت ستارے آسمان کا حسن بڑھا رہے تھے۔ ہر سو ان ستاروں کی چمک دمک تھی۔ پر دھرتی میں ایک جگہ ایسی بھی تھی جہاں یہ ستارے' اپنی دمک میں ماند پڑ رہے تھے۔ وہ جگہ اماوس کی سیاہ رات کے اندھیرے میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔ اس جگہ کے اگر قریب جا کر دیکھا جائے تو وہاں ایک موم بتی اپنی زرد روشنی چلتی رکتی سانسوں کی طرح جلتی بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کسی نے انتظار کا دیپ جلا رکھا ہو۔

یہ زرد پیلی روشنی' کسی کا انتظار تھی۔

اور اماوس کے اندھیرے والی جگہ مدارن کا گھر تھی۔

٭ ٭ ٭

سورج' دھرتی کے کشادہ سینے کو کسی تندور کی طرح گرم لپٹوں سے دہکا رہا تھا۔ ان گرم لپٹوں کی جان لیوا تپش سے بچنے کے لیے انسان تو انسان۔ چرند' پرند بھی اپنے ٹھکانوں' گھونسلوں' میں دبکے پڑے تھے۔ پر ایسے منظر میں ایک شخص ایسا تھا جو کسی کے انتظار میں ان گرم لپٹوں کی پروا کیے بغیر اندھا دھند چلتا جا رہا تھا۔ اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ اسے محو انتظار شخص کی فکر تڑپائے جا رہی تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح وہ وہاں پلک جھپکتے پہنچ جائے۔ اور چند لمحوں بعد یہ شخص اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گیا تھا۔ اور اس کو منتظر دیکھ کر اس کے سوکھے لبوں پر یک دم مسکراہٹ کھل اٹھی۔

"رانو تو آ گئی۔" فرید نے خوشی سے اسے تکا تھا۔

"تو بلاتا تو میں کیسے نہ آتی۔" وہ بولی۔

"میں سمجھا کہ اس تپتے موسم میں شاید تو نہ آئے' اور میں انتظار کرتے کرتے لوٹ جاؤں۔" فرید نے اپنا قیاس بتایا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تو جانتا ہے' یہ جو محبت کی آگ ہوتی ہے نا باہر کی آگ سے بڑھ کر ہوتی ہے جس کو یہ چھو جائے اس پہ پھر کسی آگ کا اثر نہیں ہوتا۔" اس نے فرید کا قیاس رد کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آج کل تو بڑا فلسفہ بولنے لگی ہے' خیر تو ہے نا۔" اب کے فرید نے شرارت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"میں چٹی ان پڑھ کہاں فلسفہ جھاڑ سکتی ہوں۔ یہ تو بس اس محبت ___ کے کمالات ہیں جو ہم جیسوں کو بھی کچھ نہ کچھ سکھا دیتی ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"اب بتا کیوں بلایا ہے مجھے۔" اس نے دریافت کیا۔

"میں اگلے ہفتے' شہر جا رہا ہوں نوکری کے لیے۔" فرید نے یہ کہہ کر در حقیقت اسے ساکت کر دیا تھا۔

"شہر جا رہا ہے؟ نوکری مل گئی' اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" سکتہ ٹوٹا تو یکے بعد دیگرے تینوں سوال اکٹھے پوچھ لیے۔

"مجھے یاد نہیں رہا تجھے بتانا۔"

"یہ پہلی بات ہے' جو فرید نے رانو سے چھپائی ہے۔" یہ کہتے ہوئے رانو کے نین کٹورے یکدم بھرنے لگے اور پھر بھر بھر کر چھلکنے لگے۔

"ارے پگلی روتی کیوں ہے۔ میں کام' کاج میں مصروف تھا۔ بتانا یاد نہ رہا۔" اس نے جواز پیش کر کے رانو کو تسلی دینی چاہی تھی۔

"کب جا رہا ہے؟" رانو نے دھڑکتے دل کے ساتھ

Downloaded From http://paksociety.com

پوچھا تھا۔

"بتایا نا اگلے ہفتے۔"

"ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیا؟" جوڈر کنڈلی مارے اندر بیٹھا تھا یک دم باہر نکل آیا۔

"ارے شہر جارہا ہوں کسی دوسرے ملک نہیں جو تو یوں پریشان ہورہی ہے۔" فرید اب کہ جھنجلایا سا بولا تھا۔

"میرے لیے تو تیرا شہر جانا بھی دوسرے ملک جیسا ہے۔" وہ اداسی سے بولی تھی۔

"سال بھر کی تو بات ہے پھر میں شادی کے بعد تجھے بھی وہاں اپنے پاس بلالوں گا۔" مرد کا عورت کو زیر کرنے کا ازلی ہتھیار تسلی دلاسے امید ان تین بیڑیوں کو عورت بڑے شوق سے اپنے گلے کا ہار بناتی ہے۔ اور رانو نے بھی ان بیڑیوں کو اپنا لیا تھا۔

"میں تیرا انتظار کروں گی فرید۔" اس کے جملے پر آس پاس کے درخت بڑی زور سے ہنسے تھے۔

"میں تیرے انتظار کی لاج رکھو گا رانو۔" فرید نے عہد کیا تھا۔ سورج مرد کے اس جھوٹے وعدے پر اور غصہ ہوا تھا۔ اور اس کے غصے سے بڑھنے والی تپش اور زیادہ دھرتی کے سینے کو جلانے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور یوں رانو انتظار کا لبادہ اوڑھ کے اپنی پوری زندگی اس انتظار کے نام کرچکی تھی۔ انتظار کی یہ بیڑیاں اس وقت اسے طلائی زیور سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھیں، پر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ طلائی زیور سے بھی خوب صورت بیڑیاں اس کی جوانی کا سارا رس چوس لیں گی۔ اور پھر اس کھوکھلے وجود کو سختی سے اپنے بس میں کرلیں گی۔ وہ نہیں جانتی تھی، قطعی نہیں جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

انتظار کا یہ دیپ دو سال سے زائد کا عرصہ کاٹ چکا تھا۔ پر رانو اس دیپ کو روز امید کا تیل دینا نہ بھولتی تھی۔ دیپ تھک گیا تھا۔ پر رانو نہیں تھکی تھی۔ عورت ویسے بڑی کمزور ہوتی ہے پر مرد سے محبت کے مقابلے میں سخت چٹان بن جاتی ہے۔ رانو بھی چٹان

Downloaded From http://paksociety.com

بن گئی تھی۔ بنجر چٹان جس پر بارش کبھی پھول بھی نہیں کھلاتی۔

☆ ☆ ☆

چار سال.....

انتظار کا یہ دیپ چار سال پورے کر چکا تھا۔ پر ابھی تک اس کی تپسیا کا انت نہیں ہوا تھا۔ رانو کے بالوں میں چاندی کے تارے اگ آئے تھے۔ مگر انتظار کا یہ دیپ ابھی تک بوڑھا نہ ہوا تھا۔ پر ہاں رانو کا دل ضرور بوڑھا ہو تا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"خالہ! تو رانو کو کیوں نہیں سمجھاتی' وہ فرید کو دل سے نکال دے۔ وہ شادی کر کے اپنی زندگی میں خوش و خرم ہے تو رانو کیوں اس ہرجائی کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔" رانو کی سہیلی اظہرا آج بطور خاص رانو کے گھر اس کی اماں سے بات کرنے آئی تھی۔ کیونکہ اس سے رانو کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"پتر! میں سمجھا سمجھا کر تھک چکی ہوں' پر وہ سمجھتی نہیں۔ یہ بھی بتا چکی ہوں کہ فرید شادی کر چکا ہے پر وہ مانتی نہیں بس یہی کہتی ہے کہ فرید میرے انتظار کی لاج ضرور رکھے گا۔" اماں یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

"میں بات کرتی ہوں آج اس سے۔" اظہرا یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ کر رانو کے پاس چلی آئی۔

"رانو اور کسی پر نہیں تو اپنی بوڑھی ماں پر ہی ترس کھا لے کیوں انہیں دکھ دیے جا رہی ہے۔" اظہرا نے غصے سے اسے جھنجوڑا تھا۔

"میں نے اماں کو کیا دکھ دیا ہے۔" وہ الٹا حیرت سے اس سے پوچھنے لگی۔

"تجھے اس کم بخت فرید کی ان دیکھی سب باتیں پتا ہیں' پاس رہتی ماں کے دل کا حال نہیں معلوم' واہ رانو! تجھے اس دنیاوی عشق نے صحیح خوار کیا ہے۔" اظہرا بے بسی کے مارے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی تھی۔

"میں اپنا وعدہ نہیں توڑ سکتی اظہرا' یہ انتظار کا دیپ میری محبت کی سانسیں ہے اگر اسے توڑ دیا تو میری محبت بھی مر جائے گی۔ نہیں میں ایسا ظلم نہیں کر سکتی' مجھے معاف کر دینا۔"

"فرید تجھے اللہ پوچھے گا۔ تو نے ایک ہنستی بستی زندگی اجاڑ دی۔" اظہرا دکھی دل اور نم آنکھوں کے ساتھ واپس لوٹ آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

انتظار کی تپسیا برسوں گزر جانے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی تھی۔ پر رانو کی زندگی کا اس پریم مدارن (جوگن) کی زندگی' آہستہ آہستہ ہوتے ہوئے گھٹتی جا رہی تھی۔ انتظار کا یہ دیپ بڑا ہی طاقتور ثابت ہوا تھا۔ ایک پوری زندگی کھا گیا تھا۔ پر ابھی تک اس دیپ کا پیالہ نہ بھرا تھا۔

رانو آج بھی بوڑھے ہنسیں ابھرتے تھر تھر کانپتے ہاتھوں سے اس دیپ میں امید کا تیل ڈالتی تھی۔ آج بھی اس پریم مدارن کے من میں ایک ہی بات نقش تھی کہ وہ اس کے انتظار کی لاج ضرور رکھے گا۔

پریم رانو کو دیکھ کر اس مدارن کو دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ اور یہی کہتا جا رہا تھا۔ "مجھے حاصل کرنے کے لیے بڑے دکھ اٹھانے پڑتے ہیں' پوری زندگی اٹھانے پڑتے ہیں۔" پر مدارن مجسم سوال بنی یہ پوچھ رہی ہے کہ پریم میں اٹھائے جانے والے دکھ ہمیشہ عورت کو ہی کیوں اٹھانے پڑتے ہیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

Downloaded From http://paksociety.com

نایاب جیلانی

شہر خطا

بیہ' عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا' عنایہ نزع کے عالم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموشی اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر بستا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے "فاتح" سے عشق تھا' بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے گئی۔

دیا کا کمرہ خاص تہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں.... ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔"

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاتح کو بھی فون کر کے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاتح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔ افسون مشہدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ

Downloaded From http://paksociety.com

ناولٹ

Downloaded From http://paksociety.com

کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جارہا تھا۔ تب ہی ایئرپورٹ پر افسوں پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع افراہیم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔

مرید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور "دوست" کو بھی لے آنا۔ حدید کا یہ دوست پاکٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیہہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بددماغ اور غصیل بھی ہے۔ انادیہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو روبا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ انادیہ نے اس کو ناراضی سے منع کردیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود روبا ہے۔

روبا جب انادیہ کے گھر گئی تو اس نے انادیا کے تایا زاد افراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں روبا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

فوزان مشہدی کے آئل پلانٹ پر کام ہورہا تھا۔ فوزان مشہدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کررہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیرذمہ دار اور لاپروا تھا۔ یہ لڑکا رافع افراہیم تھا۔ فوزان مشہدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظہران سے فرار ہورہا ہے تو فوزان مشہدی کو غصہ آگیا اور اس نے خروج لگوا کر اسے جیل بھجوادیا۔

افسوں مشہدی کی اپنی سوتیلی ماں آبگینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا سگا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔

رافع افراہیم کے جیل جانے سے افسوں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہوگیا۔

حریر اپنے پاکٹ دوست کے ساتھ ڈین ہیگ پہنچا تو مرید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مرید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پاکٹ دوست سیخ پا ہوگیا تھا۔ وہ مرید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا، لیکن مرید نے اسے زبردستی روک لیا۔

مرید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید آپی کی خالہ زاد تھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مرید کی لاٹری نکلی تھی۔

افسوں نے پہلی بار جب رافع افراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسوں اسے دل دے بیٹھی، وہ اس کی منت سماجت کرکے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع افراہیم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسوں کی محبت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسوں نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کرسکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسوں یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی، لیکن وہ بچ گیا تھا۔

فوزان، مشہدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسوں کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کرا چکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھتکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔

عنایہ اور دیا کی موت پر سب رشتے دار شکوک کا شکار ہورہے تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے بیہ پر شک کیا کہ اس نے پیسے کی خاطر سوتیلی بہن اور بھانجی کو زہر دے دیا۔

دیا کا پورا نام انادیہ تھا۔ روبا جب انادیہ کے لیے رشتہ لے کر گئی تو وہاں انادیہ کے چچا کے بیٹے افراہیم نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور رشتہ بھجوادیا۔ انادیہ کو شدید غصہ آیا۔ اور حسد محسوس ہوا کیوں کہ افراہیم نے اس کے لیے تو صاف انکار کردیا تھا۔ انادیہ کا رویہ سوتیلی ماں کے ساتھ دن بہ دن خراب ہوتا جارہا تھا۔ فرزانہ ماں بننے والی تھی۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

انادیہ نے افراہیم کے گھر سے آئی، اس کی منگنی کی مٹھائی بھی چھت پر پھینک دی تھی۔ اس نے ناجو کے ذریعے اماں دیوانی سے جادو کرایا۔ کاشف اس پر بری طرح ریجھ گیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

انادیہ کا بھائی ناصر ایک لڑکی کو بھگا لایا۔ اس وجہ سے گھر پر پولیس آگئی اور ابا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ابا اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے اور دل کے دورے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

افراہیم کا نکاح ہونے لگا تو انادیہ نے اماں دیوانی سے اس نکاح کو رکوانے کے لیے تعویذ لیے۔ لیکن انادیہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ نکاح ہو گیا۔ چچی نے انادیہ کے بارے میں کہا کہ یہ جس کی زندگی میں جائے گی اسے جہنم بنا دے گی۔ یہ سن کر انادیہ کے تن بدن آگ لگ گئی۔

افراہیم نے ناصر کو جیل سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اس بات کا بھی غصہ تھا۔ انادیہ نے ایک بار پھر اماں دیوانی سے رجوع کیا۔

فرزانہ ایک بچی کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ روبا امید سے تھی۔ وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی تو اسے انادیہ کی غلطی کہہ کر افراہیم نے انادیہ کو بہت مارا۔ اس تذلیل نے انادیہ کے دل میں شعلے بھر دیے۔ وہ اماں دیوانی کے پاس پہنچ گئی۔

روبا کی زندگی اچانک طوفانوں کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے گھر میں سائے نظر آتے۔ وہ خوف زدہ رہتی۔ اماں کی حالت بھی خراب رہنے لگی۔

روبا کی شادی کاشف سے ہو گئی تھی۔ انابیہ اس کی سوتیلی بہن اس کے مزاج کی سختی کا شکار تھی۔ افراہیم کی امی نے افراہیم کے بیٹے فاتح سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ انادیہ کو اس پر بھی شدید غصہ تھا۔ وہ دن بہ دن غلط عملیات میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

ایک دن نانا جو اچانک دیا کے گھر آگئی۔ اس نے بتایا کہ عملیات کی وجہ سے وہ برباد ہو چکی ہے۔ اس نے اس کا ذمہ دار دیا کو ٹھہرایا۔ اس کی ساس نے یہ باتیں سن لیں۔ انہوں نے کاشف اور دیا کو گھر چھوڑنے کے لیے کہا۔

اماں کے دل میں روبا کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ روبا سے خوف زدہ تھیں۔ افراہیم نے بھی تنگ آکر ایک دن کہہ دیا کہ۔۔۔ ”تم اماں کے سامنے نہ آیا کرو۔“

ساتویں اور آخری قسط

کچھ اور اک بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ جو روح کو جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔ اور کچھ انکشاف بڑے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔ جیسے مدید کی منگنی ہو جانے کا انکشاف، جو فاتح کے لیے تو ایک اطمینان کے سوا کچھ نہ تھا البتہ حریر کی جذباتیت اسے تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔

”اس کی منگنی پہ تمہارے غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔“ فاتح کرسیوں میں پرسکون ہوتا اب آرام کرسی پہ جھول رہا تھا۔

مدید کی منگنی ہو چکی تھی اب کوئی فنکشن ہونے والا نہیں تھا؟ پاکستان سے رشتہ داروں کا ٹولہ آنے والا نہیں تھا۔ خاص طور پر مدیحہ تائی۔ مدید کی سڑیل ماں۔

وہ ان کا سامنا کبھی نہیں کرے گا۔

”تم تو بے حس ہو۔ اس کملی ”بے عزتی“ کو محسوس نہیں کر سکے۔ احمق! اگر منگنی کا فنکشن نہیں تھا تو تمہیں اور مجھے یہاں ٹیولپ کے کھیت کٹوانے کے لیے بلوایا ہے؟ ہم بیک میں کھیتی باڑی کریں گے کیا؟“ وہ اونچی آواز میں پھنکارتا ”آپے“ سے باہر ہوا تو چولی برآمدے سے نکلتے کمال خالو نے انہیں گھور کر دیکھا۔ وہ بیلچہ اٹھائے، ہاف نیکر پہنے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔

حریر کچھ خیال آنے پہ چونک گیا تھا اور اچانک بیٹھے سے سیدھا ہو گیا۔

”وہ کانیہ تمہارا پوچھ رہی تھی۔“

Downloaded From http://paksociety.com

"میرا۔۔۔؟" فاتح بری طرح سے ٹھٹکا تھا۔ انیہ کا نام آتے ہی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ پھر اس نے جلدی سے سر جھکا لیا تھا۔ وہ اس کھوجی کی نگاہوں کے سامنے کچھ بھی عیاں نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

جب وہ کھانا کھا کر ہال سے باہر گیسٹ روم کی طرف نکلا تو انیہ اچانک سامنے سے آتی اس سے ٹکرا گئی تھی۔ انیہ کے ہاتھ میں ٹیولپ کے پھول تھے۔ جو زمین پہ گر گئے تھے۔

ٹیولپ اس ملک ہالینڈ کی فخریہ کاشت تھی۔

"آئم سوری۔۔۔" فاتح نے جھک کر پھول سمیٹے تھے وہ لڑکی جو گم صم سی کھڑی تھی۔ لمحہ بھر میں ہی سنبھل کے چونک گئی۔

"اٹس اوکے' یہ آپ کے لیے ہی تھے۔" انیہ نے مسکرا کر پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارے ڈین ہیگ میں آنے والے معزز مہمانوں کو خوش آمدید۔" دوسرے ہی پل اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر تھوڑا جھکتے ہوئے کہا تھا۔ فاتح اس انداز پہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ مسکرا دیا۔ اسے انیہ کے لیے حریر کا تعریفی انداز یاد آیا تھا۔

"مجھے مدید کی قسمت پہ رشک آرہا ہے۔"

فاتح کو اس رشک کی وجہ سمجھ میں آچکی تھی۔ وہ ایک بہت پیاری لڑکی تھی۔ یقیناً" مدید کے ساتھ اس کی زندگی بہت اچھی گزرتی۔

"تمہیں ہیگ بہت اچھا لگے گا۔ ٹیولپ یہاں کی سوغات ہے۔ یہ مسافروں کو روک لیتے ہیں۔" انیہ نے ایک عجیب بات کہی تھی۔ پھر فرش سے جھک کر ایک ننھی کلی کو اٹھا کر فاتح کی طرف بڑھایا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا۔ مدید جیسے بندے کا دوست تمہارے جیسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم ہیگ میں طلوع ہوتے ایسے سورج کی مانند ہو جو ٹیولپ پہ اپنی کرن پھینکے تو ہر سو سنہرا اجالا کر دے۔" انیہ کے تعریفی کلمات نے فاتح کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے پوری گفتگو میں ایک ہی جملہ کانٹے کی طرح چبھا تھا۔ "مدید جیسے بندے کا۔۔۔؟"

اس بات سے انیہ کی کیا مراد تھی؟ فاتح کو اپنا دماغ سنسناتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"تمہیں میری تعریف بری لگی ہے تو سوری۔" اس نے فاتح کے تاثرات فوراً" بھانپ لیے تھے۔ وہاں برہمی کی سرخی چھا رہی تھی۔ "لیکن خدا کی صناعی اور اس کی کسی بھی تخلیق کو سراہنا کوئی جرم نہیں۔"

اس تصادم کے بعد ایک مرتبہ پھر انیہ کا سامنا کرنا بڑا ہی دشوار تھا۔ لیکن رات کے اس پہر پیاس کی شدت نے فاتح کو بیسمنٹ سے اوپر آنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اور اب انیہ کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر وہ شاید واپس ہی چلا جاتا لیکن انیہ کی اچانک اس پہ نگاہ پڑ گئی تھی۔ اور دوسرے ہی پل وہ جگ' گلاس سمیت اس کے سامنے تھی۔

"یہ پانی تمہارے لیے۔" وہ پانی سے بھرا جگ فاتح کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اور فاتح کو جیسے شاک لگا تھا۔ انیہ کو کیسے پتا چلا کہ اسے پانی کی طلب تھی؟ کیا انیہ کو الہام ہوا تھا۔

"مدید نے کہا تھا کہ میں تمہارے بیڈ روم میں پانی رکھوا دوں۔۔۔ جب میں پانی لے کر آئی تو تم سو چکے تھے۔ بیڈ روم اندر سے لاکڈ تھا۔ میں تب سے یہاں بیٹھی ہوں کہ تم اٹھو گے اور پانی لینے ضرور آؤ گے۔ گرینڈ مارات کو کچن لاک کر دیتی ہیں۔ میری ماں کے وقتوں سے عادت ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ غریب گھرانے کی پاکستانی بہوئیں کو فریج کا صفایا نہ کر دے۔ اور پرانی عادتیں چھوٹتی کہاں ہیں؟ وقت بدل گیا پر برصغیر کی عورتوں نے اپنی سوچ نہ بدلی۔ اب یہی حال دیکھ لو۔ ممی کو شوگر ہوئی تو میں نے روم فریج منگوا دیا۔ ضرورت کی کھانے والی تمام چیزیں اندر بھر دیں۔ مگر گرینڈ ما کا وہم وہیں کا وہیں۔۔۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کے چیک کرتی ہیں۔ ارے' میں بھی کس کہانی میں الجھ گئی یہ پانی لو نا۔" وہ ابھی تک جگ بڑھائے کھڑی تھی۔

"فاتح۔۔۔!" انیہ کے طرز تخاطب سے اس نے

Downloaded From http://paksociety.com

ناگواری محسوس کی تھی پھر اس نے جگ اور گلاس لے لیا اور جانے کے لیے مڑا۔ لیکن انیہ کی آواز نے قدم روک لیے۔

"اور مجھے تو یہ بھی پتا ہے۔ تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟ اور تم کافی نہیں پیتے۔ میوزک میں وائلن کے سُر پسند تھے اور گیتوں میں محمد میاں صاحب' وارث شاہ' بلھے شاہ تمہارے فیورٹ' تمہیں بہت بولنے والے لوگ پسند نہیں۔ لیکن بولنے سے انسان ریلیکس ہوتا ہے۔" فاتح حیران تھا۔

"گڈ بائے فاتح! صبح ملاقات ہوگی۔" وہ بولتی جارہی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ کوئی اس کی سن بھی رہا تھا یا نہیں؟ وہ بول بول کر تھک گئی اور ٹھنڈے فرش پہ بیٹھ گئی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ یہ سب کچھ الٹ پلٹ کیوں ہو رہا تھا۔ یوں جیسے اندر کا کوئی موسم بدل رہا ہو۔

وہ اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی کو گھماتی اور وحشت زدہ سی رہ جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہیگ کا آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔

مدید اپنے ہونے والے "خالو سسر" کے ہمراہ کہیں روپوش ہوا تو آکٹیا آکٹیا حریر زبردستی فاتح کو کمرے سے گھسیٹ کر باہر لے آیا تھا۔

وہ دونوں ہیگ کے بازار گھومنے کے لیے نکل گئے تھے۔ واپسی پہ اخلاقی تقاضوں کو نبھاتے ہوئے انیہ کے لیے تحفہ خرید لائے۔ اور فاتح نے اپنی احتیاط پسند طبیعت کی وجہ سے وہ تحفہ انیہ کو براہ راست نہیں دیا تھا بلکہ مدید کے حوالے کردیا تھا۔ تاکہ وہ خود انیہ تک کو پہنچادے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟

☆ ☆ ☆

تاحد نگاہ بجلی کے بلب جیسے ٹیولپس کا فرش بچھا ہوا تھا۔

فضا میں تازہ گلابوں کی خوشبو بھی رچی تھی۔

وہ دونوں گیسٹ روم کی بالکونی میں بیٹھے تھے۔ اور ہیگ پہ اُترا حسن دیکھ کر مبہوت ہو رہے تھے۔ مدید صبح سویرے اپنے خالو سسر کے ہمراہ نجانے کہاں نکل جاتا تھا' یہ معمہ بھی حل ہوگیا۔

کمال خالو اپنے کمال کے کھیتوں کی حفاظت و نگہداشت میں کمال کے حساس تھے۔ مختصر رقبے پہ پھیلے ٹیولپس کے باغ کی دیکھ بھال بذات خود فرماتے۔ اب دست راست کیا ملا۔ مفت کے اس مزدور سے پورا دن کام کروایا جاتا تھا۔ وہ کمال خالو کی طرح ہی لمبی سی نیکر' بنیان میں بیلچہ اٹھا کر صبح صبح کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔

حریر کو جب مدید کی "مصروفیت" کا علم ہوا تو اسے پتنگے ہی لگ سکتے تھے۔

"یہ گھر داماد ہے یا مستقل چاکری؟ اگر اسے گھر داماد رکھنا کہتے ہیں تو میں ایسی دس انیہ قربان کردوں اور کبھی بھی گھر داماد نہ بنوں۔" حریر کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

انیہ کا بھیجا ہوا ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے فاتح نے حریر کے سرخ' پیلے ہوتے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"تم کہہ سکتے ہو' کیونکہ تم نے چھوٹے گھروں کے مسائل نہیں دیکھے۔ بجلی' پانی' گیس نہ ملنے پہ کئی کئی دن بھوکا' پیاسا اور ان دھلا رہنے کا عذاب نہیں سہا۔ تم کسی کے ٹکڑوں پہ نہیں پلے۔ تم نے گالیاں' کوسنے اور دھکے نہیں کھائے۔ اگر زندگی میں اس تھوڑی سی مشقت کے بدلے میں "شارٹ کٹ" انیہ کی صورت میں میسر آجائے تو اسے خوش نصیبی سمجھ لینا چاہیے۔ مدید نے اسے خوش قسمتی سمجھ لیا ہے اور اس پوزیشن کو قبول کرلیا ہے۔ کم از کم اس زندگی سے یہ زندگی بہت بہتر ہے۔ جو اس کی ماموں نے عذاب بنا رکھی تھی۔" کچھ دیر بعد فاتح نے نہایت سنجیدگی سے مدلل جواب دیا تھا۔

حریر لمحہ بھر کے لیے چپ رہ گیا۔ وہ فاتح کے لہجے کی کاٹ دار سچائی کی تکلیف محسوس کرتا مدید کو اب کوئی "یرغمالی گھر داماد" نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ گہرا سانس بھر

Downloaded From http://paksociety.com

کے رہ گیا۔

بہت دور نکتوں کی صورت میں کمال خالو اور مدید ٹیولپ کے کھیت میں کام کرتے اور گوڈی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان کے قریب کوئی اور بھی تھا۔ کوئی گلابی سلیش والا؟

"ان کا ذریعہ معاش یہی ہے ٹیولپ کی ایکسپورٹ اور روزی کمانے کے لیے انسان محنت تو کرتا ہے۔" فاتح نے چیخ چیخ کر اشارہ کرتے مدید کو ہاتھ ہلایا تھا۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ یہ دونوں سمجھ ہی نہ پائے۔ معاً" ان دونوں کے پیچھے سے نکل کے کوئی سامنے آگیا تھا۔ وہ دونوں بے ساختہ چونک اٹھے تھے۔ آنے والی انیہ کی گرینڈ ما تھیں۔ وہ خرانٹ سی بوڑھی جسے حریر نے ورچ کا نام دے رکھا تھا۔ کھچڑی بالوں والی خوفناک سی آنٹی۔

"تمہارا دوست کھیتوں میں صبح سے گوڈی کرتا ذلیل ہو رہا ہے۔ اتنا احساس نہیں کہ اس کی مدد کردو اور سن لو یہاں مفت خوری کا رواج نہیں ہے۔" انیہ کی گرینڈ ما کسی میزائل کی طرح ان دونوں کے حواسوں پہ گری تھیں۔ وہ آگے پیچھے بالکونی سے اترے اور کھیتوں کی سمت چل نکلے تھے۔ اس حال میں کہ حریر غصے میں دانت کچکچاتا تھا اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بالکونی کی طرف دیکھتا تھا۔

"ہم اس کے باپ کے ملازم ہیں کیا؟ بس نکل یہاں سے کسی ہوٹل میں بسیرا کرتے ہیں۔" فاتح اس کی حالت زار پہ مسکراہٹ دباتا اور آگے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

ٹیولپس کی لمبی دور تک جاتی قطاروں کے آخری کنارے پہ خوبانی کا ایک درخت لگا تھا۔

اور اسی درخت کے نیچے انیہ بیٹھی تھی۔ زرد ٹوکری میں ٹوٹ کر گرتی خوبانیوں کو اکٹھا کرتی ہوئی۔ اور اس کا چہرہ بہت سی سوچوں کے غبار تلے اپنا اصلی رنگ کھو رہا تھا۔

گوڈی کرتے ہوئے مدید نے بے ساختہ چونک کر انیہ کی طرف دیکھا اور پھر ماتھے پہ آیا پسینہ پونچھ کر سر سے نظر بچاتا پھولوں کی اوٹ میں رینگ کے زمین پہ چلتا انیہ کے قریب آگرا تھا۔ اپنے دھیان میں بیٹھی انیہ کی بے ساختہ چیخ نکل گئی تھی۔ مدید نے فوراً" اپنا مٹی سے بھرا ہاتھ انیہ کے لبوں پہ رکھ کر اس کی چیخ کا گلا دبایا تھا۔

"اوف' ہاتھ ہٹاؤ۔" انیہ نے زبردست مزاحمت کی تھی۔ مدید نے اسے چیخنے کے لیے پر تولتے دیکھ کر اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

"جنگلی بلی! کتنا چیختی ہو تم۔" مدید نے خفگی سے کہا اور اس کے باپ کی طرف اشارہ کیا۔

"سر صاحب نے مجھے کام چھوڑے تمہارے گھٹنے سے لگا دیکھ لیا تو ہاتھ میں پکڑا بیلچہ اٹھا کر میرے سر میں دے ماریں گے۔ اور ابھی میرا اوپر جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔" مدید نے مٹی بھرے ہاتھوں سے اپنا پسینہ رگڑا اور ٹوکری سے ایک خوبانی اٹھا کر کھانے لگا۔ انیہ ایک دم دبی آواز میں چیخی تھی۔

"ہاتھ تو دھولو۔"

"شاہی صراحی میں پانی لے آتیں تو ہاتھ بھی دھو لیتا۔" وہ اس کے چیخنے پہ عذر دیتا سنجیدگی بھری لاپروائی سے بولا تھا۔ "اب میں ایک کسان ہوں۔ اور کسان مٹی کے ساتھ مٹی ہو جاتا ہے۔ یہ مٹی کسان کے اندر رچ بس جاتی ہے۔" مدید مسکراتا ہوا خوبانیاں کھاتا رہا۔ انیہ کے دھیان کی سوئی گھوم پھر کر بالکونی میں ہی اٹک رہی تھی۔ جہاں پہ وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اور ان دونوں کی طرف اشارہ کر کر کے باتیں کر رہے تھے۔ شاید موضوع گفتگو مدید ہی تھا۔ انیہ کا دل بجھنے لگا۔ اداس ہونے لگا۔ وہ اپنی ان کیفیات پہ شدید ہراساں تھی۔

یہ اس کے اندر کون سا "بدلاؤ" چل رہا تھا۔

معاً" اس نے مدید کو ایک کونے میں رکھے پتھر کی طرف بڑھتا دیکھا۔ اس پتھر کے اوپر مدید کے کپڑے پڑے تھے اور ان کے نیچے ایک مخملی کیس۔

Downloaded From http://paksociety.com

منگنی کے بعد پہلی مرتبہ کوئی تحفہ؟
اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

مدید سابقہ انداز میں کمال خالو سے بچتا بچاتا رینگتا ہوا انیہ تک پہنچ گیا۔ پھر اس نے مخملی کیس انیہ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ انیہ نے اشتیاق کے عالم میں مخملی کیس کھولا۔ اور اندر سے ہیروں کا جگمگاتا برسلیٹ برآمد ہوا۔ ڈین ہیگ کی چمکتی روشنی میں برسلیٹ کے ہیرے دمک رہے تھے اور آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔

"یہ اتنا قیمتی تحفہ؟" وہ ہکلا کر خاموش ہو گئی تھی۔

منگنی کے بعد مدید کی طرف سے یہ پہلا تحفہ تھا۔ منگنی پہ اس کی کنجوس خالہ نے صرف ایک چھلا بھجوایا تھا۔ اور اب مدید کی طرف سے ملنے والا یہ انتہائی قیمتی تحفہ۔

وہ ایک خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ برسلیٹ پہننے لگی۔

"تم پہناؤ گے تو گندا کر دو گے۔" وہ خوشی سے کھلتی گندم کی سنہری بالیوں کی طرح لگ رہی تھی۔ مدید اس کی بے تحاشا خوشی پہ حیران ہوتا اسے بتانے لگا۔

"یہ منگنی کا تحفہ ہے۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کس کی چوائس سے خریدا ہے۔" اب وہ پہلے والی بیزاری بھلا کے سوال کر رہی تھی۔ ہونٹوں پہ مسکان، آنکھوں میں خوشی.... مدید کا دل عجیب سا ہو گیا تھا۔ کیا عورتوں کی خوشی ان ہیرے، موتیوں تک محدود ہوتی ہے؟ اس کے اندر بے کلی سی اترنے لگی تھی۔

"یہ میں نے نہیں خریدا...." مدید نے سچ بتایا اور وہ حیران رہ گئی۔

"تو پھر؟" انیہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"یہ انہوں نے دیا ہے۔ حریر اور فاتح نے۔" مدید نے بالکونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں دور بالکونی میں بیٹھے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مدید انہیں اشارے کر کر کے بلا رہا ہے۔ جواباً فاتح نے بھی ہاتھ ہلایا تھا۔ مدید کا ہاتھ اس کے پہلو میں لٹک گیا تھا۔

وہ ایک دم بے چین سا ہو گیا۔

"منگنی کا تحفہ.... اور اب شادی پہ نہیں لوں گا۔" مدید نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ الجھن بھری نظروں سے دیکھتی ایک دم ہنس پڑی تھی۔

"تو اب بھی نہ لیتے۔" وہ برسلیٹ کو بڑے پیار سے اپنی سڈول کلائی میں گھما رہی تھی اور اس کے ساتھ مدید کا دل بھی گول دائرے میں گھوم رہا تھا۔

"وہ لے آئے تھے۔ لوٹانا اچھا نہیں لگا۔" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی تھی۔ کیونکہ تیز قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا تھا۔ اور چونک تو انیہ بھی گئی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ "ہوں، فاتح کی چوائس بہترین ہے۔" اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اور مدید کے سر پہ خوبانی کا پورا درخت آ گرا۔ اس نے فاتح کا نام لیا تھا۔ حریر کا کیوں نہیں لیا؟ تحفہ ان دونوں نے مشترکہ دیا تھا تو پھر صرف فاتح کیوں؟

معاً تیز قدموں کی چاپ اس کے سر پہ پہنچ گئی تھی۔ مدید نے غائب دماغی سے آنے والوں کی طرف

Downloaded From http://paksociety.com

دیکھا تھا۔ وہ حریر تھا جو غصے میں نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اور فاتح اس کے پیچھے تھا۔ نرم نرم مسکراتا ہوا۔

اس کے دماغ میں سائیں سائیں ہوتی رہی۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔

ماحول چند پل بعد بدل گیا۔ حریر اب انیہ کو بریسلیٹ پہنے دیکھ کر تعریف کر رہا تھا اور فاتح بیلچہ اٹھا کر مدید کے حصے کا کام کر رہا تھا۔

پھر مدید نے ایک اور منظر دیکھا۔ حیران کن 'پریشان کن' اور یہی منظر حریر نے بھی دیکھا تھا۔ اور عجیب تو فاتح کو بھی لگا تھا۔

مدید کی فیانسی کے چمکیلے کٹوروں میں فاتح کو دیکھ کر بجلی سی کیوں چمکتی تھی؟

اس سوال نے حریر کو دم بخود کر دیا تھا۔ وہ بے خیالی میں مدید کی طرف دیکھتا رہا۔ مدید کروٹ کے بل نم زمین پہ سو رہا تھا۔ اچھا تھا وہ سو رہا تھا۔

وہ انجان تھا۔ انجان ہی رہتا۔

کیونکہ بعض ادراک بہت جان لیوا ہوتے ہیں۔ جو روح کو جھنجوڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ جو زلزلے کی مانند آتے ہیں اور دل برباد کر جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ہیگ میں آج چھاجوں چھاج مینہ برس رہا تھا۔

جیسے باہر کا موسم بدلا تھا ایسے ہی اندر کا موسم بھی بدل گیا تھا۔

خالو کمال سے لے کر اس خبطی بڑھیا تک سب کے سب تیر کی مانند سیدھے تھے۔ وہ مہمانوں کو دیکھ کر ماتھے کی تیوریاں، آنکھوں کی چڑھی پتلیاں 'چتونوں کے بل' سب گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھے۔

حریر نے بادل نخواستہ ہوٹل میں منتقل ہونے کا پروگرام بدل دیا تھا۔ کیونکہ آنٹی "وچ" نے انہیں قسم ہی ایسی دی تھی۔

"میری لاش سے گزر کر ہوٹل میں جانا۔" یہ کسی پنجابی فلم کا ڈائیلاگ نہیں تھا۔ وہ حقیقتاً" حریر کے سامنے اپنے منحنی وجود کے ساتھ تن کر کھڑے ہونے کی کوشش میں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اب ان کی لاش سے گزر کر جانے کا دل گردہ کوئی کہاں سے لاتا۔ اوپر سے مدید کی منتیں اور انیہ کی معذرتیں ساتھ گرینڈ ما کی ٹھنڈی ٹھنڈی بڑبڑاہٹیں۔

"مجھے کیا خبر تھی مدید کے دوست نکمے نہیں۔ ایک جہاز اڑاتا ہے اور دوسرا ماہر نفسیات یعنی ڈاکٹر۔ بھلا اس نکمے مدید کے اتنے قابل دوست ہو سکتے ہیں۔" گرینڈ ما کو بالآخر یقین آہی گیا تھا۔

ان کو یقین کیا آیا۔ حریر اور فاتح کی قسمت کھل گئی۔ ایسا شاہی پروٹوکول' اچھے سے اچھا خوان لگتا تھا اور مہمانوں والے سارے چاؤ ان پہ پورے کیے جاتے تھے۔ ساری عمر میں شاید یہ پہلے مہمان تھے جن کی مدارت اور آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ ورنہ اس گھر میں مہمانوں کی خاطر 'خدمت کا رواج نہیں تھا۔

یہ کایا پلٹ انیہ اور مدید کی وجہ سے ہوئی تھی۔

"اتنے فارغ نہیں تھے۔ جو منہ اٹھا کر آجاتے۔ میں نے منتیں کر کے بلایا تھا۔" مدید رات کو گرینڈ ما سے لڑ پڑا تھا۔ "اور آپ نے ایک کمرشل پائلٹ کو کھیتی باڑی پہ لگا دیا؟ وہ پائلٹ ہے کوئی کسان نہیں جس سے آپ ٹیولپ کی ایک نئی فصل کاشت کروانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ حریر 'ارب پتی کا بیٹا اور کھربوں اربوں کے اثاثوں کا مالک ہے۔"

انیہ کے آئینہ دکھانے پہ گرینڈ ما سچ مچ پریشان' حواس باختہ اور شرمندہ ہو گئی تھیں۔ سو انہوں نے مہمانوں سے معذرت کرنے میں دیر نہ کی۔ اور اس رات گیسٹ روم کی فضا بڑی پُرامن تھی۔

آج کی شام حریر نے انیہ کی گرینڈ ما کو وچ کہنے سے پرہیز کیا تھا۔ انہیں کنجوس' تنگ دل اور بھوکی جیسے خطابات سے نہیں نوازا تھا۔ اور اس صورت حال پہ سب سے زیادہ مدید خوش تھا۔ اب اگلے چند ہفتوں تک گرینڈ ما کا موڈ بہت اچھا ہو جاتا اور اس دوران وہ

Downloaded From http://paksociety.com

"مبارک ساعت" بھی آجاتی۔ جس کے لیے مدید نے اپنے دوستوں کو پہلے ہی بلا لیا تھا۔

اس رات مدید اپنے کمرے سے نکل رہا تھا جب اسے ٹیرس پہ انیہ کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ ٹیرس پہ اکیلی تھی اور بہت اداس بھی۔

مدید کی نگاہیں اس کے بریسلیٹ پہ جم گئی تھیں۔ وہ اضطراری انداز میں بریسلیٹ کو اپنی سندر کلائی میں گھماتی تھی اور رات کی تاریکی میں جانے کیا کھوجنے لگتی۔

"انیہ!" مدید کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ گھبرا کر چہرہ موڑ گئی۔ شاید وہ اپنے تاثرات مدید سے چھپانا چاہتی تھی۔ مدید گھوم کر اس کے سامنے آگیا تھا۔

"یہ ــــ" مدید نے اس کی کلائی کو ہاتھ میں لیا۔ اندھیرے میں بھی بیش قیمت ہیرے اپنا مول بتاتے تھے۔ اور ان کی چمک ایک دیوار تھی۔ جو مدید کی آنکھوں کے سامنے تن رہی تھی۔ یوں کہ اس کے لیے انیہ کا چہرہ دیکھنا دشوار تھا۔

"یہ اتار دو۔" مدید نے کلائی کو چھوا اور چھوڑ دیا تھا۔

"اتار دوں؟ مگر کیوں؟" اس کا سوال بڑا ہی بے چین کر دینے والا تھا۔

"اس کی چمک میری آنکھوں کو تکلیف دیتی ہے۔" مدید نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا۔

"مگر۔" انیہ ہکلا سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمکیلا پانی جمع ہونے لگا۔

"یہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس کا ڈیزائن بہت یونیک ہے۔ تمہیں نہیں پتا مدید! گرینڈ ما کا یہ پورا گھر فروخت کر دیں تب بھی اس بریسلیٹ کی قیمت پوری نہ ہو۔ اس میں بڑے قیمتی ہیرے جڑے ہیں اور یہ مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔" آخری جملہ اس نے دل میں کہا تھا اور پھر خاموش ہو گئی۔ کیونکہ مدید وہاں نہیں تھا۔ وہ چلا گیا تھا۔ غصے میں یا شاید ناراض ہو کر۔

انیہ ٹیرس کی ریلنگ سے کمر ٹکائے گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ اب بھی بریسلیٹ کو گھما رہے تھے۔ پھر اس نے بریسلیٹ کا ہک کھول کر اتارا۔ اس کی کلائی سونی اور بے رنگ ہو چکی تھی۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر لب بھینچ لیے۔

وہ روتے ہوئے دوبارہ بریسلیٹ پہن رہی تھی۔

اس بریسلیٹ کو اتارنے کا فیصلہ گھور تاریکی میں کھو گیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے ٹیرس کا دروازہ کھول کر اندھیرے میں گم ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"سرمئی رنگ کے اڑے اڑے بال۔ جیسے اس کھیتی میں کوئی بم بلاسٹ ہوا ہو۔ چھوٹی مگر انتہائی شاطر آنکھیں۔ چہرے پہ ڈھیروں جھریاں۔۔۔ بوڑھے مخروطی ہاتھوں پہ ان گنت ابھری ہوئی رگیں۔ پچکے گال، لٹکے ہونٹ، دبلا پتلا منحنی سا سراپا۔ واللہ میرے تصور میں اس لڑکی کے سوا اور کوئی نہیں آتی۔ میں جب بھی آنکھیں موندتا ہوں۔ میرے خیالوں میں آپ کا چہرہ آتا ہے۔ آئی لو یو گرینڈ ما! میں اپنا پروپوزل آپ کی پوتی کے سامنے رکھوں یا پوتی کے ہونے والے شوہر کے سامنے؟" یہ حریر تھا۔ گرینڈ ماں کے گھٹنے پہ سر رکھے اناپ شناپ بکتا ہوا۔ حریر کا کسی کسی دن میٹر الٹا چلنے لگتا تھا۔ آج بھی ان ہی دنوں میں سے کوئی دن تھا۔

اخبار کو بلاوجہ کھنگالتا فاتح بمشکل اپنی مسکراہٹ روک سکا تھا۔ کچھ بھی تھا۔ اس حریر کے علاوہ فاتح کے بے رنگ چہرے پہ مسکراہٹ لانے ہنر کا کسی اور کو نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی مسکراتا تھا۔ حریر کی بکواس پہ ہی مسکراتا تھا۔

"تم بہت شرارتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے نفسیات پڑھ رکھی ہے۔" گرینڈ ما اپنے نقلی دانتوں کے ساتھ ہنستی ہوئی بہت پیاری لگتی تھیں۔

"آپ کو تو یہ بھی یقین نہیں آتا تھا کہ فاتح جہاز بھی اڑاتا ہے۔" حریر نے فوراً جملہ اچکا۔

"لیکن اب تو آگیا نا۔" گرینڈ ما ہنسنے لگیں۔

"ہماری خوش نصیبی۔" وہ آداب بجا لایا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

گرینڈ ما نے عمر بھر میں ایسا "لطیفہ" نہیں دیکھا تھا۔ وہ انہیں ہنسا ہنسا کے بے حال کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ان پہ کھانسی کا حملہ ہو جاتا۔

اس صورت حال پہ فاتح انہیں پانی پلاتا۔ ان کی کمر مسلتے ہوئے حریر کو زبردست گھوریوں سے نوازتا تھا۔

"تم اپنی محبوبہ کی جان لینے کے درپے ہو؟"

"محبوبہ کی جان لوں گا تب ہی تو مدید کی دادی ساس سے جان چھوٹے گی نا۔" وہ آنکھ مار کر اشارہ کرتا تو فاتح اسے ایک آدھ دھمو کا جڑ دیتا تھا۔

گرینڈ ما سے حریر کی بڑی گاڑھی چھننے لگی تھی۔

اور ایک دن حریر انناس کا جوس پیتے ہوئے گرینڈ ما سے بڑی رازداری کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"آپ کی پوتی بڑی اداس اور چپ رہتی ہے۔ جب ہم آئے تھے تو ایسا نہیں تھا۔ چار دن ستا ئیس گھنٹوں میں اسے کیا ہو گیا؟" حریر ایسا ہی تھا۔ بظاہر من موجی اور لاپروا مگر در حقیقت ہر چیز کا گہرائی سے مشاہدہ کرنے والا' حریر کے سوال نے فاتح کو بھی چونکایا تھا اور سودا سلف لے کر گھر کے اندر داخل ہوتے مدید کو بھی۔

"دن جو بیٹھ گئے ہیں۔ لڑکیاں پریشان تو ہوتی ہیں۔" گرینڈ ما نے اپنے حساب سے وجہ بتائی تھی۔ حریر نے سمجھ کر سر ہلا دیا تھا۔ اور فاتح "دن بیٹھنے" کی تشریح میں الجھ گیا۔

رات کو حریر نے اس کے کمرے میں جھانکا تو فاتح نے پہلی مرتبہ از خود اندر آنے دعوت دی۔

"زہے نصیب۔" حریر عادتاً" خوش ہوا۔ پھر چھلانگ لگا کر کاؤچ پہ بیٹھ گیا۔ اپنے کمرے میں وہ اس وقت بور ہی ہو رہا تھا۔ سوچا کہ مدید سے گپ شپ لگائے۔ مگر وہ پاکستان سے آنے والی کال میں مصروف تھا۔ اُڑتی اڑتی حریر کے کانوں میں اتنی سی بات پڑی تھی۔

"بس آپ آنے کی کریں۔" وہ اپنی ماں سے مخاطب تھا۔ حریر نے کن سوئیاں لینے کا گناہ نہ کرتے ہوئے فاتح کا بھیجا الٹنے' مغز چاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور فاتح بھی شاید اسی کے انتظار میں تھا۔ پہلی مرتبہ حریر کو دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تمہارا تجربہ گھر میں ہونے والی پُراسرار تیاریوں کے بارے میں کیا کہتا ہے؟" فاتح کے سوال نے اس کو چونکا دیا تھا۔

"تم رہنا گھامڑ کے گھامڑ۔ بھئی مدید کی شادی طے کر دی گئی ہے بلکہ پہلے سے طے شدہ تھی۔ ایکچوئلی! وہ تمہیں ہرگز بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تم اس کی شادی میں شرکت نہیں کرو گے۔" حریر کے انکشاف نے فاتح کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"وہ الو گدھا۔" فاتح غصے میں کھول اٹھا تھا۔ "کیا میں اب شرکت کروں گا؟" اس نے ایک فیصلہ کیا اور اپنی چیزیں اٹھ کر سمیٹنے لگا۔

"تم اس طرح سے نہیں جا سکتے؟ سب کو سوالیہ نشان بنا کر؟ جس چیز سے تم بھاگ رہے ہو۔ وہ تمہاری تقدیر تھی۔ مدید کی خوشی پہ اپنا سایہ نہ ڈال کر تم اسے "ماموس" کی کالی راتوں سے بچا سکو گے؟ اگر مدید کی قسمت میں خوشی ہے تو اسے ضرور ملے گی۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ فاتح!" حریر نے بیگ میں کپڑے ٹھونس کر زپ بند کرتے فاتح کو اپنے وجود کی دیوار سے روک دیا تھا۔

"یہ اس کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔" مدید نجانے کب شور کی آواز سن کر آ گیا تھا۔ فاتح نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہم نہیں حقیقت ہے اور تم سمجھتے نہیں۔" فاتح نے کرب سے کہا تھا۔ "تم جانتے ہو' میں تمہاری شادی میں شرکت کیوں نہیں کرنا چاہتا۔" فاتح تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے مدید کی آوازیں اور حریر کی آہٹیں لپکتی رہیں۔

"تم کس بات سے گھبراتے ہو؟ کس چیز سے ڈرتے ہو؟ مدید کی ماں آ کر تمہارے ماضی سے پردے کھینچ ڈالے گی۔ وہ تمہارے اذیت ناک ماضی کو ہم سب پہ عیاں کر دے گی؟" حریر نے اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کو بڑی غلط جگہ اور بڑے غلط وقت میں استعمال کیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

فاتح چلتے چلتے رک گیا تھا۔ پھر اس نے خون آشام نگاہوں سے حریر کی طرف دیکھا تھا۔

"تم کس بات پہ منہ چھپاتے پھرتے ہو؟ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا؟ پھر خاندان سے کیوں ڈرتے ہو؟ ڈرنا تو انہیں چاہیے جو گنہ گار تھے۔ جنہوں نے تمہارا گوشت نوچا۔" وہ چلایا تھا۔ فاتح کے آگے بڑھتے قدم پھر سے رک گئے تھے۔ وہ پلٹ کر واپس آیا اور اس نے حریر کا گریبان پکڑ کر کھینچا تھا۔

ٹیرس پہ بھاگتی ہوئی انیہ بھی تھم گئی۔ نیچے لان میں دو ہیولے تھے جو گتھم گتھا ایک دوسرے کو لاتیں گھونسے مار رہے تھے۔

"تم بزدل! کیوں بھاگ آئے؟ اپنا انتقام تو پورا کر لیتے؟ جنہوں نے گھاؤ لگائے تھے۔ انہیں اتنے ہی گھاؤ دیتے۔" حریر اب بھی چلا رہا تھا۔

"ہاں میں بزدل تھا میں بزدل ہوں۔" فاتح ہانپنے لگا "میں بزدل ہوں حریر! اسی لیے یہاں سے بھی جا رہا ہوں۔ مجھے یہ خوف نہیں کہ مدید کی تائی مجھے دیکھ کر اپنی اصلیت دکھائیں گی۔ مجھے یہ وہم لاحق ہے کہ میری وجہ سے مدید کی یہ پہلی اور آخری خوشی کہیں چھن نہ جائے۔"

اس کی کھلی آنکھیں ٹیرس پہ ہولے ہولے کپکپاتے ہیولے پہ جم گئیں۔ حریر نے دکھتے سر، دکھتے جسم اور لہو میں بھیگتے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر ٹیرس کی طرف دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ وہاں انیہ کھڑی تھی اور ہاتھ جوڑ کر فاتح سے رک جانے کی درخواست کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ ایسا کیوں ہے؟" حریر نے بارہا مدید سے پوچھا تھا۔ اور مدید ہر دفعہ ٹال جاتا، نظر انداز کر جاتا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر حریر کو فطرتاً "کھوج سی لگ گئی تھی۔ وہ مدید کا دوست تھا۔ حریر نے اسے اپنا دوست مان لیا۔ فاتح مانتا یا نہ مانتا۔ حریر خود کو اس کا گہرا دوست سمجھتا تھا۔

اسرار کھولنا، گہرائیوں کو ناپنا، کنوؤں میں اترنا عین انسانی فطرت ہے۔ پھر حریر جیسا متجسس بندہ۔ اس نے فاتح کو ایک پروجیکٹ سمجھ لیا تھا اور وہ اس پروجیکٹ پہ لگ گیا تھا۔

ہیگ میں فاتح کو بہت قریب سے جانچا تھا اس نے۔ حریر کو اندازہ ہوا کہ وہ زندگی کی رعنائیوں سے متنفر ضرور ہے۔ لیکن وہ ان کی حقیقتوں سے انکاری ہرگز نہیں۔ وہ جب الٹی سیدھی حرکتیں اور باتیں کرتا تو فاتح اخبار پڑھتے یا کوئی نظارہ کرتے سہلے کی طرح پیچ و تاب نہیں کھاتا تھا بلکہ دھیمے سے مسکرا دیتا تھا۔

حریر نے مدید کی منگیتر کو تحفہ دینے کا پلان کیا، جان بوجھ کر سنار کی دکان میں گیا اور ایک تحفہ خرید کر واپس کر دیا۔ بریسلیٹ خرید کر واپس کرنے کی وجہ تھی۔

اور وہ وجہ حریر اب بتا رہا تھا۔ کیونکہ اس بات کا تعلق حریر کے ماضی سے تھا۔ اور ماضی کا کھولنا بڑا دشوار تھا۔

"مجھے لگا تھا۔ ہمیں انیہ کو بریسلیٹ نہیں دینا چاہیے تھا۔ کچھ اور دے دیتے۔ کپڑے، جوتے یا کچھ بھی..... مگر اتنا مہنگا بریسلیٹ نہیں۔" وہ بہت دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اور فاتح اول روز کی طرح ہی گم صم تھا۔ خاموش، چپ اور بس حریر کو سنتا ہوا۔ اس کے وجود پہ ایک مرتبہ پھر فولادی خول چڑھ گیا تھا۔

"ہمیں انیہ کو کچھ ایسا دینا چاہیے تھا جو مدید کے دیے گئے تحفے کی مالیت سے کم ہوتا۔" وہ سوجی آنکھوں کو دباتا بمشکل دور، کسی پرانی یاد سے دامن چھڑا رہا تھا۔

"تمہیں ایسے سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس کے لیے مجھے اپنے ماضی کو بے پردہ کرنا پڑے گا اور یہ مشکل کام ہے، مگر ناممکن نہیں۔" حریر کی اسودی آنکھوں میں غم کے شکستہ سائے پھیل رہے تھے۔

"ہر عورت کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ ہر عورت مادی چیزوں کی دیوانی بھی نہیں ہوتی۔ میں صرف ان چند عورتوں کی بات کروں گا جو مجھے بہت سے تجربات کی بھٹی میں جھونک کر تجزیہ نگار بنا گئیں۔"

Downloaded From http://paksociety.com

ان میں ایک میری ماں تھی۔ ہیروں اور موتیوں پہ نثار ہونے والی اور میرا باپ اسے ایران کے ایک طائفے سے چھڑا کر لایا تھا۔ اس عورت کے قدموں تلے نعمتوں کے انبار تھے مگر وہ پھر بھی ناشکری نکلی۔ ہیروں کی چمک نے اسے اندھا کر دیا تھا اور وہ اپنے دو بچوں کو دھتکار کر فرانس کے ایک انگریز کی محبت میں مبتلا ہو گئی۔ اس انگریز کی ذاتی ہیروں کی کان تھی۔ اس نے نہ اپنا وقار دیکھا نہ میرے عزت دار باپ کی محبت کو، کیوں کہ وہ انگریز میرے باپ سے بڑھ کر امیر تھا۔ اگر میرا باپ، میری ماں کو ایک لاکھ کا ہیرا خرید کے دیتا تو وہ ایک کروڑ پچاس لاکھ کا ہیرا "تحفتاً" پیش کر دیتا۔ مادیت پرستی کی اس آگ نے میری ماں کو جھلسا کر راکھ کر دیا۔ جب وہ میرے سامنے آئی تو ایک مظلوم عورت تھی۔ انتہائی غربت میں رینگ رینگ کر جینے والی۔ جس کا دوسرا شوہر اسے طلاق دے چکا تھا۔

مجھے ماں کی حالت زار پہ ترس آگیا اور میں نے اپنے باپ کے سامنے ایک ناجائز مطالبہ رکھا۔ جسے اس نے ماننے سے انکار کر دیا تھا جس کی ہمارے گھر میں سب سے زیادہ چلتی تھی یعنی میری بہن۔۔۔ اور پھر ہماری لڑائی ہو گئی۔ اس نے مجھے گھر سے نکالا اور میں نکل آیا۔ اب حالت یہ ہے کہ نہ وہ مجھے بلا رہی ہے واپس نہ میں جا رہا ہوں واپس۔۔۔ اس دن سے قریہ قریہ گھوم رہا ہوں۔۔۔ خیریات کہاں سے کہاں نکل گئی۔۔۔ بات ہو رہی تھی انیہ کی۔"

وہ اپنے ماضی کو پلٹتا ایک مرتبہ پھر انیہ تک لوٹ آیا تھا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ انیہ کی نیت میری ماں کی نیت سے مشابہ یا انیہ ہیروں کے معاملے میں حریص ہے۔ وہ اسے ایک عام انداز میں دیا جانے والا تحفہ تھا۔ اس میں غیر معمولی کچھ بھی نہیں تھا پھر بھی مجھے کسی بات نے چونکا دیا۔ انیہ کا کھونا۔۔۔ کھو کھو کے کسی کے تصور میں ڈوب جانا۔ نامعلوم سا اضطراب اور نامعلوم سی بے چینی۔۔۔ میں اپنے اندازوں کو غلط سمت میں لے جا کر اپنی نظر سے گرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن میرا شک غلط نہیں تھا۔"

حریر لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تو فاتح اپنی کنپٹی کو مسلتا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے سامنے ہوٹل بالی کھڑا تھا۔ ایک انڈین ریسٹورنٹ۔ جس کی شہرت پورے ہیگ میں پھیلی تھی۔ یہ بہت مہنگا ہوٹل تھا، مگر مجبوری یہ تھی کہ ایمرجنسی میں یہی مل سکا۔ جس حال میں وہ یہاں آیا تھا، اس ہوٹل کا مل جانا بھی غنیمت تھا۔ ہوٹل بالی اپنے نام کی طرح ہی آدھا تیتر آدھا بٹیر تھا۔ اپنی آرائش اور کھانے سمیت۔۔۔

"اور شک میرا بھی غلط نہیں تھا، لیکن صد شکر کہ کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا اور میں وقت سے پہلے وہ جگہ چھوڑ آیا۔" فاتح کو انیہ کی بجھی بجھی نگاہوں کا خیال آتا تو جسم میں ایک پھریری دوڑ جاتی تھی۔

"اب تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔ نکاح کی رسم میں شمولیت کے لیے۔ میں تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔" حریر نے ضدی لہجے میں کہا تھا۔ فاتح گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ مدید کی نظروں سے گرے بغیر یہ حفاظت وہاں سے نکل آیا اور اب اس کا دوبارہ ہیگ جانے کا ارادہ نہیں تھا، مگر حریر کی ضد؟

"تمہیں مدید کا ضرور خیال کرنا چاہیے۔ تمہارا پکا عاشق صادق ہے، نکاح نامے پہ دستخط نہیں کرے گا۔ جب تک تمہارے درشن نہ ہوئے۔" حریر اس کے برابر آ کھڑا ہوا تھا پھر اس کے کندھے پر سر رکھ کے دلار سے بولا۔

"چل نا، تیرے بغیر میرا بھی دل نہیں لگتا۔"

"حریر۔۔۔!" فاتح نے لجاجت سے کہا تھا اور حریر چیخ اٹھا تھا۔

"حریر نہیں۔۔۔ حریر۔۔۔ ح کے فتحہ یعنی زبر کے ساتھ نہیں ح کے ضمہ یعنی پیش کے ساتھ۔ میں حریر ہوں۔ حریر تو ریشم ہوتا ہے۔" وہ چیخنے لگا تھا۔ اپنے نام کے معاملے میں وہ ایسے ہی جذباتی تھا۔

فاتح اس کے چیخنے پہ بدک اٹھا۔ "میرے لیے تو تم نرم و ملائم سے ریشم کی طرح ہو۔ یا ٹھنڈی پھوار کی

Downloaded From http://paksociety.com

طرح ہو۔ اترو تو شبنم کردو۔" وہ دھیمے سے آنکھیں بند کیے ایک جذب کے ساتھ بولا تھا۔ حریر دھپ سے بستر پہ گرا اور بٹ سے بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایسی دل داری اور عزت کی توقع ہرگز نہیں کرتا تھا۔ ایسے تو فاتح سے لاتوں' مکوں او گھونسوں کی توقع رہتی تھی۔ کب وہ کوئی ایسی بات چھیڑے' جس پہ فاتح آپے سے باہر ہوتا دکھائی دے اور پھر مکے' لاتیں گھونسے شروع۔ اور اس کے بعد فاتح کی بجھی بجھی سی آواز سنائی دی۔

"میں تمہارے کہنے پہ چلا تو جاؤں گا' لیکن اتنا یاد رکھنا۔ شیر کی وحشت دور سے نظر آجاتی ہے اور سدباب کرنے کا موقع مل جاتا ہے' مگر انسان کی وحشت دکھائی نہیں دیتی اور سدباب کا موقع بھی نہیں ملتا۔"

☼ ☼ ☼

ہیگ کا چاند آج پوری آب و تاب سے مسکرا رہا تھا۔ اور یہ چاندنی میں نہائی ہوئی ایک رات تھی۔

ستارے آج جھرمٹ کی شکل میں نکلے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ گیسٹ روم میں آئینے کے سامنے کھڑا مدید ہر پچھلے دن سے زیادہ پیارا اور منفرد لگ رہا تھا۔ اس کی امی مدیحہ نے اسے بے ساختہ گلے سے لگا کر چوم لیا تھا۔

"میرا بیٹا بہت پیارا لگ رہا ہے۔"

"مگر آپ کی بھانجی سے کم۔" اس نے اپنے عکس کو دیکھ کر اطمینان محسوس کیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ وہ انیہ کو چشم تصور سے دیکھتا مسکرا دیا تھا۔ نیچے ایک چھوٹی سی محفل کا اہتمام تھا۔ ان کی شادی کی رسم ادا ہوئی تھی۔

معاً" اس کی ماں باہر گئی تھی اور پھر الٹے قدموں واپس آگئی۔ ان کے چہرے پہ ہراس اور مردنی سی چھا رہی تھی۔ مدید قدرے پریشان ہوا۔

"تم نے فاتح کو بھی بلا رکھا ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود؟؟"

مدیحہ تائی کا غصہ' ناراضی اور برہمی۔۔۔ باہر دھیمی چاپ سے آتا فاتح ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"میرا دوست ہے امی! اور کزن بھی۔۔۔ اس کے بغیر میری شادی کا فنکشن نامکمل رہتا۔" مدید کے لہجے میں فاتح کی دوستی اور محبت کا احساس سرچڑھ کے بول رہا تھا۔

"تم نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ برا نحس ہے وہ بلکہ اس کا پورا خاندان۔ جو بھی ان کے خاندان میں شامل ہوا' برباد ہو گیا۔" مدیحہ نفرت کی انتہا پہ کھڑی تھی۔ مدید نے شدت ضبط سے آنکھیں موند لیں۔

"گندا اور منحوس خون۔۔۔ جس کو لگا' چاٹ گیا۔"

"بس کردیں امی۔۔۔!" اس کی آواز پھٹ پڑی تھی۔ "آپ کے بیٹے کی رگوں میں اس کا گندا خون ہی دوڑ رہا ہے۔ جب اے بی نیگٹو سارے زمانے کی خاک چھاننے کے بعد بھی نہیں مل رہا تھا۔ تب یہی منحوس خون مجھے بچانے کے لیے آیا تھا۔"

باہر کھڑا فاتح' شدت ضبط کے سارے گُر آزماتا الٹے قدموں مڑ گیا۔ اس حال میں کہ سرخ گلابوں کی مالا گیسٹ روم کی دہلیز پہ رکھی تھی اور رکھ کے جانے والا دور دور تک کہیں نہیں تھا۔

مدید اپنے کمرے سے نکلا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے پیروں کو سرخ گلاب چھو رہے تھے۔ جو تازہ تھے۔ مہک رہے تھے اور جن کی پتیوں پہ تازہ گری ہوئی اوس چونکاتی تھی۔ یہ فاتح کی آنکھ سے نکلنے والے آنسو تھے جو گلاب کی پتیوں کے اوپر جم چمک رہے تھے اور مدید کو رو دینے پہ مجبور کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہیگ کے آسمان پہ مایوسی چھائی تھی۔ رات دبیز اور بھید بھری تھی۔ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ ہال میں مبارک سلامت کا شور تھا۔ نکاح کے بعد والا مخصوص منظر۔ مدید کا دل بوجھل تھا۔

حریر اسے کچھ دیر کے لیے دکھائی دیا تھا پھر نکاح کے بعد وہ بھی چلا گیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

مدید اس کے کچھ بغیر بتائے بھی جانتا تھا کہ فاتح کہاں اور کیوں چلا گیا تھا؟

اس نے یقیناً" ماں کی باتیں سن لی تھیں۔ اپنے آنے کی اطلاع "گلابوں کی مالا" میں پرو کر وہ چپکے سے لوٹ گیا تھا۔

نکاح کے بعد امی نے بے ساختہ اسے گلے لگایا۔

"خدا کا شکر ہے۔ وہ چلا گیا اور معاملہ بخیر و خوبی نمٹا۔" مدید نے دکھ کا گہرا احساس اپنی خاموشی تلے دبا دیا تھا۔ امی سے کچھ کہنا سننا بے کار جو تھا۔

اور ہال کی چھت سے دور گیسٹ روم کی راہداری میں چلتا فاتح نکاح تک وہیں رہا۔ وہ ہال میں نہیں تھا مگر مدید کے نکاح میں باہر کھڑا رہ کر بھی شمولیت کرتا رہا اور اپنا وعدہ پورا کرتا رہا۔

مبارک باد کے شور نے اس کے قدموں میں بے چینی بھر دی تھی۔

وہ تیزی سے راہداری میں کھلتا دروازہ نیم وا کرتے ہوئے ٹیرس پہ آیا۔ وہاں گلابوں کا ایک گل دستہ رکھا تھا۔ مدید کے نکاح میں آنے سے پہلے فاتح نے ایک پھولوں کی دکان سے پھولوں کا ہار اور یہ گل دستہ آرڈر پہ بنوایا تھا۔

پھولوں کا ہار وہ گیسٹ روم کے دروازے پہ چھوڑ آیا تھا اور گلابوں کا گل دستہ اس نے اٹھا لیا تھا۔ یہ گل دستہ وہ انیہ کے لیے لایا تھا اور اسے دیے بغیر ساتھ لے جا رہا تھا۔

پھر جیسے ہی اس نے ٹیرس سے اترنے کے لیے سیڑھی پہ قدم رکھا۔ اچانک دروازہ کھلا تھا اور کوئی زرتار آنچل لہراتا' اسے مجسم بت بناتا' سامنے آ کھڑا ہوا۔ فاتح دم بخود رہ گیا اور سامنے والی مغمور۔

"بغیر مبارک باد دیے جا رہے ہو؟ کیا ہمارے نصیب میں تمہاری نیک تمنائیں بھی نہیں۔" وہ اس کے سامنے کھڑی حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں ادراک رکھتی ہوں کہ چاند کی تمنا نہیں کرتے۔ اس کا حصول ممکن نہیں... لیکن لوگ ازل سے چاند کو دیکھتے اور سراہتے آئے ہیں۔" وہ اس کے سر پہ آتش فشاں پھاڑ رہی تھی۔ فاتح کو لگا کہ وہ ایک منٹ بھی یہاں رکا تو فنا ہو جائے گا۔

"نئی زندگی کے اس موڑ پہ تمہیں اپنے لیے آسانی کی دعا کرنی چاہیے۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

وہ اسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اس حال میں کہ اس کا گندم کی بالی جیسا سنہرا روپ زرتار آنچل سے چھلک رہا تھا اور اس کی کلائی میں ہیروں کا بریسلیٹ دمکتا تھا۔

"میں تو صرف تمہیں اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ تم بہت پیارے انسان ہو۔ چاند کی مانند بلند' اونچے اور پہنچ سے دور..." اس کی آواز میں ہیک کے ٹھنڈے چشموں کی مٹھاس بھر گئی تھی۔

"کیا تم کچھ نہیں کہو گے۔" انیہ اسے بولنے پہ اکسانا چاہتی تھی۔ وہ لب بھینچ کر خاموش تھا اور نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"میں تمہیں نئی زندگی کی مبارک باد دوں گا۔ تم میرے دوست کی زندگی کو اپنے خوب صورت وجود سے ہمیشہ آباد رکھو اور یاد رکھو کہ اونچے چاند کی بس اتنی سی حقیقت ہے کہ وہ اکیلا بھی ہے اور پیاسا بھی اور رشتوں کا مارا ہوا بھی..."

فاتح کی آواز کسی کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ پھر وہ تیز قدموں سے پلٹا اور اندھیروں میں گم ہو گیا۔ انیہ نم آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی اور ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کرتی رہی۔

معاً" اس نے پلٹ کر دیکھا اور دم بخود رہ گئی تھی۔ اس کے پیچھے مدید کھڑا تھا۔ اس کا منگیتر نہیں' اس کا شوہر کھڑا تھا۔ انیہ کا سانس اس کے زرتار آنچل کے سائے تلے دب گیا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

☆ ☆ ☆

رات "شرانگیز" تھی اور گنہ گار تھی۔

دور ہیک کے کھیتوں کی سمت ایک ہیولا بھاگتا تھا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ ٹیرس پہ

Downloaded From http://paksociety.com

لگے بلب کی روشنی میں زرتار آنچل کے تاروں سے شعاعیں پھوٹی تھیں۔ اور مدید کی غصہ اگلتی آنکھوں میں شعلے بھر گئے تھے۔

"وہ نیچے ہال میں نہیں تھا۔ وہ یہاں تھا۔ تمہارے پاس اور میں پاگلوں کی طرح اسے نیچے ڈھونڈتا رہا۔۔۔" مدید کسی زخمی درندے کی طرح غرا رہا تھا۔ اور اس کی غراہٹیں انیہ کی جان لرزاتی تھیں۔

انیہ ریلنگ سے چمٹی مدید کو دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ کسی کا لہو پینا چاہتا ہو۔ "میری پشت میں خنجر مار کے میرے یار نے اچھا نہیں کیا۔" وہ دیکھتے ہی دیکھتے رونے لگا۔ بے تحاشا رونے لگا۔

"او فاتح! تو تو بڑے آفاقی علم کا ماہر تھا۔ کیا تجھے خبر نہیں پہنچی؟ ممنوعہ علاقوں پہ اپنی فتح کے جھنڈے نہیں گاڑتے۔" مدید سر پکڑ کے چیختا رہا۔ وہ کیا سمجھ رہا تھا؟ وہ کتنا غلط سمجھ رہا تھا؟۔

انیہ سرخ لبوں پہ ہاتھ رکھے سانس روکے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔

"میں تمہیں سنجنم سمجھتا رہا۔۔۔ اور تو انگارہ تھی۔ جس نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا۔" اس نے اپنا سر دیوار سے پٹخا تھا۔ انیہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر روک بھی نہ سکی۔ کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

پھر اس کی نگاہ انیہ کی سڈول کلائی میں چمکتے ہیروں پر پڑی۔ اس کے اندر آگ لگ گئی تھی۔

"ان ہیروں کی چمک نے تمہیں اندھا کر دیا۔" وہ کسی زخمی درندے کی طرح پھنکار رہا تھا۔ انیہ کے اندر کوئی چیز بہت تیزی کے ساتھ ٹوٹی تھی۔

"اب تم میرے ساتھ زیادتی کرتے جا رہے ہو مدید!" وہ گھٹی آواز میں چیختی تھی۔

"تمہیں چاند کی تمنا تھی؟ کیا مل گیا چاند!" مدید پوری شدت سے چلایا تھا۔

"میں نے چاند کی "تمنا" کب کی؟ میں نے تو چاند کو سراہنے کی غلطی کی۔" انیہ نے شوریدہ لہروں کی بے انت طغیانی میں ڈوب ڈوب کر ابھرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم نے مجھے دھوکا دیا۔" وہ اپنا سر اب بھی دیوار سے پٹخ رہا تھا۔ انیہ ریلنگ سے ہٹ کر مدید کے قریب آئی تو ریلنگ کی ہک میں اس کا زرتار آنچل اٹک کر پھٹ گیا۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔ کسی کو سراہنا گناہ نہیں۔" وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کے پیروں پہ اپنے حنائی ہاتھ رکھ دیے۔

"تم نے میرا اعتبار توڑا۔۔۔" وہ ابھی تک کرلا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کی کلائی پہ ڈالی تھی۔ ان ہیروں کی قیمت مدید کے بے لوث جذبوں سے زیادہ تھی۔ وہ آنکھوں میں اتری دھند کو سمیٹتا اٹھنے لگا۔

"تمہاری سوچ گرد آلود ہے۔" انیہ اسے جاتا دیکھ کر پیچھے لپکی تھی۔ وہ اسے روک رہی تھی۔ اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

وہ اس کے آنسوؤں سے بے نیاز گہری اور بھید بھری رات میں گم ہو کر کسی گمنام رستے کا مسافر بن گیا تھا۔

انیہ اس کے ہیولے کو ڈھونڈتی منہ کے بل زمین پہ گری۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور چہرہ غبار آلود ہو گیا تھا۔ اس کی کلائی زمین پہ گرے پتھر سے ٹکرائی تو بریسلیٹ کا ہک نکل گیا۔ انیہ نے کھلے بریسلیٹ کو نوچ کر اتارا اور ٹیولپ کے کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتی ندی کے حوالے کر دیا۔

"یہ ہیرے تمہارے جذبوں سے زیادہ قیمتی نہ تھے۔" وہ پُرآشوب رات میں کسی بیوہ کے سہاگ کی مانند لٹی پٹی ہال کی طرف آ رہی تھی۔ اس حال میں مدیحہ تائی نے اسے دیکھا اور اپنا سر پیٹ لیا تھا۔

"میں نا کہتی تھی۔ وہ اپنی بدبختی ہمیں سوغات کی طرح دے کے جائے گا۔" ٹیولپ کے پھولوں پہ تاریکی کسی ناگن کی طرح پھن گاڑے بیٹھی تھی۔

ٹیولپ کے کھیتوں سے ایک بل کھاتی ندی گزر رہی تھی۔

"مدید نے مجھے بدنیت سمجھا۔ مجھے خائن سمجھا۔" اس نے مدید سے کہا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"وہ میرا دوست تھا۔ مجھے اتنا گرا ہوا کیسے سمجھ سکتا تھا؟" وہ کنکروں کی ڈھیری پہ بیٹھ گیا۔

"میں سب کچھ ہو سکتا ہوں مگر بددیانت نہیں۔"

حریر بغیر دیکھے بھی جانتا تھا۔ فاتح کی آواز آنسوؤں میں ڈوبتی اور ابھرتی تھی۔

"اور تم کہتے تھے۔ میں اس کی شادی میں کیوں نہیں آتا۔ میں ان وحشتوں سے ڈرتا تھا۔" وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔

"یہ سب ہونا تھا۔ کسی بھی صورت میں۔۔۔ تم یہاں آتے یا نہ آتے۔ مدید بدگمان تھا۔ اور اس کی ماں اسے مزید بدگمان کرنے میں پیش پیش تھی۔" بالآخر حریر نے کہہ دیا تھا۔ حریر چند پل کے لیے تھوڑی دیر پہلے گزر جانے والے لمحوں میں ڈوب گیا تھا۔

چند لمحے پہلے جب مبارک بار کا شور اٹھا اور چھوارے بٹتے رہے۔ پھر مشروبات سے مہمانوں کی تواضع جاری تھی تب حریر اپنا گلاس اٹھا کر کونے میں چلا گیا۔

مدید کی بے چین نگاہیں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ مدیحہ اپنا قیمتی دوپٹہ سنبھالتی مدید کے پاس بیٹھ گئی۔ اب وہ مکمل طور پر بیٹے کی برین واشنگ کر رہی تھیں۔

"مدید! اب تم بڑے ہو جاؤ۔ فاتح کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دو۔ قسمت نے تم پہ ایسی مہربانی کی۔ تمام عمر پانچ نمبر چوڑی کے تین مرلہ گھر میں سسک سسک کر گزار دیتے۔ نوکری تھی نہیں۔ ہنر ہاتھ میں نہ تھا۔ زندگی نے تمہیں ایک موقع دیا ہے۔ اسے ضائع مت کرو۔"

"میں اس موقع کو کس طرح ضائع کر رہا ہوں۔ وضاحت کریں گی آپ۔" وہ ماں سے خفا تھا۔

"میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔ اپنی آنکھیں کھولو۔ اور فاتح سے آج کے بعد دور رہو۔ ہماری انیہ خوب صورت بھی ہے اور نا سمجھ بھی۔ ایسے "سودائیوں" کے پیچھے لڑکیاں اکثر پاگل ہو جاتی ہیں۔ تم انیہ کو اس سے دور رکھو۔ تمہیں فاتح کی نظر بد۔۔۔" مدیحہ کے اگلے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔ مدید غصے سے چیخ پڑا تھا۔

"بس کر دیں امی! وہ اسی لیے یہاں آتا ہی نہیں تھا۔ آپ کی ان ہی باتوں کو سن کر وہ چلا گیا۔" مدید رو دینے کو تھا۔

"کہاں چلا گیا؟ یہیں ہے وہ۔۔۔" مدیحہ چمک کر تیز لہجے میں بولی تھیں۔ مدید کے ساتھ ساتھ حریر بھی چونک گیا تھا۔

"میں نے اسے ٹیرس کی طرف جاتے دیکھا ہے۔۔۔ ہاتھ میں گلاب تھے۔" مدیحہ نے ان پہ بم گرایا تھا۔ حریر کے ساتھ ساتھ مدید بھی چونکا تھا۔

پھر مدید دلہن کو لینے اوپر چلا گیا۔

وہ انیہ کے کمرے میں آیا۔ یہاں سے فوٹو گرافی کے بعد انہوں نے ایک ساتھ ہال میں جانا تھا۔ مگر انیہ کمرے میں نہیں تھی۔ انیہ کہاں تھی؟ اسے ٹیرس پہ آوازوں کی بھنبھناہٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹیرس کے دروازے تک آیا تھا۔ لیکن اسے انیہ کی نم آلود آواز نے روک لیا تھا۔

"میں اور اک رکھتی ہوں کہ چاند کی تمنا نہیں کرتے۔ اور اس مقام پر تو بالکل نہیں کرتے۔ چاند بلندی پہ ہے۔ اس کا حصول ممکن نہیں۔ لیکن لوگ ازل سے چاند کو دیکھتے اور سراہتے آئے ہیں۔ اگر چاند کو دیکھنا جرم ہے۔ اگر چاند کو سراہنا ایک گناہ ہے تو میں "گناہ گار" ہونا چاہتی ہوں۔"

انیہ کی بھیگی آواز نہیں تھی۔ وہ کوئی تیزابی چھینٹے تھے۔ جو اندر کھڑے مدید کو جھلسا گئے تھے۔

مدید سے مزید کچھ سنا نہیں گیا تھا۔ اس کے سر پر آتش فشاں پھٹا تھا اور وہ اندھا دھند انیہ کے سر پر پھٹ گیا۔

اور اس وقت حریر اسے اس صدماتی کیفیت سے نکالنا چاہ رہا تھا۔

رات 'سبک خرامی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ حریر کو فاتح کی آواز سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔

"مدید نے سوچا بھی کیسے؟ میں اس کی بیوی پہ بری نظر رکھوں گا؟ میں کیا اپنے بھائی جیسا مردار خور ہوں۔

Downloaded From http://paksociety.com

میں کوئی "گدھ" ہوں؟" وہ سسک رہا تھا۔"

"اور وہ مجھے جانتا تھا۔ میرا خون اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔" اس نے میرے لیے برا گمان کیا تو کیوں کیا؟" فاتح نے سارے کنکر ایک ساتھ ندی میں اچھال دیے تھے۔ ندی میں بھنور بنتے اور بگڑتے رہے۔

"معاً" ندی کے پانی پہ سکوت طاری ہوگیا۔

"سنو حریر!" فاتح نے اپنا بھیگا چہرہ آستین سے پوچھ کر اپنا رخ حریر کی طرف کیا تھا۔

"میں چاہتا تو دنیا کی ساری خوب صورت عورتوں سے عنایہ کی بے وفائی کا انتقام لے لیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ پتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ میرے اندر "حیوانیت" نہیں۔ میرے اندر "انسانیت" موجود ہے۔ اور عورت کا تقدس بھی۔" فاتح نے تھک ہار کر اپنا سر حریر کے کندھے پہ گرا دیا تھا۔ اور حریر ایسے ساکت تھا۔ جیسے ندی کا پانی۔۔۔ ایسے منجمد تھا جیسے برف' وہ اس پہ اتنی آسانی سے کھل جائے گا؟ یہ حریر کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم ندی کے پانی کو دیکھتے رہے۔ وہ پانی جس کی شفاف سطح پہ کوئی ہیرا دمکتا تھا۔ وہ دونوں چونک گئے تھے اور پھر ان ہیروں کی دمک سے بے نیاز ہوگئے۔

وہ سست رنگوں میں چمکتا قیمتی بریسلیٹ ان کے قریب سے گزرتا پانی میں تیرتا آگے بڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ظہران میں موسم بدل گیا تھا۔

ریگستانی علاقوں میں ایسی بارش برسی جو بیس سالوں میں نہ برسی تھی۔ موسم انتہا کا خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ جو رگ و جاں کو مہکا دیتی۔

افسون حرم کے بوٹے قد والے پام ہلکی ہوا کے دوش پہ لہراتے تھے اور پستہ قد والی کھجور کی جھاڑی کے پاس علم قیافہ کے ماہر بزرگ کا اب بھی ٹھکانہ وہی تھا۔

وہ جو قیافے لگاتا تھا اور ناامیدوں کی آنکھوں میں روشنیاں بھر دیتا تھا۔ اس بزرگ نے مایوسی سے سر پٹختی روتی چلاتی افسون کو امید دلائی تھی۔

"اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ایسے بہت سے "حادثوں" سے گزر چکا ہے۔"

لیکن اس کے دل کو سکون نہیں آتا تھا۔ افراہیم کو جو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ یہ مہلک بھی ہو سکتا تھا۔ جان لیوا بھی۔ اس کے دل کی تباہ حالی کا کاشی کو پتا چلا تو وہ بھی دوڑا دوڑا ظہران پہنچ گیا۔ "بھائی لوگو" میں تو اس کی جان تھی اور وہ دیواروں سے ٹکریں مارتی افسون کو اپنے انداز میں تسلی دیتا تھا۔

"بھائی کو کچھ نہیں ہوگا باجی! ابھی تو اس کی شادی ہونی ہے اور مجھے اس کے بچوں کا چاچا بننا ہے۔ بھائی کو اللہ کی خیر ہے۔ اور آپ کی دعا۔ اللہ اسے آپ کے دل سے نکال نہیں سکتا۔ نہ آپ کی زندگی سے۔" اور یہ کاشی کا یقین تھا جو افراہیم نے موت کو شکست دے دی تھی۔

اور اس وقت ظہران کے "دارالشفاء" میں ایک روشن کمرے میں افراہیم بستر پہ لیٹا تھا اور اس کے قریب "افسون حرم" بیٹھی تھی۔ یا افسون جاں بیٹھی تھی یا افسون دل بیٹھی تھی۔ وہ افسون تھی' سحر کرنے والی' جادو میں جکڑنے والی۔

وہ افراہیم کے لیے تازہ پھلوں کا رس نکال رہی تھی۔

اس نے خود ہی اپنی آواز سے اس خاموش فضا کا سحر توڑ ڈالا۔

"مجھے آج پتا چلا ہے۔ محبت ایسی بھی ہوتی ہے؟ محبوب کو دل کا اٹیک ہو رہا ہے اور محبوبہ اونچی آواز میں روتی' خوف سے کانپتی اندھا دھند بھاگ رہی ہیں تاکہ اپنے محبوب کو آنکھوں کے سامنے مرتا نہ دیکھ سکیں۔ یہ نہیں کہ محبوب کو بچانے کا کوئی سد باب کریں۔ کسی ایمبولینس کو بلوائیں۔ کسی اسپتال میں لے کر جائیں۔" وہ چمکتی آنکھوں سے افسون کے چہرے پہ پھیلتی خفت کو دیکھتا مسکرا رہا تھا۔

افسون نے جلتی نظروں سے اسے دیکھا اور خفگی

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

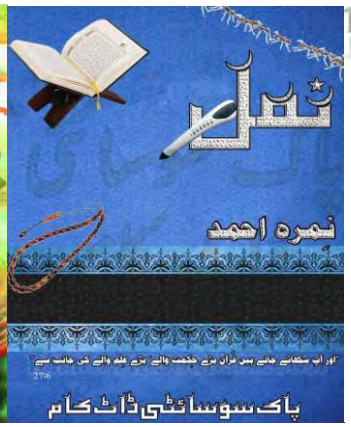

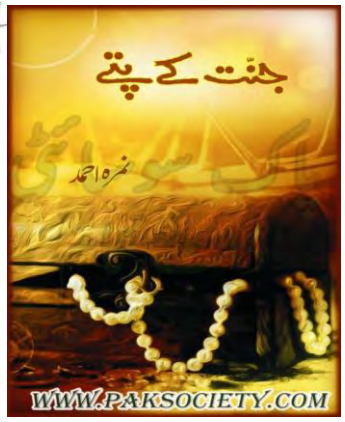

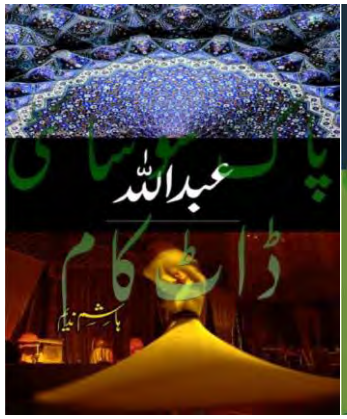

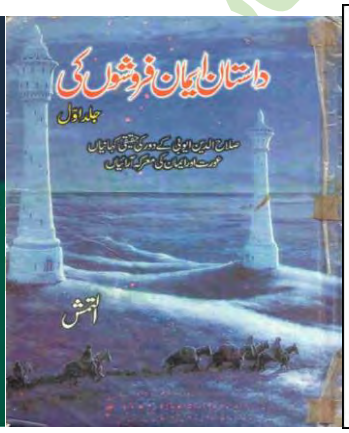

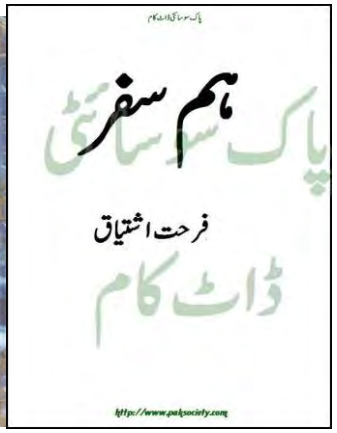

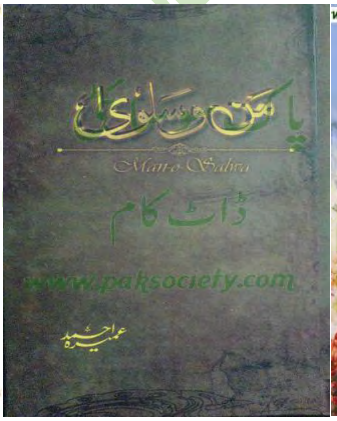

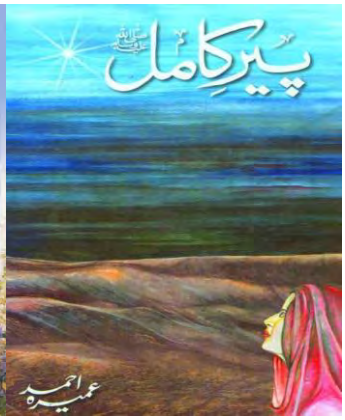

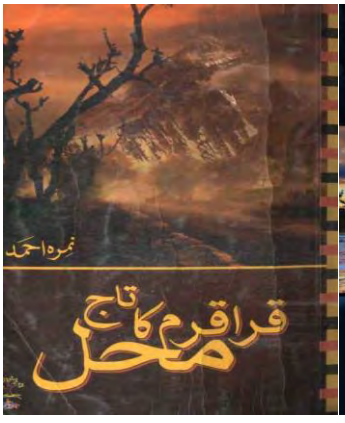

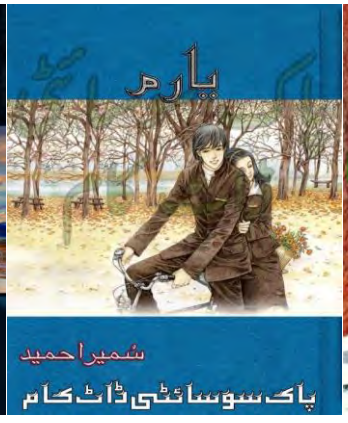

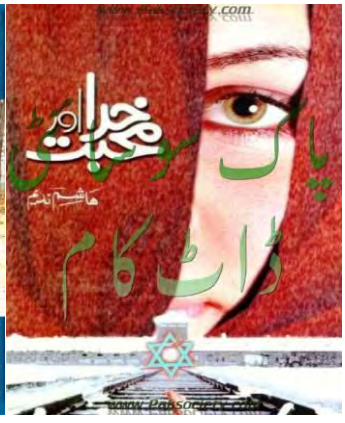

Downloaded From http://paksociety.com

سے بولی۔

"ہاں، تو نہیں دیکھ سکتی تھی مرتے ہوئے۔۔۔"

"اور اگر وہ "خطا کا پتلا" نہ ہوتا تو میرا کیا بنتا افسون!" افراہیم نے آنکھوں میں شرارت بھر کے اسے چھیڑا تھا۔

"تم میرے حصے کی خوشی تھے۔ تمہیں کچھ بھی نہ ہوتا۔" وہ سکون قلب کی لہر لہر کو اپنے من میں اترتا محسوس کرتے ہوئے دل فریبی سے بولی تھی اور پھر اپنے ڈرائیور کے لیے "خطا کے پتلے" کا لقب سن کر مسکرانے لگی تھی۔

"تم ہمیشہ بہت خوب ۔۔۔ بولتی ہو۔" افراہیم نے دل کی پوری سچائی کے ساتھ کہا تھا۔

"ہاں، میں اور میرا بھائی۔۔۔ ہم دونوں "سحر بیان" مشہور ہیں۔ میرے لیے ایک اور خوش خبری بھی ہے۔ وہ میرا گدھا نما بھائی لوٹ آیا ہے۔" افسون کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ پھر اس نے افراہیم کو تکیہ کا سہارا دے کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ اسے گھونٹ گھونٹ جوس پلا رہی تھی۔

"مبارک ہو۔ تمہارا خاندان مکمل ہو گیا۔" افراہیم نے پورے دل کے ساتھ کہا تھا۔

"خاندان تو تمہارے ساتھ مکمل ہو گا۔ ابھی تم اس میں نہیں ہو تو سب ادھورا ہے۔" اس نے کتنی محبت اور سکون کے ساتھ افراہیم کے ساتھ ایک اٹوٹ بندھن میں بندھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ افراہیم کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ وہاں پہ سرخی چھانے لگی تھی اور لال قند اس کی آنکھوں میں جم رہا تھا۔

"تم سب کچھ جان کر بھی۔۔۔؟" افراہیم کے نیلے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

"ہاں جان کر بھی۔۔۔ میں نے تمہارا دیا ہوا مسودہ پڑھ لیا ہے۔" افسون کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

"تمہیں مجھ سے نفرت نہیں ہوئی؟" وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ رہا تھا اور اگر افسون کہہ دیتی "ہاں"۔۔۔ تو پھر؟

"نہیں۔" اس کا سکون قائم تھا۔ "کیونکہ محبت اور نفرت ایک جگہ پہ نہیں رہ سکتے۔ مجھے تم سے محبت ہے تو نفرت کہاں سے ہوتی؟" افراہیم کے اندر سکون اترنے لگا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں اور بس اتنا کہا۔

"میں نے اپنا پرانا نمبر آن کر لیا ہے افسون! اور اسی نمبر سے پاکستان کال بھی کی ہے۔ میں نے وہ طوق گلے سے اتار دیا۔ جو میرے گلے کا جان لیوا پھندا تھا۔" وہ دھیمی بوجھل آواز میں بولتا جا رہا تھا۔ "رافع افراہیم سے اس کے تمام جرم جان لینے کے باوجود محبت کرنے کا بہت شکریہ افسون!" صحرائے عرب کے ریگستانوں میں کہیں دور دور تک شگوفے پھوٹ پڑنے کا عجیب و غریب موسم آگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

انادیہ کی موت کی خبر نے فاتح کے قدموں سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ مسافر جو جہاں بھر میں بھٹکا تھا اور کہیں سکون نہ پایا تھا۔ اسے اب واپس لوٹنا تھا۔ انادیہ دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ اس خبر نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ وہ اپنوں کے پاس لوٹ آیا تھا حریر اس کے ہمراہ آیا تھا۔

اور پھر عنایہ کی رخصتی کا وقت قریب آگیا۔ اسے سفید کفن میں دلہن بنا کر اس شیشے کے محل سے رخصت کر دیا گیا۔ وہ اپنے باپ کے بعد دوسری قیدی تھی جو دیا نامی اس بلا کی قید سے رہائی پا گئی تھی۔

ان دونوں ماں بیٹی کی دائمی رخصتی کے بعد بھی ابھی تک ان کی ناگہانی موت کا "معمہ" حل نہ ہو سکا تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ داغ کی شریان پھٹ گئی ہے اور کوئی کچھ۔ کسی کو قتل کی واردات لگتی تھی اور کوئی اسے بھوت پریت کی کارستانی سمجھ رہا تھا۔

مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ اور فاتح کی آمد کے ساتھ ہی بہت سارے لوگوں کے منہ بند ہو چکے تھے۔ جن لوگوں کا اس کوٹھی پہ قبضہ کرنے کا خیال تھا۔ وہ

Downloaded From http://paksociety.com

فاتح کو دیکھ کر اژن چھو ہو گیا اور فاتح نے آتے ساتھ ساری ذمہ داریوں کو سنبھال لیا تھا۔ نانا کے بوڑھے وجود میں نجانے کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ وہ فاتح کو بار بار گلے سے لگاتے اور چوم لیتے تھے۔ حتیٰ کہ نانی نے بھی اپنی قسم فاتح کی آمد کے ساتھ توڑ ڈالی تھی۔ وہ نواسے سے ملنے کی بے قراری لیے کشاں کشاں پہنچ گئیں۔

اور اب وہ دونوں میاں بیوی اسے کسی قیمتی متاع کی طرح اپنے درمیان بٹھا کر آنکھوں کی پیاس بجھا رہے تھے اور فاتح مارے ندامت کے خود سے نگاہ بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ اس نے ان دو بوڑھے لوگوں کو کس جرم کی سزا دی تھی؟ وہ انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ جو کچھ ہوا تھا۔ اس کی تقدیر میں لکھا تھا تو پھر وہ آج تک کس سے بھاگتا رہا۔ خود سے یا ان دو بے آس لوگوں سے یا اپنی تقدیر سے؟

"وہ بے ہدایتا نہیں آیا۔" نانا کی مدھم آواز ابھری تو نانی نے ململ کے دوپٹے سے آنکھیں بے ساختہ صاف کی تھیں۔

"دل پہ زنگ لگا کر ایسا گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔" وہ رونے لگیں وہ بہت کمزور دل ہو چکی تھیں بار بار رونے لگتیں۔

"وہ آگیا تو آپ اسے سینے سے لگالیں گی؟" اب کے ایک اجنبی آواز سنائی دی تھی۔ ایک خوب صورت سا کتابی چہرہ اجنبی سانولہ اور اکھڑی اکھڑی سی اردو۔

"ماپے (والدین) اپنے بچوں کو دھتکار نہیں سکتے۔ وقتی طور پہ ناراض ضرور ہوتے ہیں۔" نانا کی آواز ابھری تھی۔ تو وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

حریر نے اک نظر فاتح کی طرف دیکھا تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اپنے بھائی کے ذکر پہ اس کے چہرے پہ کوئی رنگ نہیں آیا تھا۔ نہ نفرت کا نہ بیگانگی کا اور نہ ہی محبت کا۔

پھر وہ اٹھ کر گم صم بیٹھی بیہ کے پاس آگیا تھا۔ وہ ابھی تک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب ہی دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

حریر اب نانا اور نانی سے رافع کے بارے میں بات کر رہا تھا اور وہ دونوں پورے خشوع کے ساتھ رافع کی باتیں کر رہے تھے۔ جیسے اس سے اچھا کوئی اور موضوع ہی نہ ہو۔ اور نانا نانی کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ جو بہت کم گو ہو چکی تھیں۔ رافع کے موضوع پہ بے تکان بول رہی تھیں۔ جیسے رافع کے علاوہ کوئی اور بات ہی نہ ہو اور حریر ان دونوں کو شدید حیرانی میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ایک ایسی بات کر دیتا تھا جسے سن کر وہ دونوں حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ پھر نانی ناک پہ انگلی رکھ کر پوچھتیں۔

"بچے! تمہیں کیسے پتا؟"

"بس نانی صاحبہ! میرے پاس مؤکل ہیں۔ وہی مجھے بتاتے ہیں۔ آپ کا نواسا تو ایک زمانے میں سنگر اسٹار تھا۔ گیتوں کی دنیا کا ستارہ۔ اس سے اچھا وائلن کوئی نہیں بجاتا تھا۔" حریر نے ان دونوں کے چہروں پہ پھیلی حیرانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بتایا تھا اور فاتح اس کی ساری "چالاکیوں" کو جان چکا تھا۔ یہ جوان دونوں کے ساتھ کسوٹی کسوٹی کھیلی جا رہی تھی اس کا پس منظر فاتح خوب جانتا تھا۔

"اور اس کی آنکھوں میں مدھ (شہد) جما رہتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کی آنکھیں اور بال سیم ہیں۔" حریر نے ایک اور انکشاف کیا تھا جسے سن کر نانی کا دل بھر آیا۔ وہ حریر کو اپنے ساتھ بھینچ کر چومتے ہوئے بولیں۔

"بتانا... تو نے میرے رافع کو کہاں دیکھا؟ وہ اسی ملک میں ہے؟ زندہ ہے یا نہیں؟ میں نے کئی دفعہ بڑے بھیانک خواب دیکھے۔" وہ رونے لگیں اور بیہ کے قریب بیٹھا فاتح گہرا سانس بھرنے لگا۔ اب حریر کیا کرے گا؟ وہ نانی پہ سچائی کو منکشف کر دے گا؟ وہ کسی بوڑھی عورت کے صبر اور تحمل کو آزمانے والا نہیں تھا۔ وہ ان کے لیے مزید امتحان نہیں بنے گا... فاتح کو علم تھا۔ حریر کے "سرپرائز" کے پیچھے کچھ ایسا ضرور تھا۔ جو اس کے دل اور خاندان سے جڑا ہوتا۔

"میں نے بہت دفعہ خواب میں رافع کو تکلیف

Downloaded From http://paksociety.com

سے تڑپتے دیکھا ہے۔ وہ ہر دفعہ مجھے کنویں میں گرا کیوں دکھائی دیتا ہے؟ حالاں کہ میں نے اپنے بچے کے لیے کبھی بددعا نہیں کی۔ میرے پاس تو اپنی بیٹی کا دیا ہوا بڑا قیمتی سرمایہ تھا جو سر راہ ہی لٹ گیا۔" وہ منہ پر مکمل کا دوپٹا لیے رونے لگی تھیں۔

"آپ نے اسے خواب میں ہمیشہ اذیت میں دیکھا۔ کیونکہ وہ اذیت میں ہی ہمیشہ مبتلا رہا۔ وہ اپنے خاندان سے بچھڑ کر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے بہت شرم سار تھا۔ اسے پچھلے دنوں انجائنا کا اٹیک ہوا۔ وہ دل کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس نے میری طرح اپنے خاندان سے الگ ہو کر بہت تکلیف جھیلی۔ جب ہم غلط قدم اٹھاتے ہیں تو پھر اس کی سزا بھی لمبی بھگتنی ہیں۔"

حریر دھیمی آواز میں بتا رہا تھا اور نانا' نانی ایک دم رونے لگے تھے۔ انہوں نے اپنے جوان بچوں کو مٹی تلے دبانے کا بار اپنے دل پہ جھیلا تھا۔ اب اور صدمے نہیں اٹھا سکتے تھے۔ وہ رافع کو کھو نہیں سکتے تھے۔

فاتح نے گردن موڑ کر حریر کی طرف دیکھا تھا۔ اسی طرح بے ساختہ بیہ نے بھی اپنے قریب بیٹھے فاتح کو دیکھتے ہوئے حریر کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہارا دوست رافع سے کہیں ملا ہے کیا؟ یہ بہت ساری باتوں کو جانتا ہے۔" بیہ نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ لب کشائی کی تھی۔ وہ بڑی حیرانی سے حریر کو دیکھ رہی تھی۔ جو نانی کے بوڑھے لرزتے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبائے کچھ کہہ رہا تھا۔ کچھ ایسا جو ان کے چہرے کی سپید رنگت میں سرخی گھول رہا تھا۔ ان کے رخسار چمکنے لگے تھے۔

"رافع ظہران میں ہے۔ حریر کے گھر میں اور حریر' رافع سے وہیں ملا ہے' وہ اسے اپنے ساتھ ضرور لاتا اگر اسے عنایہ کے مرنے کی تب خبر ہوتی۔" فاتح نے بے تاثر لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی اور بیہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

کیا یہ سچ تھا؟ اور کیا رافع انہیں دوبارہ مل سکتا تھا۔ اس انکشاف نے عزہ اور اندر آتے ارمیز کو بھی دنگ کر دیا تھا۔ پھر اچانک بیہ کو خیال آیا۔ اس نے فاتح سے بے ساختہ پوچھا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ایسے مخاطب تھے۔ جیسے بیچ میں اتنا وقت آیا ہی نہیں تھا۔ پھر بیہ نے گہرا سانس بھرا۔

"مدیحہ بھابھی اور مدید کو دیا کے مرنے کی اطلاع نہیں دی؟" اس نے اپنی بھابھی اور بھتیجے کے متعلق پوچھا تھا۔

"انہیں کوئی قریب کی فلائٹ نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایک دو دن تک پہنچ جائیں گے۔" فاتح نے جواب دیا۔ حریر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ بار بار فاتح کو دیکھتا جیسے اسے کچھ بتانا چاہتا ہو اور فاتح بیہ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کیا؟

"ان دونوں کی موت طبعی نہیں ہے۔" فاتح کے انکشاف نے بیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ لاؤنج میں بیٹھا ہر شخص منجمد ہونے لگا۔ نانا' نانی' عزہ اور اس کی ساس۔۔۔ ارسل اور واصف تایا۔ وہ سب آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔

"دیکھا' ہم نہ کہتے تھے۔ وہی ہوا نا۔۔۔" ارسل کی دادی کی آنکھیں چمکیں۔

فاتح نے اک نظر ارمیز پہ ڈالی تھی۔ پھر اس کی آنکھ کا اشارہ پا کر آہستہ سے بولا۔

"ان دونوں کو زہر دے کر مارا گیا ہے۔"

فاتح کے مزید انکشاف نے ہر دل کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

اب ہر کوئی تبصرے میں مصروف تھا۔ یہ کیسے ہوا؟ کس نے کیا؟ کس طرح سے ہوا؟

عزہ اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ "مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ انہیں کسی نے قتل کیا ہے۔" وہ دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ فاتح نے اٹھ کر عزہ کو پیار کیا اور پھر بیہ کا ہاتھ پکڑ کر بیسمنٹ کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے بیہ سے علیحدگی میں پوچھنا تھا کہ اس گھر میں گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟ عنایہ اور دیا کو کس نے قتل کیا؟

☆ ☆ ☆

بیسمنٹ ہمیشہ کی طرح نیم تاریک تھا۔ اندھیرے

Downloaded From http://paksociety.com

میں گم صم سا۔ ہیبت ناک اور پراسرار۔

وہ یسمنٹ کے ٹھنڈے ہال میں چلتے ہوئے دیا کے کمرے میں پہنچ چکے تھے اور اب وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے اور خاموش تھے اور ہمیشہ کی طرح خاموشی ان کے درمیان محو کلام تھی۔

ان دونوں کے درمیان کبھی اتنی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ بس عزہ کی شادی کے دوران تھوڑی سی نوک جھونک اور بس۔ اس کی باوجود فاتح کو ہمیشہ لگتا تھا۔ وہ بیہ سے قرنوں پہلے ہی جان پہچان رکھتا ہے اور بیہ تو تھی ہی ایک داسی پھر داسیوں سے کیا سوال جواب؟ معاً فاتح کی نرم آواز نے بیہ کو چونکا دیا تھا۔

"مجھے ارمیز نے میڈیکل رپورٹس دکھائی ہیں۔ اس نے نانا' نانی کو اس لیے نہیں بتایا تھا کہ انہیں تکلیف ہوگی' لیکن اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ ان دونوں کی موت سم قاتل سے واقع ہوئی ہے۔ یہ ایسا مہلک زہر ہے جو اسپتال پہنچنے کی بھی مہلت نہیں دیتا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں بیہ! یہ سب کیوں کر ہوا؟"

"تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟" بیہ نے اتنے آرام سے پوچھا تھا۔ جیسے کوئی بھی اس پہ شک کرتا۔ یہ اس کے لیے عام سی بات تھی۔ فاتح نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہرگز نہیں... میں تو بس حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ تب اس رات کیا ہوا تھا؟ کچھ ایسا انہونا جس سے تم بھی ناواقف ہو' لیکن ہم کچھ کھوج تو لگا سکتے ہیں۔" فاتح نے ملائمت سے اس کی بدگمانی دور کرنا چاہی تھی۔ وہ گہرے سانس بھرتی ٹھنڈے فرش کی ٹھنڈک محسوس کرتی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

پھر اس نے دیا کا کمرہ از سر نو دیکھنا شروع کیا۔ وہ اس کمرے سے افراہیم بھائی کی ساری تصویریں اتار کر ایک گٹھڑ میں سنبھال چکی تھی۔ اس کے پاس کچھ ڈائریز بھی تھیں۔ جو فاتح کی امانت تھیں اور جسے بیہ نے پڑھ لیا تھا تب سے اس کا دل اتنا ہی بوجھل اور افسردہ تھا۔ جیسے کسی بھاری چیز کے نیچے دبا ہو۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں...؟ اس کمرے میں تمہارے باپ اور اپنے چچازاد بھائی کی تصویریں دیکھ کر جو مجھ پہ گزری۔ وہ ایک ایک قیامت ہی تھی' لیکن ان تصویروں کی اس کمرے میں موجودگی کی جو وجہ مجھے معلوم ہوئی۔ اس نے مجھے تھرا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ میری بہن تمہارے باپ کی تصویروں پہ سفلی عملیات کرتی تھی۔ اس انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔"

وہ دھیمی بوجھل آواز میں کہہ رہی تھی اور فاتح بے چینی کے ساتھ اسے اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ رہا تھا۔ بیہ نے بیڈ کے نیچے سے تصویروں کا ایک گٹھڑ نکالا تھا۔ اسی گٹھڑ کے اندر ناکارہ بوسیدہ کھوپڑی کچھ زنگ آلود کیل' کانٹے' سوئیاں' کپڑے کی پتلیاں اور ایک زنگ آلود لوہے کا مکان بھی رکھا تھا۔

فاتح ایک ایک چیز کو دیکھتا دنگ رہ گیا تھا۔ پھر بیہ نے اسے چند ڈائریاں دیں۔

"یہ دیا نے وقت آخر مجھے تمہارے لیے دی تھیں۔" بیہ نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں کہتی رہی۔

فاتح ان ڈائریوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ایک' دو' چار' پانچ گھنٹے مسلسل فاتح ڈائریز پڑھتا رہا اور بیہ اس کے قریب بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔ ایک ٹک' بے خود ہو کر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا دیا ظالم تھی یا مظلوم۔

پھر بیہ اچانک اٹھی اور ٹوٹا ہوا ایک مگ دراز میں سے نکال لائی تھی۔ جو اس نے دیا اور عنایہ کے مرنے کے بعد کمرے سے اٹھا کر محفوظ کیا تھا۔

"اس رات کچھ ہوا تھا؟" فاتح بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بیہ سوچنے لگی۔ اس رات ہوا تو تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھی اور جلدی سے عنایہ کا وہی فون نکال کر لائی جو فاتح نے عنایہ کو گفٹ کیا تھا اور جس کی اسکرین پہ گرنے کی وجہ سے اسکریچ آگیا تھا۔

اس نے فاتح کے ہاتھ میں موبائل پکڑایا۔ جسے پکڑ کر وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھو گیا تھا۔ شاید عنایہ کی یاد میں۔

Downloaded From http://paksociety.com

"اور تم نے رافع کو اطلاع بھی نہیں دی۔ عنایہ اس کی بیوی تھی۔" کچھ دیر بعد فاتح نے سنجیدگی سے کہا تو بیہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میرے پاس اس کا نمبر نہیں تھا اور جو تھا وہ بند پڑا تھا۔" بیہ جواب دے رہی رہی تھی کہ اچانک فاتح نے کہا تھا۔

"رافع کا پرانا نمبر آن ہے۔ اسی رات سے جب عنایہ کی ڈیتھ ہوئی۔ عنایہ کے نمبر پہ آخری کال رافع کی تھی۔ اس کا مطلب ہے۔ مرنے سے پہلے اس کی رافع سے بات ہوئی تھی۔"

فاتح دبے دبے جوش کے ساتھ کچھ سوچتا ہوا عنایہ کے نمبر سے اسی فون نمبر پہ فون کرنے لگا۔ بیہ خاموش اور متجسس تھی جبکہ فاتح بے حد مضطرب۔ رافع سے پچھلا سب کچھ بھلا کر فون پہ بات کرنا بہت مشکل تھا' لیکن اس نے عنایہ کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا تھا۔ کیا پتا' رافع ہی عنایہ کی موت کا کوئی اشارہ دے دیتا۔

اور جیسے ہی فاتح نے "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف سے رافع کی سسکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ اس کے ہیلو کا بار ہی نہیں سہ سکا تھا اور اونچی آواز میں رونے لگا۔

"میں کم ظرف ہوں۔" آنسو اسے بولنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ بار بار ہچکیوں کے دوران کچھ کہتا تھا۔ شاید معافی کے الفاظ۔ اور جب اس سے بات مکمل نہ ہو سکی تو کسی اور نے رافع کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا۔ فون لینے والی نے اپنا تعارف افسون مشہدی کے طور پر کروایا تھا۔ اور اس نے کہا۔

"میں حریر مشہدی کی بہن ہوں۔ اور آپ کے بھائی کی ایک امانت سمجھ کر حفاظت کر رہی ہوں۔ اس کا دل بہت ڈسٹرب کرتا ہے۔ آج بھی ہارٹ پرابلم کی وجہ سے ہاسپٹل میں ہیں۔"

"آپ کو اپنا تعارف کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حریر نے مجھے سب کچھ بتا رکھا ہے۔" فاتح کو بے ساختہ ٹوکنا پڑا تھا۔

"تو کیا حریر نے ہماری سفارش کر دی؟" وہ بے ساختہ خوشی سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ کو سفارش کی کیا ضرورت تھی۔ اس نالائق سے کہیں۔ واپس گھر آجائے۔ نانا' نانی کا امتحان نہ لے۔" فاتح نے ضبط کے پل صراط پہ کھڑے کھڑے کہہ ہی دیا تھا۔

"اگر اس نے بچوں کی طرح رونے کا شغل پورا کر لیا ہے تو ذرا مہربانی فرما کر اسے موبائل دیں۔ مجھے عنایہ کے بارے میں کچھ بات کرنی ہے۔" فاتح کی التماس پہ افسون نے موبائل رافع کی طرف بڑھا دیا تھا۔ جو عنایہ کے نام پہ ایک مرتبہ پھر افسردہ سا ہونے لگا۔

"رافی!" فاتح کے اس طرز تخاطب نے رافع کے اندر آنسوؤں کی جھڑی لگا دی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے کوئی معجزہ ہو گیا۔ اس کا بچھڑا بھائی پلٹ آیا تھا۔ فاتح کبھی بڑے موڈ میں ہوتا تو اسے اتنے ہی پیار سے بلاتا تھا۔ اس کا روٹھا بھائی مان گیا تھا۔

"تمہاری اس رات عنایہ سے کیا بات ہوئی تھی؟" فاتح نے کچھ دیر بعد بڑے محتاط انداز میں پوچھا تھا۔ تب رافع نے دھیمے لہجے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ سب کچھ' جو اس نے عنایہ سے کہا تھا۔

"میں نے اس سے معافی مانگی تھی۔ ان سب گناہوں کی جو مجھ سے سرزد ہوئے تھے۔ جس میں وہ ملوث نہیں تھی۔ اور جن میں اپنے بیچ بن کی وجہ سے میں ملوث رہا۔ وہ تو بے قصور تھی۔ معصوم تھی۔ ہم سب نے ہی اسے اپنے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا۔" وہ دھیمی بوجھل آواز میں کہتا رہا۔

"اور اس کے علاوہ؟" فاتح کے لہجے میں پنہاں سوال کی گہرائی کو وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے سوچا اور دھیمی پر نم آواز میں بولا۔

"میں اس کے قابل نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے کیا تھا۔ وہ قابل معافی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے مجھے معاف کر دیا۔ اور میں نے اسے طلاق دے دی تھی۔ میں نے وہ آخری فون کال اسی لیے کی تھی تاکہ اسے اس نام نہاد تعلق سے آزاد کر دوں۔ مجھے اندازہ ہی

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں تھا۔ وہ زندگی کی قید سے ہی رہائی پا جائے گی۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"تم نے عنایہ کو طلاق دے دی تھی؟" فاتح کا دماغ چکرا کر رہ گیا تھا۔ جواباً" رافع اسے سارا قصہ سنانے لگا۔ اس نے کب عنایہ کو فون کیا تھا؟ اور اس فون کال کے بعد کیا ہوا؟

اس رات آخر کیا ہوا تھا؟

☆ ☆ ☆

رات پر آلکسی سوار تھی۔ جیسے رینگ رینگ کر چلتی۔ ست اور تھکی تھکی سی رات بامراد کی سچی کرنوں سے کوسوں دور تھی۔ سپیدہ سحر کسی بام پر اٹک گیا تھا۔

امل بیدپہ ویرانی سی تھی۔

باہر رات کی راج دھانی تھی۔ رات کی ساحرہ یا ملکہ عالیہ۔ جس کے اقتدار پہ نخوت سر چڑھ کے بولتی تھی۔

"صبح اقدس شاید کبھی نہ طلوع ہو۔"

عنایہ نے تھک ہار کر سوچا اور نگاہیں رات کی تاریکی سے ہٹالی تھیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے رافع کی فون کال آئی تھی۔ اس کی پہلی اور آخری کال۔

وہ سوچنے لگی۔ رافع نے اس سے کیا کہا تھا؟ کیا..... سوچ سوچ کر بھی اسے یاد نہ آیا تھا۔ اس کی یادداشت ایسے ہی کھونے لگی تھی۔ کچھ بھی یاد نہ آتا تھا۔ اور کبھی کبھی اچانک ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔ جیسے ابھی اسے بہت کچھ اچانک یاد آگیا تھا۔

رافع نے اسے طلاق دی تھی اور شاید معافی بھی مانگی تھی۔ عنایہ نے سوچا۔ یہ الفاظ وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ اب اس میں کیا نیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ سوچتی رہی۔ اور پھر بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگتی رہیں۔ اسے یاد آیا۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کی ماں کے غلط فیصلوں کی بدولت تھا۔

اس کے اندر بھانبھڑ جلنے لگے۔ آگ بھڑکنے لگی۔

"طلاق، طلاق، طلاق۔"

وہ دنیا میں صرف یہ تین لفظ سننے کے لیے آئی تھی۔ صرف یہ تین لفظ۔ وہ رونے لگی تھی۔ چیخنے لگی تھی۔

"فاتح، رافع۔" اس کی ماں نے ان دو مردوں کے درمیان اسے فٹ بال بنادیا تھا۔ ایسی ذلت؟ ایسی خواری؟ ایسی رسوائی۔

وہ رونے لگی تھی۔ بے تحاشا رونے لگی۔

"مائیں ایسی ہوتی ہیں؟ ساری عمر سولی پہ ٹنگے دیکھیں۔ ایک جہنم کے اندر دھکیلے رکھیں۔ ٹنگے پیر کو ئلوں پہ چلائیں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور چلنے لگی۔ پھر وہ اچانک کچن کے قریب آکر رک گئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ شاید لان میں تھی۔ اور آلکسی کی ماری رینگ رینگ کر چلتی رات میں محو تھی۔ اور اس کے ماں کہاں تھی۔؟ نیچے بیسمنٹ میں؟

اس نے چولہے پر پانی رکھا، وہ کافی بنا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے دو مگ تیار کیے اور پھر دراز کھول کر اپنی مطلوبہ چیز نکالی۔ یہ ایک پڑیا تھی جو اس نے ان دنوں منگوائی تھی جب فاتح اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تب وہ زندگی سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

اس نے پڑیا سے سفید سفوف نکال کر دونوں مگوں میں ملایا اور کافی کا مگ اٹھا کر دیا کے کمرے میں آگئی تھی۔

اس نے دیکھا۔ دیا اپنے نماز والے سنہری تخت پر لیٹی تھی اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔

عنایہ بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی مگر کاش اس کا دل بھی اتنا خوب صورت ہوتا اس نے آگے بڑھ کر خاموشی کے ساتھ مگ رکھا اور الٹے قدموں باہر آگئی۔ چند الفاظ اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

"جب زندگی کا بہاؤ موت کی طرف چل رہا ہو تو اے میرے سیاہ اعمال مجھ سے دور ہو جاؤ۔"

مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اور تم نے دھوکہ دہی سے سارے رشتے بنائے۔ اسی لیے سارے رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ اور تم نے اپنی بہن کا دل توڑا۔ اس کی محبت چھین کر میرا نصیب بنادی۔ اور

Downloaded From http://paksociety.com

دیکھو ماں! تمہاری عنایہ کتنی بدقسمت ہے۔ یہ محبت اس کا نصیب بھی نہیں بن سکی۔ فاتح مجھے چھوڑ گیا۔ اور رافع کو میں نے از خود چھوڑ دیا۔ اور آج اس نے میرے پاگل پن سے تنگ آکر مجھے طلاق دے دی۔ کتنی بدقسمت ہے عنایہ! کہ اس کے نصیب میں کسی کا پیار نہیں۔" وہ روتی رہی' تڑپتی رہی۔ چیختی رہی۔ پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

اور میں عنایہ کاشف ہوں۔ میرا باپ ایک جذباتی آدمی تھی۔ جسے میری ماں جیسی ساحرہ سے محبت ہوگئی تھی۔ اور میری ماں اچھی عورت نہیں ہے۔

وہ ایک "حاسد" عورت ہے۔

میری ماں کو میری اکلوتی پھوپھو سے بڑی نفرت تھی۔ ایک زمانے میں وہ اس کی سہیلی تھی۔ بعد میں تو اس نے اسے اپنے دشمنوں سے بھی بدتر سمجھا۔ کوئی دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کرتا جو کچھ میرے ماں نے پھوپھو کے ساتھ کیا۔

میں نے زندگی بھر اپنی ماں کی محبت نہیں دیکھی۔ ہاں اس کی مار کے ان مٹ نشان میرے جسم پہ موجود ہیں۔ اور روح ایسے ان گنت زخموں سے بھری پڑی ہے۔ اور میں ایسی بدبخت تھی جسے ماں باپ کا پیار ہی نہ ملا۔

پھر ماں کی گھٹیا چالوں کی بدولت میری شادی فاتح سے ہوئی۔ میں نے اپنے باپ کے بعد وہ پہلا مرد دیکھا تھا۔ بہت قریب سے۔ ایک اٹوٹ رشتے میں بندھ کر' وہ میرے باپ سے بہت مختلف تھا۔ میرا باپ ایک غصہ ور' جذباتی انسان تھا۔ وہ میری ماں پہ چیختا چلاتا اور اسے نوکروں کے سامنے مارتا تھا جبکہ میرا شوہر دنیا کا اچھا ترین انسان تھا۔ جس نے عورت کے احترام اور عزت کے ساتھ اس کی نسوانیت اور وقار کا بھی خیال رکھا تھا۔

میں اس کے لیے ایک "ان چاہی" دلہن کے روپ میں تھی۔ اس نے مجھے ہمیشہ "من چاہی" بیوی کی طرح برتاؤ کیا۔ وہ میری زندگی کا اثاثہ تھا۔ میری ماں کی غلط چالوں نے فاتح کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کردیا تھا۔ میں نے فاتح کو کھودیا تو رافع مجھ پر مسلط کردیا گیا۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ کزن تھا۔ اور کبھی الفت کی نسبت بھی رہی تھی لیکن اب میرے لیے صرف اجنبی تھا۔ مجھ پہ فاتح کے بعد زندگی کی ہر خوشی حرام ہے۔ حرام ہے۔ یہ میرا خود سے عہد تھا۔ آج رافع نے مجھے ہر تعلق سے آزاد کردیا۔

میرے دل پہ اب کوئی بوجھ نہیں۔۔۔ اور میں بہت خوش ہوں دیا! مجھے تم سے رہائی مل رہی ہے۔ اب وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ چکی تھی اور اس نے کافی کا پورا مگ خالی کردیا تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اپنا مقدر کھوجتی بیہ کو کراہتے ہوئے اندر بلایا تھا۔

پھر اس سے چند باتیں کیں۔۔۔ اور دم آخر صرف اتنا کہا۔

"میرا ایک کام کردینا۔ بیہ! بس اسے بتا دینا۔ کہ عنایہ کو اس سے بہت محبت تھی۔ باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ نظر کا دھوکا۔ یا وقتی لگاؤ۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری اور چپ ہوگئی تھی۔

"کس سے؟" بیہ الجھی۔۔۔ "کیا رافع سے؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔" عنایہ نے الجھی سانسوں کو ہموار کیا تھا۔ "فاتح سے" اب وہ آنکھیں موند رہی تھی۔ اور پھر اس نے آخری ہچکی لی اور دنیا سے منہ موڑ کر بہت دور چلی گئی۔

بیسمنٹ کی نیم تاریکی میں بیہ کی آواز گونجتی تھی۔ اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے عنایہ کی زندگی کے مختصر باب کو ختم کررہی تھی۔ اور اس نے دیکھا تھا۔ فاتح کی آنکھوں کے کونے نم تھے۔ اور وہ گہری افسردگی کو اپنے اندر اترتا محسوس کررہا تھا۔ آج اس ذلت کا اختتام ہوگیا تھا جو عنایہ کے اس دن والے اقرار کی بدولت اس کے اندر پھانس کی طرح چبھتی تھی۔ آج اس پھانس کا بھی اختتام ہوگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ بادلوں سے ڈھکا ایک رستہ تھا۔ اور خوب

Downloaded From http://paksociety.com

صورت سی ایک پگڈنڈی تھی۔ جس کے آخری سرے پہ ایک جیسے فراک پہنے دو بچیاں کھڑی تھیں۔ ان کے بالوں میں ایک جیسے ربن تھے۔ اور پونیوں کا اسٹائل بھی ایک جیسا تھا۔

وہ دونوں بچیاں آنسو بھری آنکھوں سے پگڈنڈی پہ چلتی اس حسین مورت کو دیکھ رہی تھیں۔ جو ایک سنگ مرمر سے تراشا "بت" تھی۔

وہ کسی ملکہ کی طرح چل رہی تھی۔ اپنی راج ہنس سی گردن اٹھا کر۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں سے بھری ایک ٹوکری تھی۔ جس پہ نظر پڑی تو ایک دم وہ چیخ پڑی۔ ٹوکری کے اندر سنہری تاج والا ایک سانپ بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اپنا ڈنک نکالتا اور کبھی اس کے دودھیا ہاتھ پر اپنی زبان پھیرتا۔

وہ ایک چیخ کے ساتھ سنہری تخت پوش سے اٹھ گئی۔ وہ پسینے سے تربتر خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ خواب تھا یا حقیقت؟

وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ حلق خشک تھا۔ اس نے تخت کے سامنے رکھا کافی کا مگ اٹھالیا۔ کافی بدذائقہ تھی۔ پھر بھی دیا نے ایک سانس میں مگ خالی کر دیا۔

پھر اس نے دیکھا۔ اس کے اردگرد ایک ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔ بدوضع عورتیں، بدصورت مرد۔ جن کے جسم پر لمبے کانٹے تھے۔

"تم لوگ کون ہو؟" اس نے خوف سے تھرتھراتے لہجے میں پوچھا تھا۔ جواباً وہ ہنسنے لگے۔ لمبے لمبے دانت دکھانے لگے۔ "ہم وہ "عمل" ہیں۔ جو تم نے کالی راتوں میں دھاگے باندھ کر کیے۔" کوئی اس کے کانوں میں چلا رہا تھا۔ دیا نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔

افراہیم کی شادی۔ افراہیم کی خوشیاں، افراہیم کی کامیابیاں۔

وہ دیا کی نفرت روبا کو سازش کے تحت سیڑھیوں سے گرا کر اس کی جان لینے کا منصوبہ۔ افراہیم کی زندگی کو شیطانی عملیات کے ذریعے جہنم بنانا۔

نفرت در نفرت کا سلسلہ۔ جان چھڑکنے والے شوہر کا دل برداشتہ ہو کر زندگی سے دامن چھڑا جانا۔

زوبا کے بچوں سے نفرت۔ اپنی بیٹی سے بیزاری۔ بیٹی پہ ظلم۔

رافع کو بہکانا۔۔۔ اپنی بیٹی کو نفرت کی انتہا پر فٹ بال بنا دینا۔ بیٹی سے فاتح کو چھین لینا۔

ماضی کے کسی جھروکے سے جھانکتی ماں سے نفرت، دادی سے نفرت۔ ہر رشتے سے نفرت۔

محبت تو اسے بس خود سے تھی۔ اپنے آپ سے تھی۔ اس نے خود کو چاہا۔ اپنی پرستش کی۔

اس نے اپنے صنم کدے میں افراہیم کی تصویریں محبت میں نہیں رکھی تھیں۔ وہ ان تصویروں کو پھونکیں مارنے کے لیے لائی تھی۔ اس نے یہ سب کیوں کیا؟

افراہیم کی محبت میں؟

ہرگز نہیں۔ محبت تو اسے کسی سے نہیں تھی۔ اس نے تو یہ سب نفرت میں کیا۔ فراہیم کے چھتروں سے ملنے والی اور جو اس کے آس پاس تھے وہ نفرت سے چلا رہے تھے۔

"تجھے افراہیم سے محبت تھی۔"

"نہیں تھی۔" وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر چلا رہی تھی۔ "دیکھو میرا دل، اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ماں کی محبت، نہ اس کی جدائی کا غم، نہ باپ کے جانے کا غم، نہ افراہیم کے نہ ملنے کا کرب۔ نہ کاشف کی جدائی کا سوگ اور نہ عنایہ کے اجڑنے کا دکھ۔ دیکھو میرا دل خالی ہے۔ ویران، بیابان، سنسان۔"

"کیسی بدبخت عورت ہو تم۔ ایسے سیاہ دل کی مالک۔ مفلس، کنگال۔" وہ بہت سے لوگ تھے۔ عجیب صورت والے۔ نفرت سے اسے دیکھتے اور تھوک جاتے۔

پھر اچانک ایک سفید براق کپڑوں والا ہیولا جلوہ گر ہوا۔ ایک خوب صورت مرد۔ جھکی آنکھوں والا۔ "منع کیا تھا نا۔۔۔ نہ بربادی کے راستے پہ چلو، خدا اپنے پیاروں کے چراغ بجھنے نہیں دیتا۔ لیکن تجھے عقل

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں آئی۔ گڑھے میں بیٹھ کر اپنے لیے گڑھا کھودتی رہی۔ دوبارہ سُن اپنے لیے۔ وہ تو تب ہی مرے تھے جب ان کی موت آئی۔ اور تو نے انہیں کتنا جدا کرنا چاہا لیکن خدا کو ان کی جدائی گوارا نہ تھی۔ اپنے پاس بلایا تو اکٹھے ہی بلالیا۔ وہ مر کر بھی جدا نہ ہوئے۔ تیرے برے عمل تیرے ساتھ رہے۔ دیکھو' اس کا آشیانہ اب بھی آباد ہے۔ اور تیرا آشیانہ آج پھر برباد ہے۔" وہ دھیمی آواز میں زہر پھونکتا چلا گیا تھا۔ یہ عبیداللہ تھا یا اس کا وہم۔ جامن کے پیڑ تلے کھڑے رہ کر اسے برے عمل سے "اوں ہوں" کی آواز کے ساتھ روکنے والا۔

دیا نے تھک کر تخت کے کنارے سے سر ٹکا دیا تھا۔ وہ ہار گئی تھی۔ نفرت کی ایک لمبی جنگ لڑنے کے بعد ہار گئی تھی۔ اس نے تسبیح اٹھائی تھی۔ تسبیح پڑھنے کے دوران اس پر غنودگی سی طاری ہوگئی۔ "جب زندگی کو ٹپکا لگا ہو اور موت کی طرف بہاؤ چل رہا ہو۔ جب سانس سینے کی قید میں سر پٹختی ہو۔ اور روح لمبی اڑان بھرنے کے لیے تیار ہو تو اے میرے بداعمال! مجھ سے دور ہو جاؤ۔ مجھ سے دور ہو جاؤ۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر جیسے التجا کی تھی۔ لیکن اب اس کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ اب تو بس فنا کا سفر باقی تھا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی۔ جب حریر ابھی ہیگ میں ہی تھا۔ اور مدید کے ساتھ ٹیولپ کی کٹائی کا ناپسندیدہ کام کرواتا تھا۔ اور پھر اس کا سسر کمال خانوان پھولوں کو شہر کی بڑی تجارتی منڈی میں منگے داموں بیچ آتا۔

ان ہی دنوں اسے اپنی بہن کے ای میل ایڈریس سے چھوٹے بھائیوں کی ای میل موصول ہوئی تھی۔ حریر کا دل بلیوں اچھل پڑا تھا۔ اس نے ای میل کو سہ بار پڑھا۔ اس کا یہ مطلب تھا اپنے ای میل ایڈریس سے ای میل بھجوانے والی خود افسون مشہدی تھی۔ حریر کی بہن۔

اسے واپس بلایا جا رہا تھا۔ اور ساتھ اس کی کچھ "خدمات" کی بھی ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ یہ ای میل افسون نے حریر کو حمیر کے ذریعے بھجوائی تھی۔ اسے اپنی ناک عزیز تھی۔ سو بندوق حمیر کے کندھے پہ رکھی تھی۔ چلو کوئی بات نہیں۔

حریر کو اپنا مطالبہ یاد آیا۔ جس کی وجہ سے وہ گھر بدر تھا۔ کیا ضروری تھا؟ وہ ابھی اپنا مطالبہ افسون کے "کام" سے پہلے منوالیتا۔ "لیکن یہ کیا؟ ان باکس میں ایک اور ای میل بھی پڑی تھی۔ حریر نے بے تابی سے کھولی۔

"تمہارے ناجائز مطالبے کی ہمارے نزدیک اب بھی کوئی وقعت نہیں۔ یہ مت سمجھنا۔ تمہارے "مطالبے" پہ کسی بھی قیمت پر نظر ثانی کی جائے گی۔ ہم آبگینے کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتے۔ وہ کوئی جو "بھی" ہو۔" افسون کی وہی ازلی فیصلہ کن نخوت۔ حریر کا منہ پھول گیا۔ ہونہہ۔

اور پھر اس نے ناک بھوں چڑھا کر پوری ای میل پہ نگاہ ڈالی تھی۔

اگر تمہیں ظہران کا سب سے زیادہ قابل اور منجھا ہوا ماہر نفسیات سمجھ کر ایک پیچیدہ کیس دیا جائے تو اس کیس کی تم کتنی فیس لوگے؟ اور ظہران آنے میں کتنے دن لگاؤ گے۔ ادھر دار الشفاء میں میرا ایک "مریض" تمہارا منتظر ہے۔ کسی ماہر نفسیات سے اپنی ذہنی الجھنوں کو ڈسکس کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تم سے بہتر کوئی بھی ماہر نفسیات نہیں نظر آتا۔ تمہاری قوتِ مشاہدہ کمال کی ہے۔"

اس "تعریف" پر واری جاتے ہوئے حریر مشہدی اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کرتے ہوئے ای میل کا جواب لکھنے لگا۔

"مجھے ظہران آتے ہوئے چند گھنٹے لگیں گے۔ میں ظہران پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے "مریض" کے کچھ کوائف' ایک تصویر اور اس کا کچھ بائیو ڈیٹا سینڈ کرو۔ اور "ہاں" فیس میں حریر مشہدی پھر "مطالبہ" ہی لے گا۔ اپنے والد صاحب کو بتا دینا۔ ہاں۔"

حریر نے ہونٹ کا کونا دبا کر لیپ ٹاپ آف کیا اور

Downloaded From http://paksociety.com

مدید کے ساتھ باقی مشقت کے لے نکال پڑا۔ پھر افسون نے ای میل کی تھی۔ اس میں افسون کے "مریض" کی تصویریں بھی تھیں۔ اس کا نام' قومیت' ولدیت۔ وہ سب کچھ جو انتہائی صدمے میں مبتلا کردینے کے لیے کافی تھا۔ افسون کے مریض کی تصویروں نے حریر کو بری طرح سے چونکا دیا تھا۔ اس نے ایک ایک چیز کو بغور دیکھتے ہوئے اپنا سر تھام لیا تھا۔

حریر کو ٹیولپ کے کھیت میں اتری وہ رات یاد آئی۔ جب وہ دونوں ندی کے کنارے بیٹھے تھے اور فاتح اپنی زخم زخم زندگی کا ایک ایک آنسوؤں بھیگا ورق کھولتا تھا اور حریر اندر تک اتری رنجیدگی کے ساتھ اس کا لفظ لفظ اپنے دل میں اتارتا تھا۔

فاتح اور رافع.....؟ یہ دو کردار؟ دو مریض..... ایک ہی کہانی کے دو حصے' دو کردار۔ دونوں اپنے اپنے احساس زیاں میں ڈوبے ہوئے۔ وہ دونوں جو اس کے "مریض" نہیں تھے۔ لیکن حریر نے زبردستی ان کو اپنا مریض بنالیا تھا۔ رافع یعنی فاتح کا بھائی؟ ظہران میں؟ افسون کے قریب' کیوں؟

ان ساری باتوں کا جواب اسے افسون کی اگلی ای میل سے مل چکا تھا۔ اس نے اپنے "برادرانہ" جذبات کا گلا گھونٹ کر ایک آہ بھری۔

"صد شکر کہ تمہیں کوئی پسند آیا۔ تم راستے سے ہٹو گی تو میری باری آئے گی۔"

حریر افسون کی ای میل پڑھتے ہوئے حیران تھا۔

زندگی کے اس سفر میں لوگ ایسے بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں۔ جیسے کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی جائیں۔ جیسے الجھی ڈوروں کے سرے سلجھتے جائیں۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دنیا جہاں کے تجسس کے ساتھ رافع کی زندگی میں کھو گیا تھا۔ حریر نے ابھی تصویر کا ایک رخ دیکھا تھا۔ جو اسے فاتح نے دکھایا تھا۔ اب اسے تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا تھا۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ رافع سے ملاقات کرنے ظہران پہنچ جاتا۔

ویسے بھی آبگینے کے ہاتھ سے بنے پراٹھے کھائے ایک مدت ہوگئی تھی۔ حریر کو بے طرح اپنے یاد آنے لگے۔ وہ نک چڑھی سی رعب جماتی بہن' نٹ کھٹ سے چھوٹے بھائی۔ حلیم سے روشن خیال والد صاحب۔ جنہوں نے اپنی بیٹی کی "پسند" پہ سمجھوتا کرلیا تھا۔ اور وہ سب کی فکر میں ہلکان بابا کی لاڈلی بیگم۔

حریر کو یاد آیا۔ وہ کیا کچھ پیچھے چھوڑ آیا تھا؟ اپنی محبتیں' رشتے' چاہتیں اور مطالبہ بھی۔

اس کا دل بڑا ہی بے قرار ہوا تھا۔ دل چاہتا' اڑتے ہوئے ظہران پہنچ جائے۔ اپنے "افسون حرم" میں۔ ظہران کے تپتے سورج تلے اس کا عالیشان محل۔ جسے وہ اپنی بے کار ضد میں ٹھوکر مار آیا تھا۔

اور اب اسے واپس جانا تھا کیونکہ افسون نے اسے بلایا تھا۔ چاہے کسی وجہ ہی سے۔ سب سے بڑھ کر حریر کو اپنے "مریض" سے ملنے کی دلچسپی اور اشتیاق تھا۔ فاتح کا بچھڑا ہوا بھائی؟

اور پھر اگلے دو دنوں میں وہ ظہران افسون حرم میں اپنے' اپنوں کے درمیان موجود تھا۔ اس حال میں کہ حریر کے چھوٹے بھائی اس کی وہ درگت بنا رہے تھے کہ اللہ کی پناہ۔ انہوں نے اس کا افسون حرم کی بالکونیوں میں کھڑے ہو کر ایسا والہانہ استقبال کیا کہ کیا ہی کوئی کسی اپنے پیارے کا کرتا ہوگا۔

سارے ظہران کے گندے انڈے اور ٹماٹر انہوں نے گولیوں کی طرح اس پہ برسائے تھے۔ ایسا برا استقبال؟ حریر مارے خجالت اور غصے کے پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ اور جواباً" حمیر اور عمیر کی ہنسی۔ وہ چیخ رہے تھے۔ "لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔" وہ غصے میں بل کھاتا اندر آیا تو سامنے ہی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ اس کے اپنے' بابا آبگینے' افسون اور کوئی ایسا بھی تھا۔ جو اسے پہلی نظر میں بری طرح سے ٹھٹکا گیا۔

وہ ہو بہو فاتح تھا۔ اپنی آنکھوں' بال اور ہونٹ کے تل سے..... حریر اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنی مشابہت سے ہی نہیں تاثرات سے بھی فاتح ہی تھا۔

ویسا ہی دکھ' کرب اذیت اس کی آنکھوں سے

Downloaded From http://paksociety.com

جھلکتی ہوئی۔ ایک چیز اس کے اندر فاتح سے زیادہ تھی۔ اور وہ تھی۔ ندامت' ملال' پچھتاوا' شرم ساری۔ احساس زیاں۔ جس کی وجہ سے حریر نے اگلے کئی دن بعد بھی اس کی آنکھوں کو جھکا ہوا پایا تھا۔ وہ کبھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا تھا۔ اس کا قیام افسون حرم میں تھا۔ اور حریر جانتا تھا کہ وہ کس قدر مجبور ہو کر افسون حرم کے مہمان خانے میں رہنے پر مجبور تھا۔ اس کے بابا فوزان مشہدی کی دھمکیوں کے باعث۔

"یاد رکھنا' ہماری بات نہیں مانو گے تو ظہران کی حوالات میں بھجوادوں گا۔ انہیں میزبانی کا موقع دے آنا۔ ہماری میزبانی تو تمہیں پسند نہیں۔ بلکہ ناک تلے نہیں آتی۔" اور جب میزبان ایسے جان نچھاور کرنے والے ہوں تو مہمان کب تک نخرے دکھاتا؟ بالآخر اسے جھکنا ہی تھا۔

رافع سے مل کر حریر کو بہت جلد فاتح کی کہی ایک ایک بات پر یقین ہو گیا۔ جو فاتح نے کہا۔ لفظ بہ لفظ ٹھیک تھا۔ لیکن جو رافع کہہ رہا تھا۔ وہ سچائی کے ساتھ ساتھ اقبال جرم تھا۔ ایک ڈاکٹر اور مریض کے رشتے کو سمجھتے ہوئے رافع نے اپنے ایک ایک درد کو کھول دیا تھا۔ اس نے سر جھکا کر اقرار کر لیا۔ "میں نے اپنے بھائی کی بیوی پہ بری نظر رکھی۔ میرے اس گناہ کی یہ سزا عمر بھر کے لیے کافی ہے۔ میں کبھی اپنوں سے نہیں ملوں گا۔ اور ہمیشہ کے لیے اس بھیڑ میں کھو جاؤں گا۔" وہ سر جھکا کر رو رہا تھا۔

رافع کے ایک ایک درد کو سنتا' اس کے درد کا درماں کرتا حریر گہری سانس بھرتا ایک فیصلے پہ پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔ شرمندگی' پچھتاوا' ندامت اور توبہ ہر بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر دیتے ہیں۔ اور وہ تو اتنے عرصے سے قریہ قریہ بھٹکتا اپنے لیے معافی کا ایک لفظ سننے کے لیے مر رہا تھا۔ سسک سسک کر تڑپ تڑپ کر۔

فیصلہ مشکل تھا لیکن ہو گیا۔ حالانکہ افسون حریر کے اس فیصلے پہ خوش نہیں تھی۔ اس نے حریر کے ساتھ جھگڑتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمہیں اس کا علاج کرنے کے لیے کہا تھا۔ ایک ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے اس کی مسیحائی کرو۔ میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا۔ تم الٹے سیدھے مشورے بھی دو۔"

تب حریر کو اسے سمجھانے میں بہت وقت لگا تھا۔ لیکن وہ افسون کو سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"وہ اپنوں کے بغیر ادھورا اور نامکمل ہے۔ کوئی بھی انسان اپنوں کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔ تم اسے یہاں اپنے ساتھ رکھو گی تو وہ تمہارے جذبوں کی قدر کرتا ٹھہر جائے گا۔ کیونکہ وہ ایک ہارا ہوا انسان ہے۔ تنہا اور اکیلا ہے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ جو تم سے اسے مل جائے گا۔ مگر وہ خوش نہیں رہے گا۔ اس احساس ندامت کے ساتھ۔ تو بہتر ہے۔ اسے اپنے "P صل" کی طرف لوٹنے دو۔ تاکہ جب وہ تمہارے پاس واپس آئے تو خالص تمہارا ہو کر آئے۔ اس کے دل پہ کوئی بوجھ نہ ہو۔ آنکھ میں کوئی پچھتاوا نہ ہو۔ دل چین اور سکون سے بھرا ہو۔"

اس کی نرم گفتگو اور دل پر اثر کرنے والا لہجہ افسون کے دل پر اثر کر گیا تھا۔ تاہم وہ پھر بھی تذبذب کا شکار تھی۔

"تم کیا کرو گے؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

"کچھ زیادہ نہیں۔ اس کا بھائی دبئی میں ہے۔ اسے یہاں بلاؤں گا۔ سمجھاؤں گا کہ جزا اور سزا کا اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تم ایک انسان ہو۔ ایک بہت اچھے انسان۔ تمہیں درگزر کا اختیار دیا گیا ہے۔ تمہیں اپنے اسی اختیار تک محدود رہنا چاہیے۔" حریر نے گہرا سانس بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"وہ آجائے گا کیا؟ مجھے لگتا ہے۔ رافع سے مختلف ہو گا۔ غصے میں بھرا ہوا۔ نفرت کا مارا ہوا۔ اس کی بیوی نے اسے رسوا کیا۔ اس کے بھائی سے اظہار محبت کر کے۔ وہ کیسے بھولے گا سب کچھ۔" افسون کی آنکھوں میں پریشانی تھی۔ اضطراب تھا۔ رافع کو کھو دینے کا وسوسہ تھا۔ حریر نے اسے تسلی دی۔

"وہ نہ آیا تو میں رافع کو وہاں لے جاؤں گا۔ میں

Downloaded From http://paksociety.com

سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔" حریر کی سنجیدگی نے اسے ایک نامعلوم گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ خوف زدہ سی اپنے بھائی کو دیکھتی رہی۔

"تم رافع افراہیم کو وہاں لے جاؤ گے؟ اگر افراہیم واپس نہ لوٹا تو.....؟" وہ بے چینی بھرے لہجے میں چیخی۔

"یہ تمہارے لیے افراہیم کے جذبات کی آزمائش ہوگی۔ افراہیم کو واپس جانا ہوگا۔ اور تم اسے نہیں روکو گی۔" حریر نے افسون کا ہاتھ نرمی سے پکڑ کر دبایا تو وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔ وہ افراہیم کے لیے قربانی دینے پر تیار ہوگئی تھی۔

اس نے انتظار کی سولی پہ خود کو چڑھا کر اپنی محبت کے کندن بننے تک کی "جدائی" کا سفر آج سے ہی شروع کردیا تھا۔ آج حریر کو بنی چلے جانا تھا۔ اور آج رات ہی رافع نے سارے عذاب اس کے حوالے کر کے اپنا پرانا نمبر آن کرلیا تھا۔ اسے پاکستان میں ایک پہلی اور آخری کال کرنا تھی۔ اس فون کال میں رافع نے اپنی نام نہاد بیوی سے کچھ کہا تھا۔

"میں اس قابل نہیں کہ کسی سے بھی معافی مانگ سکوں۔ لیکن مجھے تم سے ہر صورت معافی مانگنی ہے۔ جو طوق تمہارے گلے میں میرے نفس کی سرکشی اور تمہاری ماں کے جاہلانہ فیصلے کی بدولت لٹکا ہوا ہے۔ اس طوق سے تمہیں رہائی دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی اب تک کی زندگی میں کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہوں..... عنایہ! میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ اس عذاب ناک بندھن سے آزاد کرتا ہوں۔ اس رشتے سے جو میرے اور تمہارے دونوں کے لیے شرمناک ہے۔"

جب وہ روتے ہوئے فون پہ بات کررہا تھا تب۔ افسون اس کے پاس نہیں تھی۔ لیکن اس نے رافع کی ایک ایک بات کو سن لیا تھا۔ اور اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ افراہیم کا یہ انتہائی قدم؟ بعد میں اس کا ایک مرتبہ پھر اسپتال میں داخل ہونا' افراہیم نے یہ فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا تھا۔ اسی دن حریر دبئی فاتح کے پاس چلا گیا تھا۔ اسی رات عنایہ کا انتقال ہوگیا تھا۔

اور پھر اگلے چار دن بعد فاتح کی فون کال نے برسوں کے زنگ اتار دیے تھے۔ اس نے اپنے بھائی کو واپس بلانے کا مژدہ جان فزا سنا دیا تھا۔ اس نے رافع کے اندر سے ہر کانٹا نکال دیا تھا۔

اس رات ہوائی اڈے کے بڑے ہال میں معمول سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ یا اس کی نگاہ کا واہمہ یا گمان؟ اسے تو ہر جگہ ایسا ہی ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس ہجوم سے وہ ہر جگہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس شمال سے لے کر جنوب تک' مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلی وسیع و عریض دنیا میں کیا اس کے لیے تنہائی کا کوئی ایک گوشہ موجود تھا؟ کوئی ایسا ٹھکانہ جہاں وہ اکیلا بیٹھ کر جی بھر کے "اسے" رو لیتا۔ اسے یعنی "عنایہ" کو۔ اور عنایہ کو رونے کے لیے اس کے پاس ایک آنسو بھی نہیں تھا۔ کیوں؟

وہ آج بھی ظہران سے جارہا تھا۔ لیکن افسون سے بھاگ کر نہیں۔ افسون کو بتا کر۔ اور آج وہ اسے ایئرپورٹ ـــ "پکڑنے" نہیں۔ چھوڑنے آئی تھی۔ جہاز اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا۔ افسون اس سے بہت دور رہ گئی تھی۔ اور وہ اپنے روٹھے ہوؤں کو منانے کے لیے افسون کی آنکھوں میں "انتظار" بھر کے جارہا تھا۔ کون جانے رافع افراہیم واپس لوٹا یا نہیں؟

☆ ☆ ☆

یہ جھکے برآمدوں والا گھر تھا۔ سال کے بارہ مہینے اس گھر میں ٹھنڈک ہی رہتی تھی۔ دادی کا یہ گھر ٹھنڈا اور پرسکون تھا۔ اس ٹھنڈے گھر میں مختصر سے افراد تھے۔ دادا' دادی' فاتح' رافع اور عنایہ۔

عزّہ شادی کے بعد اپنی سسرال میں تھی۔ وہ ایک خوش حال زندگی گزار رہی تھی اور کم کم یہاں آتی تھی۔

اس جھکے برآمدوں والے گھر کے پچھواڑے میں ایک عظیم بننے والے موسیقار کا اثاثہ دفن تھا۔ ایسا موسیقار جو اپنے فن میں عروج کمال سے پہلے ہی طبعی

Downloaded From http://paksociety.com

موت مر گیا۔ یا اسے مار دیا گیا۔ اس کے شوق' لگن' جنون کو ختم کر دیا گیا۔

اس کا وائلن' اس کا چھوٹا سا ہارپسی کارڈ' اس کے تخلیق کیے ہوئے نغمے اور اس کی تصویریں۔ وہ کمرہ جہاں پچھلے گیٹ سے آنے والے زائرین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور دادی کو بہت غصہ آتا۔

"استغفراللہ' ساری دنیا کے نکمے اکٹھے ہو گئے۔ اب جانے کس کس کی قبر سے مردوں کو جگائیں گے۔" اور دادا تو ذرا لحاظ نہ کرتے تھے۔ لاٹھی اٹھاتے اور دنگل مچا ڈالتے۔

"میراثی' گویے' ڈوم... میرے گھر میں حرام کام نہیں ہوں گے۔ نکل جاؤ یہاں سے۔" ان کے گیتوں سے نفرت کرتے وقت کے ساتھ رافع سے بھی لپٹ گئی تھی۔

عنایہ کا جنون' اسے کھو دینے کا دکھ جب اسے پاگل کر رہا تھا۔ جب وہ کمرہ بند کیے کئی کئی گھنٹے وائلن پہ اپنی انگلیوں کو زخمی کرتا... تب نانی دروازہ بجا بجا کر تھک جاتی تھیں۔

پھر ایک وقت میں دستک کا انداز بدل گیا تھا۔ رافع چونکا' ٹھٹکا اور کسی طوفان کی طرح اٹھ کر دروازے تک گیا۔ پھر اس نے دروازہ کھولا اور دھاڑ سے بند کر دیا۔

عنایہ اس کی حالت زار پہ رو رہی تھی۔ وہ اس کی مجرم تھی۔ اپنی ماں کی فرماں برداری میں اس نے رافع کا خون کر ڈالا تھا۔ اس کے جذبات کا' اس کے دل کا' اس کی روح کا۔ اس کی محبت کا۔

وہ رافع کے دکھ میں پور پور غرق تھی۔ اور اپنے تئیں اس کے دکھوں اور رستے زخموں کا مداوا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے غلط وقت رافع کو ڈھارس دینی چاہی تھی۔ اس کے زخموں پہ مرہم رکھنا چاہا تھا۔

"سارا قصور ماما کا ہے۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ تمہیں چاہا۔ تم سے محبت کی۔ تمہیں دل میں بسایا۔" وہ ایک خواب کی کیفیت میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور رافع اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

عنایہ کے بال بکھر گئے تھے۔ اس کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔

"یہ کیسی ادھوری چاہت تھی۔ جو تم نے میری آنکھوں کے سامنے فاتح کا گھر بسا لیا۔ مجھے دن رات زخمی کرنے کے لیے۔ تم تو میری تھیں عنایہ۔ پھر فاتح کی کیسے بن گئیں؟" وہ رونے لگا۔ بچوں کی طرح جیسے اس کا من پسند کھلونا چھن گیا تھا۔ جسے وہ دوبارہ حاصل کرنے کے لیے واویلا کر رہا تھا۔

"میں تو اب بھی تمہاری ہوں۔" یہ عنایہ نے کیا کہہ دیا تھا۔ اسے خود سمجھ میں نہ آیا۔ رافع تو پاگل تھا۔ دیوانہ تھا اور شاید وہ کسی نشے میں بھی تھا۔ عنایہ کو خود محتاط رہنا تھا مگر اس میں اتنی عقل نہیں تھی۔

رافع نے اسے کمزور پڑتے دیکھ کر تھام لیا۔ وہ اس کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ وہ رافع کی بانہوں میں تھی اور بے بسی سے رو رہی تھی۔ اس کا دل بند ہونے لگا۔ دماغ بند ہونے لگا۔ وہ فاتح کی بانہوں میں تھی یا رافع کی؟ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی عزت' وقار اور نسوانیت کو کھو چکی تھی۔

اور اسے اس حال میں نہ صرف دادی بلکہ فاتح نے بھی سلاخوں والی کھلی کھڑکی میں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک انتہائی نازیبا صورت حال تھی۔ کوئی انہیں اس حالت میں دیکھ کر کسی بھی نتیجے کی انتہا پہ پہنچ سکتا تھا۔ اور فاتح تو ایسے جیسے کوئی پتھر تھا۔ جس میں جان ہی نہیں تھی۔ یہ دادا تھے جو چلا رہے تھے اور اپنی لاٹھی سمیت رافع کے سر پہ کھڑے برس رہے تھے۔

"بدذات' بدنیت... میرے گھر میں غلط کام کرتا ہے؟ اپنے بھائی کی "عزت" کو روندتا ہے؟ آستین کے سانپ نکل جا... نکل جا۔" دادا پاگل ہو رہے تھے۔ اسے جوتوں اور لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔

"اپنے نیک ماں باپ کے نام پہ ایک دھبہ ہے تو۔ نکل جا بے غیرت۔" وہ اسے گالیاں دیتے اور جوتے مارتے تھے۔ یہ آوازیں آج بھی رافع کو ندامت کے گڑھے میں دبائی تھیں۔ اسے پہروں رلاتی تھیں۔

پھر جب وہ دیا مامی کے گھر سے ہمیشہ کے لیے طوفانی

Downloaded From http://paksociety.com

بارش میں نکل آیا تھا۔ وہ سیدھا نانا کے پاس آیا تھا۔ ان کے قدموں میں گرا تھا۔ ان سے ہر طرح گڑگڑا کر معافی مانگی تھی۔ ساری رات فاتح کے دروازے پہ بیٹھ کر رویا تھا۔ نانی کے قدموں میں گرا تھا۔ نانا کے قدموں میں گرا تھا۔ فاتح سے غائبانہ معافیاں مانگتا تھا۔ مگر "شہر خطا" کے اس خطاوار کے لیے کسی کے پاس معافی کا ایک لفظ نہیں تھا۔

وہ دھتکارا ہوا تھا۔ ٹھوکریں کھایا ہوا تھا۔

اور اس پہ خدائے کریم نے اپنا کرم کر دیا۔ اس کے لیے توبہ کے دروازے کھول دیے گئے تھے۔ وہ جرم کرنے میں اکیلا نہیں تھا۔ عنایہ اپنی بے وقوفی اور لاپروائی میں اس کے ساتھ تھی۔ بیکراں رحمت کی بارشیں افراہیم پہ برسی تھیں۔ کیونکہ وہ ہدایت کا طالب بن چکا تھا۔ دیا اور عنایہ اس سے مستثنیٰ تھیں۔ وہ ہدایت کی طلب گار نہیں تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں ڈوبتے سورج کی شعاعوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پہ فاتح موجود تھا۔ ریلنگ پہ کہنیاں ٹکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔

وہ لوگ تین دن پہلے ڈین ہیگ سے پاکستان پہنچے تھے۔ مدید کو اپنی اکلوتی پھوپھی کی ناگہانی موت کا بہت صدمہ تھا اور عنایہ کے لیے دل بہت دکھتا تھا۔ ابھی کوئی اس کی جانے کی عمر تھی؟

اس کی ماں اب بھی ویسی ہی تھی تیکھی اور روکھی۔ لیکن اپنی زبان کے جوہر یہاں پہ دکھانے سے قاصر تھی۔ رافع بھی کل شام کی فلائٹ سے گھر آگیا تھا۔ اور جب سے آیا تھا۔ تین چار مرتبہ قبرستان کا چکر لگا چکا تھا۔ جہاں پہ ماما اور بابا تھے۔ ماموں، دیا اور عنایہ تھے۔ دل ایسا بوجھل اور ویران تھا کہ کہیں بھی بہلتا نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ دل کو معافی کا سندیسہ ملا اور توبہ نے قبولیت کی معراج پائی تو دل موم ہو کر پگھل گیا تھا۔ اور آنکھوں سے سیل رواں بہنے لگا۔

فاتح اسے زبردستی قبرستان سے واپس گھر لایا تھا اور بیہ نے اسے نیند کی گولی اور چائے پلا کر سلا دیا۔ فاتح اور بیہ کو اندازہ تھا۔ اب وہ جب اٹھے گا تو پہلے سے بہتر ہو گا۔ بوجھل سوچوں سے آزاد ہو گا۔ اور خود کو پہلے کی نسبت ہلکا پائے گا۔

جب دل کا غبار آنسوؤں کی صورت ڈھل جائے تو ساری کدورتیں، رنجشیں، عداوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

فاتح ریلنگ پہ کہنیاں ٹکائے اب اطمینان سے دیا کو سوچتا ہوا اپنے ماں باپ کی گزشتہ زندگی میں کھو گیا تھا۔ جو ماضی کا ایک حصہ تھی۔

اس رات جب بابا گھر چھوڑ کر غصے میں نکل آئے تھے۔

تب بھلا کیا ہوا تھا؟ فاتح سوچنے لگا۔ سوچوں میں ڈوبنے لگا۔

اس رات افراہیم گھر سے نکل آیا تھا اور اب ایک سنسان گوشے میں سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ جانتا تھا۔ وہ گھر میں روبا کے سر پہ کیسا بم گرا کر آیا ہے۔ اور وہ اس صدمے کے زیر اثر ابھی تک ساکت ہو گی۔

اور جب تک اس کے حواس ٹھکانے آتے تب تک افراہیم واپس گھر جا چکا ہوتا۔ اور گھر جانے کے بعد افراہیم اسے سنبھال لے گا۔ اسے روبا کو سنبھالنا آتا تھا۔ مگر ان حالات کو کیسے سنبھالتا؟ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بگڑتے جا رہے تھے۔

وہ سوچتا رہا۔ شروع سے لے کر اب تک۔ روبا کی نہ سمجھ میں آنے والی کیفیات یا بیماری سے شروع ہونے والا سلسلہ، اماں کی موت ... روبا کا دن بدن ذہنی شکستگی کا شکار ہونا۔ گھر سے اکتاہٹ، افراہیم سے ذہنی، جسمانی، روحانی دوری۔ ایک ناختم ہونے والی نحوست کا احساس۔

یہاں آنے سے پہلے وہ ایک اور جگہ پہ بھی گیا تھا۔ کسی سے ملنے اور پھر اس نے اپنے ڈرائیور کے ہاتھ کسی کو پیغام بھی بھجوایا تھا۔ وہ ایک ایک پہلو پہ غور کرتا رہا۔ ایک ایک نکتے کو سوچتا رہا۔

Downloaded From http://paksociety.com

کڑیوں سے کڑیاں ملتی رہیں۔ اور بالآخر اس کا دماغ ایک حتمی نتیجے پہ پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ سوچتا ہوا سیاہ تارکول پہ چلنے لگا۔ آگے جا کر اس نے مین روڈ سے ٹیکسی پکڑلی تھی۔

ٹیکسی ایک پرانے محلے کی ٹوٹی سڑک پر آرکی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور کرایہ لے کر چلا گیا تھا۔

افراہیم نے گہرا سانس بھرا اور تالا لگے دروازے کی طرف دیکھتا نوکیلی باڑ پہ ہاتھ جما کر دیوار پہ چڑھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ دیوار کے پار تھا۔

اپنے پرانے گھر میں ... اپنے باپ کے گھر میں۔ جہاں اماں کی خوشبو تھی۔ اور ان کے پیروں کی آہٹ' ان کے دھیمے قدموں کی چاپ۔ وہ ایک ایک آہٹ کو دل کے کانوں سے سنتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہوتے ہوتے چھلک پڑتے تھے۔

وہ جھاڑیوں اور نوکیلی گھاس میں دھنسے پیر اٹھاتا چیس کے صحن میں چلنے لگا۔ دھول اور مٹی سے اٹا ہوا فرش۔ جگہ جگہ کوڑا۔ پتے' ٹہنیاں' لکڑی کے گٹھے' کاغذ' پلاسٹک کے تھیلے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اندرونی حصے کی طرف آیا۔ ایک ایک کمرہ کھولتے ہوئے وہ عجیب سے احساسات کا شکار تھا۔

اس گھر میں وہ زندگی کے بے شمار ادوار گزار کر گیا تھا۔ بچپن' لڑکپن' جوانی ... اور شادی کے بعد کا مختصر عرصہ۔ وہ روبا کو عروسی لباس میں سجا کر اسی کمرے میں لایا تھا۔ وہ حبس زدہ کمرے کی بند کھڑکیاں کھولنے لگا۔ روشن دان' دروازے کھولے اور بتیاں جلائیں۔ آن کی آن میں پورا گھر روشن ہو گیا تھا۔

پھر وہ اس کونے میں گیا جہاں پہ روبا کی جائے نماز ویسی کی ویسی ہی رکھی تھی۔ کھونٹی پہ تسبیح بھی موجود تھی۔ وہاں ہر کچھ بھی آگے پیچھے نہیں تھا۔

وہ اس کمرے سے نکل کر کچن میں آگیا۔ کچن کے حالات بھی ویسے ہی تھے۔ برتنوں میں چمک مفقود تھی۔ غبار آلود اور گرد میں اٹے۔ اسی کچن میں ایک مرتبہ برسات کے اندر سے سوت کے کیڑے نکلے تھے۔ جنہیں دیکھ کر روبا چلا چلا کر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اور پریشان تو افراہیم بھی بہت تھا۔ پھر وہ تیلے کو پچھلے صحن کی دیوار کے پار الٹ آیا تھا اور اگلی کئی راتیں پریشانی سے سو نہیں پایا تھا۔

پھر وہ چلتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ گرل کے پار گھنا گہری شاخوں والا پیڑ جس کے نیچے کوئی مصلے بچھا کر نماز پڑھتا روبا کو دکھائی دیتا تھا اور اس کے سامنے تیز طوفان میں دیا بھی جلتا تھا۔ تھی ناحیرانی کی بات؟ انسانی عقل سے بہت آگے تک کی؟ اب وہ لائٹیں جلتی چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف آرہا تھا۔ اس نے پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا اور جانے کیا کچھ نہیں یاد آیا تھا۔ روبا کا گیلے کے چھلکے سے پھسل کر گرنا اور شدید تکلیف کی حالت میں موت و زندگی کی کشمکش میں سے گزرنا۔ اور منڈیر سے جھانکتی انادیہ۔ جس کے ہاتھ میں کیلا ہوتا نہ ہوتا منڈیر پہ رکھی ٹوکری سارا راز فاش کر رہی تھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آگیا تھا اور پھر دوسرے ہی پل وہ برابر والے صحن میں تھا۔

اندھیرے میں ڈوبا ہوا مکان کسی وحشت ناک ساحرہ کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

اسی صحن میں اسے تائی چلتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک خاموش اور بے ضرر کردار ... کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو دکھ جھیلنے دنیا میں آتے ہیں اور اسی خاموشی کے ساتھ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

کسی بھی جزا اور سزا کے پیچھے بلکان ہوئے بغیر' کسی بھی نفرت و حسد کے جذبات سے مبرا۔

کتنے قیمتی اور انمول لوگ ہوتے ہیں وہ۔ جو دنیا سے تکلیف کی حالت میں اٹھتے ہیں لیکن آگے ان کے لیے کوئی بھی تکلیف کوئی بھی مشقت نہیں ہوتی۔ آگے ایسے لوگوں کے لیے موتی کے گھر ہوتے ہیں۔ اور سکون سے بھرے میٹھے جام۔

اور اسی گھر میں ایک ظالم اور سنگ دل کردار بھی تھا۔ دادی کا کردار ... ایک بے حس اور سخت دل عورت۔ مہر لگے دل والی عورتیں۔ سنگ دل عورتیں اور ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھی۔ دادی جیسی دادی

Downloaded From http://paksociety.com

کا پرتو شکل ناسمی عادتیں' مزاج' نخوت اور وہی سنگ دلی۔

یہ وہی صحن تھا جس میں اس نے تائی کو بہت دفعہ پٹتے دیکھا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے مار کھاتی تھیں کہ شاید انہیں نہیں کسی اور کو پیٹا جارہا ہو۔

پھر تائی کی وفات اور بعد میں دادی کا انجام؟

دکھ دینے والے خود بھی سکھی نہیں رہتے۔ اگر تائی نے بنا کسی شکوے' انتقام یا بدلے کے آنکھیں چپ چاپ موندلی تھیں۔ تو قدرت نے ان کا انتقام پورا پورا لیا۔ ایک ذرے کے برابر بھی کم یا زیادہ نہیں۔

ویسا ہی سسک سسک کر تنہائی' تکلیف اور اذیت و بیماری کے ہاتھوں رینگ رینگ کے مرنا۔ جس رزق کو دادی نے تائی اور ان کے بچوں پہ تنگ کر رکھا تھا۔ وہ دادی پہ قدرت کی طرف سے تنگ ہو گیا۔ دم آخر تک وہ پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں اتارنے سے قاصر تھیں۔

اگر ہر انسان اپنے انجام کے بارے میں پہلے سے باخبر ہو تو وہ اتنی خودسری اور اکڑ میں کیوں رہے؟

افراہیم نے گہرا سانس بھرا اور ٹارچ کی روشنی سے صحن میں جگہ جگہ پھیلے کوڑے سے بچتا بچاتا کسی ایسی چیز کی تلاش میں ـــــ رہا جو اسے مطلوبہ جگہ تک پہنچا دیتی۔

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی کدال' کھرپی اور بیلچہ بھی تھا۔ جو کہ گھر سے آتے ہوئے ساتھ لایا تھا۔

وہ کچھ دیر کے لیے سوچتا رہا۔ اور پھر کھارے پانی والے نلکے کے قریب آگیا۔ اس کے ساتھ چبوترہ تھا۔ جس کے اوپر مٹی کے بنے چولہے تھے۔ افراہیم کے گھر کی دیوار کے بالکل ساتھ۔

اس نے گہرا سانس بھرا اور کدال کو چولہے کے اوپر مارا۔ ایک' دو' تین اور چوتھی ضرب کے ساتھ چولہے اکھڑ کر دور جا گرے تھے۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ننھے سے گڑھے میں اتاری۔ پھر اس نے ہاتھ مار کر کچھ ـــــ چیزیں برآمد کی تھیں۔ یہ چند تعویذ تھے۔ کچھ کیلیں تھیں اور کچھ غلیظ کترنیں۔

افراہیم کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اس کا آنا بے کار نہیں گیا تھا۔ اس نے چرمی تھیلے میں سارا سامان ڈالا اور مکان کے پچھلے اور کچے حصے کی طرف آگیا۔ ایسی چیزیں یا تو انگیٹھیوں میں دفن کی جاتی ہیں۔ یا آگ جلانے والے چولہوں میں۔

جس سے وہ مل کر آرہا تھا۔ اس نے افراہیم کے ساتھ غلط بیانی نہیں کی تھی کیونکہ وہ ناجو کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور غلط بیانی کی سزا کو بہت اچھے طریقے سے جانتا تھا۔

وہ لڑکا اس کے دفتر میں چوکیدار تھا اور افراہیم کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔ دراصل یہ سارا سلسلہ اس کی گاڑی جلنے کے بعد ہوا تھا۔ اس کے قیمتی نقصان کی اطلاع دفتر میں بھی پہنچی تھی۔ پھر یہ خبر نچلے عملے تک بھی گئی۔ وہیں پہ ناجو کا بھائی بھی ٹھٹک گیا تھا۔ افراہیم کو لگا تھا وہ بہت مرتبہ اسے کچھ بتانا یا کہنا چاہتا ہے۔ ایک دن افراہیم نے اسے اکیلے میں بلا کر پوچھ لیا اور پھر وہ وسیم نامی لڑکا اسے سب کچھ بتاتا چلا گیا تھا۔ اپنی بہن کا لالچ' ناجو کا انادیہ کو جادو ٹونے کی طرف راغب کرنا' انادیہ سے پیسے لے کر کھانا۔ وہ پراسرار عملیات اور تعویذ دھاگے اور آخر میں وسیم نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ منحوس چیزیں کس کس جگہ دفن تھیں۔ افراہیم کا جیسے دماغ کھول گیا تھا۔ غصے' اشتعال اور نفرت کے بھانبھڑ جل اٹھے تھے۔ پھر اس نے اپنے اشتعال اور غصے کو قابو کیا تھا۔ اس نے خود پہ قابو پایا کیونکہ یہ جوش میں بگاڑنے والا کام نہیں تھا۔

یہاں آکر اسے یقین آچکا تھا کہ وسیم نے جو کہا تھا۔ سچ کہا تھا۔ افراہیم وہ سارے ثبوت اکٹھے کرتا رہا جو اسے کسی کے منہ پہ مارنے تھے۔

اماں کا ذہن پسماندگی کی طرف مائل کرنے کا یہ موجب تھا۔ اور ہر چہرے کے اندر روبا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔

اس عمل کے پیچھے یہی بھیانک خواہش پوشیدہ تھی تاکہ اماں روبا سے بدگمان ہو جائیں۔ روبا سے نفرت کرنے لگیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

اسے اپنی ماں کی وہ شکستہ حالت یاد آنے لگی تھی۔
جب وہ چلا چلا کر افراہیم کی منتیں کرتیں۔
"اس منحوس کو نکال دو۔ یہ مجھے مارنا چاہتی ہے۔"
پھر آخری لمحات میں اماں کی التجا... غصہ اور روبا کے لیے شدید بیگانگی۔
"یہ بدبخت ہے۔ جب سے ہمارے گھر میں قدم رکھا۔ بدقسمتی نے ادھر ڈیرہ جمالیا۔" اماں کا چلانا' تکلیف میں کراہنا۔ درد سے بے حال ہو جانا۔ دنیا کے کسی ڈاکٹر' حکیم یا فقیر کے پاس اماں کا علاج نہ تھا۔
افراہیم نے قبر نما گڑھے سے وہ آخری دو الگ الگ دبی چیزیں بھی نکال لی تھیں۔
ایک افراہیم کا اور ایک روبا کا پتلا۔
شقاوت اور نفرت کی اس انتہا پہ وہ ان دونوں کو یہاں دیکھنا چاہتی تھی؟ قبر میں' زمین کے اندر؟ ایسی نفرت؟ ایسا حسد؟ ایسی کمینگی؟ ایسا پچ پن' افراہیم کا سر چکرانے لگا تھا۔ اور وہ بے دم سا زمین پہ دوزانو بیٹھ گیا۔
اور حد تو یہ تھی۔ ان چیزوں کو زمین کے اندر دبانے والی یہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ ان منحوس عملیات کا "اثر" کتنا سخت ہو گا؟ اور ان کی وجہ سے ان دونوں کی جانوں کو بھی کتنا بڑا خطرہ لاحق ہو گا؟ دیا کو عمل کرواتے ہوئے اتنی سوجھ بوجھ ہی نہیں تھی۔
معاً" اس بھوت بنگلے میں باتوں کی بھنبھناہٹ کے ساتھ مردانہ قدموں کی آہٹ قریب آنے لگی۔
افراہیم نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ جانتا تھا وسیم' کاشف کو یہاں لے آیا ہے۔

☆ ☆ ☆

اور زندگی میں ان کے حصے کی خوشیاں' رنگ اور جگنو موجود تھے۔
اللہ نے اپنے ہاتھ میں سارے اختیارات رکھے ہیں.... وہ جانتا ہے کہ اس کے نائب کی اتنی اوقات نہیں۔ اگر ایک بھی اختیار اپنے بندوں کو دے دیتا تو یہ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے اور شام ہونے سے پہلے میتوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ بات تو صرف اتنی تھی زندگی میں پتھروں سے واسطہ پڑے یا پتھر دلوں سے' زندگی کا سفر رکتا نہیں۔ زندگی کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ چاہے انسان کسی دوسرے کے لیے کتنا ہی برا کیوں نہ سوچے۔
کسی کے تلووں تلے انگارے بچھائے یا راہوں میں نوکیلے کانٹے۔ جب تک اللہ نہ چاہے۔ کوئی بھی انسان ایسی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ وقت سے پہلے کسی کو موت دے۔ اسے زندگی سے دور کر دے۔ اس کے اوپر زندگی کی خوشیوں کو حرام کر دے۔
اور وقت افراہیم اور روبا کے لیے ستاروں کی ردا اوڑھ چکا تھا۔
ان کا گھر سکھ' امن' خوشیو اور سکون کا گہوارہ بن گیا۔ افراہیم اور روبا نے ایک سال عمرہ کیا دوسرے سال حج کی سعادت حاصل کی۔ ابا کو بھی ساتھ لے گئے پھر افراہیم نے اپنی ماں کے لیے حج بدل کیا۔
ان کے بچے صحت مند' خوب صورت اور فرمانبردار تھے۔ لیکن روبا اکثر رافع کے لیے پریشان ہوتی تھی۔
جھنجلا بھی جاتی اور افراہیم کی تنبیہہ پہ الجھ بھی جاتی۔
دراصل افراہیم کا یہ بیٹا نانی کے گھر سے بہت ہلا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر رہتا ہی نانی کے گھر تھا اور روبا جانتی تھی نانی کے گھر رہنے کی کیا وجوہات ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی' افراہیم کبھی بھی ایسا نہ چاہے گا۔
رافع بھاگ بھاگ کر نانی کے گھر عنایہ کے لیے جاتا تھا۔ مگر اس کے پیچھے ایک اور وجہ بھی تھی۔ جس دن اس وجہ کا روبا پہ انکشاف ہوا تھا۔ اس دن سے وہ کئی خدشات میں گھر چکی تھی۔
رافع گھر سے بیزار تھا۔ یہ بات درست نہیں تھی۔ رافع' فاتح سے بیزار تھا۔ اصل بات یہی تھی۔ چاہتا تھا کہ اس سے دور ہی رہے اور حتی المقدور کوشش کرتا تھا کہ فاتح اسے دکھائی ہی نہ دے۔
یہ ٹھیک عمل تو نہیں تھا۔
اور ابھی وہ اماں کے گھر سے واپس جا رہے تھے۔
افراہیم جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ روبا اس کے برابر بیٹھی تھی اور پیچھے تینوں بچے تھے۔ روبا جانتی تھی' رافع کا

Downloaded From http://paksociety.com

مزاج خراب ہے۔ وہ اسے زبردستی ساتھ لائی تھی۔ ورنہ آج بھی اس کا موڈ نانی کے گھر میں رہنے کا تھا۔

"ماموں کا ڈرائیور مجھے اسکول ڈراپ کردے گا۔ عنایہ بھی تو اسی اسکول میں ہے۔" اس کی منمناتی خواہش کا گلا گھونٹتی روبا زبردستی اسے وہاں سے لائی تھی۔

اور اب رافع چپکے چپکے روتا سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم غنودگی میں تھا۔

"تیرہ سال کا ہو چکا ہے اور ابھی بچپنا وہی ہے۔" روبا نے محبت سے نگاہ ڈالتے ہوئے اپنا رخ بدل کر افراہیم کی طرف کیا تھا۔ سب سے پچھلی سیٹ پہ فاتح اور عزہ بھی اونگھ رہے تھے۔ بیچ والی پہ اکیلا رافع پھیل کر لیٹا تھا۔ وہ جہاں بیٹھتا تھا یہی کوشش کرتا کم از کم فاتح اس کے ساتھ نہ بیٹھ سکے۔ اور جب فاتح نہ بیٹھتا تو عزہ خود بخود پیچھے ہٹ جاتی۔

روبا کا ذہن رافع میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ اپنے اس بیٹے کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔

"میں رافع کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ فاتح کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔" روبا کی تفکرات میں ڈوبی آواز پہ افراہیم نے گہرا سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

"اور ایک انکشاف نے مجھے شدید پریشان کر رکھا ہے۔" روبا نے اندر ہل کھاتی بے چینی سے تنگ آکر کہا تھا۔ افراہیم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا؟" افراہیم نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ وہ روبا کی بے چینی اور اضطراب کو خوب سمجھ رہا تھا۔

"رافع اپنے بھائی سے حسد کرتا ہے اور مجھے اس چیز نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ افراہیم! ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ حسد کی "چنگاری" کیسے سلگاتی ہے؟ اور کس طرح دلوں اور گھروں میں آگ لگاتی ہے۔ میں اس عذاب سے دوبارہ نہیں گزرنا چاہتی۔" روبا نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ روبا کی بات نے افراہیم کو بھی پریشان کیا تھا۔ وہ ایک دم سوچنے لگا۔ اس کا دھیان بھٹکنے لگا۔ اور اس کے ہاتھ میں اسٹیرنگ لڑکھڑانے لگا۔ بس لمحوں کا کھیل تھا۔ افراہیم کو سامنے سے آتا ٹرک دکھائی نہ دیا تھا۔ ایک زوردار تصادم ہوا۔ اور جیپ لڑکھڑاتی ہوئی ہچکولے کھانے لگی۔

جیپ کے اندر سے بھیانک انسانی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

روبا کو یوں لگا۔ جیسے ہر طرف اندھیرا چھا رہا ہے۔ گھور تاریکی، مہیب سناٹا، اور اس سناٹے کے پیچھے چیخیں تھیں۔ یہ کس کی چیخیں تھیں؟ رونے کی آوازیں؟

روبا کا دم اٹکنے لگا تھا۔ حلق سوکھنے لگا۔ اور کوئی چیز ایسی تھی، جو نم تھی، گیلی سی، بھیگی، جو حلق میں بھر رہی تھی۔ وہ خون تھا۔ اور یہ آوازیں؟ اس نے پہچاننے کی کوشش میں ساری ہمتیں صرف کردی تھیں۔ اور اسے اندازہ ہوا۔ یہ اس کے بچوں کی آوازیں تھیں۔ روبا کی جان پہ بن آئی۔ دم اٹک گیا۔ "میرے بچے! اللہ ان کو سلامت ..." اس نے سیٹ کے اندر پھنسے سر کو اٹھانا چاہا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا یا پھنس گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بس اس نے اذیت کی آخری انتہا پہ اتنا محسوس کیا تھا۔ ایک روشنی کا منبع ہے۔ سفید براق سا، یا پھر کوئی پراسرار وجود۔ سفید لباس میں.... وہ اس کے تینوں بچوں پہ ڈھال کی مانند چھایا ہے۔ وہ کون تھا؟ کوئی محافظ؟ کوئی نگہبان؟ کوئی راہ گیر؟ اور وہ کہہ رہا تھا۔

"خدا اپنے پیاروں کے چراغ بجھنے نہیں دیتا۔"

اور روبا کے دل پہ تسلی کے بادل چھا گئے تھے۔ اس کے اندر سکون اتر گیا تھا۔ اس کے بچے محفوظ تھے۔ اور خدا نے اس کے روشن چراغوں کو بجھنے نہیں دیا تھا۔ اور اس کے بعد روبا کا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆ ☆ ☆

"ماں کو لگتا تھا وہ دیا ماں جیسے حسد کا شکار ہو رہا ہے۔ اگر ماں زندہ ہوتی تو رافع کی منفی سوچوں کو لگام دے ڈالتی۔ اسے پیار محبت اور سمجھاؤ سے سمجھاتی۔ لیکن خدا کا شکر ہے وہ دیا ماں جیسی نفرت کا شکار ہو کر "گمراہ"

Downloaded From http://paksociety.com

ہونے سے بچ گیا۔ اس نے خطا کی اور اس خطا پر شرمندہ ہو کر توبہ کے لیے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اور یقینی طور پر یہ ہماری ماں کی دعاؤں کا اثر تھا۔ ماں کی دعاؤں کے حصار نے رافع کو بھٹکنے سے بچالیا۔ اور توبہ کے دروازے رب کریم نے اس پر کھول دیے۔ مجھے میرا بچھڑا ہوا بھائی مل گیا۔ رافع ہمارے درمیان آگیا۔ ہمارا آشیانہ پھر سے مکمل ہو گیا اور ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی اللہ اپنے چراغوں کو بجھنے نہیں دیتا۔"

ماں کن چراغوں کے ہمیشہ جلنے کی بات کرتی تھی۔ ایک میں یعنی فاتح افراہیم اور ایک میرا نا سمجھ اور جذباتی سا بھائی رافع افراہیم۔"

وہ حریر کے پاس بیٹھا تھا۔ جھکے برآمدوں والی چھت کے اوپر پاس ہی مدید مالٹے چھیل رہا تھا۔

عنایہ اور دیا کے چالیسویں کے فوراً" بعد دادا نے وہ گھر بند کروا دیا تھا۔ اور یہ سب لوگ بیہ سمیت نانا کے گھر میں شفٹ ہو چکے تھے۔ اس گھر میں ایسا کون تھا؛ جس کے لیے ادھر قیام کیا جاتا؛

مدید اور اس کی والدہ بھی یہیں تھیں۔ اس کا ننھیال تو کسی قابل نہ تھا۔ جو انیہ جیسی مہمان کو ٹھہر سکتا۔ انیہ' تائی اور مدید یہاں بہت آرام اور سکون سے تھے۔ ان کی فلائٹ ایک ہفتہ بعد کی تھی۔ تب تک ان کا قیام نانا کے گھر میں ہی تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے۔ مدید تو اس رات ... ہاں اپنی شادی والی رات انیہ سے بدگمان ہو کر اسے سوجان سے ٹھکرا تا ٹیولپ کے کھیتوں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا تھا تو پھر انیہ اور مدید ایک کیسے ہوئے؟

اور یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ انیہ کی "پکار" کو اپنی ٹھوکروں سے اڑا کر ٹیولپ کے کھیتوں کو چیرتی ندی کے کنارے چل رہا تھا۔ اس حال میں کہ مدید کا چہرہ آنسوؤں کی برسات سے بھیگتا تھا اور وہ آستین کو موڑتا اور ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتا۔ آنسوؤں کی دھند اس کے گمنام رستوں کو دھندلائے رہتی تھی۔

معاً" دل میں سلگتے نفرت کے شعلوں میں گھرا مدید کسی آواز پر ٹھٹکا تھا اور پتھر کی ٹھوکر سے زمین پہ جا گرا تھا۔ اس کا ماتھا پتھر کی نوک سے رگڑ کھانے کی وجہ سے پھٹ گیا تھا۔

اسے ہوا کے دوش پہ لہراتی یہ آواز بہت قریب سے آتی سنائی دی تھی۔ کرب و درد میں ڈوبا لہجہ۔ ٹوٹتا بکھرتا اور شکستگی کے احساس میں لہولہان ... یہ فاتح کا لہجہ تھا۔ یہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز فاتح کی تھی۔ مدید جیسے پتھر پہ گرا ہی پتھر آگیا تھا۔

"اس نے میرے بارے میں برا گمان کیا تو کیوں کیا؛ میں اس کی بیوی پہ نظر رکھوں گا؟ میں کوئی اپنے بھائی جیسا مرد ہوں۔ میں کوئی گدھ ہوں؟"

وہ بری طرح ٹوٹ کر رو رہا تھا۔ اسے مدید کی بدگمانی نے توڑ ڈالا تھا۔ اسے مدید کی نفرت نے کرچی کرچی کر دیا تھا۔ وہ لہولہان تھا۔

مدید کو لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر اٹھے اور فاتح کے منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کروا دے۔ وہ اپنا کریہہ روپ فاتح کے الفاظ اور لہجے کے آئینے میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

"کوئی جائے اور اس کم نصیب کو بتا آئے۔ وہ کیوں اپنے دروازے پہ آئی خوشیوں کو ٹھوکر مار رہا ہے۔ وہ اپنا آپ بدگمانی کے برزخ میں کیوں گرا رہا ہے؟ وہ اپنی ماں کے خدشات کو یقین کی انتہا پہ کھڑا کیوں کر رہا ہے؟ حریر! اسے بتاؤ فاتح ایسا نہیں فاتح ایسا بالکل نہیں وہ مدید ہے جو اپنی بیوی کی ایک نگاہ' صرف ایک نگاہ کی گستاخی برداشت نہیں کر سکا۔ صرف ایک پسندیدہ نظر کی ... اور اسے دلہن کے روپ میں دھتکار آیا۔ وہ مدید ہے کم ظرف۔ اپنا ظرف اور دل کشادہ نہیں کر سکا۔ اس کا دل تنگ پڑ گیا۔ اور یہ میں ہوں فاتح۔ جو اپنی بیوی کی بے وفائی کو جان کر بھی نہ اسے دھتکار سکا نہ چھوڑ سکا۔ تو بتاؤ حریر! اعلا ظرف کون؟"

فاتح کی زخم ادھیڑتی آواز مدید کے منہ پہ طمانچوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ مدید دم بخود رہ گیا۔ اس کا دل چاہا وہ بھاگ کر فاتح سے لپٹ جائے۔ اس کے قدموں میں گر

Downloaded From http://paksociety.com

جائے۔ اس سے معافی مانگ لے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔ وہ بے بس پتھر پہ گرا رہا... خود کو ملامت کرتا۔ خود سے نفرت کرتا۔

پھر اچانک ندی کے پانی میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔ مدید کا سر پتھر سے اٹھا اور وہ لمحہ بھر کے لیے دم بخود رہ گیا تھا۔ پانی کی شفاف ابلق سطح پہ کوئی ہیرا بڑی شان سے دمکتا تھا۔ اور بڑی سبک خرامی سے پانی کی موجوں پہ سوار آگے بڑھ رہا تھا۔ مدید نے ایک جھٹکے سے خود کو پتھر سے اٹھایا اور دوسرے ہی پل وہ ہیروں سے دمکتا بریسلیٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔

پھر اس نے آواز کے مخالف سمت چلنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے واپسی کا سفر کرنا شروع کر دیا۔

اسے بالآخر واپس مڑنا ہی تھا۔ پلٹنا ہی تھا۔ اپنے مدار کی طرف' اپنے گھر کی طرف' اپنی ٹھکرائی ہوئی جنت کی طرف' وہ گھر جس کے چوبی برآمدے میں ابھی تک اس کی اجڑی دلہن سر نیہوڑائے اپنے "جرم" کی بھیانک سزا پہ حیران پریشان بیٹھی تھی۔

مدید کو اپنی دلہن کے پاس جانا تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں ستاروں کی چمک بھرنا تھی۔ اس کی خالی سونی کلائی کو روشن کرنا تھا۔ فاتح کا دیا ہوا تحفہ اس کی سندر کلائی میں سجانا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر اپنی ماں کی توہم پرستی' تمام وسوسوں اور خدشات کو غلط کرنا تھا۔ انہیں ایک گڑھا کھود کر ہمیشہ کے لیے اس میں دفن کرنا تھا۔

تاکہ اس کی ماں کو پتا چل سکے۔ کوئی انسان بدبخت یا منحوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے نصیب اور مقدر کا دکھ' امتحان یا آزمائش پاتا ہے۔

یوں مدید ایک گمنام رستے کی طرف بڑھتا رک گیا تھا۔ اپنے گھر اپنی جنت کی طرف پلٹ گیا تھا۔

وہ جنت جو آج بھی اس کے آس پاس بکھری تھی۔ اور اسے فاتح جیسے دوست پہ فخر محسوس ہوتا تھا' جو سوچ کا ہی نہیں' اخلاق اور کردار کا بھی اعلیٰ انسان تھا۔

اور اس وقت فاتح جیسا پیارا انسان اپنی زندگی کی سب سے بڑی الجھن میں گم تھا۔ اور حریر سے اس کا

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت -/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف -/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے ---------- -/350 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- -/500 روپے
6 بوتلوں کے لئے ---------- -/1000 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

Downloaded From http://paksociety.com

سدّباب چاہتا تھا۔ وہ لفظوں کا جادوگر تھا۔ اسے لفظوں کو اپنے من پسند قالب میں ڈھالنا آتا تھا۔

"جانے وہ حسد کی کون سی قسم تھی۔ جس میں مبتلا ہو کر دیا نے دوسروں کی زندگیوں میں چنگاریاں بھریں؟" فالح نے حریر سے پوچھا تھا۔

حریر اٹھ کر فالح کے قریب آگیا۔ مدید اب بھی مالٹوں کے شغل میں مصروف تھا اور عقبی کھڑکی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کھڑکی کے پار اس طرف پلنگ کے اوپر رافع نیم دراز تھا۔ جس طرح مدید کا سارا دھیان حریر کی طرف تھا۔ اسی طرح رافع کا سارا دھیان بھی حریر کی طرف تھا۔ وہ تینوں بہت خاموشی کے ساتھ حریر کو سن رہے تھے۔

"دنیا کا ہر مذہب سب سے پہلے انسانیت کا درس دیتا ہے۔ جو انسانیت کے رتبے سے گرے وہ انسان نہیں، حیوان بن جاتا ہے اور مجھے یہ کہہ دینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ دیا نامی وہ عورت اپنے اندر "حیوانیت" رکھتی تھی اور مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے۔ آپ میں سے ہر کوئی اس کی حیوانیت کو تسکین پہنچاتا رہا۔ اس کی ناجائز خواہشات کو قبول کر کے۔

وہ ہر احساس سے خالی تھی، اس لیے آپ اس سے کسی بھی رحم دلی کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک حیوانی جذبے کے تحت اپنے سے وابستہ ہر انسان کو "زک" پہنچاتی رہی۔ اپنے شوہر اور بیٹی تک کو نہیں بخشا۔ تو پھر باقی رشتے اس کے نزدیک کیا معنی رکھتے تھے؟ اسے جس جس نے تکلیف دی۔ حتیٰ کہ رائی کے دانے برابر بھی اس نے اپنا بدلہ وگنا کر لیا تھا۔

یہ سلسلہ تب سے شروع ہوا جب اس کی حقیقی تائی نے اس کو ٹھکرا کر ایک عام لڑکی کو اہمیت دی اور اسے اپنے شان دار بیٹے کی دلہن بنا کر لے آئیں۔ دراصل اس کے ذہن میں تب سے ہی نفرت و حسد کے بیج نمو پانے لگے تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھ کر تناور درخت بنتے رہے۔ وہ اپنی نفرت میں اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ شاید ہی روبا کے بچے اس کے بد اثرات سے محفوظ رہتے؟ میں ابھی بھی کہتا ہوں۔ یہ جو تم اتنی ٹھوکروں، سانحوں اور حادثوں کے بعد بھی اپنی جگہ پر تن کے کھڑے ہو، صرف اور صرف اپنی ماں کی اچھائیوں، نیکیوں اور دعاؤں کی بدولت۔

جبکہ دیا؟ وہ ایک بد قسمت عورت۔ جس نے پوری زندگی اپنے سے وابستہ رشتوں کو اذیت دی۔ اس کی حکومت کو تب زوال آیا جب اس کا شوہر اپنے بہنوئی کے انکشاف کرنے پر دیا کے اندر کی سڑاند اور شر کو پا گیا تھا۔

تمہارے ماموں نے دیا کو شدت سے چاہا تھا۔ وہ اس کے باطن کا کریہہ روپ نہ سہ سکے اور جلد ہی زندگی ہار گئے۔ اب دیا کے لیے حکومت کرنے اور رعایا پر حکم چلانے کے لیے صرف دو مظلوم کردار موجود تھے۔ اس نے اپنی سلطنت پر تشدد، زدوکوب والا اپنا رعب داب ویسے ہی قائم رکھا اور یوں اپنی من پسند راج دھانی میں مرضی کے فیصلوں سے خوش ہوتی رہی۔

ہاں اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ دھوکا کھا کر عنایہ کی خوشی کا اپنے تئیں اہتمام کرنا چاہا تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے ایک بساط بچھائی۔ آپ سب ایک عورت کی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو گئے اور دیا شاید پہلی مرتبہ عنایہ کی خوشی کا احترام کرتے ہوئے غلط فہمی میں ماری گئی۔ پھر اسے اپنی غلطی کا بڑے غلط وقت میں احساس ہوا۔ وہ ایک مرتبہ پھر غلط فیصلوں کا شکار ہوئی اور اس نے عنایہ کی زندگی میں اپنے لیے نفرت بھر دی تھی۔

عنایہ کی پہلی طلاق کے بعد دیا کے لیے عنایہ کے پاس نرمی، عزت، مان اور فرماں برداری میں سے ایک جذبہ بھی نہیں بچا تھا۔ حتیٰ کہ رحم بھی نہیں۔

وہ دنیا کا بہترین تجزیہ نگار تھا۔ وہ حریر تھا۔ لفظوں کے ریشم بنتا، ادھیڑتا اور مرضی کے معانی نکالتا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا تھا تو ہر طرف بے چینی پھیل گئی تھی۔ بے قرار سا فالح اسے دیکھنے لگا۔ رافع نے پلنگ پہ کروٹ بدل کر اپنے اضطراب کو ظاہر کیا تھا اور مدید کینو کھانا بھول گیا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

معاً" حریر نے دوبارہ ٹوٹے سلسلے کو جوڑتے ہوئے کہا۔

"غلط اور ناجائز فیصلہ کچھ بھی ہو۔ کبھی کامیاب زندگی کی ضمانت نہیں بنتا۔ ایسا ہی ایک غلط فیصلہ میں بھی کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ماں افسہ کا اپنے باپ فوزان مشہدی سے دوبارہ نکاح کروا کے۔ تب مجھے ماں مظلوم لگی تھی۔ لیکن میری بہن افسون نے میرا غلط فیصلہ ماننے سے انکار کردیا تھا اور یوں میں گھر سے نکل آیا۔ یہ میری ناراضی کا ایک اظہار تھا۔ جس کا شاید سب کو خیال ضرور تھا۔ لیکن وہ میری ناجائز خواہش کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔ تب ہی ہماری زندگیاں سانحوں سے محفوظ رہی تھیں۔ غلط فیصلوں کے سامنے ایسے ہی ڈٹ جانا چاہیے۔ ایک دیوار بن جانا چاہیے۔

جبکہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔ عنایہ کی زندگی کا دوسری مرتبہ فیصلہ بھی اس پر مسلط کردیا گیا۔ تب وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ٹوٹ چکی تھی' اس کی بیماری اس فیصلے کے خلاف ایک مزاحمت بن کر اتری اور شاید تب ہی رافع کو بھی اپنی "خطا" کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ ندامت سے سر جھکا کر اپنے خاندان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟

عنایہ کی دن بہ دن بگڑتی ذہنی حالت۔ دیا کی لاپروائی۔ ایک ماں ہونے کے ناتے وہ کسی بھی مقام پر اس کی مسیحا نہیں بنی۔ اس نے بیٹی کا درد بانٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اسے صرف ایک بیماری نہیں تھی۔ اسے صرف حسد اور انتقام کی بیماری نہیں تھی۔ وہ ذہنی طور پر دو بڑی بیماریوں کا شکار تھی۔ سٹیڈ سٹک یعنی دوسروں کو ستانے' ذلیل و خوار کرنے اور ذلت کے عمیق گڑھے میں گرا کر ان پر حکومت کرکے خوش ہونے کی بیماری۔۔۔

اور ٹرو کولنٹ یعنی انتہائی وحشی' انتہائی بے رحم اور انتہائی سنگ دل۔

اس کی ان بیماریوں کا بہت بچپن میں علاج ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ وہ اچھی صحت مند زندگی گزارتی۔ اور نہ خود ایب نارمل ہوتی اور نہ دوسروں کو کرتی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر گہرا سانس بھرتے ہوئے بولا' وہ سب سانس روکے اسے سن رہے تھے۔

"اور رہی عنایہ تو اس سارے قصے میں عنایہ ایک ایسا کردار ہے۔ جو آپ سب کی نگاہوں میں ہی نہیں' بلکہ پوری دنیا کی نظر میں سب سے زیادہ قابل رحم' مظلوم اور معصوم کردار ہوگی؟ آپ سب کے دل میں عنایہ کے لیے ڈھیر ساری نرمی اور ڈھیر ساری ہمدردی ہے۔ کیونکہ بظاہر وہ سب سے زیادہ قابل رحم کردار تھی۔ مگر میری نگاہ میں وہ قطعی طور پر "ہمدردی" کے لائق نہیں۔"

حریر کے ان الفاظ نے ان سب کے اندر بے چینی بھر دی تھی۔ رافع بے قراری سے ایک مرتبہ پھر کروٹ بدلنے لگا۔ فاتح اسے یک ٹک دیکھنے لگا۔

"یقیناً" وہ بہت صابر تھی۔ اپنی ماں کی ہر مار' ہر تکلیف کو چپ چاپ سہہ جانے والی۔ اسے ڈنڈوں کے ساتھ ادھیڑ دیا جاتا' وہ تب بھی اپنی ماں کا ہاتھ نہ روکتی۔ یہاں تک بھی اس کی فرماں برداری سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اپنی ماں کے جوتوں' لاتوں' گھونسوں اور ڈنڈوں کے جواب میں ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا اور ایک بھی آنسو تکلیف کا واویلا کرکے نہ گرانا؟ کیا یہ صبر تھا؟"

صبر بھلا کیا ہوتا ہے؟ صبر کی تعریف میرے سامنے یہ نہیں۔

صبر دو پرہیز گاریوں کا نام ہے۔ یعنی نفس' اعمال نیک اور افعال پسندیدہ پر کاربند ہو۔ ان کاموں کے کرنے میں عمداً" اس سے کوتاہی یا سستی ظاہر نہ ہو۔ میرے نزدیک اپنی ماں سے ظالمانہ حد تک مار کھانے کے بعد "اف" نہ کرنا صبر نہیں تھا۔ وہ کچھ اور ہی تھا۔ کچھ ایسا جو آپ کے ذہن شاید قبول نہ کریں۔

وہ "اذیت پسندی" تھی۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ عنایہ بہت "اذیت پسند" تھی۔ اسے ماں کے دیے دکھ' کرب اور تکلیف سے جو اذیت ملتی تھی۔ وہ اسے نفسیاتی طور پر تسکین پہنچاتی تھی۔

اس نے رافع سے دستبرداری کا فیصلہ تب کیا' جب

Downloaded From http://paksociety.com

اس کی ماں نے اسے پرتشدد انداز میں فاتح کی طرف مائل کرنا چاہا۔ وہ اس تشدد میں انوکھی لذت کو محسوس کرتے ہوئے سر جھکا گئی تھی۔ پھر اس اذیت پسندی کی تسکین کے لیے اور بھی بڑے مواقع تھے۔ جب لوگ اس سے ہمدردی رکھتے اور اس کی ماں سے نفرت کا اظہار کرتے۔ وہ تب بھی بڑی تسکین محسوس کرتی تھی۔

اس نے اپنی کم عقلی میں ایک غلطی کی تھی۔ رافع سے بلاوجہ ہی اظہار محبت کر کے جسے فاتح نے اپنے کانوں سے سنا اور عنایہ کے دادا نے بھی۔۔۔ تب فاتح کے کسی بھی انتہائی فیصلے سے پہلے عنایہ کے دادا اور دادی نے اسے اپنی طرف سے کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرتے دیکھ کر گھر سے نکال دیا تھا۔

عنایہ کے لیے یہ کھلی بے عزتی تھی۔ اس توہین نے اسے نیم پاگل کر دیا۔ وہ دادا اور دادی سے خفا ہو گئی۔ وہ ساری دنیا سے خفا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں سے خفا ہو گئی تھی۔

پھر یکے بعد دیگرے دیا کے بھیانک فیصلے۔ رافع سے عقد ثانی اور عنایہ کی اذیت کا ایک اور سفر۔۔۔ اس نے پھر بھی ماں کو نہیں روکا۔ حالانکہ اس نے ذہنی، روحانی، قلبی طور پر رافع کو قبول نہیں کیا تھا، نہ کرنا تھا۔ پھر بھی اس نے دیا کے سامنے سر نہیں اٹھایا۔ یہ نہیں کہ وہ بہت فرماں بردار تھی۔ یا بہت صابر تھی۔ بس وہ اذیت پسند تھی۔ خود کو تکلیف میں دیکھ کر تسکین حاصل کرتی تھی۔"

حریر خاموش ہو گیا تھا۔ جیسے کہنے کے لیے اس کے پاس اور کچھ نہ ہو۔ تاہم سننے والوں کو بہت کچھ سننے اور زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے میسر آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھر زندگی کا یہ سفر رکا نہیں۔ آگے بڑھتا گیا۔ آگے چلتا گیا۔

فاتح اپنی فیلڈ میں ترقی کرتا رہا اور رافع فاتح سے بھی بہت آگے نکل گیا۔ اس نے حریر کی گفتگو کو اپنے لیے زادِ راہ تصور کیا اور کامیابی کے سفر پہ نکل کھڑا ہوا۔

اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اسلامک لاء میں بڑا نام کمایا۔ پی ایچ ڈی کی اور وہ دھیرے دھیرے زینہ بہ زینہ آگے بڑھتے مذہبی اسکالر بن گیا۔

پھر اس نے اپنے آبائی گھر کو گرا کر ایک عالی شان قرآن اکیڈمی بنائی اور زندگی کے اس سفر کو اپنے اور اپنے ماں باپ کے لیے رحمت اور جنت کا نمونہ بنا دیا۔

گزرتے سالوں میں نانا نے فاتح اور بیہ کی شادی کر دی تھی۔ وہ ایک بھرپور ازدواجی زندگی گزار رہے تھے اور ان کے پیارے سے بیٹے کو دیکھ کر رافع کی ساری تھکن اتر جاتی تھی۔ محمد ولی اپنے باپ سے بڑھ کر چچا کا لاڈلا تھا۔

مدید ڈین ہیگ میں ٹیولپ کی پیداوار کا سب سے بڑا کاشت کار بن چکا تھا۔ ایک بیٹی اور بیٹے کے ساتھ اس کی زندگی مکمل اور بھرپور تھی اور مدید خود آج بھی فاتح کے لیے اتنا ہی دیوانہ تھا۔

ان کی زندگیاں ہر قسم کے آسیب سے پاک ہو چکی تھیں۔ آسیب وہ نہیں ہوتا، جو گرہوں میں پھونکوں کے ذریعے انسانوں پہ مسلط کیا جاتا ہے۔ بلکہ آسیب انسانوں کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ جب وہ انسانیت کا لبادہ اتار دے تو خود بخود آسیب میں ڈھل جاتا ہے۔

کبھی دیا نے سوچا تھا۔ وہ افراہیم اور اس کے بچوں کا نام و نشان مٹا دے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی ہزار سفلی چالوں کے باوجود۔۔۔ روبا اور افراہیم اپنی زندگی اور وقت پورا کر کے مرے۔۔۔ کہ ہر انسان اپنے وقت مقرر سے آگے پہلے نہیں جا سکتا۔ دیا کے لاکھ برا چاہنے کے باوجود روبا کے گھر کے چراغ روشن تھے۔ انہیں کوئی بھی طوفان بجھا نہیں سکا۔ بلکہ ان چراغوں کی روشنیوں سے دور، دور تک چراغاں ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اور خود دیا کا اپنا نام و نشان مٹ گیا تھا۔

اس نے جو قبر افراہیم اور روبا کے بچوں کی خاطر ان کے لیے برا سوچ کر کھودی تھی۔ اس میں وہ خود بھی گری اور اس کی بیٹی عنایہ بھی گری۔

اگر انتقام لیا تو انتہاؤں پر جا کر، اگر اپنے شوہر کو

Downloaded From http://paksociety.com

تکلیف دی تو انتہاؤں پر جا کر' اگر اپنی بیٹی کو اذیت سے دوچار کیا تو انتہاؤں پہ جا کر۔ وہ ایک انتہا پسند عورت کی اذیت پسند بیٹی تھی۔ ان دونوں ماں' بیٹی میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز تھی شدت پسندی۔ ماں نفرت کی انتہا تک شدت پسند تھی۔ عنایہ اذیت کی انتہا تک شدت پسند تھی اور ان دونوں ماں' بیٹی کی اس شدت پسندی نے انہیں اپنی ہی کھودی قبر کے گڑھے میں اتار دیا تھا اور حریر فاتح کو نہ بھی بتاتا تو وہ تب بھی جان گیا تھا۔ عنایہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود پس منظر میں تھی۔ بیہ اپنی کسی بھی کوشش کے بغیر صرف نیکی' اچھائی' صلہ رحمی اور حلیم قلبی کے باعث آج بھی منظر پہ تھی اور فاتح کے دل میں بھی اور یہی بیہ کے صبر کا صلہ اور قناعت پسندی کا پھل تھا۔ وہ ایک صبر کرنے والی ماں کی بہت صابر بیٹی تھی۔ اس نے اپنے تمام تر صبر کا ثمر پالیا تھا اور وہ رافع افراہیم تھا۔ ایک ان دیکھی بدنامی کا طوق لیے نگر نگر بھٹکتا اور دھکے کھاتا۔ وہ جو راندہ درگاہ تھا۔ خدا نے اسے تھام لیا۔ اسے عزت' علم' حلم اور مرتبے سے سرفراز کیا۔ اسے دین و دنیا کا علم دیا۔ اس کے آبائی گھر میں خدا کی رحمتوں کا بیکراں نزول تھا۔ اور اسی گھر کی نئی تعمیر شدہ بلڈنگ کے ماتھے پر اس کے باپ کا نام چمکتا تھا۔ یہ چراغ روشن تھے اور رافع کی زندگی کے بعد بھی روشن ہی رہتے۔ پھر ایک دن ظہران سے سنہرا کارڈ رافع کے پتے پہ پہنچا تھا۔ یہ شادی کی تقریب سعید کا کارڈ تھا۔ مدید تو اپنے خاندان کے ہمراہ ظہران پہنچ بھی گیا تھا۔ اسی سنہرے کارڈ کے ساتھ رافع کے لیے ایک نامہ بھی تھا۔ اسی مہربان پری کے ہاتھ سے لکھا ہوا۔ محبتوں کے قافلے تو ماہ و انجم کی منزلوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بغیر رکے اپنے مدار میں چلتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی پڑاؤ نہیں ہوتا۔ ان کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سفر' محبت کے مسافروں کے نصیب میں ازل سے لکھا ہے۔ انہیں رکنا نہیں' چلتے چلے جانا ہے۔ یہ نامہ رافع سے پہلے فاتح کے ہاتھ لگا تھا۔ اس نے نہ صرف نہایت عقیدت سے پڑھا' بلکہ اس کا جواب بھی لکھ کے بھیج دیا تھا۔ ''ہم معزز میزبانوں کو تکلیف سے دوچار کرنے عنقریب پہنچ رہے ہیں۔ شہزادی افسون جان! خاطر جمع رکھیے۔ اور اپنے باوا کے محلوں کو بھول جائیے۔ ہمارا رافع گھر داماد بننے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ آپ کو اپنی سسرال' یہ نفس نفیس تشریف لانا ہی ہوگا۔ رافع کی بے رنگ زندگی میں رنگوں کو آنا ہی ہوگا۔ آخر افسون جاں نے رافع افراہیم کو پانا ہی ہوگا۔'' نامہ خوشبوؤں میں لپٹا ظہران کی فضاؤں میں تیرتا اسے مژدہ جاں فزا سنا چکا تھا۔ افسون جان پہ مبارک باد کا فیضان آچکا تھا اور آج رافع افراہیم بڑے دنوں بعد مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ پہ ریگستانوں میں شگوفے کھلتے تھے اور افسون جان کی بحیرہ اسود کے کالے پانیوں جیسی آنکھوں میں سفید کنول تیرتے تھے۔ وہ اپنی قرآن اکیڈمی کی ذیلی سڑک پر جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسرور سا گھر کی طرف جا رہا تھا اور یہیں کہیں ایک پاگل سی عورت پتھروں کو اٹھاتی اور جھولی میں بھرتی آتی جاتی بھاگتی۔ رافع اسے اکثر تاسف سے دیکھتا اور نگاہ پھر اجاتا تھا۔ وہ کبھی برہنہ ہوتی اور کبھی کسی بھیس میں لپٹی۔ وہ ناجو تھی۔ جو ''شہر خطا'' میں اپنے سیاہ گناہوں کی سزا بھگتتی پتھروں سے جھولی بھرتی سڑکوں پر اندھا دھند بھاگتی تھی۔ بھاگنا اس کے مقدر میں لکھا گیا تھا۔

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From http://paksociety.com

میمونہ صدف

جل پری

وہ ایک ایسا ہی قہقہہ' ایسی ہی ہنسی تھی جو کبھی اس در و بام کا مقدر مانی جاتی تھی اور پھر سالہا سال وہاں نہ گونجی تھی۔ اور اب گونجی تو ــــــ تو سب ہی چٹخنیاں گرا دی گئیں' بوہے باریاں کھول دیے گئے کہ وہ ہنسی ہر اور گردش کرتے ہوئے ہر گوشے میں سما جائے... کہیں تو قید ہوتی' ٹھہر جائے۔ اور اس لیے بھی کہ سب جان لیں کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا...؟

عمو جان ٹوٹے عدسے والا چشمہ جمائے چھت سے جھانکنے لگے تو بڑے بھیا مسواک چھوڑ کر غسل خانے سے باہر نکل آئے۔ سویرا بھابھی گھی کے ٹنے ہاتھ لیے برآمدے میں آکھڑی ہوئیں۔ باہر چاٹی میں سے مکھن نکالتی تائی کے ہاتھ تھمے تو ننھی اماں کے گھٹنے میں سر دیے دبک گئی... اور اماں' انہیں تو جیسے بیٹھے بیٹھے لقوہ ہی ہو گیا... انہیں یقین کرنا مشکل ہو گیا۔ یقین تو اس کچی نیند سے ننگے پیر بھاگنے والے چاند کو بھی نہیں ہوا تھا' جس کے دائیں پیر میں سوئی چبھنے کے سبب خون کی لکیر برآمدے سے صحن تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ اور وہ بڑی فرصت سے اس قہقہے والی کو دیکھنے کھڑا تھا۔

راجہ بازار کے پرانے محلے کی اینٹ سے اینٹ جڑی ہوئی تھی' کتنوں نے سر ـــ نکال دیکھا' کتنے چوبارے چڑھ کر جھانکنے کھڑے ہوئے۔ اس نے آخری بار تب وہ قہقہہ سنا تھا جب وہ لڑکپن کے آخری زینے پہ کھڑا تھا یا شاید اس سے پچھلے زینے... بات پرانی تھی مگر اتنی پرانی بھی نہیں تھی کہ اسے ٹھیک سے یاد نہ رہتی۔ میٹھا ماضی خرد ماغوں کو بھی خوب یاد رہتا ہے۔

دو چٹیاں بنائے' ربربینڈ سے گول مول کر کے انہیں اوپر ٹکائے' دوپٹا ایک کندھے سے لا کر کمر پہ کسے' گھٹنوں تک آتی قمیص اور پٹیالہ شلوار پہنے وہ چھت پہ چڑھی اس کی پتنگ اڑاتے ہوئے' بلا مبالغہ آس پڑوس کی کوئی دس پتنگیں تو کاٹ چکی تھی... اور گیارہویں پتنگ کاٹنے پر اس کے حلق سے قہقہہ بلند ہوا اور اس نے ازخود اپنی پتنگ کو ہوا کے سنگ اڑنے کے لیے چھوڑ دیا۔

چاند نے گڈی اُڑاتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا... خالصتاً "بھائیوں والی گھوری..."

"باز آجا... مت یوں چھتوں پہ چڑھ کر ہنسا کر۔"

اور پری پہ ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ بری آوازوں سے بری ترین گدھے کی آواز۔ جس سے پناہ مانگتے تعوذ پڑھا جاتا ہے تو پری کی ہنسی بھی تعوذ پڑھنے لائق تھی۔

"لو پڑ گیا پھر سے ٹھٹھے کا دورہ بھاگوں والی کو..."

تائی نے نیچے سے ہی آواز لگائی تو وہ منہ پر ہاتھ رکھے' ہنسی کے مارے دہری ہوتی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ جتنی چاند کی گڈی اوپر کو اٹھی' اتنا پری نیچے کو جھکی۔ گڈی نے عرش کو چھوا تو پری نے فرش کو۔ پھر چاند نے ہی گڈی کاٹتے اور اسے اٹھاتے ہوئے نیچے کا رخ کیا۔

"اب کے نہ جائے یہ اوپر..." چاند نے کچھ غصے سے اسے لا کر چارپائی پہ پٹخا۔

"تجھے ہی شوق ہوتا ہے اسے اوپر لے جانے' چھت پہ چڑھانے اور گڈی اڑوانے کا۔" تائی اسی پہ پل پڑیں۔ جواباً "وہ کان کھجانے لگا۔

"اسے چھوڑ جاؤں تو لگتا ہے کہ آدھا اوپر اور آدھا نیچے رہ گیا ہوں۔" اور چاند کی بات پہ وہ پیٹ پکڑے' وہیں چارپائی پہ ہی ہنستے ہوئے گول مول سی ہو گئی۔

اور اس لڑکپن سے بھی پیچھے کچھ قدم رکھو تو بچپن

Downloaded From http://paksociety.com

آتا ہے۔۔۔ مسکراتا، بانہیں پھیلا کر، سر جھکا کر خوش آمدید کہتا، اپنے پر اٹھاتا۔ ان میں چھپے دو عم زاد اور دو ماں جائے دکھاتا ہے، کل ملا کر تین لڑکے اور ان تینوں کے مابین وہ لڑکی نما لڑکا۔ ان ہی جیسی پتلون قمیص پہنے، بال انگلی کی پور برابر کٹوائے، سر پہ ٹوپی جمائے، پیروں میں کھیڑیاں چڑھائے۔۔۔ تنگ گلی میں بلا گھماتی، سب کے چھکے چھڑاتی، گیند کراتی، کنچے اچھالتی، چھتیں پھلانگتی وہ "پیان" عرف "پری" تھی۔

ان تین لڑکوں سے بھی بڑھ کر لڑکا، جو لڑکا بن کر دکھانے میں کوئی کسر چھوڑ بھی دیتی تو ابا یہ کہہ کر پوری کر دیتے کہ اس گھر میں چار بچے ہیں۔ تب ہی اماں تصحیح کرتیں، تین بچے اور ایک بچی۔ تو وہ جو ابا کا بچہ اور اماں کی بچی تھی، وہ چاند کی جڑواں اور اس سے پورے دو منٹ چھوٹی تھی، جسے وہ تمغے کی طرح سینے سے لگائے گلی گلی پھرتا تھا۔ جو چاند کی دیکھا دیکھی میں آتی ہوں کو "میں آتا ہوں" کہا کرتی۔ کود کر اس کی سائیکل پہ سوار ہو جاتی اور اس کے ساتھ پورے راجہ بازار کی سیر گولا گنڈا چوستے، ریوڑیاں کھاتے، پان چباتے، کیا کرتی۔

اماں کی سلائی کے لیے ڈوریاں، بٹن، نلکیاں خریدی جا رہی ہیں تو تائی جی کے لیے مسالے، پراندے اور چھلے۔ اپنے لیے کبھی اردو بازار سے کتابیں تو کبھی عمو جان کے لیے بوہری بازار سے دواؤں کی شیشیاں، اور ہوا کے سنگ سائیکل اڑاتی، وہ واپسی کا سفر چاند کو پیچھے بٹھا کر طے کرتی۔ گھر پہنچنے سے پہلے وعدے کم وعیدیں ہوتیں کہ اگر کسی کو پتا چلا کہ وہ سائیکل چلاتے بھرے بازار میں سے گزر کر آئی ہے تو وہ پھر اس کی شکل کو ترس جائے گا۔ اور چاند بھلا جھلا تھا کہ کسی کو بتا کر اس کی شکل کو ترستا۔ وہ اس کا دم چھلا تھا تو وہ اس کی دم چھلی۔ اماں لاکھ منع کرتیں کہ مت اسے بازار لے کر جایا کر، مگر مہینے میں ایک آدھ چکر تو لگ ہی جایا کرتا تھا۔ اور تائی برملا کہتیں۔

"آوارگی کا سایہ پڑ گیا ہے اس بھاگوں والی پر۔"

لڑکپن سے دو ہاتھ آگے بڑھی تو اماں نے دو دھموکے اسے جڑے اور تین چاند کو اور زبردستی اسے گھر بٹھایا۔ شرٹ پتلون سے قمیص شلوار تک گھسیٹ کر لائیں۔ انگلی پور برابر بال پھر شانوں کو چھونے لگے۔ اور سر پہ موجود ٹوپی کو دوپٹے نے ہٹاتے ہوئے اپنی جگہ بنا ڈالی۔ "میں آتا ہوں۔" سے "میں آتی ہوں۔" کا سفر تمام ہوا تو کہیں جا کر پیان عرف پری اماں کو اچھی لگی اور تائی کو بس گزارے لائق۔

گھر تو بٹھا ڈالا مگر چھت کی خالی منڈیر پر چڑھنے کی پابندی کیسے عائد کرتیں۔ بھائیوں کے ساتھ چھت پہ چڑھنے سے بھلا کون روک پاتا اسے۔ اماں دانت نکوستی رہ جاتیں۔

"کوئی لڑکی ایسے اپنے بھائیوں کے ساتھ چھت پر چڑھی دیکھی ہے کبھی؟"

اور وہ ماں کی بات پہ ہنس ہنس کر دہری ہوتی سر نفی میں ہلا ہلا کر کہتی۔ "کبھی نہیں اماں جی، کبھی بھی نہیں۔ لڑکیاں کیوں اپنے بھائیوں کے ساتھ چھت پہ چڑھنے لگیں؟ وہ تو دوسروں کے بھائیوں کے ساتھ

Downloaded From http://paksociety.com

چڑھتی ہیں نا اماں۔" اور اماں کی تو آنکھیں ابل سے کر باہر آنے کو تیار ہو جاتیں اس بات کو سنتے ہی۔

"تو یہ سب دیکھتی ہے اوپر جا کر؟ اور تیرے بھائی؟"

"وہ سب بھی تو دیکھتے ہیں نا اماں! تو کیا میں نہ دیکھوں؟"

"وہ لڑکے ہیں؟"

"لڑکے ہیں یا بے حیا ہیں؟"

"بھائیوں جیسی نہیں بننا تجھے... سمجھی...؟"

اور وہ معصومیت سے سر ہلا کر دہرا دیتی "بھائیوں جیسا نہیں بننا مجھے۔"

پھر چاند کتنی بار اسے بلانے آیا مگر وہ نظریں چرا کر اماں کو تکتی جو ایسے میں بس چولہے چڑھی ہنڈیا کو تکا کرتی تھیں۔

"چل نا پری!" چاند اسے کھینچتا۔ کم بخت چاند بھی نا کھینچنے کی فطرت سے نہ باز آیا کبھی۔ آسمان پہ ہو تو جہاں کو کھینچے اور چھت پہ ہو تو پیاں کو "تیرے بغیر میں ادھورا ہوں۔"

"جا میرے بھائی' چاند پورا ہی اچھا۔" آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔

"تو گڈی نہیں اڑائے گی اب؟" وہ تعجب سے سوال کرتا۔

"میں گڈی تھوڑا ہی اڑاتی تھی' میں تو خود ڈور سنگ اڑتی تھی... اب میری ڈور کسی اور ہاتھ میں تھمادی گئی ہے اور وہ مجھے اڑانا نہیں چاہتے۔"

✲ ✲ ✲

اماں اور تائی کی بدولت بھائیوں سے قربت بتدریج کم ہونے لگی تو کتابوں سے بڑھنے لگی۔ پھر اسکول کے بعد کالج جانے کی ضد پکڑلی۔ کالج' جس کی شکل کبھی بھائیوں تک نے نہ دیکھی تھی' وہ وہاں جانے کی ضد کرنے لگی۔ ابا اور عمو جان موتی بازار میں گوٹے تلے کے کام سے وابستہ تھے اور ایسی ہی ایک دکان پرانے قلعے میں بھائیوں کو بھی کھول دی' جسے تینوں مل کر سنبھالتے۔

"لڑکیاں کہاں پڑھتی ہیں اتنا...؟"

"تعلیم کی کب سے صنف ہوگئی؟ مرد اور عورت سب پر فرض ہے۔ دونوں مہد سے لحد میں اتریں گے تو بھی سیکھتے ہوئے اتریں گے۔ مجھ تک تو یہی بات پہنچی ہے۔ کیا آپ تک صرف مردانہ حصہ آیا؟"

"تعلیم کا سایہ پڑ گیا ہے بھاگوں والی پہ..." تائی کا منہ بنا۔

"تعلیم کا سایہ پڑے تو بھاگوں والی ہی ہوئی نا پھر..."

"تیرے بھائیوں نے کب اتنا پڑھا...؟" اماں نے ناگواری سے دیکھنے کی حد ہی کردی پھر۔

"خود تو کہا تھا کہ بھائیوں جیسا نہیں بننا۔ اب بھائیوں جیسا بنا رہی ہو۔"

"لوگ تھو تھو کریں گے کہ بسم اللہ کلاتھ والوں کی لڑکی نے پڑھنا شروع کردیا اور بھائی ان پڑھ رہ گئے۔"

"تھو تھو اس پہ نہ کریں جو نہ پڑھے' اس پہ کریں جو پڑھے۔ پھر تو ایسوں کو بھی پڑھنے کی ضرورت ہے۔"

"بڑی سبکی ہوگی۔" تائی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"جاہل رہتے سبکی نہ ہوئی' عالم ہوتے سبکی ہونے لگی۔"

اور اس بحث کا اختتام ابا پہ ہوا کہ جہاں تک پڑھائی جائے گی' پری وہاں تک اڑ کر جائے گی۔ اماں کو اگلی فکر نے گھیرا کہ پڑھی لکھی لڑکی کے لیے پھر ایسا بر کہاں سے آئے گا؟ کون بتائے گا' گھر تک کون لائے گا؟

"آجائے گا' پری کے لیے تو کوئی شہزادہ آئے گا بابو سا روپ دھار کر۔"

ابا اسے شاید سچ مچ کی پری سمجھ بیٹھے تھے کہ اس کے لیے کسی شہزادے کے خواب سجانے لگے۔ سو وہ ابا کی اجازت سے کالج جانے لگی۔ پیان سے کیا پیان ابا نے نبھایا' تو پری نے بھی پری ہونے کا حق ادا کرتے اڑ کر کتابوں کے صحراؤں میں ساربانوں کے ہمراہ رخت سفر باندھا۔ وہ سفر جس پہ ابا نے بڑے مان سے' من لگا کر کہا تھا کہ جہاں تک تعلیم جائے گی وہاں تک پری اڑ

Downloaded From http://paksociety.com

کر جائے گی۔ سو اسے ایک ایسی دنیا میں پرواز بھرنے کی اجازت بنا ڈور کے دے دی گئی جس کا کوئی انت نہ دیکھا نہ سنا۔۔۔ علم مزرع حیات علم مزرع موت۔

بس انت ہی ہوا پھر۔۔۔ ابا کی روح نے آسمان میں جاتے جاتے اسے اڑتے دیکھا' آنسو بہائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی پر کاٹے اور اسے واپس زمین والوں میں بھیج دیا۔۔۔ اور بنا بال و پر کے پری زمین پر مار دی گئی۔ علم کے پھوٹتے سوتے خشک سالی میں بدل گئے۔ پیمان ابا نے کیا تھا عمو نے نہیں کہ نبھایا جاتا۔ ابا نہ رہے تو پیمان کہاں باقی رہنا تھا؟ اور سچ میں پیمان کو لگا اب وہ باقی نہیں ہے۔

"یہ پڑھائیوں کے چونچلے اپنے گھر جا کر پورے کرنا اب۔" تائی نے زبان اور سر دونوں ہلائے اور اس نے نہ زبان ہلائی نہ سر۔ ابا کے بعد بھائی بیاہ دیے گئے اور وہ الگ ہوتے گئے۔ بھرا گھر سونا ہونے لگا۔ صرف ایک چاند کنوارہ رہ گیا اور ایک وہ۔

وہ سرخ رنگ پہنتی تو اماں کہتیں۔۔۔ "کنواری لڑکیاں سہاگنوں والے رنگ نہیں پہنتیں۔۔۔" وہ لاج رنگ اوڑھ کر لال رنگ اتار دیتی۔

وہ شادی بیاہ پہ میک اپ کرتی تو تائی رگڑ رگڑ کر منہ دھلوا دیتیں۔۔۔ "کنواری لڑکیاں یوں بنتی سنورتی نہیں ہیں۔۔۔" اس روز کے بعد وہ کبھی نہ بنی نہ سنوری۔۔۔ وہ کالا رنگ پہنتی تو تائی ڈپٹنے لگتیں۔۔۔ "کنواری لڑکیاں ایسے ماتمی رنگ نہیں پہنتیں۔"

اور وہ اماں تائی کی شکل دیکھتی رہ جاتی کہ کنواری لڑکیاں پھر کرتی کیا ہیں۔۔۔؟ ان کے لیے ہر بات میں "نہیں ہے تو" "ہاں" کس بات میں ہے؟

"پتنگ اڑائے گی۔۔۔؟" چاند دکان سے لوٹتے ہی اس کی کلائی تھام کر اسے کھینچنے لگتا۔

"اماں مجھے ڈانٹیں گی' وعدے وعید یاد کرائیں گی۔" اور چاند اس پہ چپ اوڑھ لیتا اور پری دکھ۔۔۔ پھر ایک کے بعد ایک رشتہ ٹھکرایا جانے لگا۔

"چودہ پڑھی لڑکی کو کسی کم پڑھے سے کیسے بیاہ دوں۔۔۔؟" اماں ابا کی بات پہ خود قائم ہو گئیں۔ تعلیم بھلے وہاں تک نہ گئی ہو مگر شہزادے کا انتظار تو اماں کو سوتے سے اٹھانے لگا۔

گھر میں رہتے کام ہی کتنے تھے بھلا۔۔۔؟ دو گھنٹے کم اور بس کام ختم۔۔۔ وہ کام نبٹاتی اور پھر سارا دن دل بہلاتی۔ دل بہلانے کو بھی کچھ چاہیے ہوتا ہے' کوئی بندہ' کوئی مشغلہ۔ اور وہاں نہ بندہ ٹھانہ ہی کوئی مشغلہ۔ فراغت ایسی ملی کہ بستر سے جا لگی۔ پہلے درد شقیقہ رہنے لگا' پھر گردے کا درد۔۔۔ ٹیسٹ کرائے گئے تو سب ٹھیک تھا۔ تائی اور اماں سارا دن بستر پر پڑی پری کو آوازیں لگاتی رہتیں۔

"پری بستر سے اٹھ جا' تھوڑا چل پھر لے۔" وہ اٹھ جاتی' چل پھر لیتی۔

"پری جھاڑو لگا دے۔" وہ جھاڑو لگا دیتی۔

"پری' آٹا گوندھ کر روٹیاں بنا دے۔" وہ آٹا گوندھ کر روٹیاں بنا دیتی اور باورچی خانہ صاف کر کے اپنی پرانی کتابوں کو کھولتی' انہیں دماغ میں گھولتی۔ پرانی کتابوں کا پرانا سبق نیا سمجھ کر دہراتی' رٹے لگاتی رہتی۔

"پری کبھی ہنس بھی دیا کر۔" اور بس اماں اور تائی کا کہا گیا ایک یہ کام ہی اس سے نہ ہو پاتا۔

"کچھ تو میری مرضی کا بھی ہو' اداسی ہی سہی۔" پھر درد شقیقہ نے ایسا جکڑا کہ وہ بستر کو محبوب ٹھہری اور تائی اٹھتے بیٹھتے کہتیں۔۔۔ "ایسی بیمار لڑکی کو کون بیاہنے آئے گا؟"

"شہزادہ نما بابو۔۔۔" اماں' ابا کی بات دہرا کر رو دیتیں۔ بات کو کھوں چڑھی تو آتے رشتے بھی جاتے رہے۔ اب نخرے ادھر سے نہیں' ادھر سے ہونے لگے تھے۔ دم' درود' طبیب' حکیم' تعویذ سب کو دیکھا مگر افاقہ نہ ہوا۔

پھر چاند ہی ضد کر کے اس کے سارے ٹیسٹ کرانے لے گیا۔ ٹیسٹ بھی ٹھیک رہے' بس وہی ٹھیک نہ رہی۔۔۔ ڈاکٹر نے صاف کہا "دماغی دباؤ ہے۔ اس کی شادی کر دیں۔" رات گئے وہ اماں کے پیر دابنے لگا۔

"اماں پری کی شادی کر دیں۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

Downloaded From http://paksociety.com

اماں حیران ' پریشان۔ "یہ کہاں کی سوجھی؟ اور کس سے کرے گا اس کی شادی؟"

"سلیم کیسا رہے گا؟ قدر دان ہے ' خوش رکھے گا۔" اماں سے رائے مانگ کر اپنی رائے دی۔

"وہ کالا بجنگ۔"

"سانولا ہے ' کالا نہیں۔۔۔"

"کم پڑھا لکھا۔۔۔ پری بی اے ہے۔" اماں نفی میں سر ہلانے لگیں۔

"بی اے ہے ' سی اے نہیں۔ اماں! کسی روز ذہنی دباؤ سے دماغ الٹ جائے گا پری کا۔" اور دماغ تو اماں کا الٹا پھر ' زارو قطار رونے لگیں۔

"میں سلیم کو ہاں کر رہا ہوں۔" اور دروازے پہ کھڑی پری وہیں سے پلٹی۔ چاند ———————

اس کے پیچھے تھا۔ وہ اس کے پیچھے چھت تک آیا تھا۔

"جس نے پہلی سانس بانٹی ہو ' اس پہ گمان ہوتا ہے کہ وہ آخری آس بھی بانٹے گا۔"

"تو شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"پہلے مرض کی تشخیص تو کر لی ہوتی۔" وہ شاکی نظروں سے ماں جائے کو تک رہی تھی۔

"سلیم تجھے پڑھائے گا۔ اس نے پیمان باندھا ہے۔"

"ضرور باندھا ہو گا پیمان ' پیمان کا کام ہی بندھ جانا ہے۔ چاہے یہاں بندھے یا وہاں۔۔۔" چاند نے ہاتھ اس کے سر پہ دھر دیا۔ نہ وہ ہنسی ' نہ وہ روئی۔

خون کی لکیر وہیں جم گئی تھی جیسے چاند وہیں جم گیا تھا۔ اور وہ اپنے دوپٹے کے پلو کو پھاڑے چاند کے پیر پر باندھ رہی تھی۔

"آج تو بڑے عرصے بعد ایسے ہنسی ہے۔" وہ اپنے پیر پہ اس کے ہاتھوں کو پٹی باندھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"ایسے کیسے؟" اس نے ہاتھ روک کر چاند کو دیکھا۔

"پہلے جیسی۔۔۔ کھل کر۔۔۔"

وہ مسکرا دی۔ "میں بندھ گئی تو سوچا ہنسی کھول دوں ' لیکن سوچنے کی بات ہے جب میں پہلے سی نہیں رہی تو ہنسی کیسے پہلے سی ہو گئی؟ یہ سب نظر کا دھوکا ہے جو ہر اس نظر کو ہوتا ہے جو ظاہر کو جانچتی ہے۔" وہ پھر سے پٹی کرنے لگی۔

"تو سلیم کے ساتھ خوش نہیں ہے۔۔۔ اس نے تجھے پابند کیا ہے؟"

"سلیم مجھے کیا پابند کرے گا ' وہ تو خود پابند ہے۔ میرا لال جوڑا پہننا میری ساس کو پسند نہیں تو میرا کالا رنگ اوڑھنا میرے سسر کو۔ میرا چھت پہ جانا میرے دیور کو برا لگتا ہے اور میرا سجنا سنورنا میرے میاں کو اور میرا پڑھنا سب کو ہی اچھا نہیں لگتا۔ کتاب کھول لوں ' رسالہ یا اخبار۔۔۔ وہ ہر نظر کی گالی بن جاتی ہے۔"

"تو یہاں آ کر پڑھ لیا کر۔۔۔"

"جائز کام بھی چھپا کر کروں۔"

"شادی کے بعد بہت کچھ سہنا پڑتا ہے پری۔۔۔"

"ہر مسئلے کا حل شادی نہیں ہوتا ' تھوڑی سی آزادی ہوتا ہے۔ جو بیٹیاں ماں باپ کی دہلیز پہ کھل کے سانس نہ لیں ' وہ میاں کے ہاں جا کر سانسیں بھریں گی ' اس کی کیا گارنٹی ہے؟"

"گارنٹی تو کسی بھی چیز کی نہیں دی جا سکتی۔۔۔"

"لیکن تھوڑی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔۔۔ کوئی حیلہ۔۔۔ وسیلہ۔۔۔"

"لڑکیوں کی آزادی کا یہ معاشرہ قائل نہیں۔۔۔"

"لڑکیوں کی بربادی کا قائل ہے؟ سب نہ کرنے دو ' لیکن کچھ تو کرنے دو۔۔۔"

"نصیب میں ہو تو سب ہو جاتا ہے پری۔۔۔"

"نصیب کا ہی رونا روتے رہے تو کبھی کچھ نہیں ہو گا چاند۔۔۔"

"میاں کا رنگ چڑھ گیا ہے بھاگوں والی کو۔" تائی باہر سے اونچی آواز میں تبصرہ کر رہی تھیں۔ اندر چاند کی پٹی مکمل کرتی پری زخمی نظروں سے چاند کو دیکھ کر اٹھنے لگی۔ اس نے ہاتھ تھام لیا۔

"پری۔۔۔"

پری کی نظریں مڑ کر اپنی کلائی پہ گئیں اور کلائی سے بھائی پہ۔

"پری نہیں ' جل پری۔۔۔" ✡

Downloaded From http://paksociety.com

سمیرا عثمان گل

دیوار کے پار سے

سرما کی نرم گرم دھوپ نے آنگن میں ڈیرا جمالیا تھا' نکھرا ستھرا سا آسمان آج کچھ زیادہ ہی پیارا لگ رہا تھا۔ جھاگ کی مانند بڑے بڑے سفید بادلوں کے پہاڑ سے نیلے افق پر پھیلے تھے۔ چھت پر دیوار کے ساتھ کین کی کرسی لگی تھی جس پہ بیٹھا وہ چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سامنے میز پر اخبار پھیلا ہوا تھا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ گونج رہی تھی۔ آج اتوار تھا اور کچھ فراغت بھی تھی۔

"اتنا خرچا کروا دیا بھلا اس صورت کے ساتھ کون پسند کرنے والا ہے تمہیں' مگر یہ بات تمہارے بھائی کی سمجھ میں نہیں آتی' آئے دن کسی نہ کسی رشتے والے کو لے کر آجاتے ہیں' اس پر نت نئی فرمائشیں' کمر تختہ ہوگئی میری' اب کھڑی اپنی روتی منحوس صورت کا ماتم نہ کرتی رہنا' جلدی سارا کچن سمیٹ کر نیچے آؤ' کپڑوں کا ڈھیر رکھا ہے دھونے کے لیے۔" نسوانی پاٹ دار بھدی آواز نے اس کی سماعت کو جھنجوڑا تھا۔ یہ آواز دیوار پار سے آرہی تھی۔

وہ ابھی چند روز قبل ہی اس نئے مکان میں شفٹ ہوا تھا اور یہ آواز جیسے معمول کا حصہ تھی۔ جانے کیا مسئلہ تھا اس عورت کے ساتھ' ہر وقت چیختی چنگھاڑتی ہی رہتی تھی۔ کبھی بچوں پر برستی' کبھی برتنوں کو زور زور سے پٹختی' مگر اسے لگتا اس کے عتاب کا زیادہ تر نشانہ یہی لڑکی بنتی تھی جس کا نام مہو تھا۔ وہ گرج برس کے جاچکی تھی اور اب مہو کی دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔

احمر کچھ بے چین سا ہوا تھا' دل چاہ رہا تھا اٹھ کر ایک بار دیوار پار دیکھے تو سہی' آخر ایسی کیا کمی تھی اس

Downloaded From http://paksociety.com

لڑکی میں اس کا بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ دیکھے کہ وہ کتنی بدصورت ہے' کیونکہ اس کا جب بھی کوئی رشتہ مسترد ہوتا تو اس کی بھاوج ہر بار اس کی صورت کو ہی موردالزام ٹھہراتی تھی۔

وہ کرسی سے اٹھا پھر رک گیا۔ ''نہیں یہ بہت ہی معیوب اور غیر اخلاقی حرکت ہوجائے گی۔'' دل کو سمجھا کر بہلالیا' مگر دوسری جانب کی بن بادل برسات نے اسے ہنوز بے چین کیے رکھا تھا۔

وہ کچن سمیٹ کر برتن دھونے کے بعد باہر نکلی تو مخصوص خوشبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا اتنی دلکش اور معطر سی خوشبو نے جیسے اس کے اندر کے بوجھل پن کو زائل سا کردیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر کھڑی اس خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارتی رہی' یہ کسی مردانہ پرفیوم کی خوشبو تھی' مہو نے اکثر اس خوشبو کو دیوار کے اس پار محسوس کیا تھا۔

''لگتا ہے یہ بندہ پرفیوم کی پوری بوتل ہی خود پر انڈیل لیتا ہے۔'' وہ اکثر یہ بات سوچتی اور پھر مسکرا دیتی۔

''خوشبو میں بسا یہ شخص خود نہ جانے کیسا ہوگا۔'' یہ خیال کہ وہ کیسا ہوگا' خود بخود اس کے دماغ میں چبھنے لگا تھا اور پھر آج تو بھابھی کے ہاتھوں تازہ بے عزتی کا صدمہ یہ سوچ کر کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

''کیا ساری باتیں دیوار پار بیٹھے اس شخص نے بھی سنی ہوں گی۔'' اس کی پلکیں ایک بار پھر بھیگ گئیں۔ اسے لگ رہا تھا کبھی یہ شخص اگر اس کے سامنے آیا تو وہ مارے خفت کے نظریں نہیں اٹھا پائے گی۔ عجیب ہلکان سا محسوس ہو رہا تھا اسے جیسے بھابھی کچھ بھی کہہ لیتی مگر اس شخص کے سامنے نہیں۔۔۔

جانے کون تھا یہ شخص جسے دیکھا نہیں تھا۔ جانتی نہیں تھی۔ پھر بھی جیسے حواسوں پہ چھا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے بھائی کا خوب چلتا ہوا اسٹور تھا' مگر بھابھی کی نظریں ان کی خاندانی زمین پر تھیں کہ اس کو بیچ کر بینک بھر لیا جائے۔ بارہا وہ اپنے باپ سے اس سلسلے میں بات کرچکا تھا' مگر کرم دین جواب بوڑھا ہوچکا تھا' بغیر لاٹھی کے چلا نہیں جاتا تھا۔ سماعت اونچا سننے کی عادی تھی' مگر اس ایک معاملے میں وہ کچھ بھی نہیں سنتا تھا۔ یوں باپ' بیٹے کی درمیانی فضا کچھ کشیدہ تھی اور مہو باپ' بھائی اور بھابھی کے درمیان پس رہی تھی۔

''مہو آج میرے لیے کھیر بنانا۔'' وہ ابا کے کمرے میں پانی کا جگ رکھنے آئی تو ابا نے نئی فرمائش کردی تھی' مہو لب کچلتے ہوئے ابا کو دیکھنے لگی۔ کبھی میٹھا' کبھی چٹ پٹا' لگتا تھا ابا کو اپنی صحت کی کوئی فکر نہیں تھی۔ آرام سے آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ اندر ہی اندر جز بز ہوتے وہ کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ تب ہی ابا کی آواز ایک بار پھر مہو کی سماعت سے ٹکرائی' جس نے اسے بھونچکا کردیا تھا۔

''باہر دھوپ نکلی ہے تو مجھے چھت پر لے چلو۔'' اس نے ہاتھ روک کر حیرت سے ابا کو دیکھا اور اگلے ہی پل جیسے روہانسی ہوگئی۔

''ابا میں اکیلے آپ کو کیسے چھت پر لے جاسکتی ہوں۔'' مگر کرم دین کی ضد کے آگے اس کی ایک نہیں چلی تھی' وہ ابا کو سہارا دے کر سیڑھیوں تک لائی۔

''بس بس۔۔۔ اب اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوا' خود چڑھ سکتا ہوں' تم بس میرے پیچھے چلو۔'' اب یہ نئی پابندی تھی' ابا کو کوئی کسی بات کے لیے رضامند نہیں کرسکتا تھا' وہ اپنی مرضی کے مالک تھے اور دوسروں کو بھی اسی پر چلاتے تھے۔ بھابھی باہر نل پر بچوں کو نہلاتی کن انکھیوں سے دونوں باپ بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔

''نخریل بڈھا' ساری جائیداد پر سانپ بن کر بیٹھا ہے' قبر میں لے کر تو نہیں جائے گا' کلموہی تو ہی صبر کرلے۔'' بڑبڑاتے ہوئے آخر میں جیسے خود کو دلاسا دیا تھا۔ ''شہر میں خوب بڑا سا گھر لوں گی' بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھیں گے تو کر چاکر' واہ میرے کیا ٹھاٹ ہوں گے' بڑی بیگم صاحبہ بن کر گھوموں گی۔۔۔'' اس کی سوچوں کو دھکا مہو کی دلدوز چیخوں نے لگایا تھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ابا نے پاؤں اگلی سیڑھی پہ رکھا ہی تھا کہ پاؤں رپٹ گیا' مہو نے بمشکل انہیں تھام رکھا تھا' لیکن بغیر کسی سہارے کے وہ ان کا توازن بحال نہیں کر سکتی تھی۔

"اچھا ہے' یہیں سے گر کر مر کھپ جائے۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

مہو کی چیخیں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"کوئی میرے ابا کو بچائے۔" اس نے چیختے ہوئے پکارا تھا۔ دیوار پار سے احمر نے ایک ہی جست میں چھلانگ لگائی اور بھاگ کر اس کے ساتھ ابا کو سہارا دے کر اوپر لایا۔ ابا کے چہرے پہ خجالت تھی اور مہو کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے' اسے کلثوم بھابھی سے نفرت محسوس ہوئی' کیسی عورت تھی یہ' ایک گرتے مرتے ہوئے کو بچانے کی خاطر بھی آگے نہیں بڑھی تھی۔

احمر کچھ دیر ابا کے پاس بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ ڈھنگ سے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پائی تھی۔ لیکن رات دیر تک اس شخص کے متعلق سوچا تھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا کسی بھی لڑکی کا خواب ہو سکتا تھا۔ پر کشش' باوقار' خوش لباس۔

✵ ✵ ✵

آج بالآخر اس نے مہو کو دیکھ ہی لیا تھا اور ابھی تک وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا تھی وہ۔ کوئی ساحرہ یا جادوگرنی' کتابی چہرے کے خدوخال ایسے دل نشیں جیسے کسی مجسمہ ساز نے صدیوں کی ریاضت سے انہیں سنوارا ہو۔ گہری سانولی رنگت اور اس پر بڑی بڑی روشن آنکھیں' اتنی خوب صورت گہری خاموش اور دلکش آنکھیں اس نے آج سے قبل کبھی نہیں دیکھی تھیں' ہاں ایک کمی تھی اس کے چہرے پہ پھلبھری کے داغ تھے' جس نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔

لیکن اسے ان داغوں سے کیا سروکار۔ وہ تو اس کی آنکھوں کا اسیر ہوا تھا۔ جس نے نیند اور دل کا قرار لوٹ لیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اس کے ابا سے ملنے جائے' لیکن اس کی بھابھی کی تیز دھار نظریں' اسے مہو پہ باتیں بنانے کا موقع مل جاتا اور اس لڑکی کی رسوائی تو اسے کسی طور گوارا نہیں تھی۔

تو پھر اب کیا کرے؟ گھر میں کوئی بڑا بھی نہیں تھا۔ وہ ماں' باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ تو کب کے راہ عدم سدھار چکے تھے۔ ایک چاچی تھیں جو ایک تو دوسرے شہر میں تھیں۔ پر انہیں کہنا تو فضول ہی تھا۔ وہ تو بنتا کام بھی بگاڑ دیتیں اور اپنا رشتہ خود لے کر جانا کتنا معیوب لگتا۔ باہر دروازے کی گھنٹی بجی تھی' جس نے سوچوں کا ارتکاز توڑ دیا تھا۔

مہو دروازے کی گھنٹی پر انگلی رکھے' دوپٹے سے چہرہ صاف کرتی' بار بار پیچھے گلی میں جھانک رہی تھی۔ گھبراہٹ اس قدر تھی کہ سخت سردی میں بھی ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ ابا نے آج نیا حکم سنا دیا تھا۔

"مہو! جو لڑکا اس روز چھت پر آیا تھا' اسے بلا کر لاؤ' میں ملنا چاہتا ہوں اس سے۔" اور اب وہ گھنٹی پر انگلی رکھے حواس باختہ سی کھڑی تھی۔ احمر نے دروازہ کھولا اور اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"وہ ابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سرپٹ واپس بھاگی۔ احمر زیر لب مسکراتے ہوئے تیار ہونے لگا۔

وہ گھر آیا تو ابا نے مہو کی دوڑیں لگوا دیں' کبھی چائے منگوائی' کبھی اسنیکس' پھر بھی یہ کم لگا تو ابلے ہوئے انڈے اور نگٹس تلنے کو کہہ دیا تھا۔ ابا یوں کسی کی خاطر تو کبھی نہیں کرتے تھے۔ شروع کے چند سوالات کے بعد مہو کے ابا نے جو بات اسے کہی وہ بہت عجیب تھی۔ وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے التجا آمیز انداز میں کہہ رہے تھے۔

"تم میری بیٹی سے شادی کر لو' میں اپنی ساری جائیداد تمہارے نام کر دوں گا۔" دروازے کے اس پار کھڑی مہو نے یہ بات خود سنی اور جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

پھر ابا اور اس کے درمیان جانے کیا طے ہوا' ہر ایک کے لاکھ سمجھانے اور بھائی کے منع کرنے کے

Downloaded From http://paksociety.com

باوجود ابا نے دس دن کے اندر اندر اس کا نکاح کر دیا تھا۔ اس کے دل میں احمر کا مقام کچھ بدل سا گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ شخص جائیداد کی خاطر اس سے شادی کرلے گا۔ دل نے جو خوش گمانیوں کا محل تعمیر کر رکھا تھا۔ وہ بھوسے کا ڈھیر ثابت ہوا تھا اور اس ڈھیر کو آج جیسے کسی نے آگ لگا دی تھی۔ اس کی رخصتی کے دو روز بعد ابا چل بسے' اسے احمر کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ کچھ روز صدمے میں رہی' پھر سنبھل گئی۔

✿ ✿ ✿

احمر نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔ اس پر اپنی محبت' دولت' خواب سب نچھاور کر دیا تھا' مگر وہ تھی کہ نہ سیراب ہوتی تھی نہ آسودہ۔ احمر کی اصلیت نہ جانتی تو خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کرتی' مگر اب دل نہیں مانتا تھا۔ اس کی محبت کو' جذبے لٹاتی نظروں کو' حسین خوابوں کی رہ گزر کو' خود کو آئینے میں دیکھتی تو یہ احساس مزید کچوکے لگانے لگتا کہ وہ احمر کے قابل نہیں تھی۔ اس کے ابا نے ساری جائیداد کے عوض اس کو احمر پہ مسلط کیا ہے۔

اور احمر۔۔۔ وہ اس کا گریز اور محتاط سا انداز دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ کیا چیز ہے جو دونوں کے مابین دیوار بن کر کھڑی ہے' وہ روز ایک اینٹ ہٹاتا ہے اور اگلی صبح وہ اینٹ پھر سے جڑ جاتی ہے۔

"مہو! کیا تم میرے ساتھ خوش ہو؟" دونوں ہاتھ اس کی پشت پہ رکھے' وہ بال بناتی مہو سے پوچھ رہا تھا۔

"جی۔۔۔" اس نے مختصراً" کہا۔

"مجھے کیوں نہیں لگتا۔" اس نے بات کو طول دینا چاہا۔

"پتا نہیں۔۔۔" وہ معصوم بن گئی۔

"کیا تم کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو یا پھر میری طرف سے۔۔۔ دل میں کوئی بدگمانی ہے تو مجھ سے کہو۔" اس نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا بتاؤ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔" مشکل سوال آیا۔

"اچھے۔۔۔" اس نے بھی اچھے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"بس اچھے۔۔۔" اس نے منہ بسور لیا۔

"جی۔۔۔" وہ سعادت مندی سے بولی۔

"اچھا آج کیا کھاؤ گی۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"جو آپ کو پسند ہو۔" اس نے بات ہی ختم کر دی۔

"یہ کی ہے نا اچھی بیویوں والی بات۔" اس نے پھر بھی سراہا' وہ خاموش رہی' لیکن ہار اسے بھی منظور نہیں تھی۔

"تمہیں کھانا بنانا آتا ہے۔"

"جی۔۔۔"

"کیا کچھ بنا لیتی ہو۔"

"سب کچھ۔۔۔"

"یہ انٹرویو مجھے پسند نہیں آرہا' اب کچھ مجھ سے بھی پوچھو نا۔" اس نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی۔

"کیا پوچھوں۔" وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہی کہ ان سمندر جیسی آنکھوں میں کب ڈوبا تھا اور دیکھو ابھی تک مجھے تیراکی نہیں آئی۔" وہ کہہ کر خود ہی ہنسا' پھر اپنی والہانہ محبت بھری نظریں اس پہ جما دیں۔

وہ جی بھر کر جزبز ہوئی اور سوچا' اس سے تو اچھا تھا یہ بولتا ہی رہے۔

✿ ✿ ✿

بہت دن ہوئے دیوار پار سے بھابھی کی مخصوص آوازیں نہیں آرہی تھیں۔ مہو نے دیوار کے ساتھ آٹھ دس اینٹیں جوڑ کر رکھیں اور پھر ان پہ چڑھ کر منڈیر کے اس پار جھانکا۔ دونوں بچے چارپائی پہ سہمے سے بیٹھے تھے اور کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں' پھر بھائی کا چہرہ نمودار ہوا' ان کی نظر مہو پہ پڑی تو اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مہو کے دل پہ جیسے گھونسا سا پڑا تھا۔ وہ اینٹوں سے نیچے اتر گئی۔ دل جیسے کسی نادیدہ

Downloaded From http://paksociety.com

بوجھ تلے دبنے لگا تھا۔ حلق میں پھندا سا لگا اور آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔ احمر نے اس کی سرخ آنکھوں کا سبب پوچھا تو ٹال گئی۔

"کیا بھائی اس سے ناراض ہے۔" یہ خیال ہی کس قدر جان لیوا تھا' ایک ہی تو بھائی تھا اس کا' بس ایک رشتہ اگر وہ بھی خفا ہو جاتا تو... اور وہ بھائی کے بچوں کے بغیر کیسے رہے گی۔ پھر ایک روز بھابھی آئیں اس کے پاس... سوجی ہوئی آنکھیں' ملگجا حلیہ۔

بھابھی نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"مہو' پلیز مجھے معاف کردو۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ ابا نے ساری جائیداد احمر کے نام کردی ہے اور تمہارے بھائی نے اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہراتے ہوئے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" وہ رو رہی تھیں' گڑگڑا رہی تھیں' التجائیں کررہی تھیں اور مہو کا دل جیسے قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں احمر سے کیسے بات کروں اور اتنی بڑی جائیداد سے وہ کیوں دستبردار ہوگا اور اگر جائیداد کے ساتھ اس نے مجھے بھی چھوڑ دیا تو... میں بھلا اس کے بغیر کیسے رہوں گی۔" سوچ سوچ کر وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

"مہو' کھانا تو ٹھیک سے کھاؤ۔" احمر نے اسے دوسری بار ٹوکا تھا۔

"میں کھا چکی ہوں۔" اس نے بے دلی سے پلیٹ پیچھے سرکائی۔

"تم پریشان ہو۔" وہ اس کے چہرے کا ہر رنگ پہچانتا تھا۔

"ہاں..." کچھ سوچ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ احمر کی استفہامیہ نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ وہ اس کے مزید بولنے کا منتظر تھا۔

"میں چاہتی ہوں آپ ساری جائیداد میرے بھائی کے نام کردیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے بولی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' پھر مسکرا دیا۔ "ابا کا ذہنی توازن آخری دنوں میں ٹھیک نہیں تھا' اسی لیے انہوں نے آپ سے ایسی..." اس کا لہجہ بھیگ گیا' وہ بے بسی محسوس کرنے لگی تھی۔

"پہلی بات تو یہ ہے..." آخر احمر نے ہی اس کی مشکل آسان کرنے کا سوچا۔ "میں نے جائیداد کی خاطر تم سے شادی نہیں کی تھی' تمہارے فادر نے مجھے ایک آفر کی تھی' جسے میں نے ٹھکرا دیا تھا اور پھر اپنا مدعا پیش کیا تھا۔ وہ ساری جائیداد میرے نہیں' تمہارے نام ہے' میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم اپنے بھائی کا حصہ ان کے نام کردو' لیکن میں بس تمہاری بھابھی کو تھوڑا سبق دینا چاہتا تھا' تم جانتی ہو تمہارے رشتے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ تھیں۔ مجھے بھی آکر تمہارے خلاف ورغلایا تھا کہ میں تم سے شادی نہ کروں' لیکن چونکہ یہ دیوار پار کا معاملہ تھا تو مجھے سارے حالات کی خبر تھی۔" وہ مزے سے بتا رہا تھا اور وہ بنا پلکیں جھپکے یہ سارے انکشافات سن رہی تھی۔

"تو پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" وہ حیران ہوئی۔

"تم سے شادی تمہارے لیے کی' کیونکہ تم مجھے پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھیں۔"

"میں۔؟؟" ایسا لگا جیسے اس کے گرد گلاب بکھر گئے ہوں' آج پہلی بار وہ جیسے دل سے مسکرائی تھی' کسی نے اس کو بھی اس کی ذات کا اعتماد دیا تھا۔

"ہاں تم' صرف تم..." احمر نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ آج اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی' محبت کی خوشبو نے اس کے گرد حصار سا بنا دیا تھا۔

اور وہ سوچ رہی تھی دیوار کے اس پار آکر احمر نہ ہوتا تو اس کی زندگی کیا ہوتی۔

www.paksociety.com

سمیرا حمید

برہا سہاگن کی سیتا

دکھ کی آفاقی صورت' رات کے سناٹے میں چلاتے ہوئے نومولود کی دہائی دیتی آواز۔ یتیم خانے کی گندی سیڑھیوں پر چڑھاوے کی طرح چڑھی' وہ حلق پھاڑ کر رو رہی ہے۔ اتنا کہ فضا بینا ہے۔ سناٹا قصہ گو۔ اس کی آمد برہا کا تہوار ہے۔

وہ رو رہی ہے۔۔۔ کہ۔۔۔ ہزاروں سال۔۔۔ ہزاروں سال ہی تو۔۔۔

اسے یتیم خانے کی ان سیڑھیوں پر چھوڑ کر ماسٹر علی بخش' ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کی دھندلاہٹ کو رگڑتے بمبئی کی سڑکوں پر ڈگمگاتے قدموں سے چلنے کی

مکمل ناول

کوشش کر رہے ہیں۔ بے اختیار ہچکیوں سے روتے جا رہے ہیں۔۔۔ روتے ہی جا رہے ہیں۔ ان کی ساری ریاضت' ان کا سارا سنگیت' ان کی روح میں موجزن سب راگ راگنیاں تڑپ تڑپ کر رو رہے ہیں۔

روپ تارا اسٹوڈیو کے قریب ایک سرکاری ہسپتال میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ مہینہ اگست کا ہے سن بتیس ہے۔

رات کالا پانی ہے۔۔۔

جبر موجود میں آنا۔

یتیم خانے کے اندر اتنا گھپ اندھیرا تھا' وہ سب اتنی گہری نیند میں تھے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ باہر دو تین دن کی بچی' اپنے پیدا ہونے کا ماتم منا رہی ہے۔ بھیگے اگست کی گیلی زمین' اس کے ننھے وجود پر کیڑے رینگ رہے ہیں۔ کیچڑ میں پھنسے کنول کی طرح وہ تکلیف میں دھنستی جا رہی ہے۔ وہ اس پر چڑھ آئے ہیں۔ اسے کاٹ رہے ہیں۔

کتنے ہی گھنٹوں تک ماسٹر علی بخش یہ بھولنے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ یتیم خانے کی سیڑھیوں پر ایک ننھا پھول چھوڑ آئے ہیں۔ کھولی میں واپس آنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From http://paksociety.com

کے بجائے وہ بمبئی کی سڑکوں کے اندھے کنوئیں میں گول گول گھومتے رہے۔ انسان اپنے جسم کے ٹکڑے نہیں کرتا جب تک وہ صاحب اولاد نہیں ہو جاتا۔ پھر کوئی ایک دل بن جاتا ہے' کوئی جگر' کوئی بینائی' کوئی پوری زندگانی۔ ماسٹر علی بخش کی بینائی کمزور پڑنے لگی اور روشنیاں دھندلا گئیں مگر سماعت بڑھ گئی اور انہیں یوں دور' اتنی دور جا کے بھی اس کے رونے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔

آستین سے اپنی آنکھیں پونچھتے وہ واپس پلٹے تو یتیم خانے کی سیڑھیوں پر وہ بددعا بنی پڑی تھی اور اس بار زیادہ شدت سے چلا رہی تھی۔

رونا کچھ پیدائش کا تھا' کچھ بے قدری کا....
اندھیرا کچھ رات کا تھا' کچھ نصیب کا....

جیسے ہی انہوں نے اسے بانہوں میں لیا۔ ان کے ہاتھوں پر کتنے ہی کیڑے چڑھ دوڑے.... سیاہ.... زہریلے....

"جس کا آغاز ایسا المناک تھا۔ اس کے خوش گوار انجام کا سوچا جا سکتا ہے؟"

☆ ☆ ☆

آبلہ پا کوئی اس دشت میں آیا ہوگا
ورنہ آندھی میں دیا کس نے جلایا ہوگا

جیوا جی مینشن داور کی تین منزلہ چھپرہ بلڈنگ کی کرائے کی کھولی میں ماسٹر علی بخش اسے اپنے ساتھ لپٹائے لے آئے۔ اس کے رونے کی شدت نے سارے شہر کی نیند خراب کر دی تھی۔ کھولیوں میں اس کے رونے کی گونج تھی۔ پل کے اس اور اس پار ساری دنیا اداس تھی۔ پانی میں جلدی سے ہلدی گھول کر ماسٹر علی بخش نے اس کے جسم پر لگانی شروع کی۔ بستر پر لیٹی اقبال نے اپنا منہ دوسرے رخ پھیر لیا تھا۔

"ماسٹر جی' بٹیا جیوت ہے؟" ننھے خان سارنگی نواز نے ان کی کھولی کے پھٹے پردے کے باہر کھڑے ہو کر پوچھا۔

"جی خان جی۔" ماسٹر علی بخش نے رندھے گلے سے کہا۔

"یوں لگا مہاکالی کے ہاتھوں میں ہے...."

خورشید جو سہمی بیٹھی تھی جلدی سے آگے بڑھی۔ "بابو جی یہ تو بہت ہی خوب صورت ہے۔"

چور نظروں سے اقبال نے اسے دیکھا جو سوتے ہوئے بھی سسک رہی تھی۔ اس کا دل کسی نے تپتی ریت پر پھینک دیا۔ تھیٹر کے اندھیروں میں چھپی بیٹھی کسی وقت وہ بھی ایسے ہی سسکی تھی۔

"تکلیفوں نے آتے ہی کچل دیا.... یہ جنم ہوا اس کا۔" وہ کراہ اٹھی۔

"میں نے تو اس کا نام "مہ جبیں بانو" سوچ لیا ہے۔" ماسٹر علی بخش نے ٹوٹے ہوئے ساز کی بکھری سی آواز میں کہا۔

اقبال خاموش رہی۔ خورشید نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں لینا چاہا تو وہ ٹوکے بنا نہ رہ سکی۔

"نہ خورشید' کیسے تڑپ تڑپ کر سوئی ہے' تمہارے چھونے سے اٹھ گئی تو...." خورشید نے کچھ خائف سا ہو کر ماں کو دیکھا اور پھر جھک کر اس کے گال کو چوم لیا۔

"ہمارا منا.... دیکھو ماں! ہماری کھولی میں روشنی ہو گئی۔ یہ تو مانو جگنو ہے۔"

"نصیب کے اندھیروں میں کتنے بھی جگنو لا کر جگمگا لو' اندھیرا ماند نہیں پڑتا۔" اقبال نے تلخی سے کہا۔

"اقبال! اس کا نام مہ جبیں بانو ہی رکھ لیں نا پھر؟" ماسٹر علی بخش کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مہ جبیں نام رکھنے سے یہ مہ نصیب تو نہیں ہو جائے گی۔"

ایک آنسو اقبال کے گال سے پھسل کر اس کی پیشانی پر گرا۔ ماں کا آنسو اتھاہ سمندر تھا' زندگی کے سمندر کو بھی اس نے یہی "آنسو" پایا۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

"یہ دنیا ایک قفس ہے۔ جس کے اندر رہ کر انسان کسی بھی نوعیت کی جدوجہد کرتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔" (ڈائری)

وہ دونوں کلکتہ تھیٹر میں کام کرتے رہے تھے۔ علی بخش پیٹی ماسٹر' ہارمونیم بجاتا اور ضرورت پڑنے پر چھوٹے موٹے کردار بھی کرلیا کرتا تھا۔ اقبال کمال کی رقاصہ تھی۔ اداکاری بھی کرتی اور گاتی بھی تھی۔ اسٹیج پر رقص کرتے' ہارمونیم بجاتے' پیٹی ماسٹر علی بخش کو وہ دل دے بیٹھی تھی۔ اس کے رقص کی چال بدل گئی' من کی آشا ٹھہر گئی۔ ماں کو چھوڑ چھاڑ وہ علی بخش کے ساتھ اقبال بانو بن کر بمبئی آگئی۔ ماں سے ویسے بھی رخصت تو لینی ہی تھی' چلو ایسے ہی سہی۔ ٹاکیز شروع ہوئیں تو ہارمونیم بجانے کا کام جاتا رہا۔ وہ دونوں بمبئی آ گئے کہ فلموں میں کام کریں گے۔ لیکن انہیں فن کے مطابق تو نہیں' بمشکل ضرورت مطابق کام ملا۔ اتنا کہ کھانے کو باسی روٹی مل جاتی۔ تینوں وقت نہ سہی' تین میں سے کسی ایک وقت سہی۔

ماسٹر علی بخش' ہارمونیم بجانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ سُر سا گر اس کی روح میں بہتا تھا۔ ساز' راگ الاپ' میں اس کی زندگی کی دھارا بہتی۔ ہارمونیم کی کنجیوں میں اس کی سانسیں مقید تھیں۔ اپنی یہ سانسیں وہ ہندی فلموں کو دے کر انہیں امر کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بڑا موسیقار بننا چاہتا تھا۔

اقبال نے ہیم سندری کی گود میں آنکھ کھول' تھیٹر میں جھپکی تھی۔ اگر فلموں کو اس کی ضرورت نہیں ہوگی تو پھر کس کی ہوگی۔ کلکتہ تھیٹر میں اس کے رقص کی مانگ تھی۔ اس کا رقص اشارے کنایوں سے مبرا' بے خودی کی کوکھ میں سانس لینے لگا تھا۔

دادر کی کھولیوں میں ناک تک فن میں دھنسے فنکار' پیٹ کی بھوک کی آگ میں جھلستے تھے۔ دادر کی ان کھولیوں میں تھا ہی کیا' بھوک' بدبو' گندگی اور جی جان کو روگ لگاتا اندھیرا۔ اقبال سارا سارا دن اسٹوڈیو کے چکر لگاتی رہتی۔ خوش امیدی نے کچھ سُر حلق میں' کچھ رنگ رقص میں' کچھ حرف اداکاری میں زندہ چھوڑ رکھے تھے اور وہ سمجھتی تھی کہ کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔ یہی سب علی بخش کرتا۔ وہ جتنا اعلیٰ پائے کا ہارمونیم نواز تھا' اتنا ہی بدنصیب فنکار تھا۔ گرمیوں میں جب دس ضرب دس کی کھولی میں پانچ افراد کی سانسیں جہنم کی دھونکنی بن جاتیں' اور وہ اس جہنم کو کچھ سرد کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر آکر سوتا تو اس پر کھلتا کہ وہ تو کسی ساز اور سُر کو پہچانتا ہی نہیں۔ ستار' ہارمونیم' سارنگی' طبلہ اس کے تخیل میں تو بج سکتے ہیں' حقیقت میں نہیں۔ ہارمونیم پر انگلیاں تھرکا کر سُر تو نکالے جاسکتے ہیں' ان ہی انگلیوں کو پیشانی پر نچا کر "خوش بختی کے راگ" نہیں۔

ان کے ساتھ بچوں کو بھی بھوکا رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ جانتے تھے ماں تین چار دن کی روٹی پکا کر کپڑے میں لپیٹ دیتی ہے اور کام ڈھونڈنے جاتی ہے۔ انہیں یہ روٹی' پیاز' مرچ کے ساتھ کھاتے رہنا ہے۔ مہ جبیں کو خورشید اور مدھو (مہ لقا) دیکھ لیتیں ورنہ علی بخش اسے گود میں لیے' خیالوں ہی خیالوں میں موسیقار بنے' سازندوں کو ریاض کرا رہے ہوتے۔ علی بخش کے خون کی گرمی اسے اس کے بابو جی کے خواب سنا رہی ہوتی کہ "ایک دن میری بنائی دھنوں سے پورا ہندوستان گونجے گا۔ آل انڈیا ریڈیو صبح و شام میرے گیتوں کو نشر کرے گا۔ سنگیت کاری میں میرا نام "سا اور پا" سروں کی طرح پائندہ رہے گا۔"

اقبال کے ساتھ خورشید بھی فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار کرنے کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔ ورنہ سارا دن وہ تینوں بہنیں مل کر کھیلا کرتیں۔ ان کی کھولی کے سامنے بابو جی کے دوست ماسٹر جی رہتے تھے۔ جو ان ہی کی طرح ہارمونیم بجاتے تھے۔ وہ تاک تاک کر ان کی کھولی میں پتھر پھینکتی تھیں۔ ایک دن ان تینوں نے اتنے پتھر پھینکے کہ وہ بھنا کر ان کے بابو جی کے پاس آئے اور ان کی شکایت کی۔ بابو جی نے دل لگا کر انہیں مارا۔ سب تو رو رو کر چپ ہو گئیں لیکن مہ جبیں کی

Downloaded From http://paksociety.com

صورت پر اداسی کچھ ایسی سمت آئی کہ بابو جی کے دل کو بے قرار کر گئی۔

"منا! ایسے دوسروں کو تکلیف دو گی تو خود بھی دکھی ہو جاؤ گی۔" انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

وہ اتنی چھوٹی تھی کہ بات تو ٹھیک سے سمجھ نہ سکی لیکن لفظوں کو اپنے دل پر محسوس کیا۔ غربت میں محسوسات ویسے بھی بہت متحرک اور بیدار ہوتے ہیں۔ یتیم خانے کی سیڑھیوں پر ہی وہ بیدار ہو گئی تھی۔ پھر آنکھ جھپکی نہ اونگھی۔

ایک دن اقبال خوشی سے دیوانی ہوتی گھر لوٹی۔ اندھیری کھولی ٹمٹماتے دیے میں بھی جگمگ کرنے لگی۔ اسے ایک بڑی فلم 'اچھے اور مضبوط کردار کے ساتھ مل گئی تھی۔ یوں بھی اقبال اب اپنی خواہشوں کو نئی جہتیں دینے لگی تھی۔ پہلے اگر وہ ہیروئن بننا بھی چاہتی تھی کہ اس میں سب گن تھے' فن' حسن' ادا' آواز' رقص۔ تو اب وہ اس خواب کو نئی جہت میں ڈھال چکی تھی۔

"اگر جان ہو تو معاون کردار بھی کسی سے کم نہیں ہوتا۔ ہیرو' ہیروئن کو پچھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔"

ان ہی دنوں علی بخش کو بھی جیسے تیسے ایک فلم کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع مل گیا۔ اس کا دیرینہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ وہ موسیقار بننے جا رہا تھا۔ بھوکے پیٹ وہ ساحل پر ٹہلا کرتا' تاروں بھری رات میں سرگم چھیڑے رکھتا' راگ بہاگ اس کی سانسوں سے اٹکھیلیاں کرتا۔ وہ' وہ علی بخش نہیں تھا جو دن بھر اسٹوڈیو کے چکر لگاتا' اور پھر راتوں کو برہا الاپتا۔ اب وہ روز صبح دم اٹھتا' ہارمونیم کو صاف کرتا اور اپنی خوابیدہ دھنوں سے لاڈ پیار کرتا۔

" زندگی کے یہ وہ دن تھے جب بنا کھائے بھی ان کے بھرے پیٹ تھے۔ باسی روٹی کے چند ٹکڑے بھی مانو بہت ہی تھے۔ کھولی کی گھٹن میں گھنٹیاں بجتی تھیں۔ بنا غازے کے ماں جی کا چہرہ چمکتا دمکتا تھا۔ نقاہت پر بھی بابو جی کے گال اناری تھے۔

چپ چاپ۔۔۔ چپ چاپ سن سن سی زندگی۔"
(ڈائری)

ایک دن وہ گھر واپس آئے تو چپ چاپ چت لیٹ گئے۔ اتنے خاموش' اتنے ٹھنڈے کہ ان پر مردے کا گماں ہوتا تھا۔ اس دن ساری ہی کھولی پر موت کا گمان تھا۔ پورا ہندوستان راکھشس بنا ان کی سانسوں پر سوار تھا۔ موت کے اس کھیل میں ماں بھی شامل ہو گئی وہ کیوں پیچھے رہتی۔

علی بخش پیٹی ماسٹر کبھی موسیقار نہیں بن سکتا۔۔۔ یہی اس کی تقدیر ہے۔

اقبال بانو' کسی بڑے کردار کے لیے پیدا نہیں ہوئی تھی۔۔۔ یہی دلیل ٹھہری۔۔۔

بات فن سے شروع ہوئی' بھوک تک آئی اور پھر خوابوں پر ٹھہر گئی۔ فنکار بھوکا مر جاتا ہے' فن نہیں چھوڑتا۔ فن چھوڑ دیتا ہے' خواب نہیں چھوڑتا۔ خواب چھوڑتا دیتا ہے تو سانس بھی چھوڑ دیتا ہے۔ ان کی سانسیں کچھ اٹکی تھیں' کچھ بس آخری دموں پر تھیں۔ دونوں کو ہی جو فلمیں ملی تھیں وہ ان کے ہاتھ سے جاتی رہیں۔ زندگی اس بازی کی مات پر بھی قہقہے لگانے لگی۔

☼ ☼ ☼

" آہ! ہم سب اداس ہی کیوں رہتے ہیں۔"
(ڈائری)

جو چکر' نانی ہیم سندری سے شروع ہوا تھا' وہ وہیں چکراتا رہا۔ زندگی کی کھوہ میں چھپے سارے دکھ ان کی کھولی میں آ کھلے۔ ماں' بابو جی' پھر سے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اسٹوڈیو کے چکر کاٹنے لگے۔ کبھی کام مل جاتا' کبھی انکار۔ کبھی پیسے آ جاتے' کبھی آس۔

ماں اپنے ماضی کو شکوے کی طرح یاد کرنے لگی جب ہیم سندری پانچ بچوں کو اکیلے پال پوس رہی تھی۔ پھر تھیٹر کی بھیڑ' فن کا جنتر منتر۔ اسے یہ دکھ ستانے لگتا کہ فن میں انتہا کی انت کے بعد بھی دکھ کا انت کیوں

Downloaded From http://paksociety.com

نہیں ہوتا۔ کلکتہ' لکھنؤ' بمبئی کی سڑکوں کی دھول چاٹنے پر بھی انہیں کہیں ٹھکانہ کیوں نہیں ملتا۔ ایسا کون سا مہاساگر ہے جو ان کی نیا سے پار نہیں ہو رہا۔ ہندوستان کی اتنی بڑی فلم نگری میں' ایک ان ہی کے لیے اتنی سی جگہ نہیں ہے کہ وہ کسی رات تو مستقبل کے سہانے خوابوں کی آس پر بس چپ چاپ سو سکیں۔

سامنے کی کھولی میں ماسٹر نوشاد کے یہاں جب رات گئے' ساز بجتے تو وہ سب اندر آنکھیں چھت سے لگائے بس چپ چاپ آنسو بہایا کرتے۔ خورشید اور مدھو سو جاتیں لیکن اس کی نیند بھی جیسے ماں بابو جی کی سانسوں سے جڑی' ان کے سنگ جاگی رہتی۔

"یہ تنہائی اس قدر خاموش ہے کہ زندگی اس طرف دیکھتے ہوئے ڈرتی ہے۔" (ڈائری)

کھولی میں ٹوٹے خوابوں' بے انت بھوک کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ "ماں کی کہانیاں۔" جس دن ماں اسٹوڈیو سے کچھ زیادہ ہی دل شکستہ ہو کر واپس آتی' اس رات کی کہانی تو کمال کی ہوتی۔

"رانی نے سوچا کہ اسے دریا میں کود کر جان دے دینی چاہیے۔ جیسے ہی وہ چھلانگ لگانے کے لیے بڑھی اسے وہاں اپنی صورت دکھائی دی۔ اس نے اپنی سندر تا دیکھی' دیکھا کہ اس کی پیشانی پر چاند چمکتا ہے' آنکھوں میں سورج سے دیے روشن ہیں۔ اس سے وہ چراغ بجھائے نہ گئے' چاند کو گہنایا نہ گیا۔ وہ چپ چاپ اپنے محل لوٹ آئی' اور طاؤس بجاتی گیت گانے لگی۔ اس کے گیت مسافر سنتے اور اپنی راہوں پر واپس لوٹ جاتے۔"

مہ جبیں نے رانی کو تو ڈھونڈ نکالا لیکن وہ چاند سورج نہ کھوج سکی۔ لیکن جب وہ بڑی ہو گئی تو اس نے ماں کی کہانی کا راز پالیا۔ پیشانی کا چاند وہ تھی' سورج سے دیے خورشید' مدھو اور بابو جی۔ ماں کہانی سناتے کچھ ایسا سماں بنا دیتی کہ آسمان کے کنارے اس کی آنکھوں کو چھونے لگتے۔ سورج کی کرنیں اس کے آنچل میں چھپ جاتیں۔ اور وہ اندھیرے کے اس طرف ماں کے پیچھے سے جیسے سورج کو طلوع ہوتے دیکھتی۔ اسے اپنی ماں دیوی لگتی۔ جس دن ماں ہنس دیتی' اس دن مہ جبیں رو دیتی۔ جس دن ماں کھانے کی چیزیں گھر لاتی اس دن مہ جبیں کا دل کھانے سے اچاٹ ہو جاتا۔ ماں بیمار پڑی رہتی تو وہ مرہی تو جاتی۔

یوں ایک رات وہ سسک اٹھی۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ وجہ جان ہی نہیں سکی۔ کیا ماں کی اکھڑی اکھڑی سانسیں' یا بابو جی کا وہ ہار مونیم جسے وہ گھورتے رہے اور پھر اپنی آنکھیں پونچھنے لگے' یا اوپر کی کھولی کی وہ بچی جو دودھ کے لیے بلکتے بلکتے مر گئی' یا مدھو کی سہیلی جو آنچل میں روٹی کے چند ٹکڑے چھپا کر ان کے کھانے کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
زندگی ایک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
مین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-

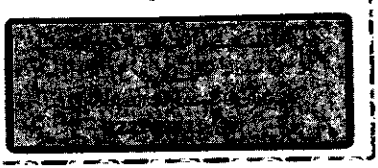

Downloaded From http://paksociety.com

لیے لائی' یا کوئلے سے جلا اس کا ہاتھ۔۔۔

"منا! کیا ہوا تمہیں؟ تم تو رو دینے کو ہو؟" مہ جبیں کے ہونٹ کپکپا گئے۔ یوں جیسے کوئلہ سلگتا بھی ہو اور آگ بھی نہ پکڑتا ہو۔

"کیا ہوا منا؟ تمہیں بھوک لگی ہے؟" ناچار اس نے جلی ہوئی ہتھیلی ہی سامنے کر دی۔ اقبال تڑپ اٹھی۔ ہتھیلی پر مرہم لگا تھا اور دیکھو تو مہ جبیں مٹھی کو بند کیے چپ ہی تو لیٹی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔۔۔ مجھے خود بھی خیال نہ آیا کہ تم یوں ہاتھ کو مٹھی بنائے کیوں گھوم رہی ہو۔"

"آپ کو اور پریشان کیسے کرتی ماں جی؟ آج درد ہے کل نہیں رہے گا۔ مرہم لگا دیا ہے' زخم جاتا رہے گا۔" اقبال نے اس کی ہتھیلی کو چوم لیا۔ "درد کو ابھی جانا ہو گا۔" پھر چوما' "کئی بار چوما" "درد کو جانا ہو گا۔"

مہ جبیں کی ساری محبت ماں کی اس درجہ کی محبت پر پگھل گئی اور اس نے خود کو ماں کے قدموں میں جھکا پایا۔ وہ اندر ہی اندر زار و قطار رونے لگی۔ محبت کے اس اولین احساس نے اسے بھسم کر ڈالا' اور بس یہیں سے اس نے خود بھسم ہونا شروع کر دیا۔

جانے آج اقبال کو اتنی فرصت کیسے ملی کہ وہ اس کے تاثرات کو غور سے دیکھتی رہی۔ خورشید اور مدھو' دونوں میں وہ بات نہیں تھی جو مہ جبیں میں تھی۔ یہ بانو کے دودھ کا اثر تھا یا علی بخش کی ٹوٹی بکھری دھنوں کا کہ وہ یوں تان سین کا راگ الاپ بنتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی یوں کہ پلٹ کر واپس نہ ہو۔ محسوسات میں اتنا درد' مانو جسم جنگل ہے اور دھڑا دھڑ کٹ رہا ہے۔

"منا! فلموں میں کام کرو گی؟" اپنی تقدیر سے نظریں چرا کر اقبال نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

اس نے سہم کر ماں کو دیکھا۔ "آپ نے تو کہا تھا میں بڑی ہو جاؤں گی تو اسکول جاؤں گی۔ ڈاکٹر بنوں گی۔"

"بھوکے پیٹ انسان مر تو سکتا ہے لیکن کچھ بن نہیں سکتا منا۔ تم ڈاکٹر کیسے بن جاؤ گی۔"

"پھر میں کیا بنوں گی؟"

"اپنا نہیں جان سکتی تو تمہارا کیسے جان لوں۔" ماں کی آنکھیں جوگ دیپ ہوئیں۔

ماں اسٹوڈیو کام کے لیے بھی جاتی' اور بیمار بھی رہتی۔ شاید ماں کو اپنا سارا فن کھولی کے اسٹیج پر ہی دکھانا تھا۔ وہ بیماری کی انت پر پہنچ کر' پھر سے لوٹ آتی۔ ایسے کھانستی کہ جیسے آخری سانس دے بیٹھے گی اور پھر سے نئی سانس پھانک لیتی۔

ان ہی بیماری کے دنوں میں جب وہ گھر ہوتی' اسے اداکاری سکھاتی۔ اسے بیمار ماں کے سرہانے رونے کے لیے کہتی۔ مری ماں کو لوٹ آنے کے لیے کہتی۔ وہ تو بیمار ماں کا چہرہ دیکھتے ہی تار تار ہو جاتی کہ آنسو گنگا جمنا بنے بہہ نکلتے۔ ماں کے یاد کرائے مکالمے بولتے ہی غم سے صحرا ہو جاتی۔

دونوں ماں بیٹی کا یہ کھیل کھیل تھا بھی اور نہیں بھی۔ مہ جبیں پورے من سے وہ کرتی جو ماں کہتی لیکن پھر بھی من ادھا ہی رہتا۔ اس کا دل کھولی کے باہر ان بچوں کی آوازوں میں بھی اٹکا ہوتا جو اپنا سارا بچپنا لیے کھیل رہے ہوتے' آنکھوں پر پٹی باندھے دھما چوکڑی مچا رہے ہوتے' ورنہ پتھروں کی ڈھیریاں بنا رہے ہوتے۔ اور اندر وہ۔۔۔

"دودھ لینے جاتی ہو نا اپنے بابو جی کے ساتھ؟ دودھ والا کیسے دودھ دیتا ہے؟"

"ارے بھیا' گایا ہمارا دودھ نہیں امرت دیوت ہیں۔ جرا پانی کے دیکھو' نہ امرت دھار من میں بہہ نکلے تو ہم کا بنسی نہ کہیو۔"

کتنے ہی دن وہ دودھ والا بنی رہی۔ اس کی طرح ٹپک کر' اسی کی طرح سر دھن کر' اسی کی طرح بوے لہرا لہرا کر۔ اقبال تھوڑا محظوظ ہوتی' مبہم مسکراتی' کبھی دل تھام لیتی اور اکثر بس چپ سی ہو جاتی۔

اب جیسے ہی ماں کھیک ہوئی' اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جانے لگی۔ جب وہ ایک سے دوسرے' تیسرے' چوتھے اسٹوڈیو جانے لگی تو اس نے

Downloaded From http://paksociety.com

جان لیا' ماں کی راتیں نیند سے خالی کیوں ہوتی ہیں۔ اس کے من کا نرت دم سادھ کیوں ہے۔ جب وہ گھنٹوں فلسازوں کے دفتروں کے باہر بیٹھتی' چپراسیوں کی منت کرتی' اسسٹنٹ ڈائریکٹروں کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی تو مہ جبیں جان گئی.... اقبال بانو رات بھر کھانستی' ہائے ہائے کیوں کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"وجے جی! سنا ہے آپ نئی فلم شروع کر رہے ہیں۔ ایک بچی چاہیے آپ کو؟" اقبال نے پوچھا۔

"ہاں چاہیے تو.... کیا نام ہے بے بی کا؟" انہوں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میرا نام مہ جبیں ہے۔" ماں نے کہا تھا اپنا نام فوراً خود ہی بتا دیا کرو۔

"بہت پیاری بچی ہے تمہاری اقبال۔ خورشید تو کام کرتی ہی ہے' یہ بھی کرے گی کیا؟"

"جی یہ بھی کام کرے گی.... مایوس نہیں کرے گی آپ کو...."

وجے بھٹ نے بچی کی آنکھوں میں دیکھا اور کہے بنا رہ نہ سکے۔

"بہت معصوم ہے یہ تو۔ دیکھو آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔ یہ خورشید اور مدھو سے نہیں ملتی؟"

اقبال بھی ہنس دی۔ "سب ہی یہی کہتے ہیں۔ خدا کرے قسمت بھی ہم سے نہ ملے۔" دو چوٹیاں کیے' سفید شلوار' پھول دار قمیص میں چپ سی۔ سہم چھپانے کو ہولے سے مسکرا دیتی۔

وجے بھٹ نے مہیش بابو کو بلا کر انہیں اس کے سپرد کیا۔ وہ ماں سنگ آفس سے باہر اسٹوڈیو میں آگئی۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر مہیش بابو اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اس وقت مہ جبیں نے خود کو بڑا بے مول سا پایا۔ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

"میں نے اسے کچھ مکالمے یاد کرا دیے ہیں۔ آپ چاہیں تو یہ آپ کو ایکٹ کر کے دکھائے گی۔" اقبال مہیش بابو کی نظروں سے سہم سی گئی کہ کہیں مہ جبیں کو ناں ہی نہ کہہ دے۔

"اچھا! ذرا کر کے تو دکھاؤ بے بی...."

مہ جبیں نے سہم کر ماں کو دیکھا۔ تو کیا یہ وہی دیو ہے جس کی کہانی ماں نے سنائی تھی۔ جو سنگھاسن پر شانت بیٹھا' سانپ نیولے کا تماشا دیکھتا ہے اور بہت پرسن ہوتا ہے۔ ماں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورا۔ ماں جب گھر سے باہر ہوتی تو وہ بس اقبال بانو ہوتی' ہیم سندری کی بیٹی جس نے اکیلے پانچ بچے پالے تھے۔ جو بال ودھوا تھی۔ معاشرے سے بغاوت کرتی' روایت کی رسی پھلانگتی گھر سے نکل گئی تھی۔ گھر سے باہر مہ جبیں کو کہیں ماں نہ ملتی۔ وہ اس عورت سے ڈر جاتی جو اس کے سامنے تن کر کھڑی اسے حکم دیتی۔ وہ کھوئی والی ماں کو تلاش کرتی پھرتی اور ماں اس سنگ ایک باکمال اداکارہ بنی گھومتی۔

"چلو بے بی! انکل کو کر کے دکھاؤ.... کچھ بھولنا نہیں.... سمجھیں۔" اصل حکم ماں کی آنکھوں میں نہاں تھا' آواز میں نہیں۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو دیکھنے سے گریزاں وہ تھوڑی دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ کچھ پل گزرے اور پھر وہ دوبارہ پلٹی تو اس کی آنکھوں میں یہ ڈھیروں ڈھیر آنسو تھے۔

"ماں.... مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو.... تو لو پہلے میرا گلا دبا دو.... تمہارے بن جی کر میں کیا کروں گی۔" روکر' تڑپ کر' مر کر اس نے کہا اور چپ ہو گئی۔ مکالمے کی ادائیگی تو اتنی اچھی نہیں رہی تھی کہ وہ گھبرا رہی تھی۔ لیکن اس کا رونا' آنکھ کا درد' چہرے کا کرب کمال کر گیا۔

"ویری جی یہ مکالمے یاد کر لے گی؟"

اقبال نے کسی قدر جھک کہا۔ "یاد بھی کرے گی اور کر کے بھی دکھائے گی۔"

"ٹھیک ہے' کل بے بی کو ریہرسل کے لیے لے آئیں۔"

اقبال نے غیر یقینی سے اسے دیکھا۔ "تو لیڈ رفیس مہ جبیں کی ہوئی؟"

Downloaded From http://paksociety.com

"ریہرسل میں دیکھیں گے۔ بچی ہے پہلے کبھی کام بھی نہیں کیا۔ اتنے لوگوں میں سہم سکتی ہے' مکالمے بھول سکتی ہے۔ مجھے تو کر کے دکھادیا ہے' کیمرے کو نہ دکھایا تو؟"

"تمیش بابو! کیا آپ مجھے جانتے نہیں؟ اداکاری اس کے خون میں ہے۔" تمیش بابو مسکرادیا۔

"اگر خون اتنا ہی اثر رکھتا دیوی جی! تو گیانی کی نسل' مہا گیانی ہوتی۔" اقبال خاموش ہوگئی۔ مہ جبیں کا ہاتھ پکڑ کر گھر لائی۔ اور یوں ہر روز اسے ریہرسل کے لیے لے کر جانے لگی۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ اس سے پوچھتی۔

"منا! آج جو ریہرسل میں کیا وہ یاد ہے؟"

"ہاں ماں!"

"تمیش بابو تمہاری ریہرسل سے بہت خوش ہیں۔ لیکن دیکھو ریہرسل اور شوٹنگ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جب تم سیٹ پر کیمرے کے سامنے جاؤ گی تو سب بھول جاؤ گی۔ کیمرے کی آنکھ کا بوجھ سہ نہ پاؤ گی۔"

مہ جبیں ڈر گئی۔

"تو میں کیا کروں ماں؟" اقبال نے اسے اٹھا کر اپنے سامنے بٹھالیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ جیسے وہ پھنکار بھی رہی ہو اور منت بھی کر رہی ہو۔

"تمہاری نانی کہا کرتی تھی' شیر سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شیر سے کبھی سامنا نہیں ہوگا۔ وہ جنگل میں رہتا ہے' وہیں رہے گا۔ کبھی ہماری بستیوں کی طرف نہیں آسکے گا۔ مہ جبیں! تمہیں کیمرے سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ وہیں ٹرالی پر کھڑا رہ جائے گا۔ کبھی دھاڑ نہیں سکے گا۔ اور تم دور آسمان تلک چلی جاؤ گی۔۔۔ ستارہ بن جاؤ گی۔"

"تمہیں مہ جبیں کو اسٹوڈیو لے کر نہیں جانا چاہیے تھا اقبال! وہ تو ابھی اسکول بھی نہیں گئی۔ تھوڑا بہت کام تو خورشید بھی کر رہی ہے۔ مہ جبیں بہت معصوم ہے' اسے نہ لے جاؤ۔ اس دن لک لک کر گڑیا کی شادی پر گیت گا رہی تھی۔ اس کی لک نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا۔ ہم اسے سنگیت سکھائیں گے' وہ گانے گائے گی۔ اس کی آواز میرے زخموں پر مرہم بنتی ہے۔"

"ہماری غربت اس کے پیٹ کا ناسور بن جائے گی ماسٹر جی۔"

"یہ اس کی کھیل کی عمر ہے۔۔۔ یہ تو سوچو۔"

"سیٹ پر کھیل لیا کرے گی۔"

"آنگن کے کھیل اور اسٹوڈیو کے میدان میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گڑیوں اور کیمرے کے ڈبے میں کوئی میل نہیں۔ ہم تینوں کے جانے سے کیا ہوگیا جو اس کے جانے سے ہو جائے گا؟"

"ہم تینوں نے اپنا فن نہیں قسمت آزمائی ہے۔۔۔ یہ بھی آزمالے گی۔"

"خود کو اتنے دھوکے نہ دو اقبال! مجھ سے پرلے درجے کے موسیقاروں کو کئی کئی فلمیں مل گئیں۔ ان کی دھنوں کے ریکارڈ بننے لگے۔ بھونڈی رقاصاؤں' سستی اداکاراؤں کو کیسے کیسے کردار مل گئے فلموں میں۔ یہاں تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو۔ ہماری کلاء سچی ہو تو ہو' ہم سب کی قسمت بہت کھوٹی ہے۔ اس کے اندر آس نہ جگاؤ۔ فن کی پیاس لگ گئی تو کیسے مٹے گی؟" اقبال نے تیکھی نظروں سے علی بخش کو دیکھا۔

"تم اپنی ہارمونیم پیٹی پھینک ڈالو لیکن مجھے اس کی قسمت کا سکہ آزمالینے دو۔ مجھے کہتے ہو کہ میں خود کو دھوکا نہ دوں' دھوکا تو تم خود کو دے رہے ہو۔ کیا میں جانتی نہیں کہ ابھی بھی تم کتنے بڑے بڑے خواب دیکھتے ہو۔ آل انڈیا ریڈیو پر تمہیں اپنے گانے سنائی دیتے ہیں۔ بمبئی کی سڑکوں پر تمہیں اپنی فلموں کے پوسٹر لگے دکھائی دیتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اقبال نے پردہ اٹھا کر آواز دی۔

"منا' آجاؤ۔ وقت ہوگیا ہے اسٹوڈیو جانے کا۔"

ماں کی آواز سے پہلے ہی احساس نے جاگ کر کھیل سے اس کے ہاتھ روک دیے تھے اور وہ اپنی ہمجولی سے کہہ رہی تھی۔

"کنیز! ماں جی بلا رہی ہیں۔۔۔ جب میں واپس آؤں گی تو کھیلیں گے۔"

Downloaded From http://paksociety.com

صاف کپڑے پہنا' بال سنوار' اقبال اس سے مکالمے سننے لگی۔ ایک بار پھر سے ریہرسل کروائی اور وہ دونوں سیٹ پر آگئیں۔ مہ جبیں نے اسٹوڈیو کی اونچی چھت کو دیکھا۔ بھٹکی ہوئی ایک چڑیا اوپر چکرا رہی تھی۔ بڑی بڑی وزنی لائٹوں کو دور اوپر کتنے کئی آدمی چڑھے سیٹ کر رہے تھے۔ وہ ڈر گئی کہ ضرور کوئی اس پر آگرے گا۔

کتنے بہت سے لوگ تھے وہاں' سب مصروف۔ وہ اکیلی وہاں مجسمہ تھی۔ اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ ماں کسی سے بات کرنے لگی تھی۔ اس نے اتنے سارے لوگ' اتنا بڑا اسٹوڈیو' اونچی چھت' چھت پر بڑی بڑی وزنی لائٹیں' کیمرہ' ٹرالی' کلفٹ پہلی بار دیکھے تھے.... جنگل کی بلائیں۔

ماں نے غلط کہا تھا شیر جنگل میں ہی رہتا ہے....

اس نے آنکھیں میچ لینا چاہیں کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کیمرے کی پوزیشن سمجھانے لگا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ یہیں سے اسے عادت ہوئی چپ چاپ ہدایات سننے کی۔ پھر اس نے اسے اداکاروں سے ملوایا۔ ایک گڑیا اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ کچھ ہی دیر میں شارٹ تیار ہو گیا۔ کیمرے کی ٹرالی ٹرائل لینے کے لیے گھومنے لگی۔ وہ اس ٹرالی کے درمیان میں کھڑی تھی۔ اکیلی' چپ' تھر تھر' انتر منتر۔ ماں کی آنکھوں سے ہیم سندری جھانک رہی تھی' کھولی کا پھٹا پردہ' باسی روٹیاں' ہارمونیم کی گونگی پیٹی' کچلے مسلے خواب' روہانسی خواہشیں' سسکتی زندگی.... ان سب کے دلوں میں بہتے دکھوں کے مہاساگر.... لائٹ.... کیمرہ.... ایکشن۔

روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ کیمرے کی آنکھ نے شیر سامنہ کھولا۔ ساری دنیا نے چپ سادھ لی....

"میں ہوں مہ جبیں.... علی بخش چٹی ماسٹر کا ریاض اقبال بانو کا نرت...."

اسٹوڈیو کی دیواریں گر گئیں.... دیوانوں کا ہجوم دیواروں سے اندر آنے لگا....

بیجو باورا کی گوری.... صاحب بی بی کی چھوٹی بہو....

سارا ہندوستان دائرے میں سمٹ آیا۔

ہزاروں سال نرگس جس بے نوری پر روتی ہے....

میں ہوں وہ "صاحب جان"

☆ ☆ ☆

اس کا پہلا شارٹ کامیاب رہا تھا۔ بے بی کے لیے سب نے تالیاں بجائی تھیں۔ واپسی پر ماں کے ہاتھ میں پہلے دن کی کمائی پچیس روپے تھی اور ماں کے پیر زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اسٹوڈیو میں چلتے' سڑک کو پار کرتے' ٹرام میں بیٹھے' کھولی کی طرف آتے اس دن کئی بار ماں کے چہرے پر مسرت کے وہ رنگ نظر آئے جو اس کی کسی ساڑھی میں نہ تھے۔ ماں بنگالی گانا گنگنا رہی تھی۔ گھر واپسی پر اس کے ہاتھ میں مٹھائی تھی اور ماں کے ہاتھ میں کھانے پینے کا سامان۔

کھانا کھا کر مہ جبیں کنیز سے کھیلنے کے لیے اس کی کھولی میں گئی تو اس کی ماں بولی۔

"رات کو بھی کوئی کھیلتا ہے بٹیا؟"

"رات....!" مہ جبیں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس رات سوتے ہوئے اسے سب بھول گیا۔ گڑیا' کیمرہ' تالیاں' مٹھائی' سینما۔ یاد رہا تو بس اتنا "رات کو بھی کوئی کھیلتا ہے بٹیا...."

کتنے ہی دن وہ روز ماں کے ساتھ جاتی رہی۔ ایک دن سیٹ پر بلی لائی گئی اور وہ ڈر کر ماں کے پلو میں دبک گئی۔ اس نے چیخ مارنی چاہی لیکن مہیش بابو' جو اس کے سر پر کھڑے تھے' ان کے ڈر سے خاموش رہی۔

"بے بی! یہ بلی آپ کا منہ ایسے چاٹے گی۔" وہ کھڑے بتا رہے تھے۔

سارا اسٹوڈیو اوپر نیچے سے ہل رہا تھا۔ وہ بلی سے کسی بچھو کی طرح خوف زدہ ہوتی تھی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اس نے ماں کے پلو میں دبک جانا چاہا لیکن ماں کی نظر میں ایسی کڑی تنبیہہ تھی کہ اس کی جان پیروں کے راستے نکلنے لگی۔ شوٹنگ شروع ہوئی۔ بلی اس کے قریب آئی اور اس کا منہ چاٹنے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکن موت بن گئی۔ شہ رگ تلوار تلے آگئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

آسمان اس کا گلا دبوچنے کو جھک آیا۔ ایک بڑی وزنی سی لائٹ اوپر سے آکر عین اس کے سر پر گری۔ پھر بھی تکلیف کم نہ ہوئی اور بلی اس کا منہ چاٹتی رہی۔۔۔ چاٹتی رہی۔۔۔

یہیں سے اسے تکلیف سہ کر بھی کام کرتے رہنے کی عادت پڑی۔۔۔

☆ ☆ ☆

مدھو جانتی تھی وہ بلی سے ڈرتی ہے اور یہ کہ آج سیٹ پر بلی لائی گئی تھی۔ جب وہ بمشکل سو پائی تو وہ اس کے کان کے پاس آئی اور میاؤں میاؤں کرنے لگی۔

مہ جبیں نے وہ چیخیں ماریں کہ ننھے خان کی سارنگی موتی رام کے آرگن پر نزع طاری ہو گیا۔ ماسٹر نوشاد کی دھن نے بھٹک کر جنگل کی راہ لی۔ چھپرہ بلڈنگ' دادر پل کے اطراف' جہاں جہاں کوئی خواب میں بھی محو کلام تھا وہ بھی گونگا ہو گیا۔ ہسٹریائی چلاتے چلاتے وہ بے ہوش ہو گئی۔

اندھیروں میں برائے نام روشنی ہوئی
بستیوں میں کسی کے درد کی پکار ہوئی

جو کیمرے کے سامنے نہ کر سکی وہ کھولی میں کر دیا۔ ماں کی آنکھوں کی تیرگی اور باپ کے ہار مونیم کی پیٹی خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

☆ ☆ ☆

رات دہلی۔۔۔ دن لکھنؤ۔۔۔ پہر امروہہ۔۔۔

امروہہ کی چاندنی رات' مرحوم انیس حسن کے گھر کے آنگن میں رتے جگے سنگ جھلملا رہی تھی۔ بڑی آپا کی شادی کی ڈھولک تھی۔ سفید اجلی چاندنیوں پر لڑکیاں اپنے رنگین آنچل' کچھ پھیلائے' کچھ سمٹائے' ڈھولک بجا رہی تھیں۔ ان کی مائیں مخملیں گاؤ تکیوں سے کمر ٹکائے تخت پر براجمان تھیں۔ بچے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ ادھر بڑے کمروں میں گانگریس کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا تھا۔

امیر حیدر ادھر مردانے میں تھا نہ ادھر ڈھولک کے زنانے میں۔ وہ درمیانے میں تھا کہ دور پرے کی بوا کے تخت کے آس پاس منڈلا رہا تھا۔ کب سے ان بوا کے چاندی کے پاندان پر نظر رکھی ہوئی تھی جس پر چھوٹی جنجری لگی تھی اور چابیاں بوا جی کے پلو سے بندھی تھیں۔ پاندان بوا جی کے گھٹنے سے کچھ ایسے چپکا تھا جیسے اس میں ان کا دل ہو' اور اسے الگ کرتے ہی بوا جی فوت ۔۔۔ ہی تو ہو جاتی ہوں۔

بتاشے جی کو خراب کرتے۔ میٹھی سپاریاں' بالوشاہی اور چم چم کس قدر بدمزہ۔ اصل لطف تو اس جنجری والے پاندان میں ہی تھا بس۔

رات کا دوسرا پہر بھی بیت جانے کو ہوا۔ بوا جی کے سونے کے آثار سرے سے نظر ہی نہ آئے تو امیر حیدر نے کھسک کر بوا جی کے تخت پر جگہ بنائی۔ بوا جی اپنے رنگیلے' چمپا لگے آنچل کو پیشانی تک کھینچے سہاگ گیت گا رہی تھیں۔ اندر آپا شرم سے زعفران ہو رہی تھیں۔ لڑکیوں کا ہجوم بھی عجیب سحر انگیز تھا۔ پرپان کو چرا کر کھانے لینے کی مستی بھی کم نہیں تھی۔ آخر پاندان تک اس کا ہاتھ پہنچ گیا اور بوا کا پلو بھی ہاتھ آگیا۔ جیسے ہی اس نے جنجری میں چابی ڈالی' بڑے بھیا رضا حیدر کی پولیسی للکار نے اسے کپکپا کر رکھ دیا۔

"امیر حیدر' یہ کیا گستاخی ہے؟" ڈھولک تھمی' سب کے چہرے ادھر امیر حیدر کی طرف گھوم گئے اور بوا دھک سے رہ گئیں۔ ماں بہنیں مانو شرم سے ڈوب مریں۔

"کیا کر رہے ہو؟" جواب نہ ملنے پر سامراجی جلال عود آیا۔ جبکہ سب کو نظر آگیا تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔

امیر حیدر نے پاندان کو وہیں چھوڑا اور چاہا کہ اندر کسی کمرے میں دوڑ جائیں کہ بھائی جان نے سامنے آ کر اسے روک لیا۔

"یہ کیا کر رہے تھے۔۔۔ چوری؟"

"میں تو بس پان۔۔۔" سب اسے دیکھ رہے تھے ورنہ وہ اتنا نہ سہتا۔

"ایسے چرا کر۔ جانتے ہو نا چوری دانے کی ہو یا خزانے کی' چوری ہی ہوتی ہے۔ تمہاری انہی حرکتوں نے ہمیں عاجز کر دیا ہے۔ یوں کرو گے خاندان کا نام

Downloaded From http://paksociety.com

روشن....؟" غصے کی شدت سے آواز سارے گھر میں گونجنے لگی۔ سب ہی عورتیں اپنے دل تھام کر رہ گئیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی قریب جا کر دونوں کے درمیان آتا' ایک گونج دار تھپڑ نے امیر حیدر کو دور جا پٹخا۔ باپ کے مرنے کے بعد بھائی جان ہی تو گھر کے بڑے تھے۔ یوں اتنے لوگوں میں تھپڑ بھی مار سکتے تھے اور گلا بھی دبا سکتے تھے۔

جب وہ زمین سے اٹھا تو کیاری کی مٹی نے اس کی کچھ ایسی درگت بنا دی تھی کہ ماحول کی سفاکی کے باوجود خاندان کی لڑکیاں' اس کی دھول مٹی صورت پر کھلکھلا کر ہنس دیں۔ دن بھر جو لڑکا ہیرو بنا گھومتا رہا تھا اب وہ یوں جوکر بن گیا ہے۔ انہیں تو بھئی بڑا مزا آیا۔ سولہ سترہ سالہ امیر حیدر کھڑے کھڑے وہیں جل کر دھواں ہو گیا۔ اماں نے بڑھ کر پلو سے منہ صاف کرنا چاہا لیکن وہ کوندے کی طرح گھر کے اندر گم ہو گیا.... یہ لڑکا اگلے کئی سال گھر سے گم رہا۔ اس نے امروہہ ہی چھوڑ دیا۔

رات کالا پانی ہے.... امروہہ جیل کی سلاخیں۔

وہ لاہور چلا آیا۔ پرنسپل نے فیس کی عنایت کی اور وہ پڑھنے لگا۔ کہانیاں لکھنے لگا' اشعار کہنے لگا۔ امروہہ اس کے خوابوں میں آتا رہا لیکن وہ خواب میں بھی چل کر امروہہ نہیں گیا۔ اس کی کہانیاں اور شاعری اسے بھیڑ میں الگ کرتی گئی اور وہ راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ کلکتہ سے ہوتا بمبئی آیا۔ دوستوں نے یقین دلایا....

"بمبئی جاؤ' فلم لکھو' تم سے بڑھ کر کون اس فن کے لائق ہو گا۔"

مدرسے کا لائق فائق' اردو' عربی' فارسی کا ماہر' زبان و بیاں پر حاکم' انداز و اطوار میں شاہانہ' مزاج میں نواب امیر حیدر.... کسی نہ کسی طرح ایک بڑی فلم کمپنی کے مالک سے ملنے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ کچھ اس تک اس کی شہرت پہلے ہی پہنچ چکی تھی کہ ایک لڑکا ہے' اچھا لکھ لیتا ہے۔ دیکھ لیں۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے امیر حیدر کو دیکھا انہیں مایوسی ہوئی۔ انیس بیس سال کا' موٹا چشمہ لگائے' دھان پان سا لڑکا کیا لکھے گا۔ وہ بھی فلم.... بچوں کا کھیل تھوڑی ہے۔

"تم.... تم تو لیکھک نہیں دکھتے۔" وہ کہے بنا رہ نہیں سکے۔

"میں دیکھنے کی چیز تو نہیں جناب.... سننے کی چیز ہوں۔" سہراب مودی مسکرا دیے۔

"چلو پھر سناؤ.... دیکھتے ہیں تم کتنا سننے کی چیز ہو۔"

امیر حیدر نے ہاتھ میں پکڑی فائل کھولی اور یہ جان کر کہ جو فائل وہ کمرے سے اٹھا کر لے آیا ہے وہ تو خالی ہے' اس کا سر گھوم گیا۔ اسے سہراب مودی کے پاس آنے کی زیادہ جلدی تھی یا وہ اتنا پُرجوش ہو گیا تھا کہ یہ تک نہ دیکھ سکا کہ فائل میں اس کے لکھے کاغذات سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ سہراب مودی امیر حیدر کو دیکھ رہے تھے۔

تو کیا وہ ان سے کہہ دے کہ وہ تو خالی ہاتھ آ گیا ہے۔ ذہن میں تو بہت کچھ ہے لیکن ہاتھ میں کچھ نہیں۔ جس شخص کے آفس کے باہر کام لینے والوں کی لمبی لائن لگی تھی' وہ اس انسان کے آفس کے اندر بیٹھا تھا۔ زندگی کہیں اس پہلے موقعے کی بربادی کو زندگی کے آخر تک نہ لے جائے۔

سہراب نے امیر حیدر کو دیکھا کہ چلو میاں' دیر کیوں کر رہے ہو۔ پسینہ اس کی پیشانی پر چمکا لیکن کھڑے ہو کر اس نے جلدی سے اپنا رخ ان سے موڑ لیا۔ خالی فائل کو کتاب کی طرح کھول کر ایسے پڑھنے لگا جیسے اندر کوئی مسودہ ہی تو رکھا ہے۔

"کس نے پکارا ہمیں؟"

"جہاں پناہ...." کاندھے پر اٹھائے مردہ وجود کو فریادی' جہانگیر کے سامنے کرتا ہے۔

"کس نے ظلم کیا تم پر.... تم نے.... تم نے بدولت کی رعایا کی جان پر ہاتھ ڈالا۔ تم نے ہماری حکومت کی ساکھ پر چوٹ کی۔ تم نے ایک انسان کا خون کیا۔ تم گردن مار دینے کے لائق ہو۔ جو انسان اخلاق کے دائرے سے نکل جائے' اسے دنیا کی حد سے بھی باہر نکل جانا چاہیے۔ تمہارے لیے ہمارے انصاف نے سزائے موت تجویز کی۔ ایک ملاح کی غلطی' ناؤ کے

Downloaded From http://paksociety.com

سارے مسافروں کو لے ڈوبتی ہے۔ حکم کی تعمیل کی جائے۔"

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا جا رہا تھا' یہ جانے بغیر کہ سہراب اپنی سیٹ سے اٹھ کر باہر جا چکے ہیں۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں بھی اسے چونکنے پر مجبور نہ کر سکیں اور جیسے ہی وہ پلٹا' سہراب مودی کو عین اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ وہ نا سمجھی سے سہراب مودی اور کاغذ کو دیکھنے لگا۔

"یہ لو... تم تو کمال کے آدمی ہو..." وہ سمجھا کہ شاید انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ فائل میں کوئی مسودہ موجود نہیں۔ اب وہ اس پر طنز کر رہے ہیں۔

"جی... وہ میں... دراصل۔"

"یہ اپنا کنٹریکٹ لو تین سو روپے ماہوار پر' آج سے تم میری فلم کمپنی یوٹرن کے لیے لکھو گے۔" امیر حیدر نے کنٹریکٹ کو ہاتھ میں لیا اور حیرت سے سہراب مودی کو دیکھا۔

"عدل جہانگیر پر جو کچھ تم نے مجھے ابھی سنایا ہے' اس پر فلم لکھنا چاہو گے؟"

"ضرور جناب... اس کا مرکزی خیال مجھے شبلی نعمانی کی ایک نظم کو پڑھ کا آیا تھا... فلم کا نام "پکار" ٹھیک رہے گا؟"

"پکار" یوٹرن کی ہوئی... تم اس کا اسکرپٹ لکھو امیر حیدر۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

اپنے ہاتھ میں پکڑے کنٹریکٹ کو دیکھتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرا دیا۔ پھر میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر کہا۔

"ابھی آپ نے ہی مجھے کمال کا آدمی کہا۔ کمال کا یہ آدمی امروہہ سے ہے۔ مجھے "کمال امروہوی" کہیں۔ کیونکہ آج ابھی سے میں "کمال امروہوی" ہوں۔"

☆ ☆ ☆

"اگر میری قسمت مداری کے بندر جیسی ہی بنانا تھی تو مجھے انسان بنا دینے کا مطلب۔" (ڈائری)

روز اسٹوڈیو جانا' جیسے بحر ہند میں ڈوب مرنے کے لیے کود جانا۔ سانسیں پتھر ہو جاتیں' آنکھیں ستارا ہو جاتیں' من بھاگ جانے کو چاہتا۔ شوٹنگ کے وقفوں میں وہ ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔ اسے سب بڑے بڑے دیو لگتے' کیا مشینیں' کیا انسان۔ ان دیووں میں اس نے خود کو کبھی پری نہ سمجھا۔

جس دن شوٹنگ مکمل ہوئی' اس دن اس سے وہ گڑیا واپس لے لی گئی جو اسے بہلانے کے لیے دی گئی تھی۔ آنسو کچھ اس کرب سے اس کی آنکھوں سے نکلے کہ اقبال نے اسے فوراً اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

"اور پیسے آجانے دو۔ میں تمہیں ویسی ہی گڑیا لے دوں گی۔" چار پانچ سالہ مہ جبیں نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"آپ تو کہتی ہیں جو لوگ مر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے۔"

وہ پہلی گڑیا تھی جو اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئی تو وہ اس کے لیے مردہ ہو گئی۔ رات بھر وہ جاگتی رہی۔ اپنی گڑیا کے مردہ وجود سے لپٹ کر روتی رہی۔ پھر اس نے گڑیا کی قبر بنا دی۔ دل کے گلستان میں قبرستان بننے کی ابتدا ہو گئی۔ کتبے لگنے لگے۔ جمعراتیں' نہ شب راتیں' وہ ہر رات ان پر رو کر سونے لگی۔

☆ ☆ ☆

کافی دیر سے وہ اس کھولی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے بارے اسے بتایا گیا تھا کہ وہاں ماسٹر علی بخش کی دو چھوٹی بیٹیاں جیلر فلم کے کردار کے لیے مناسب رہیں گی۔ کمال ان میں سے کسی ایک کو اگلی فلم کے لیے دیکھ لے۔ جیسے ہی وہ ان کھولیوں کے قریب آیا اسے عجیب سی الجھن ہوئی۔ ایک لمحے کو سوچا کہ کیسے لوگ ان چھوٹے چھوٹے بدبودار ڈربوں میں رہ لیتے ہیں۔ پچھلی رات کچھ بارش ہوئی تھی' اس کی بھی بساند تھی۔ اس نے ناک پر رومال رکھا اور ادھر ادھر چند لوگوں سے ماسٹر علی بخش کے بارے میں پوچھا۔

Downloaded From http://paksociety.com

کچھ ہی دیر میں وہ اس کھولی کے سامنے کھڑا تھا جہاں چار پانچ سازندے بیٹھے اپنے سازوں کی مرمت کر رہے تھے۔ وہیں اسے علی بخش بیٹھے مل گئے۔ وہ باہر ہی کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

مدھو کو بلایا گیا لیکن اس نے دوسری بچی کو دیکھنے کے لیے بھی کہا۔ علی بخش نے مدھو کو بہن کو بلالانے کے لیے کہا۔ کمال ادھر سامنے سازندوں سے بات کرنے لگا۔

"آداب.... میں ہوں مہ جبیں... فرمایئے۔"

آواز کی کھنک' انداز کی مدھرتا نے کمال کو یکدم پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ماسٹر نوشاد ہارمونیم کے تختے اٹھائے' لوہے کی کنجیاں ٹھیک کرنے میں جتے تھے کہ اسی ساعت کتنی ہی کنجیاں سازوں کی لہریں بناتی "آداب! میں ہوں مہ جبیں۔" کے سنگ ہوتی کانوں کے پردوں پر چھن چھن برسیں۔

اس کے عین پیچھے ایک معصوم صورت چھ سات سالہ بچی کھڑی تھی۔ ادھ کھایا آم ہاتھ میں تھا' کچھ منہ پر لگا تھا۔ کمال مسکرا سا دیا۔

علی بخش سے بات کر کے جب وہ واپس لوٹا تو بھیرویں بھیس راگنیاں "آداب! میں ہوں ۔ مہ جبیں" کی صورت اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ ستار کے دو تار آپس میں آملے۔

بہت دن گزرے' وہ ٹرام میں اپنے دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ جب ٹرام چھپرہ بلڈنگ کے پاس سے گزری تو اس نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور کہا۔

"ایک دن میں یہاں سہراب مودی کی فلم کی کاسٹ کے لیے آیا تھا۔"

"اس چھپر گھاٹ سی بلڈنگ میں سہراب کی فلم کی کاسٹ کے لیے؟ ایسا کون رہتا ہے یہاں جو ان کی فلم میں کام کر سکے؟"

کمال ہنس دیا۔ لیکن پھر سنجیدگی سے کہا "آنے والے وقت کی بہت بڑی ہیروئن...."

"تم گائک بن گئیں تو دنیا کو بہت رلاؤ گی مہ جبیں۔"

اس کی آواز کے سوز پر طبلہ نواز کبھی کبھی اس کے سر پر چپت لگا کر کہتے۔ فلم کی تلاش میں اسٹوڈیو جانے کے ساتھ ساتھ وہ گانا بھی سیکھنے لگی تھی۔ ماں تو خود بہت اچھا گالیتی تھی' اسے بھی سیکھنے کے لیے بٹھا دیا۔ وہ کمر سیدھی کیے' گردن' پیٹ کو ایک بل کیے' استاد جی کے سامنے سنگیت سیکھنے کے لیے بیٹھتی تو اس کی آواز میں کھولی کی کتنی ہی راتیں اندھیرا کرنے لگتیں۔ ایسے ہی اس کی آنکھیں گمبھیر ہوتی گئیں' اس کی آواز تشریح ہوتی گئی۔

اس کا بچپن اسٹوڈیو کے شور ہنگامے' روشنیوں اور کیمرے کی ٹرالی کے گرد گزارا تھا۔ اسے باہر کی دنیا غیر حقیقی لگنے لگی۔ وہ فلم کے سیٹ پر ہوتی تو لگتا ہمیشہ سیٹ پر ہی رہے گی' زندگی یہیں تمام ہو جائے گی۔ فلم میں اس جیسے دو تین اور بچے بھی شامل ہوتے تو اس کی ان سے دوستی ہو جاتی۔ شوٹنگ کے وقفوں میں وہ آپس میں کھیلتے۔ فلم کے مکمل ہوتے ہی گڑیا کی طرح یہ دوستیاں بھی اس سے چھن جاتیں۔

اب کبھی وہ ماں جی کے ساتھ اسٹوڈیو' اسٹوڈیو فلم کی تلاش کے لیے جاتی۔ کبھی بابو جی کے ساتھ اور کبھی ماسٹر نوشاد کے ساتھ۔ اس نے چار پانچ فلموں میں کام کر لیا تھا' اسی لیے ماں کو یقین سا ہونے لگا تھا کہ فلم نگری کے ساتھ جو سنگم ان سب کا نہیں بن سکا' اس کا بن جائے گا۔ ایک دن شاید وہ کچھ نہ کچھ بن جائے گی۔

ایک دن مدھو کی ضد پر بابو جی انہیں جیسے تیسے میلہ دکھانے لے آئے۔ گلابی ساڑھی پہنے ایک من موہنی سی لڑکی نے اسے روک لیا۔

"تم فلموں میں کام کرتی ہو نا.... میں نے تمہیں دیکھا ہے۔" مہ جبیں شرما گئی۔ لڑکی نے ہاتھ میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں پکڑی ہوئی تھیں' وہ اس نے مہ جبیں کے سامنے کیں۔

"لو کھاؤ... اچھا ذرا یہ تو بتاؤ' جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو کیا کرو گی....؟"

"پڑھوں گی.... ساری دنیا گھوموں گی.... گانا گاؤں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

گی۔" وہ یہ کہنا ہی چاہتی تھی کہ آپا فوراً بولیں۔

"کیا کرے گی مطلب؟ بڑی بڑی فلموں میں کام کرے گی۔ بڑی سی موٹر میں گھومے گی۔ یہ بڑے بڑے بنگلوں میں رہے گی۔ سارا ہندوستان اس کے آگے پیچھے ہوگا۔"

"باپ رے۔۔۔" لڑکی آپا کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی اور اس کے گال پر پیار کرکے چلی گئی۔ مدھو اور آپا دونوں ہی میلے میں اترائی اترائی پھریں کہ جیسے سارا ہجوم ہی تو جانتا تھا کہ دیکھو وہ فلموں میں کام کرنے والی بے بی چلی جا رہی ہے۔ اسے لگا سب اسے ہی دیکھ رہے ہیں۔ اب اسے کہیں غلطی نہیں کرنی ورنہ شارٹ کٹ ہو جائے گا۔۔۔ وہ فلم سے نکال دی جائے گی۔

اس کے ہاتھ سے گرم جلیبی پھسل کر گری اور وہ اسے اٹھا کر کھا نہ سکی۔ "چھی دیکھو تو بے بی گندی چیزیں کھاتی ہے۔" سارا میلہ اُجڑ گیا۔ بڑی بڑی لائٹیں لگ گئیں کیمرے کی آنکھ کھل گئی ڈائریکٹر کی بھنویں تن گئیں۔ ساری دنیا اسٹوڈیو کے سیٹ میں بدل گئی۔ اور وہ تنہا کھڑی رہ گئی۔۔۔

"کس سے چھوٹ کر میں کہاں چلی جانا چاہتی ہوں۔" "معلوم نہیں۔ معلوم نہیں۔" (ڈائری)

☆ ☆ ☆

کچھ دن وہ اسکول گئی لیکن پھر اگلی فلم مل گئی تو دوبارہ نہ جا سکی۔ ماسٹر جی گھر پڑھانے آجاتے تھے۔ اپنی کتابیں وہ ہر جگہ ساتھ رکھتی تھی۔ جب شوٹنگ میں وقفہ ہوتا پڑھنے لگتی۔ سب اسے "کتابی بچہ" کہتے۔ شروع شروع میں وہ کتابیں چھپا لیتی تھی لیکن پھر ایک دن ایک ہیروئن نے اسے دیکھ لیا۔

"تم اپنی کتابیں کیوں چھپا لیتی ہو؟" گال چھو کر کہا۔

"مجھے یہ ڈر رہتا ہے کہ کوئی انہیں مجھ سے چھین لے گا۔"

"تم کسی فلم کے سیٹ سے تو نکالی جا سکتی ہو لیکن کتابوں کی نگری سے نہیں۔ تم سے سب کچھ چھینا جا سکتا ہے تمہاری پڑھنے کی لگن کو نہیں۔"

وہ بات سمجھ گئی اور اس سے یہ خوف جاتا رہا کہ گڑیا کی طرح اس سے کتابیں بھی چھین لی جائیں گی۔ یہ کتابیں اس کی تھی۔ لفظوں کے ہجے کرتے جب وہ جملے پڑھنا سیکھ گئی تو اس نے اسٹوڈیو کے میک اپ روم کے ایک دراز سے ایک کاغذ پایا۔ وہ کسی اسکرپٹ کا پھٹا کاغذ تھا۔ اس پر ایک سطر لکھی تھی۔۔۔

"زندگی کی قید و بند میں میرا قصور اتنا ہی رہا کہ میں نے وہ دل پایا جسے ہر ایک نے تختہ دار بنایا۔"

وہ اتنی حساس تھی کہ ادھوری بات کا پورا احساس پا گئی۔ کاغذ ہاتھ میں لے کر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ یکدم اس کے دل میں درد ہوا۔ اپنے دل کے تختہ دار بن جانے کا خوف اسے لاحق ہوا۔ وہ حساس تھی اتنی حساس تھی تصدیق ہو گئی۔ آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

بابو جی سے وہ ایک ہی فرمائش کرتی۔ ناریل پانی تازہ پھول اور کتاب۔ ایک گملا کھولی کے باہر لا کر رکھ دیا گیا جس پر گلاب کے دو پھول کھلے تھے۔ جنہیں وہ آتے جاتے سونگھتی رہتی۔ ناریل پانی تینوں بہنوں کو لے جا کر بابو جی پلا لاتے۔۔۔ اور کتاب۔۔۔

فلم کے سیٹ پر ایک اداکار کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں تک ہمت کرتی رہی کہ کاش گھڑی دو گھڑی کے لیے اس سے کتاب مانگ کر دیکھ سکے۔ کتاب ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے کی شدت اس انت پر ٹھہر گئی کہ اسے دن کی روشنی میں رات کے ستارے دکھائی دینے لگے۔ بہت دنوں بعد ہمت مجتمع کرتی خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی ان کے پاس گئی۔

"جب آپ یہ کتاب پڑھ لیں گے تو مجھے دیکھنے کے لیے دیں گے؟" اداکار نے چونک کر اسے دیکھا پھر ہنس دیا۔

"میں یہ کتاب دو بار پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ تم اسے دیکھ بھی لو اور پڑھ بھی لینا۔ یہ کتاب تمہاری ہوئی۔" مہ جبیں نے مرجانے کی حد تک خوشی محسوس کی اور کتاب کو پکڑ لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"ماسٹر جی کیا میں بھی یہ سب لکھ سکتی ہوں؟" جب وہ کتاب کو کتنی ہی بار پڑھ چکی تو ایک دن ماسٹر جی کو دکھاتے لگی۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ بس یہ خیال رہے کہ شاعری ٹٹو کی سواری نہیں کہ پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اس پر بیٹھ گئے۔ یہ تو اپنے آپ ہوتی ہے مہ جبیں۔"

"ساری کتابیں اپنے آپ ہوتی ہیں۔"

"نہیں! لیکن جو اپنے آپ ہوتی ہیں' وہ امر ہوتی ہیں۔ وہ خدا کی دین ہوتی ہیں' روح کی پکار ہوتی ہیں۔ سمجھو وجد کی کیفیت۔"

"میں بھی امر ہونا چاہتی ہوں۔۔۔ میں شاعری کروں گی۔"

"پر تم تو اداکاری کرتی ہو۔۔۔؟"

وہ تجھ سی گئی۔ "میں فلموں میں کام کرنا چھوڑ دوں گی۔ جب ہمارے پاس ایک گھر ہو گا۔ بابو جی کے پاس اپنی موٹر اور اتنے پیسے کہ خورشید آپا کی شادی کر سکیں۔"

"اتنے پیسے کبھی اکٹھے نہیں ہوتے مہ جبیں۔"

"ہو جائیں گے ماسٹر جی۔ دیکھیں نا میں پانچ فلمیں کر چکی ہوں۔ فلم بہن کے لیے گانا بھی گایا ہے۔ کے بی لال جی نے "لال حویلی" کے لیے بابو جی سے بات بھی کر لی ہے۔" اس نے کاپی پر لکھنا شروع کیا۔

"میں سمجھ گیا مہ جبیں۔۔۔" ماسٹر جی نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

"دیکھا ماسٹر جی۔۔۔ آپ بھی سمجھ گئے نا۔" وہ خوش ہو گئی۔

"تمہارے بابو جی بتا رہے تھے تم نے طرح طرح کے پتھر اکٹھے کرنے شروع کر دیے ہیں۔"

وہ پٹ پٹ ماسٹر جی کو دیکھنے لگی اور خاموشی سے سر جھکا دیا۔ یہ تب کی بات ہے جب ایک فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران اسے ایک پتھر ملا تھا۔ جسے اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ پتھر کی بناوٹ کچھ ایسی تھی کہ اسے لگا کہ وہ ایک چھوٹا سا بونا انسان ہے۔ چپ' خاموش' لیکن سانس لیتا ہوا۔ جیب میں اس پتھر کو رکھے رکھے وہ شوٹنگ کرتی رہی۔ اسے پہلی بار لگا کہ وہ وہاں اکیلی نہیں ہے۔ کھولی کی سہیلیاں' اسکول کی ہم جولیاں اس کے سنگ ہیں۔ شوٹنگ کے وقفے میں وہ پتھر کو جیب سے نکالتی اور اس سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ بھی اس سے باتیں کرتا۔۔۔

"اوہاں! یہ تو بولتا بھی ہے۔۔۔"

وہ ہنس دی۔ وہ بھی ہنس دیا۔ یوں روز یہ پتھر اس کی جیب میں رکھا شوٹنگ کرنے آتا۔ واپس گھر جاتا' رات کو اس کے ساتھ سوتا۔ اب وہ جہاں جاتی یہی پتھر اکٹھے کرتی رہتی۔ کمرے میں پتھروں کو جا بجا جھلونوں کی طرح سجا دیا۔ وہ ان کے ساتھ مل کر روتی' ہنستی' باتیں کرتی' غصہ کرتی' انہیں ڈانٹ دیتی۔ بابو جی نے ایک دن اسے پتھروں سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔

"منایہ کیا کر رہی ہو۔۔۔ لوگ پاگل کہیں گے۔"

مہ جبیں نے ڈر کر اپنے سارے مادھو چھپا دیے۔

"مجھے منظور ہے لیکن انہیں کوئی کچھ نہ کہے۔"

☆ ☆ ☆

فلم "پکار" ریلیز ہوئی اور کمال کی مکالمہ نویسی کے ڈنکے چاروں طرف بجنے لگے۔ فلم کی کامیابی نے اس بیس سال کے لڑکے کو صف اول کے کہانی نویسوں میں لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے وہ گھر سے بھاگ آیا تھا۔ لاہور کے ایک کالج کے گیٹ کے باہر بیٹھا' بڑی آس سے آتے جاتے طلبا کو دیکھ رہا تھا۔ پرنسپل نے کچھ اس کی نظروں میں بھانپا' کچھ اس کے حلیے سے اور اسے کالج میں اپنی سرپرستی میں داخلہ دلوا دیا۔ گھر' خاندان' محبوبہ سے دور' نئے شہر کی زندگی امتحان مسلسل تھی۔ لیکن اصل امتحان "سنیما اسکرین" تھی۔ پہلے تو اسی بات کی بہت شہرت رہی کہ ایک کم عمر لڑکے کو سہراب مودی کی فلم مل گئی ہے۔ پھر فلم بن کر مکمل ہو گئی تو سب ہی منتظر تھے کہ فلم تو ضرور ہی پٹے گی۔ سہراب مودی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ کتنا سمجھایا لیکن نہیں مانے' اب سب سمجھ میں آجائے گا۔

Downloaded From http://paksociety.com

غلطی کا احساس ہوا' لیکن ان لوگوں کو جنہیں فلم کے پٹنے کا انتظار تھا۔ "امیر حیدر" کو کمال کا آدمی بننے سے کوئی نہ روک سکا۔ اس کی فلم کی تعریفوں سے لدے اخبار امروہہ شہر میں بھی پڑھے گئے۔ جو یہ اعلان کر کے گیا تھا کہ میں اس شہر میں تب ہی لوٹوں گا جب یہ شہر میرے نام سے پہچانا جائے گا۔ شہر کو پہچان مل گئی تھی لیکن شہر کو ابھی کمال واپس نہیں ملا تھا۔

دادی نے رو رو کر زمین آسمان بھگو ڈالے تھے۔ اپنے چندن کی واپسی کے لیے انہوں نے کوئی وظیفہ' نفل' منت نہیں چھوڑی تھی۔ کوئی ایسا جاننے والا نہیں بچا تھا جسے امیر حیدر کی تلاش کے لیے ہندوستان بھر میں دوڑایا نہیں گیا تھا۔ لیکن ان کا چندن واپس نہیں آیا۔ دادی کی آنکھوں کی بینائی' آنسوؤں کے رستے بہتی رہی۔ کمال کو اپنے پیچھے شاید ہمیشہ سے ہی عورتیں رُلانے کا شوق رہا تھا۔

کام کا جنون' نام کے جنون کے سنگ تھا۔ کچھ عزت نفس کا پاس تھا' کچھ ساری دنیا کو پچھاڑ دینے کی دھن۔ جتنی اس کے نام کی شہرت ہوتی جاتی' اتنا ہی اسے دلی سکون ملتا۔ اس کی عزت اور عزت نفس کچھ کھلی ملی سی تھی۔ وہ عزت کرنا چاہتا تھا لیکن پہلے اسے اپنے لیے ساری عزت چاہیے تھی۔ اسے دینے سے پہلے لینا آتا تھا۔ وہ کچھ وصول کر کے دان کرنا چاہتا تھا۔

وہ بے حد خوب صورت اور وجیہہ انسان تھا۔ اس کی شخصیت کی دلفریبی اتنی قدرتی تھی کہ وہ جہاں سے گزرتا اس کی دھاک بیٹھ جاتی۔ بارہا اس نے رنگین شیشوں کے پیچھے لک چھپ آنچل دیکھے۔ امروہہ میں' مدرسے میں' یارانے میں' وہ اگر بہت خاص نہیں تھا تو عام تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ امیر حیدر تھا۔ اس کی چال میں خاندان کا نام' وقار' دبدبہ ہی نہیں تھا' اس کی چال میں "کمال" بھی تھا۔

کمال امروہوی ... وہ دنیا کو زیر بار رکھنا چاہتا تھا۔ محبت کو باندی' کامیابی کو پیشانی کا تلک۔ اس کے لب و لہجے کی فصاحت' اس کی سنجیدگی کی نقاشی اتنی دلفریب تھی کہ کم ہی لوگ خود کو اس کی طرف مائل ہونے سے روک پاتے تھے۔ خواتین کو اکثر یہ دھوکا رہتا کہ کمال ان ہی سے ایسے بات کرتے ہیں۔ لیکن پھر وہ جان ہی جاتیں کہ کمال کے انداز میں محبت کا وہم تو ہوتا ہے لیکن یقین نہیں۔

جہاں انڈسٹری اس کے فن اور قلم کی دلدادہ ہونے لگی تھی' وہیں اس کی ذات کے اس سبھاؤ سے خائف ہونے لگی۔ اس کی انا کے چھینٹے جب اڑتے تو کچھ لوگ منہ پر رومال رکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس کے لیے سوالیہ نشان ہمیشہ موجود رہتے۔ اسے چاہیے کیا؟ کیا صرف کامیابی یا سب کچھ؟ اگر سب کچھ تو کیا کچھ نہیں؟

انڈسٹری کی بہت سی لڑکیاں' اسے پسند کرتی تھیں۔ جن فلمی محفلوں میں وہ جاتا تھا' وہاں وہ عورتوں میں ہی مقبول رہتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک ہیروئن کو محبت نامہ لکھا۔ اس ہیروئن نے اسے اپنے میک اپ روم میں بلایا۔

"یہ خط آپ نے مجھے لکھا ہے؟" کمال صرف مسکرا دیا۔

"میں نے سنا تھا آپ اچھے انسان ہیں۔" اپنی گردن بلند کیے وہ آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ پھولے ہوئے پف کو اپنی گردن پر سیٹ کرنے لگی۔

"کیا اچھا انسان محبت نہیں کر سکتا ...؟" اس کے پیچھے کھڑا' وہ اسے سامنے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔

"کر سکتا ہے لیکن ایک ہیروئن سے نہیں۔ ہیروئن کو پالینا صرف ہیرو کے بس کی ہی بات ہے۔" ماچس کی تیلی جلا کر اس نے خط کو آگ لگا دی۔ جلتا ہوا "محبت نامہ" اس کے پیروں میں مچلتا رہا۔ پھر اس نے راکھ کو پیروں سے مسل دیا۔ بھائی سے چھٹکارے کے بعد یہ دوسرا چھٹکارا تھا جو اسے پڑا تھا۔ پہلے اس نے امروہہ چھوڑ دینے کا قصد کیا تھا' اور چھوڑ بھی دیا تھا۔ تو کیا اب اس نے "ہیروئن" کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا؟

نہیں ... اس نے ایک "بڑی ہیروئن" کو پالینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

Downloaded From http://paksociety.com

اقبال کو زندگی کے اسٹیج پر ہیرو کردار کرنا تھا۔ وہ بس سات کرداروں پر راضی نہیں تھی۔ وہ اداکارہ، رقاصہ، گلوکارہ، بن کر امر بھی ہو جانا چاہتی تھی اور اب یوں بیماری، نقاہت سے مرمٹ بھی جانا چاہتی تھی۔ ایک وہ دن تھا جب وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر فلموں کے ایوانوں میں خوشامدیں، تکراریں، منتیں کرتی تھی۔ ایک وہ دن آیا جب وہ اس سے پوچھا کرتی کہ آخر وہ یہ کام چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ اسے بھی چاندی کی کٹوری چاہیے تھی، اب وہ مٹی کے پیالے پر راضی ہو جانے پر تیار تھی۔

وہ طاؤس کی طرح کسی شہزادی کے ہاتھوں کا ساز بھی رہنا چاہتی تھی اور اک تارا بنی کسی فقیر کے ہاتھ میں بھی۔ بیماری میں ویسے بھی انسان دنیا کی بے ثباتی کو جان لیتا ہے۔ بے ضرر ہو کر خواہشوں کی پرستش کو گناہ سمجھتا ہے۔

ماں کی کچھ حسرتیں پوری ہو چکی تھیں لیکن جب اچھا کھانا، اچھا گھر، زیادہ پیسے، چاندی کا پاندان، اقبال بیگم نام ملا تو زندگی کو زنگ لگنے لگا۔ وہ ایسے بیمار رہنے لگی کہ اس نے ساری نعمتوں، راحتوں کے ذائقوں کو پچھلے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا۔

"میری ماں، تمہاری نانی، بال ودھوا تھیں۔ ان کے نصیب میں بیوہ بن کر جینا ہی لکھا تھا لیکن انہوں نے خاندان اور روایات سے بغاوت کر کے تمہارے نانا پیارے لال سے شادی کی۔ خاندان چھوٹ گیا۔ تمہارے نانا بیمار رہ کر مر گئے تو انہوں نے نرس بن کر کمانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنے پیسے نہیں کما سکتی تھیں کہ ہم پانچ بہن بھائیوں کو پال پوس سکتیں۔ ایک دن وہ پھر سے واپس تھیٹر چلی گئیں۔ جس دن وہ دوبارہ تھیٹر گئیں، اس دن میں نے ان کی کانچ سی آنکھیں کرچی کرچی دیکھیں۔"

وہ اور ماں دونوں سمندر پر چہل قدمی کے لیے آئی تھیں۔ ماں جب سے بیمار رہنے لگی تھی، اسے پانی میں ڈوبتا، ابھرتا سورج دیکھنے سے بہت سکون ملتا تھا۔ صبح کی ساری ہوا، اسے زندگی کی سانس لگتی تھی۔ بڑے جتنوں سے وہ ان سانسوں کو اپنے اندر اتارلیتی تھی۔

رات کے سکوت میں لہروں کا شور اسے ڈھارس دیتا تھا۔ "زندگی کے ساحل پر ابھی بہت ریت پڑی ہے ہم قدم بہ قدم بس چلتی جاؤ۔"

"میں اپنی پوری زندگی میں آج تک وہ انسان نہیں ڈھونڈ سکی جس نے قربانی دی ہو اور اسے دیوی، دیوتا بنا دیا گیا ہو۔ میں ایسے کسی انسان کو نہیں جانتی جس نے اپنا آپ مار دیا ہو اور اسے سنگھاسن پر بٹھا دیا گیا ہو۔ میری ماں کے دکھ کلنک کا ٹیکا بنے رہے۔ تن تنہا اس کا بچوں کو پالنا، خاندان سے بغاوت کی سزا بنا رہا۔" شام کا سورج ڈوب رہا تھا۔ ہوا، ماں کے سیاہ، گھنے بال اڑا رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں منا کہ تم پتھر جمع کرتی ہو۔ راتوں کو تمہیں ان سے باتیں کرتے سنا ہے۔ تمہیں ان کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر روتے بھی دیکھا ہے۔" ماں سے آنکھیں چرانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ماں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر، اس کی آنکھوں کو صاف پڑھ لیا۔

"تمہاری شاعری پڑھی ہے میں نے، تمہاری نانی کے بابو جی، رابندر ناتھ ٹیگور کے بڑے بھائی تھے۔ اس حساب سے وہ تمہارے پرنانا ہوئے۔ لکھنا، پڑھنا تمہارے خون میں ہے۔ فلمیں نہیں کرنا چاہتیں تو چھوڑ دو۔"

"اب چھوڑ کر کیا کروں گی ماں۔ جب تک بڑی بڑی لائٹوں کی روشنی میری آنکھوں میں نہیں پڑتی، اسٹوڈیو کی چہل پہل میرے کانوں میں نہیں گونجتی، مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ میرا بچپن ان سیٹوں پر گزرا ہے۔ اب شاید مر کر ہی کسی سیٹ سے نکلوں۔"

"شکایت کر رہی ہو؟"

"شکایت کا وقت کہاں رہا۔ میں نے اتنی سانسیں نہیں لیں جتنی ریہرسلز کی ہیں۔ اب کیسے زندہ رہوں گی ان کے بنا؟"

"تم ہیروئن تو نہیں بننا چاہتیں منا؟ نہ بننا، کبھی نہ بننا۔ شادی کرنا، اپنا گھر بار دیکھنا، ہیروئن نہ بننا۔ فلمیں

Downloaded From http://paksociety.com

المیوں کے بغیر نہیں چلتیں اور پھر ان میں کام کرنے والوں کی زندگیاں بھی۔"

ماں کی زبان کے لفظ 'نیگور' کے ان فلسفوں میں ڈھل گئے جو اس نے زندگی سے دور رہ کر موت کے قریب ہو کر کھوجے تھے۔

"مجھ سے وعدہ کرو منا کہ تم اب کوئی فلم نہیں کرو گی۔" نجانے ماں کیوں اتنی بہک گئی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا جس پر وہ وعدہ کرتی۔۔۔ نہ زبان' نہ کلام' نہ استحقاق۔ جس وقت ماں اس سے وعدہ لے رہی تھی اس وقت بابو جی فلمساز وجے جی سے باتیں کر رہے تھے۔ وجے جی نے مہ جبیں کو اپنی اگلی فلم "بچوں کا کھیل" کے لیے سائن کر لیا تھا۔

"علی بخش! فلم کا نام تو بچوں کا کھیل ہے لیکن یہ فلم بچوں کی نہیں ہے۔ بے بی بھی بڑی ہو گئی ہے۔"

"آپ نے ہمیشہ مہ جبیں کو اچھی فلمیں دی ہیں۔ پہلی فلم بھی آپ نے دی تھی۔ اب یہ اتنی بڑی فلم بھی آپ ہی دے رہے ہیں۔"

"مہ جبیں کا کام ہی اتنا اچھا ہے۔ یہ بتاؤ علی بخش کہ اور کام کراؤ گے بے بی سے؟" علی بخش اس سوال پر تھوڑا سا چونکے۔

"کام تو کر ہی رہی ہے۔۔۔"

"اگر آگے بھی کام کرنا ہے تو اس کا نام بدل دو۔"

☆ ☆ ☆

"زمین مصروف ہے سب کچھ نگل لینے کو۔۔۔ اللہ روشنی جانے کو ہے۔" (ڈائری)

ماں جی اسٹوڈیو لے گئیں تو بابو جی نے روکنا چاہا۔ ماں جی کو بیماری نے دنیا کھوکھلی دکھائی تو وہ فلم نگری سے خائف ہو گئیں۔ لیکن اب بابو جی خائف ہونے پر تیار نہ تھے۔ گھر آتے ہی انہوں نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"تمہیں نئی فلم ملی ہے اور نیا نام بھی۔"

"بابو جی اور کام کرنا ضروری ہے؟" انگلیاں مروڑتے اس نے پوچھا۔

"تم نے ابھی کام ہی کیا کیا ہے؟ بچوں کی فلمیں؟ وہی معمولی کردار۔ لیڈ میں تو کبھی نہیں آئیں تم منا۔"

"فلم میں کام تو کام ہوتا ہے بابو جی۔ معمولی کیا اور غیر معمولی کیا۔"

"بس یوں سمجھو کہ اب تک تم فلموں میں کام کرتی رہی ہیں۔ اداکاری تو اب کرو گی۔"

"اور کام کر کے کیا کروں گی؟"

"فلموں میں کام نہیں کرو گی تو کیا کرو گی؟ اتنی پڑھی لکھی تو ہو نہیں کہ کوئی اور کام کرو۔ میں نے ساری عمر یہ خواب دیکھے کہ میں ایک بڑا موسیقار بنوں۔ فلمیں میری دھنوں کے بغیر ادھوری مانی جائیں۔ لیکن مجھے کوئی فلم نہیں ملی اور تم۔۔۔"

"میں نے تو کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا بابو جی۔"

"جب ہیروئن بن جاؤ گی تو ہر رات خواب دیکھ کر سویا کرو گی۔۔۔" وہ خاموش کھڑی سنتی رہی۔

"تمہیں نیا نام دیا ہے وجے جی نے آج سے تم مینا کماری ہو۔"

☆ ☆ ☆

کمال' بمبئی ٹاکیز کی فلم "محل" ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ اس فلم کی دھوم بہت پہلے سے ہی تھی۔ اسے کسی نئے چہرے کی تلاش تھی۔

"آپ ماسٹر علی بخش کی بیٹی کو دیکھ لیں۔۔۔ بہت تعریف ہوتی ہے اس کے کام کی۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"مہ جبیں۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "اگر ہندوستان کے تمام یوسف خان اپنا نام دلیپ کمار رکھ لیں گے تو وہ دلیپ کمار نہیں بن جائیں گے۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔ اس نام کی لڑکی نہ خوب صورت ہو سکتی ہے نہ اچھی اداکارہ۔ ہر انسان جو کیمرے کے سامنے آتا ہے وہ اداکار نہیں ہوتا۔"

مہ جبیں اپنے میک اپ روم میں بیٹھی میک اپ کروا رہی تھی۔ خبری منہ اس کے کان کے پاس لا کر خبر سنا رہا تھا۔ اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

"مینا چند اجی! ایسے کیوں ہنس رہی ہیں؟ میک اپ مین نے پوچھا۔

"نہ میں خوب صورت ہوں ... نہ اچھی ایکٹریس۔"

"کس دیوانے نے کہا ہے یہ؟"

"آج رہنے دو میک اپ۔ یہ شارٹ بنا میک اپ کے ہوگا۔" اس نے میک اپ مین کا ہاتھ روک دیا۔

اس کے دل میں ایک دم ابال اٹھا۔ وہ دوسرے' تیسرے درجے کی فلمیں کر رہی تھی۔ کمال جیسا بڑا ڈائریکٹر یہ بات کہہ سکتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتی' بڑی فلمیں کیسے حاصل کرتی۔ سب اس کا کام تو پسند کرتے تھے لیکن اسے بڑی فلمیں نہیں دیتے تھے۔ فلم بچوں کا کھیل کی خوب شہرت رہی تھی لیکن پھر اس کے بعد اسے دوسرے درجے کی دھارمک اور فارمولا فلمیں ہی ملیں۔

اب مینا کماری کا نیا گھر تھا جہاں روشنیاں بھی نئی تھیں۔ وہاں پرندے چہچہاتے' درختوں اور بالکونیوں میں پھول مہکتے' موسم بدلتے۔ ماں اہتمام سے بنگالی کھانے بناتی' بنگالی میں ہی گنگناتی۔ لیکن یہ بہار مارچ کے اس پہر تک رہی جب تک ماں زندہ رہی اور پھر مارچ ہمیشہ کے لیے "خزاں ـــ" ہو گیا۔

بابو جی دل شکستہ زیادہ تھے کہ یار مونیم کی پٹی کو بھول گئے یا انہوں نے کوئی قسم کھالی تھی۔ پہلے اسے لگتا تھا کہ وقت آئے گا کہ بابو جی پھر سے کوشش کریں گے۔ لیکن شاید انہوں نے جان لیا تھا کہ اس گھر میں ایک ہی انسان کامیاب رہ سکتا ہے ـــ مینا۔

وہ ایسی ہیروئن نہیں تھی جو اسکرپٹ پڑھتی اور پھر ہاں یا ناں کہتی۔ اسے تو بس کام کرنا تھا۔ فلمیں چاہیے تھیں۔ جو تھوڑا بہت اس کا نام بنا تھا وہ اسے تیسرے درجے کی فلمیں ہی دلوا رہا تھا۔ یہ تیسرے درجے کی فلمیں بھی نہ ملتیں تو وہ کیا کر لیتی۔ کوئی بھی فلم اس کے بغیر ادھوری نہیں تھی۔ وہ کسی ایک بھی کہانی یا فلم کی ضرورت نہیں تھی۔

"کیا میں کبھی بڑی ہیروئن نہیں بن سکوں گی۔ میرے نصیب میں ایسی فلمیں کرنا ہی لکھا ہے؟" وہ وجے جی سے کہہ رہی تھی۔

وہ ہنس دیے۔ "کیسی باتیں کر رہی ہیں چند اجی ـــ وقت بدلتے' وقت نہیں لگتا۔"

"وقت بدلتے زمانے بھی تو لگ سکتے ہیں۔"

"پہلے کبھی تمہیں ایسے بے چین ہوتے نہیں دیکھا مینا ـــ تمہیں جو کام ملا تم نے کیا۔" وہ حیران ہوئے۔

"پہلے کام کر رہی تھی' روٹی کما رہی تھی۔ جن سے میں نے سنگیت سیکھا ہے' وہ کہا کرتے تھے۔ "سنگیت اتھاہ سمندر ہے۔" گائک اس کا ایک قطرہ پی لیں تو سمجھو بہت ہے۔" اس بات نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ میرا فن بھی تو سمندر ہی ہے۔ کیا میں اس سمندر کے کنارے کھڑی ہونے کے لائق بھی نہیں۔"

"اداکاری کے لیے میں نے تمہیں آج سے پہلے اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا مینا۔"

فلم نگری کے ایک بڑے نام' وجے بھٹ نے غور سے اسے دیکھا۔ ماسٹر نوشاد نے ان سے کہا تھا جو فلم دلیپ اور نرگس کو لے کر بنائی جا رہی ہے' اس میں "مینا" کو لے لیں۔ ان کی آنکھیں سکڑ کر مینا کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

"بچپن میں جس کیمرے سے ڈر لگتا تھا' آج اس سے عشق ہو گیا ہے۔" جوانی کی دہلیز پر کھڑی لڑکی کے دل کا پہلا عشق اس کی آواز کی کھنک پر کھنک رہا تھا۔

"اپنے کام سے عشق تو عبادت ہے ـــ ایسے ہی لوگ تو پھر امر ہوتے ہیں۔"

"میں نے تو کبھی امر ہونے کے خواب نہیں دیکھے۔ بس میرا فن بلند ہو جائے۔"

"سنا ہے جب کوئی پیاسا ہوتا ہے تو اسے کنویں کا کنارہ مل ہی جاتا ہے۔ لیکن کنویں سے پانی نکالنے کا انتظام اسے خود کرنا پڑتا ہے ـــ پیندے کے پانی کو اوپر لا کر اپنی پیاس بجھا سکو گی چندا؟"

مینا نے اس بڑے فلمساز کی آنکھوں میں دیکھا' دیکھا کہ وہاں حقیقت کی حکمرانی کتنی وسیع ہے۔ اس نے اپنے اندر جھانکا' اپنے من کی گہرائیوں میں' اتھاہ

Downloaded From http://paksociety.com

سمندر میں جو ٹھنڈ پڑا تھا' دور کنویں کے پیندے سے لگے پانی کو۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اپنی سولہ سترہ سالہ زندگی میں پہلی بار۔۔۔ اپنی آواز کی پوری کھنک۔۔۔ اپنے حسن کی ساری مہک۔۔۔ اپنے فن سے کامل عشق کے ساتھ اس نے کہا۔

"ہاں! میں لاؤں گی۔ اپنی پیاس بجھاؤں گی۔ ورنہ مینا' مینا کماری ہو کر نہیں مرے گی۔ ایک ٹوٹے ہوئے ساز کی ادھوری دھن بن کر بکھر جائے گی۔"

"لو پھر "بیجو باورا" تمہاری ہوئی۔"

☆ ☆ ☆

"آپ آئے' آپ نے مجھے خط لکھا اور پھر آپ نے مجھے کبھی چین سے سونے نہیں دیا۔"

کچھ وقت گزرا' بمبئی ٹاکیز کی فلم تماشا کے سیٹ پر ایک شخص آیا۔ جس کی فلم محل کی غیر معمولی مقبولیت نے اسے شہرت کی بلندیوں پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا اور وہ ہندوستان کے سکہ بند ہدایت کاروں' فلمسازوں اور کہانی نویسوں کی صف میں جا کھڑا ہوا تھا۔

یہ شخص کمال امروہوی کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

کچھ اس کی مردانہ وجاہت' کچھ اس کی جادو اثر آنکھیں' اور باقی کا سب اس کی سحر پھونکتی باتیں۔ وہ نظر بند کرنے کے سارے اختیار اپنے پاس رکھتا تھا۔ عالم پناہ شاہ جہاں کی طرح سنجیدہ ہو جانے' اور شہزادہ سلیم کی طرح بہک جانے کا وصف وہ اپنی ذات کے نہاں خانوں میں مقید رکھے ہوئے تھا۔

وہ وہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔ شوٹنگ میں وقفہ چل رہا تھا۔ وقفے میں سب ہی آرام کرتے تھے لیکن وہاں ایک چیز تھی جو محو آرام نہیں تھی۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ حیدر آبادی چپل میں ہلتا ایک گورا پیر۔ اس پیر پر سرخ بیل بوٹے بننے لگے۔ انگلیوں پر چھلے بن گئے' اطراف لکیریں نقش ہوئیں۔ پیر کی انگلیوں میں مغلائی انگوٹھیاں آ جڑیں۔ ذرا اوپر پازیب آ بندھی اور کمال کے دل کو چھو کر۔۔۔ چھن' چھن' چھن۔۔۔ کرنے لگی۔

غلام رسول کی دھن' مضراب سے ستار کو چھو کر نکلی۔

"کاش! یہ پاؤں زمین پر نہ اتریں۔"

وہ جو کوئی بھی تھی' کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے' ایک پیر ہلاتے' کتاب کو محبت نامے کی طرح پڑھ رہی تھی۔ اتنی محویت اگر کتاب کے نصیب میں تھی تو "محو محبت" وہ کس درجے کی ہو گی۔ اس کے سفید پہناوے نے ساری دنیا کو سفید کر دیا تھا اور رنگین بھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال' چاندنی رات کے راہی رہے تھے۔ سیاہی کے ساتھ چاندنی بھی چرا لائے تھے۔ اس کی پشت سے نمایاں ہوتی اس کی گردن' جس میں فقط ایک بل سانس کی آمد و رفت کو ظاہر کر رہا تھا۔

کمال کا دل اس کی دھڑکنوں کی تلاش میں نکلا۔

"سیٹی کو کتی ریل پٹریوں پر بھاگتی چلی گئی۔"

اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کمال کو یوں اسے دیکھتے پایا تو دونوں کا تعارف کرانے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن کمال نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور اکیلا ہی آگے بڑھ گیا۔ گھوم کر کرسی کے پاس پہنچا۔ چاندنی نکھر کر دن میں ڈھل آئی۔ کتاب کے الفاظ مفہوم بدل کر سرخی میں سمٹ آئے۔ اس کی آنکھیں یک بارگی اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں شرارہ لپکا پھر وہ فوراً" مسکرا دی۔

"آپ۔۔۔" اس کے عین سامنے کھڑا کمال اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں ماسٹر علی بخش کی بیٹی! جو نہ خوب صورت ہے نہ اچھی ایکٹریس۔ میرا بد صورت سا نام مہ جبیں ہے آداب۔" ہاتھ کو پیشانی تک لے جا کر اس نے کہا کمال ایک لمحے کو چونکا' اسے چھیڑ و کھولی' آم کھاتی بچی یاد آ گئی۔ "آداب۔۔۔ میں ہوں مہ جبیں فرمایئے۔"

"میں کمال امروہوی ہوں۔" اس نے سوچا آخر وہ اس لڑکی کو کیسے بھول گیا۔ یہ گناہ ہوا کیسے۔

"کون کمال۔۔۔؟" مینا نے آنکھوں کی چمک مدھم کر لی' بے نیازی نمایاں کر دی۔

Downloaded From http://paksociety.com

"آپ کمال امروہوی کو نہیں جانتیں؟"

"میں ایسے کسی بھی شخص کو نہیں جانتی.... جو مجھے نہیں جانتا۔" اس نے گردن کو تھوڑا اکڑا لیا۔

وہ مسکرا دیا۔ "جب میں محل فلم بنا رہا تھا تو میں نے کہا تھا "کون چندا" لگتا ہے آپ تک وہ خبر پہنچ چکی ہے۔"

"اگر آپ نے یہ کہا تھا کہ کون چندا، تو اس میں آپ کی بدنصیبی تھی میری نہیں۔"

"اور یقیناً" میری بدذوقی بھی...."

اس نے کچھ اس انداز سے سر جھکا کر اپنی غلطی تسلیم کی کہ چندا اپنے بالوں کی کچھ لٹوں کو جھٹک کر ہنس دی۔ اور ہنستے ہنستے اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانت میں دبا کر چھوڑ دیا۔ کمال نے بمشکل اس منظر سے نظریں ہٹائیں اور نظریں جھکا کر اس کے پیروں کو دیکھا۔

"تمہارے پاؤں بہت حسین ہیں مینا۔ انہیں زمین پر نہ اتارا کرو۔ میلے ہو جائیں گے۔" کہا اور وہ چلا گیا۔

مینا ہکا بکا کھڑی رہ گئی اور وہ دور.... دور ہوتا گیا.... اتنا دور کہ کہیں بہت پاس آ ٹھہرا۔

دور بہت دور سے ایک ٹرین آ رہی تھی، وہ اس کا مسافر لا رہی تھی۔ اس کا دلدار، اس کا محبوب۔

"تمہارے پاؤں مینا...."

دھرتی پر اس نے اپنے پیروں کو پھول پایا.... دل کو گلستان....

وہ یہ جان نہ سکی کہ اسے کس بات نے زیادہ خوش کیا ہے۔ کمال کی تعریف نے یا ایک کامیاب کہانی نویس اور ہدایتکار کی تعریف نے۔ اس بات نے کہ اب شاید وہ اسے اپنی کسی بڑی فلم میں لے لے گا۔ یا اس بات نے کہ اب وہ اکثر اس سے ہمکلام ہوا کرے گا۔

رات نے سونے نہ دیا.... دھڑکنوں نے رج جگا کیا۔

"وہیں تھم کے رہ گئی ہے.... وہیں تھم کے رہ گئی ہے۔

میری رات ڈھلتے ڈھلتے...."

✡ ✡ ✡

اقبال بنگلہ، جو ماں کے نام سے تھا، کے دریچوں میں موسم پھر سے مہکنے لگے تھے۔ پھولوں کا ڈھیر لگائے، کھڑکی کی دہلیز پر بیٹھی، وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ ملازم نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

"کون ہے....؟" جب شوٹنگ نہیں ہوتی تھی تو اسے کسی سے بھی ملنا بہت مشکل لگتا تھا۔

"وہ بولے نام نہیں بتائیں گے.... آپ کو بلا کر لاؤں۔"

"ایسا کون باغی آیا ہے جو ہمارے گھر آ کر ہمیں ہی کچھ بتانے سے انکاری ہے۔" وہ ہنس دی۔ دوپٹہ سنبھالتی اٹھی۔

اتفاق سے وہ ننگے پاؤں تھی۔ قالین پر اس کے پیروں کی مدھر دھمک سے اس نے مڑ کر اسے دیکھا.... اس سے پہلے پیروں کو۔ وہ سمٹ سی گئی۔ جی چاہا پیروں کو ہاتھوں میں سجا لے۔

"کمال آپ....؟" کوئی آ کر کہہ دیتا کہ آسمان زمین پر آ گیا ہے تو وہ اتنا حیران نہ ہوتی جتنا کمال کو اپنے گھر دیکھ کر ہوئی۔

وہ کھڑا تھا، اس کی حیرانی پر زیر لب مسکرا دیا۔ "سنا ہے آپ کے پاس بہت سی کتابیں ہیں؟"

اسے یاد نہ آیا کہ وہ جو الفاظ ادا کر رہا ہے، ان کا مطلب کیا ہے۔ یہ کتاب کیا چیز ہوتی ہے۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"سنا ہے آپ کے پاس بہت سی کتابیں ہیں۔" پہلے وہ مسکرایا اور پھر دہرایا۔

وہ چونکی، آس پاس دیکھا، کچھ کچھ یاد آیا۔ "ج.... جی! بہت سی ہیں.... آپ کون سی پڑھیں گے؟"

"سب.... جو نہیں لکھی گئیں وہ بھی۔" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے کر، اس کی طرف جھک کر، بہت قریب ہو کر وہ کہہ گیا۔

مینا نے بے اختیار ہاتھ کو دل کی طرف اٹھتے پایا۔

Downloaded From http://paksociety.com

ہونٹ کو دانت سے کاٹ کر چھوڑا اور ساری دنیا میں شور مچاتی اپنی دھڑکن کو ہولے سے ڈانٹا۔ وہ اسے اپنے کتابوں کے ذخیرے کے پاس لے آئی۔

"یہ اتنی کتابیں آپ پڑھ چکی ہیں یا نمائش کے لیے رکھی ہیں۔۔۔ یہ دیوان' یہ ناول؟"

"نمائش کی چیزیں نشست گاہ میں سجی ہیں' یہ میرا کمرہ۔۔۔ آپ کو تو یہاں لے بھی آئی' ورنہ کم ہی لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت ملتی ہے۔"

کمال نے ایک کتاب اٹھائی' اس پر اس کا اپنا شعر لکھا تھا' تخلص ناز بھی لکھا تھا۔ "تو آپ شاعری بھی کرتی ہیں؟"

"جی۔۔۔ کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔۔۔"

"دوسروں کی کتابوں پر کیوں لکھتی ہیں۔۔۔؟"

"شاید کسی کی تحریر کو اپنا عنوان دینا چاہتی ہوں۔"

کمال نے کتاب ہاتھ میں لیے لیے' مڑ کر اسے دیکھا' پھر فاصلہ کم کرتا عین اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ایک فلم تحریر کی ہے میں نے۔۔۔ عنوان بنو گی؟"

"کیسا عنوان۔۔۔؟" آپ سے وہ تم ہوئی۔ وہ مسکرا دی۔

"انار کلی۔۔۔" دونوں ہاتھوں میں کتاب دبائے' سینے سے لگائے وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہی تو اس کا سلیم ہے۔ انار کلی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھتی رہی۔ آج تک وہ تیسرے درجے کی فلمیں کرتی رہی تھی۔ اب اسے ایک ایسی فلم دی جا رہی تھی جس پر ہر کوئی بات کر رہا تھا۔

"میں انار کلی بنوں گی؟"

"پورے ہندوستان میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

"پورے ہندوستان میں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں۔" اسے لگا یہ فقرہ فلم کے لیے نہیں کہا گیا۔ وہ خاموشی سے گیت ہو گئی۔

"ماسٹر علی بخش آئیں تو ان سے کہیے گا' کمال امروہوی آئے تھے۔ انڈسٹری کی سب سے خوب صورت اور باکمال اداکارہ کو فلم "انار کلی" میں کاسٹ کرنے۔" اس کے قریب سے گزرتے' اس کی پیشانی پر الجھی بکھری لٹ کو اپنی انگلی سے چھو کر کہتے وہ چلا گیا۔

اس بار پھر وہ چلا گیا۔۔۔ لیکن خود کو وہیں چھوڑ گیا۔۔۔ مینا کے پاس۔۔۔

کتاب کمال کے ہاتھ میں تھی' لیکن وہ اسے پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ کتاب ایک اسکرین تھی جس پر چوڑی دار' نیلے دامن پر سرخ آنچل لہرا رہا تھا۔ وحشت و محبت بیک وقت ایک ہی نگاہ میں' وہ کتنی بار دیکھ چکا تھا لیکن یوں ہلکان نہیں ہوا تھا۔ باقر علی کافی دیر اسے یوں گم صم دیکھ کر ہنس دیا۔

"کس اسکرپٹ پر کام کر رہے ہیں جو یوں بدھا گیان میں ہیں؟"

"میں نے مینا کماری کو انار کلی کے لیے سائن کر لیا ہے۔"

"لیکن فلمساز تو نہیں مان رہا۔۔۔"

"کیسے نہیں مانیں گے مکھن لال جی۔۔۔ ماننا ہی پڑے گا۔"

"آپ مینا کے لیے اتنے بضد کیوں ہیں؟ انار کلی کے لیے تو کوئی بڑی ہیروئن ہونی چاہیے۔ جیسے مدھوبالا۔"

"باقر علی! تمہیں میری "صاحب جان" یاد ہے۔۔۔ مینا ہی وہ صاحب جان ہے۔"

"جس فلم کو بنانا آپ کا خواب ہے' اس کے لیے آپ ایسی لڑکی کا نام لے رہے ہیں جو معمولی فلموں میں کام کرتی ہے۔"

"اگر مینا صاحب جان نہ بنی تو یہ فلم بھی نہیں بنے گی۔"

"کون سی فلم۔۔۔ یہ انار کلی۔۔۔؟"

"نہیں' میری پاکیزہ۔"

☆ ☆ ☆

"ڈھونڈو۔۔۔ کھوج' کہتے ہیں ختم نہیں ہوتی' کہیں

Downloaded From http://paksociety.com

چلے جاؤ بس چلتے جاؤ۔" (ڈائری)

وہ تینوں مہابلشیور گھومنے آئے تھے۔ "بیجو باورا" اس کی کیا ہوئی' انار کلی' نور جہاں اور پھر فٹ پاتھ میں پہلی بار دلیپ کمار کے ساتھ اسے سائن کر لیا گیا تھا۔ بابو جی نے کہا وہ اسے اور مدھو کو گھماتے ہیں۔ اس کا تو پہلے ہی دل چاہتا تھا کہ وہ وادیوں میں کھو جائے۔ پھر کوئی اسے آواز دیتا ڈھونڈنے آئے۔ مدھو کو یہ فکر لاحق تھی کہ پھر پتا نہیں وہ کتنی مصروف ہو جائے۔ کب وقت ملے' کب وہ ساتھ مل کر گھومیں۔

"بابو جی بڑی فلموں کے لگنے کے بعد یہ باہر نکلا کرے گی تو دیکھیے گا کیسے بھیڑ لگ جایا کرے گی۔ کھڑکیاں ٹوٹ جائیں گی سینماؤں کی۔" شام کو پہاڑیوں میں ٹہلتے' راہ چلتوں نے جب مینا پر کوئی خاص توجہ نہ دی تو مدھو کہے بغیر نہ رہ سکی۔

بابو جی ہنس دیے۔ "مدھو! مجھے لگتا ہے کہ یہ حسرت تمہاری ہے۔"

"ہماری اتنی قسمت کہاں تھی کہ ہم مینا بنتے۔ دیکھیں ذرا جس لڑکی کو آپ یتیم خانے کی سیڑھیوں پر چھوڑ آئے تھے' آج وہ کتنی بڑی اداکارہ بننے جا رہی ہے۔"

مینا نے بابو جی کے چہرے کے دیے بجھتے دیکھے تو ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"مجھے تو یہ مسرت بے حال رکھتی ہے کہ آپ بمبئی کی سڑکوں پر روتے پھرتے تھے۔ پھر واپس آکر آپ نے مجھے بانہوں میں سمیٹ لیا۔"

"کچھ اس لیے بھی تم میرے اور اپنی ماں جی کے دل کے اور قریب ہو گئی تھیں۔ خدا کے کھیل ہیں' شاید اسی چنگاری سے ہماری محبت کی آگ بھڑکنی تھی۔"

وادی میں بادل بھی ان ہی کی طرح گھومتے پھرتے تھے' ٹھہرے ہوئے سے۔ پرتاب گڑھ' بھوانی کا مندر' افضل خان' اور بندے شاہ کا مقبرہ اور پھر پانچ سو سیڑھیاں۔ ڈھیر ساری چڑیوں کو جیسے پہلی بار دیکھا۔ کتنے نئے پھولوں کو کھوجا' انہیں چنا۔ خوشبوؤں کو اس نے قید کرنا چاہا۔ نیلی گھنٹی (بیلو بیل) کو وہ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر دیکھتی رہی۔ کتنے ہی پتھروں نے اس کا راستہ روک روک لیا اور اس نے وہ سارے پتھر چن لیے۔ اب تو یہ پتھر گنگنانے بھی لگے تھے۔ آسمان کے رنگ رات کو کہکشاں سنگ سنگ بدلتے رہے۔ دور نیچے وادی میں کھڑی ہو کر' دور اوپر ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھنا' خوش نصیبی سے کم تو نہیں ہوتا۔

"یہاں تو اللہ! کتنے ڈھیر سارے ستارے ہیں۔ آہ' ہر شام کیسی پاک پاک سی ہے۔ زمین پر یوں دور تک پیر رکھتے چلے جانا' اللہ!" (ڈائری)

خاموشی' تنہائی اور سکون ہمیشہ سے اسے مطلوب رہے تھے۔ وہ یہ تو نہیں چاہتی تھی کہ ساری دنیا سو جائے' بس اتنا کہ ساری دنیا کچھ خاموشی کو بھی سن لے۔ چاند کے پار جا کر' دلدار کے ساتھ جا کر' وہ شاعری کرتی۔

یوں تیری رہ گزر سے
دیوانہ وار گزرے
تو نے بھی ہم کو دیکھا
ہم نے بھی تجھ کو دیکھا
تو دل ہی ہار گزرا
ہم جان ہار گزرے

صبح مدھو نے اسے اٹھایا تو وہ تب بھی ہولے ہولے گنگنا رہی تھی.... رات کی چھیڑی تان.... صبح تک نہ ٹوٹی....

"تو دل ہی ہار گزرا.... ہم جان ہار گزرے...."

مدھو نے دل تھام لیا۔ "اللہ سے رحم مانگو مینا! کیسی جان سے جانے کی باتیں کرتی ہو۔"

اپنے رنگین آنچل کو لہرا کر اوڑھتے' کھڑکی کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اس نے دونوں بازو پھیلا کر سامنے پھیلی وادیوں کو رازدار بنا کر انگڑائی لی۔ پلٹ کر مدھو کو دیکھا اور گلابی مسکراہٹ سجا کر کہا۔

چھم چھم کرتی پایل جیسی....
کھن کھن کرتی چھاگل جیسی....

مدھو نے اسے چونک کر دیکھا۔ "تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ میں نے آج سے پہلے تمہیں اتنا

Downloaded From http://paksociety.com

حسین نہیں دیکھا۔ دل چاہتا ہے تمہارے قدموں میں جھک جاؤں۔"

"جھک تو میں گئی ہوں۔" مینا نے زیر لب کہا "رات بھر دو آنکھیں۔۔۔ اور میرے دو پاؤں۔"

بمبئی واپسی پر بھی وہ زیر لب یہی گنگناتی رہی۔ "تم دل ہی ہار گزرے' ہم جان ہار گزرے۔" نجانے وقت کی آنکھ میں بال آیا تھا' یا اس کی قسمت ہی زیادہ اونچائی پر جا کر بیٹھ گئی تھی کہ دھڑام سے نیچے آگری۔ ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جس وقت اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے اس وقت بھی وہ یہی کچھ گنگنا رہی تھی۔۔۔

"ہم جان ہی ہار گزرے۔"

☆ ☆ ☆

فلم انار کلی کی لوکیشن دیکھنے کے لیے کمال' دہلی میں موجود تھا۔ کتنے دنوں سے وہ لوکیشنز دیکھ رہا تھا لیکن پسند آ کر بھی اسے کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ بلی ماراں میں کچھ دوستوں نے رات کو محفل غزل بھی سجائی لیکن وہ اوب کر اٹھ آیا۔ ساری شاعری' ساری غزلیں' سارا چین و قرار کہیں دبک گیا اور دل کو بڑی بے کلی لگی رہی۔ رات بھر اس کی نیند ایسے ٹوٹتی رہی جیسے کوئی اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھا رہا ہو' چھم چھم کمرے میں بج رہا ہو۔

رات کانٹا ہوئی۔۔۔ نیند دیوانی۔۔۔

صبح ہوٹل کی بالکونی میں چائے پیتے' اخبار پڑھتے' وہ چونک کر کچھ اس بے قراری سے اٹھا کہ تپائی ساری کی ساری فرش پر آگری۔ دہلی کی ساری دھول اس کی آنکھوں میں گھس آئی۔

"اداکارہ مینا کماری' اپنے والد اور بہن کے ساتھ مہابلیشور سے واپس بمبئی آتے ہوئے کار حادثے میں بری طرح سے زخمی ہو گئی ہیں۔"

یہ مئی' یہ ظالم مئی۔ وہ جہاز سے بمبئی اور بمبئی سے پونا پہنچا۔ مینا کو دیکھتے ہی جیسے اسے یقین سا ہو گیا' کہ یہی لڑکی اس کی موت کی وجہ بنے گی۔ اس کا دل چاہا گھٹنے ٹیک دے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ زندہ تھی۔ لیکن یہاں تک کے سفر میں اس نے کتنی بار اس کا جنازہ دیکھ لیا تھا۔ کتنی بار اسے قبر میں اتار چکا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی لیکن آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ مدھو جوس کا گلاس لیے اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ کچھ پی لے۔ وہ اپنے آنسوؤں سے انکار کر رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بری طرح سے کچلا گیا تھا کہ ڈاکٹر ہاتھ کو کاٹ دینے پر غور کر رہے تھے۔ ایک کٹے ہوئے ہاتھ کی لڑکی کو لوگ بھنگن کا کردار تو شاید دے دیں' نور جہاں یا انار کلی کا کیوں دیں گے؟

"کیا ہوا مینا۔۔۔؟" پھولوں کو ہاتھوں میں لیے' اس کے سامنے آ کر وہ پوچھنے لگا۔

"آپ۔۔۔ یہاں؟" اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس نے فوراً" کھول دیں۔

"کیسی ہو۔۔۔؟ رو رہی ہو۔۔۔؟"

"میرا ہاتھ کچلا گیا۔۔۔ م۔۔۔ میں۔" اتنے سے لفظ ادا کرتے اس کی سانس پھول گئی۔

وہ جو بیڈ سے دو قدم دور کھڑا تھا' دو قدم سمیٹ کر قریب ہوا۔ مدھو کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور اس پر ذرا سا جھک گیا کہ ان دونوں کی آنکھوں میں فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ گلاس کو اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"تم زندہ ہو۔۔۔ تو میں زندہ ہوں۔۔۔ کیا یہ کافی نہیں؟"

مینا اپنی نگاہ سمیٹ نہیں پائی تھی کہ اس سے بھی کہیں پہلے وہ پورے دل سے' پورے شوق سے' کمال امروہوی پر نثار ہو گئی۔ اس سے پہلے تک اس نے جتنا بھی در گزر سے کام لیا' چارہ نہ ملا۔ وہ اس کے وجود میں سمٹ جانے کے لیے بہت شوق سے بکھری۔

"ہاں بات کچھ اور تھی کچھ اور ہی بات ہو گئی
اور آنکھ ہی آنکھ میں تمام رات ہو گئی"

"مینا کماری کا ہاتھ کچلا گیا ہے۔" یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح فلم نگری میں پھیلی۔ وہ بری طرح سے زخمی ہے' مر بھی سکتی ہے' ورنہ فلم کرنے لائق تو

Downloaded From http://paksociety.com

مشکل سے ہی رہ سکتی ہے۔ یہ افواہیں اخباروں کی زینت بننے سے پہلے فلم ایوانوں کی زینت بنیں اور ایک ایک کر کے اسے ان فلموں سے نکالا جانے لگا جو وہ بمبئی میں سائن کر کے آئی تھی۔ جو کہانی شروع ہی کی تھی وہ اختتام پذیر بھی ہو گئی۔ جیسے دعا کو قبولیت کے بعد 'راستے میں روک لیا گیا تھا۔

وہ بدترین ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئی کہ بس مر ہی جائے گی۔ اگر اس نے یہ ٹھان ہی لی تھی کہ اسے بڑی فنکارہ بننا ہے تو تقدیر ایسے دشمنی پر کیوں تلی تھی۔ ہتھیلی میں آ کر سب ریت کی طرح پھسل گیا۔ تو کیا یہ بات وراثت کی طرح نصیب میں بھی لکھ دی گئی تھی کہ علی بخش کے خاندان میں 'اقبال کی اولاد میں سے 'کوئی فنکار نہیں بنے گا۔ کوئی اپنی پیاس نہیں بجھا پائے گا۔"

"جو ہمارا نہیں ہوتا' وہ ہمارے پاس بھی نہیں رہتا مینا۔" کمال نے اسے تسلی دی۔

"چھن جانے سے پہلے' ہمیں معلوم بھی تو نہیں ہوتا کہ کیا ہمارا نہیں تھا۔"

کمال نے چونک کر مینا کو دیکھا۔ "تمہاری باتیں مجھے حیران کر دیتی ہیں۔"

"آپ کی سحر زدہ..." اس کی زبان سے پھسلا اور یکدم اس نے اپنی زبان اپنے دانتوں میں دبالی۔

"تم تو خود ساحرہ ہو... کرو توڑ میرے سحر کا... پھونک دو مجھ پر خود کو۔" اس کے زخمی ہاتھ کو کمال نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اپنی پیشانی پر رکھ دیا' اور آنکھیں بند کر لیں۔

ساری دنیا سو گئی... ہاتھ انتر منتر جنتر پڑھ پڑھ کر آنکھوں پر پھونکتا رہا۔

دل جو دم سادھ تھا سہاگ راگنی ہوا۔

اب روز وہ بمبئی سے پونا ہسپتال کار چلا کر کے آتا اور پھولوں کے ڈھیر اس کے کمرے میں سجا دیتا۔ جاتے ہوئے اسے ایک خط دے جاتا۔ پھر وہ بھی خط کے بدلے خط دینے لگی۔ چار مہینوں بعد جب وہ ہسپتال سے گھر جا رہی تھی تو اس کے کھلے ہوئے ہاتھ پر لپٹی سفید پٹیوں پر لکھا تھا...

"میری انار کلی!"

☆ ☆ ☆

"محبت وہ سفر ہے' جس میں انسان اکیلا ہی اپنا راز دار اور ایمان دار ہوتا ہے۔"

جو نصیب میں نہیں تھا وہ جاتا رہا' فلمیں 'لوگ' بہت کچھ اور بھی۔ کچھ انگریز ڈاکٹروں نے علاج کیا' کچھ باہر سے منگوائی دوائیوں نے اثر کیا' بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بے کار کر کے ہاتھ سلامت رہا۔ دو تین زیر تکمیل فلمیں تھیں جن سے اسے بہت امیدیں تھیں لیکن سینما کا کیا کیجیے کہ یہاں کوئی شرط نہیں لگ سکتی۔ سینما تو سب جوا ہے۔ اچھا اسکرپٹ بھی پٹ سکتا ہے۔ پھس پھس کہانی اور کردار بھی سلور گولڈن جوبلی کر سکتے ہیں۔ لکھمن لال دیوالیہ ہو گیا اور انار کلی نہ بن سکی۔ چار چھ ریل شوٹنگ ہوئی اور فلم ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ اسے "نور جہاں" کے جانے کا بہت دکھ تھا۔ لیکن کمال کا سوچتی تو ڈھارس رہتی۔ حادثہ ہوا تو کیا کچھ حاصل ہو گیا۔

کمال کے خط مینا نے اپنی سانسوں سے زیادہ سنبھال کر رکھے تھے۔ رات میں وہ جانے کتنی کتنی بار انہیں پڑھتی۔ بستر پر ان خطوں کو پھیلا لیتی۔ کھڑکی سے آتی ہوا جب انہیں پھڑپھڑاتی تو لفظ کمال بن کر اٹھ کھڑے ہوتے۔

"کاش دوا کی طرح درد بھی خریدے جا سکتے' میں تمہارے سارے درد خرید لیتا منجو۔"

وہ جھوم جاتی' ہر بار' ہزار بار۔

"میں اس دن کی گواہی دینے کے لیے تیار ہوں جس دن تم پیدا ہوئیں کہ تمہیں میرے لیے بنایا گیا۔"

منجو مسکرا مسکرا کر رات کو کمال کر دیتی۔ دل کے دروازے وا کیے وہ بہت اہتمام سے کمال کا استقبال کرتی۔ اس کی آنکھوں کے ستارے کہکشاں بن گئے۔

"جان چندن منجو! میں تمہاری آواز کی اس کھنک کا دیوانہ ہوں جو میرا نام لیتے تمہاری سانسوں سے سفر کرتی' میری سماعتوں سے آملتی ہے۔ جی چاہتا

Downloaded From http://paksociety.com

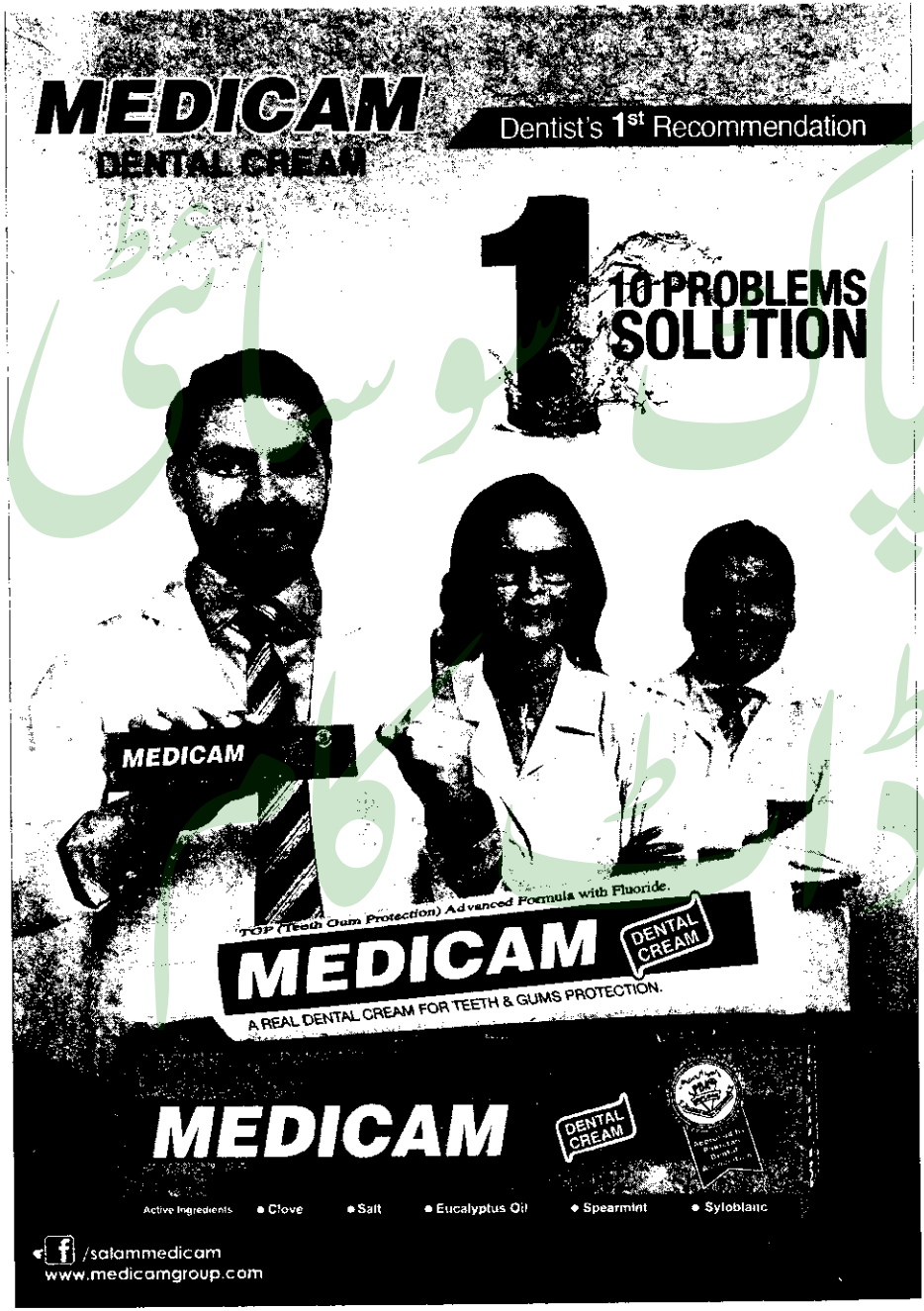

Downloaded From http://paksociety.com

ہے اس کھنک کی چوکھٹ کا دیوانہ بن جاؤں۔"

چندن کی منجو ہنستی جاتی اور پیروں کی ایڑیاں اٹھا' ان کی پائلیں چھن چھن چھنکائیں۔

"ایک دن میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں ہو۔۔۔

قیامت آجائے اور وہ دن تمام نہ ہو۔۔۔۔"

کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے' دوسرے میں خط پکڑے 'ایڑیاں چھن چھناتی گوری۔ وہ کچھ اور نہیں آغاز سے انجام تک "جمال یار" تھی۔ "محو کمال" تھی۔

دو گناہ کبھی نہ کرو۔۔۔

دو دلوں کے درمیان کبھی نہ آؤ۔۔۔ دو دلوں کو کبھی دور نہ کرو۔۔۔

☼ ☼ ☼

ہو۔۔۔ جی ہووووو۔۔۔ووو۔۔۔ووو

"میں گنگا کی موج تو جمنا کا دھارا۔۔۔ ہو رہے گا ملن یہ ہمارا تمہارا۔"

وہ اور مدھو بازار آئی تھیں۔ دونوں برقع میں تھیں۔ یہ تو ان دونوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ سنیما میں گھس جانا' ساحل پر گھومتے ناریل پانی پینا' کار کے ہوتے بھی ٹرام میں سفر کرنا' تانگے میں بیٹھ کر آوارہ لڑکوں کی طرح بمبئی کی سڑکوں کو ناپتے رہنا اور نہ پان کی دکان سے پان لے کر بکریوں کی طرح چبانا۔ زیادہ وقت مل جاتا تو ایک ایک کر کے سب سہیلیوں کے گھر جانا۔ ان سے بیاہ کی بابت پوچھنا' اپنے بیاہ کے بارے بتانا اور پھر منہ میں دوپٹے ٹھونس ٹھونس قہقہوں کو روکنا۔

مدھو ہی سب بھاؤ تاؤ کرتی تھی۔ وہ بس ہوں ہاں ہی کرنے پر مجبور تھی۔ اس کی آواز ایسی کھنک دار تھی کہ کوئی نہ کوئی پوچھ ہی لیتا' آپ مینا کماری ہیں' وہی الہ دین والی۔ پھر انہیں ٹھنڈا گرم پلایا جاتا۔ وہ ایسی ناز برداریوں کی قائل ہی نہیں تھی۔

تھوڑی بہت خریداری وہ کر چکیں تو پان کی دکان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ مدھو گئی' پان لے کر آئی اور مدھو نے تو نقاب بھی اتار دیا لیکن جیسے ہی اس نے نقاب کے نیچے سے ہاتھ لے جا کر پان کو منہ میں ڈالنا چاہا' نقاب ڈھلک کر نیچے آگرا۔ اس نے جھٹ پان کو منہ میں ڈالا لیکن اس سے پہلے ہی پان والا چلا اٹھا۔

"وہ دیکھو گوری۔۔۔"

آس پاس جتنے لوگ کھڑے تھے' انہوں نے سرعت سے گردن گھمائیں۔ سرعت سے ہی انہوں نے نقاب ڈالے اور تیز تیز قدم اٹھاتی پان والے سے دور ہو گئیں۔ لیکن۔۔۔ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی چند لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا اور بس۔۔۔

اور بس پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا بازار "گوری گوری" کی تکرار سے گونج اٹھا۔ جو یہاں وہاں خریداری میں مصروف تھا وہ فرض اولین جان کر "گوری" کو دیکھنے کے لیے بھاگا۔ وہ بری طرح حواس باختہ ہو گئی۔ لوگوں کا ہجوم شہد کی مکھیوں کی طرح اس کی طرف بڑھا اور وہ اتنی تیزی سے آگے بھاگی جیسے بیل دوڑ میں آکھڑی ہوئی ہو۔

مدھو نے اس کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ دونوں بازار میں بھاگ رہی تھیں۔ ان کے برقع اڑ رہے تھے۔ کسی بھلے مانس نے جلدی سے دونوں کو اپنی دکان کے اندر کیا اور دروازہ بند کر لیا۔ باہر سارا بمبئی سمٹ آیا۔ شور تھا کہ کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ وہ دکان کے لکڑی کے دروازے کے ساتھ لگی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔

"اس دکان کے اندر گوری ہے۔۔۔ مینا کماری۔۔۔"

وہ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ باہر لوگ پاگل ہو رہے تھے۔ مدھو مزے سے کرسی پر بیٹھی فون آگے کھسکائے پولیس کو کال کر رہی تھی۔ اور وہ۔۔۔ خوفزدہ سی۔۔۔ سہمی ہوئی دروازے کی ایک جھری سے آنکھ لگائے باہر دیکھ رہی تھی۔

ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ لوگ تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے جیسے ریڈیو پر نشر ہو گیا ہو کہ وہاں "بیجو باورا کی گوری' ماسٹر علی بخش کی مینا کماری کھڑی ہے' جاؤ جا کر اس کی آرتی اتار لو۔"

"بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا۔۔۔

Downloaded From http://paksociety.com

جب یاد میری آئے ملنے کی دعا کرنا۔۔۔"

منچلوں کا ہجوم لک لک کر گا رہا تھا۔ دروازے پر دھکے پڑ رہے تھے۔ پولیس کی سائرن بجاتی گاڑی آ رہی تھی۔ پولیس منچلوں پر لاٹھیاں برسا رہی تھی لیکن منچلے تو کیا عورتیں تک وہاں سے ہلنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ سب مر کر ہی سہی اسے دیکھ لینے پر بضد تھے۔

"گوری مجھ سے دور نہ رہو۔۔۔ ورنہ میں باورا ہو جاؤں گا۔" ہجوم یک زبان فلم کا مکالمہ دہرا رہا تھا۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مدھو اس کے ساتھ کھڑی جھری سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے جھری سے آنکھ اٹھا کر مدھو کو دیکھا۔

"یہ سب کیا ہے مدھو؟"

"تمہارے دیوانے۔۔۔" اس نے آنکھ مار کر کہا۔

وہ آنکھیں جھپکانا بھول گئی۔ اکتوبر کا مہینہ' پچاس جمع دو کا سن۔ بیجو باورا نے ہندوستانی سنیماؤں کی کھڑکیاں توڑ ڈالی تھیں۔ فلم سلور جوبلی سے ڈائمنڈ جوبلی تک جا کر بھی نہیں رک رہی تھی۔ سارا ہندوستان "بیجو باورا" کا الاپ الاپ رہا تھا اور یہاں دروازہ بس ٹوٹ جانے کو ہی تھا کہ مدھو نے اس کے شانے کو ہلایا۔

"باہر سارا ہندوستان تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے امڈ آیا ہے۔ دیکھو کہ اب یہ ہجوم تمہیں کتنی بڑی ہیروئن بنانے والا ہے۔ تم باورا کی گوری ہو' اور ان کی "مینا کماری۔"

☆ ☆ ☆

"مینا نے کبھی چاند کو سورج ہوتے نہیں دیکھا تھا اپنی قسمت کو یوں بدلتے دیکھ کر دیکھ لیا۔"

اخبارات' رسائل' آل انڈیا ریڈیو کو اور کوئی کام نہیں تھا سوائے "بیجو باورا کی گوری" کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہنے' نشر کرتے رہنے کے۔

دلیپ کمار کے بعد اب انہیں ایک مینا ملی تھی' جس پر اگر لکھا نہ گیا تو قلم توڑ ہی تو دیے جائیں گے۔

روپ تارا اسٹوڈیو' چھپرہ کھولی' کھولی کا کونا کونا' یتیم خانے کی سیڑھیاں' بچپن سے اب تک کی ساری فلمیں' کچھ بھی تو نہیں چھوڑا تھا صحافیوں نے۔ اب بات ٹیگور سے شروع ہوتی' بال ودھوا ہم سندری سے پربھا دیوی' اقبال بانو سے ہوتی علی بخش کی بیٹی مینا کماری تک آتی۔ فلم تھی کہ سینماؤں سے اترنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ہندوستان "گوری گوری" کی پکار سے گونج رہا تھا۔ ریڈیو "بیجو باورا" کے فرمائشی گانوں کو چلا چلا کر بھی نہیں تھکا تھا۔ "بچپن کی محبت" گیت نے لوک گیت کا روپ دھار لیا۔ شہروں سے نکل کر گانا' ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں گونجا۔ ہر چھوٹے' بڑے نے اسے سبق کی طرح یاد کیا' ترانے کی طرح گنگنایا۔ جیسے کشن کنہیا اپنی بانسری اسی گیت میں ڈھال گئے ہوں۔

اس کے گھر کے باہر فلسفازوں کی لائن لگ گئی۔ معاوضے ان کے ہاتھ میں تھے۔ رہی سہی کسر دلیپ کمار کے ساتھ کی گئی فلم "نغمہ پاتھ" نے پوری کر دی۔ اخبارات نے اس میں کوئی شک نہ رہنے دیا کہ وہ کتنی بڑی اداکارہ ہے۔ ناؤ کھیتی گوری' ہو جی ہوو کرتی گوری' باورے کی گوری۔ اس کی اداکاری نے گاؤں کی گوریوں کو بھی دنگ چھوڑ دیا تھا۔ حقیقت نگاری کے اس درجہ کمال فن نے اسے سب سے آگے لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔

فروری میں 'بیجو باورا کی ریلیز کے ہی سال۔۔۔ سرخ آنچل اس نے اپنے سر پر ڈال' گھونگھٹ بنا' خود کو کمال کے نام کر دیا۔

"مہ جبیں' منجو' بنام کمال امروہوی۔۔۔

مہر۔۔۔ عشق۔۔۔

مہواجب۔۔۔ بس تم تم۔۔۔

کمال کا منیجر باقر علی اس کا ولی بنا تھا۔ وہ برقع میں مدھو کے ساتھ آئی تھی۔ عام معمول کے کپڑوں میں ایک سرخ دوپٹہ ہی تھا جو وہ اپنے بیگ میں رکھ کر لانے میں کامیاب ہو پائی تھی۔ بابو جی سے چھپ کر وہ نکاح کر چکی تھی۔ مینا کمال ہو کر کمال کی دوسری بیوی بن چکی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی۔ بابو جی کو کچھ کچھ شک تھا لیکن اتنا یقین نہیں تھا کہ وہ ایسے نکاح کر سکتی ہے۔ ایک کہانی نویس ' ہدایتکار کی حیثیت سے انہیں کمال پسند تھے لیکن اپنی بیٹی کے شوہر کی حیثیت سے نہیں۔ کمال عرصہ پہلے امروہہ میں شادی کر چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

چاہ کر بھی وہ بابو جی سے شادی کی بات نہیں کر سکی۔ دل ہی دل میں وہ سارے دلائل بابو جی کو دے چکی تھی اور جان چکی تھی کہ وہ کبھی کمال کے لیے نہیں مانیں گے۔ دونوں کو یہی طے کرنا پڑا کہ وہ نکاح کر لیتے ہیں۔ پھر بابو جی کو راضی ہونا ہی پڑے گا۔ رخصتی پھر ہو جائے گی۔

اور رخصتی ہوئی۔۔۔

نکاح وہ کر چکی تھی۔ شوٹنگ سے آنے کے بعد رات گئے تک وہ کمال سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتی رہتی تھی۔ ایک دن ملازم نے کچھ شک محسوس کیا اور بابو جی کو بتا دیا۔ اسی رات گھر میں طوفان آگیا اور اسے کہنا ہی پڑا۔

"ہمارا نکاح ہو چکا ہے بابو جی۔"

سناٹے پر اس نے موت کا یقین پھینک دیا۔ بابو جی اسے ایسے دیکھنے لگے جیسے وہ ان کی بیٹی نہ ہو' بازار میں کھڑی فاحشہ ہو۔

"تم نکاح کر چکی ہو؟" یہ لفظ اتنی دیر بعد ان کے منہ سے نکلا کہ گمان ہوا وہ گونگے ہو چکے تھے۔

"جی۔۔۔ م۔۔۔ میں تو مناسب وقت کے انتظار میں تھی۔ آپ کو خود بتانا چاہتی تھی۔"

"چھپ کر نکاح کے بعد کون سا وقت مناسب رہ جاتا ہے؟ میرے مشورے کے بغیر تم نے آج تک کوئی فلم نہیں کی' تم نے نکاح کر لیا؟ تم مہ جبیں ہی ہو نا؟ میری بیٹی؟"

"ہمیشہ آپ کی بیٹی ہی رہوں گی۔ میرا یہ نکاح قبول کر لیں۔ اپنی خوشی سے مجھے کمال کے ساتھ رخصت کر دیں۔"

"تم تو ابھی بیس سال کی بھی نہیں ہوئیں۔ بیس فیصلے تم نے اپنی زندگی میں خود سے نہیں کیے اور تم نے خود سے عمر میں پندرہ سال بڑے آدمی سے چھپ کر نکاح کر لیا۔" ایک ایک کر کے سارے سرپٹی ماسٹر کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"آج میں نے جان لیا کہ مناجو' میری بیٹی تھی اب وہ "مینا کماری" بن چکی ہے۔ بہت بڑی ہیروئن۔ جائیں مینا جی! دوبارہ اس غریب کو اپنی شکل مت دکھائیے گا۔ اگر کہیں تو ہم آپ کے اس گھر سے نکل جاتے ہیں۔"

مینا کے دل میں کسی نے تیز دھار انی اتار دی۔

"مجھے معاف کر دیں۔۔۔ ایسے نہ کہیں۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔"

"تم نے کمال سے طلاق نہ لی تو میں مر جاؤں گا۔"

بات گھر سے نکلی اور فلم نگری تک پہنچی۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ دکھ سے اس کی آنکھیں اندر دھنسنے لگیں۔ وہ کملا کر رہ گئی۔ گھر کے تناؤ نے اس پر اتنا دباؤ ڈالا کہ کیمرے کے سامنے وہ بت بن کر کھڑی ہو جاتی' اپنے مکالمے بھول جاتی۔ وہ باپ کو پالیتی تو کمال کو چھوڑنا پڑتا' کمال کو حاصل کرتی تو باپ کو بھولنا پڑتا۔

بابو جی نے مدھو سے بھی بات چیت بند کر دی تھی۔ گھر میں ایسا سناٹا رہنے لگا تھا جیسا ماں کی موت کے دنوں میں رہا کرتا تھا۔ بابو جی کسی بھی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں کمال داماد کی حیثیت سے قبول ہی نہیں تھا۔

مینا کمال کی فلم سائن کر چکی تھی' اس کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی لیکن وہ بابو جی کے عہد کے ہاتھوں مجبور تھی۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"اگر تم کمال کی فلم کے سیٹ پر گئیں تو واپسی پر تمہیں گھر کے دروازے بند ملیں گے۔"

"میں نے غلطی کی ہے تو مجھے معاف نہ کر کے آپ غلطی نہ کریں بابو جی۔ ایسے دکھ میری زندگی کے دن کم کر دیں گے۔"

"میں محبوب صاحب کو ہاں کہہ چکا ہوں ان کی فلم امر میں تمہیں کام کرنا ہے۔" بابو جی نے اس کے

Downloaded From http://paksociety.com

آنسوؤں کی قطعاً" کوئی پرواہ نہ کی۔ اور کمال اور اپنے درمیان اسے لے آئے۔

"میں امر نہیں کروں گی۔۔۔"

"کون ہے جو محبوب صاحب کو ناں کہہ سکتا ہے؟ جانتی ہو نا کہ فلم کے ہیرو دلیپ کمار ہیں۔"

دل پر پتھر رکھ کر وہ امر کی شوٹنگ پر جانے لگی۔ چار پانچ دن بمشکل گئی پھر چھٹے دن معاہدہ توڑ کر بمبئی ٹاکیز میں کمال کی فلم "دائرہ" کے سیٹ پر کیمرے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور اسی دن گھر واپسی پر اسے گھر کے دروازے بند ملے۔ بابو جی نے اسے چلے جانے کے لیے کہہ دیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ تم نہیں جاؤ گی۔ اب تم اس گھر سے بھی چلی جاؤ۔"

"میں ان سے طلاق نہیں لوں گی۔ آپ کو بھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ ضد چھوڑ دیں بابو جی۔۔۔"

"تم نے یہ نکاح کرتے ہوئے ایک بار بھی میرے بارے میں نہیں سوچا مینا؟" اب وہ اسے مینا کہتے تھے۔

"مجھ سے جو ہو سکا وہ میں نے آپ کے کہنے پر کیا۔ کیا کبھی میں نے کوئی شکایت کی؟"

"تو تم بھی لوگوں کی زبان سیکھ آئی ہو۔ ساری دنیا کہتی ہے مینا کا باپ اس کی کمائی کھاتا ہے۔ بولو مینا! کیا تمہیں بھی یہی لگتا ہے؟ میں نے تمہاری کمائی کھائی ہے؟" مینا خاموش کھڑی رہی۔

"ایک دن میں نوشاد کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ میرا ہار مونیم لے لے اور مجھے اس کے بدلے کچھ پیسے دے دے۔ جانتی ہو کتنے پیسے؟ پچیس روپے، جو تمہاری ایک دن کی فلم کی کمائی تھی، وہ میری ساری زندگی کی ریاضت کی کمائی تھی۔ وہ ہار مونیم مجھے تم تینوں سے بڑھ کر عزیز تھا۔ لیکن تمہیں بھوکا دیکھا تو اسے لے جا کر بیچنا چاہا۔ اگر میں موسیقار بن جاتا، مجھے سنگیت کے علاوہ کچھ اور آتا تو تمہیں "مینا کماری" نہ بننے دیتا۔"

"مجھ پر آپ کا حق سلامت ہے بابو جی۔ میری بوٹیاں کر دیں۔" روتے روتے وہ ان کے قدموں میں گر گئی۔

"تمہارے لیے فیصلہ نہیں کر سکا تو تمہارے خون کا کیا کروں گا۔"

"وہ میرے شوہر ہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہیں اجازت دے دیں کہ وہ مجھے رخصت کروا کر لے جائیں۔"

"تمہارے نکاح میں تمہارا باپ ہی ولی نہیں بنا تو جاؤ مینا، اب خود ہی رخصت ہو جاؤ۔ کیسا انسان ہے وہ جس نے تم سے چھپ کر نکاح کر لیا؟ کہاں گئی اس کی شرافت؟ کیا اسے یہ گوارا ہو گا کہ اس کی بیٹی یوں چھپ کر نکاح کرے؟"

اس نے ان کے ہاتھ لجاجت سے پکڑ لیے۔ "بھول سمجھ کر معاف کر دیں۔ ایسے نہ کہیں۔"

"تم ہی وجہ نام ہو گی، تم ہی سے بدنامی ہو گی، معلوم نہ تھا۔ میرے دکھ کا مداوا تمہاری کوئی معافی نہیں کر سکتی۔ اب لوٹ جاؤ مینا۔۔۔ تمہاری واپسی ہوئی بھی تو تم علی بخش کو پہلے جیسا نہ پاؤ گی۔ شیشہ ٹوٹ کر بھی کبھی جڑا ہے۔ تم ایک بہت بڑی ہیروئن بننے جا رہی ہو اور میری حیثیت صرف ایک کمائی کھانے والے باپ کی ہی رہے گی۔ دنیا کبھی یہ سمجھ نہیں پائے گی کہ علی بخش موسیقار نے مہ جبیں کو اپنی ساری تپسیا، اقبال بانو نے اپنے رقص کا سارا ثمر دیا تو پھر کھولی میں رہنے والی "مہ جبیں" مینا کماری بنی۔"

"میں آپ کی تپسیا ہی ہوں بابو جی۔ مجھے یوں ادھورا نہ چھوڑیں۔"

"چلی جائیں، جائیں مینا جی! اس گھر میں آپ کو علی بخش تو شاید مل جائے گا لیکن "مہ جبیں کا باپ" نہیں ملے گا۔" بابو جی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے باہر لے جا کر کھڑا کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

وہ دروازہ پیٹتی رہی، پیٹتی رہی۔ گھر کے باہر کھڑی وہ اتنی شدت سے رو رہی تھی کہ ماں کے مرنے پر بھی کیا روئی ہو گی۔ گھر کا دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ باپ کے گھر کی دہلیز پر سر پٹختے پٹختے اس نے فن کے رازوں کو، غم کے سہارے پا لیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

اور ہاں اب اس نے جان لیا۔ اب وہ ایک بڑی اداکارہ بنے گی۔ دکھ نے اس کی روح میں کمند لگانی شروع کردی ہے۔ دیمک اس میں رینگ رینگ آرہی ہے۔۔۔ اب۔۔۔ ہاں اب۔۔۔

جب ساز ٹوٹے۔۔۔ تب موسیقار بنے۔۔۔

جسم مٹے، روح آہ میں ڈھلے تو "فنکار" بنے۔

جانے اس نے کس پہر دعا کی تھی۔ دعا کی قبولیت کے آثار تھے۔ فن کا سمندر، جوار بھاٹا بنا پھٹا اور اس کی لہریں اس کے پیروں سے آلپٹیں اور وہ شدت کرب سے چلا اٹھی۔

یہیں سے وہ "مینا کماری" بنی۔

☆ ☆ ☆

"دروازوں پر دیے جل رہے ہیں لیکن ان کے اندر۔۔۔ چار دیواری میں کتنا گھپ اندھیرا ہے۔

بے شکل اندھیرا اور دروازوں پر دیے جل رہے ہیں۔۔۔" (ڈائری)

وہ فلموں کی ہیروئن تھی لیکن ایک عام لڑکی تھی۔ عام لڑکی بن کر ہی محبت کی، شادی کی، اور اسی طرح دلہن بن کر رخصت ہونا چاہتی تھی۔ لیکن اب وہ شلوار قمیص میں، بھیگے گالوں کے ساتھ، اپنی رخصتی خود ہی لے کر کمال کے گھر آگئی تھی۔ کمال کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا وہ اسے ہزار طرح سے بہلا رہا تھا۔ تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"تم سے محبت میرا قصور ہے۔ بابو جی نے مجھے اپنے سنگیت سے زیادہ چاہا ہے اور میں انہیں تم سے زیادہ نہ چاہ سکی۔ جب میں نکاح کرنے جارہی تھی تو تم نے مجھے سمجھایا کیوں نہیں کہ ہم پہلے بابو جی کو منائیں گے۔ ان کی رضامندی سے نکاح کریں گے۔

بابو جی نے آج مرنے کی باتیں کیں۔ انہوں نے کہا "مینا جی" مجھے منا کہنے والا باپ مجھے "مینا کماری" کہہ رہا ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اس گھر سے نکل جائیں جو میرے پیسوں سے بنا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ کیا وہ ان نوالوں کو بھی منہ سے نکال نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیں جو وہ کھا چکے ہیں۔ میں کیسی اولاد ہوں، میں نے کیا کر دیا؟ مجھے یہ کیوں لگا کہ میں تمہیں کھو دوں گی۔۔۔ اب دیکھو میں نے ایک کو پا کر دوسرے کو کھو دیا۔۔۔ کیا حیثیت ٹھہری میرے باپ کی؟ میرے شوہر کے مقابلے میں کمتر؟ میرا۔۔۔ میرا باپ تم سے مقابلے میں ہار گیا۔۔۔ میں نے اسے ہرا دیا۔" ہسٹریائی ہو کر وہ ہنسنے لگی۔ پھر رونے لگی۔ پھر قہقہے لگانے لگی۔

باپ کا دلایا آنچل مسلا گیا۔۔۔ آنکھ کا سارا کاجل پھیل گیا۔۔۔

آئندہ کبھی مینا کو کیمرے کے سامنے رونے کے لیے کسی مصنوعی سہارے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غم کے سائے ہر فلم کے ہر منظر میں نظر آئے۔

اس کی آنکھ ہمیشہ بھیگی ملی۔۔۔ اس کی مسکان ہمیشہ زخمی دکھی۔۔۔

اور یوں وہ۔۔۔ "گریٹ ٹریجڈی کوئین آف انڈین سینما" کہلائی۔

"ہندی سینما کے استھان کی نئی ملکہ۔ بیجو باورا کی گوری۔ مینا کماری۔" (اخبار)

"بیجو باورا" پر فلمی تاریخ کا پہلا فلم فیئر ایوارڈ اسے مل گیا۔ سارا ہندوستان، پوری فلم نگری انگشت بدنداں رہ گئی۔ صرف پانچ لوگوں کو ایوارڈ دیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک مینا بھی تھی۔ فلمی تاریخ کے پہلے ایوارڈ کو حاصل کر کے اس نے تاریخ رقم کردی تھی۔ بڑی بڑی ہیروئنوں کو اس انیس بیس سال کی ابھرتی ہوئی اداکارہ نے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ایک بڑا اداکار "دلیپ کمار" ایک بڑی اداکارہ بننے جارہی "مینا کماری"۔ ایوارڈ نے جیسے دونوں کو ہم پلہ کردیا تھا۔ اس ٹرافی نے اس پر کامیابی کی پہلی مہر لگائی۔ ایوارڈ ہاتھ میں لیے اس کی تصویر ہندوستان کے ہر اخبار میں چھپی۔ لوگوں نے اپنی پیاری "گوری" کی تصویریں کاٹ کاٹ کر سنبھال کر رکھیں۔ سرورق کے لیے اس کی تصویریں حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے رسالوں کے ایڈیٹروں کی جوتیاں گھسنے لگیں۔

اگلے ہی سال، ایک بار پھر سے سب کو پچھاڑتے

Downloaded From http://paksociety.com

ہوئے' ایک اور تاریخ رقم کرتے ہوئے اس نے "شری چترجی" کے مشہور ناول پر بنی فلم "پرنیتا" پر بھی ایوارڈ حاصل کرلیا۔ یوں رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ عروج کے ستارے کا پورا آسمان اس کا ہوا۔ لوگوں نے کہا "پرنیتا" میں وہ کسی بھی بنگالی عورت سے زیادہ بنگالی لگی ہے۔ لڑکیاں للیتا کی محبت میں ڈوب گئیں۔ اس کے سنگ روئیں' اس کے سنگ ہنسیں۔

"وہ تم جیسی پتنی کی قدر نہیں کرتے؟"

"میں ان کے کاموں کا وچار نہیں کرتی....."

اپنے شوہر سے محبت کرنے والی ہر لڑکی نے اس فقرے کو اپنی نوک زبان پر پایا۔ اخباروں نے اسے مثالی ہندوستانی لڑکی کا خطاب دیا۔ گھر گھر وہ ایک ایسی لڑکی کے روپ میں یاد کی جانے لگی جو محبت کو مذہب سے بڑھ کر نبھاتی ہے۔ یہی اس وقت کا آغاز تھا جب دلیپ کمار کے بعد لوگ اس کے نام سے ٹکٹ لینے لگے۔ سینماؤں میں کھینچ لانے کے لیے پوسٹر پر اس کا نام کافی تھا۔ "مینا کماری" وہ فلم ساز' کہانی کار' ہدایت کار جو اب تک مینا کے مستقبل کا فیصلہ کرتے آئے تھے' اب ان کے مقدر کا فیصلہ مینا کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ کسی ایک فلم کے لیے اس کی "ہاں" اخبار کی خبر بن جاتی۔

"فلم بمل رائے کی ہو اور اداکاری مینا کماری کی۔ ایسی فلم کا انتظار کسے نہیں ہوگا۔ مینا کماری نے "دو بیگھہ زمین" سائن کرلی ہے۔" (اخبار)

☆ ☆ ☆

زندگی کا خاکہ پہلے سے نہیں کھینچا جاسکتا۔ کب کیا ہوگا' کیوں اور کیسے ہوگا' یہ سوچا تو جاسکتا ہے لیکن اس ہونی پر اختیار نہیں رکھا جاسکتا۔ اگر بابو جی نے کمال کو قبول نہیں کیا تھا تو کمال کے گھر والوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا تھا۔ ہنگامہ دونوں طرف رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ امروہہ میں اٹھنے والا شور ان کے گھر تک نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں اپنے گھر میں خوش تھے۔ اپنی دنیا بسا چکے تھے۔ اگر محبت ایک بیماری تھی تو یہ بیماری بگڑ کر اب "عشق" کے عارضے میں بدل چکی تھی۔ اس کی معصومیت' خوب صورتی میں بدل رہی تھی۔ اس کی چال' ناز' ادا' وہ "کمال سے کمال" ہو رہی تھی۔

"پرنیتا" فلم کی پریس ریلیز میں مینا نے اپنے اور کمال کے رشتے کو کچھ ایسے عام کیا تھا۔

میں پرنیتا (شادی شدہ) ہوں؟

کس کی....؟

"کمال کی....."

صحافی دنگ رہ گئے۔ اخبارات نے وہ شور مچایا کہ ہفتوں' ہندوستانیوں کو مینا کماری کے کمال کی "پرنیتا" ہونے پر یقین نہ آیا۔ کہیں حیرت' کہیں دکھ' کہیں بے قراری۔

"مینا جیسی معصوم' ادب نواز' شاعرانہ مزاج کی مالک لڑکی کو کمال نے اپنے جال میں پھنسا لیا۔" اخباروں نے اس طرز کی سرخیاں لگائیں۔ تبصروں' تجزیوں' تنقید' کالا متناہی سلسلہ شروع ہوگیا تو اسے ان اعتراضات کا جواب دینا پڑا۔

"لوگ سمجھتے ہیں کہ ہیروئن کی شادی بس ہیرو سے ہی ہونی چاہیے جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ایسا ہی ہو۔ شادی کے لیے محبت کا ہونا ضروری ہے' شوہر کا ہیرو ہونا نہیں۔ اگر دنیا میں اس وقت کوئی عورت پورے دل سے سکھی ہے تو وہ میں ہوں۔ اگر اس زمین پر کسی کا دل دکھ سے خالی ہے تو وہ میرا دل ہے۔"

وہ گھر آتی اور منجو بن کر تیار ہوتی۔ کمال کے کرتے اس کا پہناوا ہوتے ورنہ وہ شرارے' فراکیں' ساڑھیاں پہنتی۔ گلابی' سبز' سفید' چمکیلے' جھلملاتے آنچل اوڑھتی۔ ہاتھوں میں کئی طرح کے زیور سجاتی۔ لمبے سیاہ بالوں کو نت نئے انداز سے گوندھتی۔ اس کے گھر میں ڈھیروں ڈھیر پھول مہکا کرتے۔ اس کے دل کی طاق پر انتظار کے دیپ جلتے۔ محبت کی زمین پر کمال اس کا آسمان تھا۔

فارغ وقت میں وہ' سنیما جاتے' تھیٹر دیکھتے' تاش

Downloaded From http://paksociety.com

کھیلتے' کار لے کر سیر و سیاحت کے لیے نکل جاتے۔ چاندنی راتوں میں ساحل پر چہل قدمی کرتے۔ محفلیں ہوتیں' یاروں کا ہجوم ہوتا اور وہ اپنے رنگین آنچل اوڑھے' چوڑیاں جھنکاتے' کمال کی نظروں کے تعاقب میں جھلمل ہوتی۔ وہ کمال کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ لیتی تو اسے لگتا کہ اس نے ستاروں کے جھرمٹ کی کمان کو ہاتھ میں لے لیا ہے اور اب انہیں کائنات کے سب ہی کنارے چھو لینے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

اس نے اپنے گھر کو اپنی مرضی کے رنگ سے سجایا۔ "سفید" رنگ سے۔ سفید رنگ اسے اتنا بھاتا تھا کہ وہ ساری دنیا کو ہی سفید کر دینا چاہتی تھی۔ کمال سے ملاقات سے بھی پہلے اس نے کمال کی تصویر اخبار سے کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھی۔ اب وہ تصویر اس کی ڈائری میں محفوظ رہتی تھی۔ اس تصویر سے اس کا رشتہ کمال سے اس کے حقیقی رشتے سے کہیں زیادہ گہرا تھا۔

اس کے ساتھی اداکار اسے سیٹ پر دیکھتے تو چونک جاتے' مسکرا دیتے۔ اس کی خوب صورتی خیرہ کن ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا یہ محبت کا اثر ہے مینا؟"

"نہیں... کمال کا..."

اسے کمال کی باتیں کمال کے لب و لہجے میں کرنا اچھا لگتا تھا۔ ہر بات میں اس کا حوالہ دینا' کیسے بھی کر کے اس کے ذکر کو گھسیٹ لانا۔ اس ذکر کو طول دیتے جانا۔ وہ کمال کو بیان کرتے اس کی تشریح کرتے تھکتی نہیں تھی۔

اس کی فلموں اور ہر طرح کے معاہدوں کا چارج کمال اور کمال کے خاص آدمی باقر علی نے سنبھال لیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان معاملات سے دور بھی رہی تھی اور ان میں کوری بھی۔ ویسے بھی اسے دماغ کو زحمت دینا پسند نہیں تھا۔ پہلے یہ کام بابو جی کرتے تھے۔

"آہ بابو جی!" کتنی ہی بار وہ جا کر ان کے شانے پر سر رکھ کر آنسو بہا چکی تھی۔ ان کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا چکی تھی لیکن ان کی خاموشی چپ کسی کونے میں پڑی تھی۔ اب وہ اس کے ذاتی یا فلمی معاملات میں نہیں بولتے تھے۔ باپ کی ناراضی کا یہ انداز اس کے اندر ناسور بن کر پنپنے لگا۔ بابو جی کی آنکھوں میں سر شام ہی رات کا سناٹا اس کے دل کے ٹکڑے کر دیتا۔

اس کی نظروں میں وہ علی بخش گھوم جاتا جو پھٹے پرانے کپڑوں' گھسے ہوئے جوتوں میں بمبئی کے اسٹوڈیو میں کام کی تلاش میں صرف اس لیے بھٹک رہا ہوتا کہ بیمار بیوی کو دوا اور بھوکے بچوں کو پیٹ بھر خوراک مل جائے۔ اپنی ساری ہستی مٹا کر اسے "مینا کماری" بنا کر وہ باپ اب خاموش ہو گیا تھا۔ وہ جب جب سیٹ پر کسی فلمی باپ کے سامنے مکالمے بولتی' اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ دل تڑپ اٹھتا۔

اقبال بنگلہ میں وہ دن دوبارہ طلوع نہ ہوا جس دن بابو جی اس کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر آواز دیتے۔

"منا! اٹھ جاؤ... تم رات بھر کتابیں پڑھتی ہو اور پھر یوں دیر سویر کرتی ہو؟"

وقت تو لوٹ کر نہیں آئے گا لیکن شاید وقت بھیس بدل کر بھی نہیں آئے گا کہ جب وہ بابو جی کا ہاتھ کھینچتے ہوئے انہیں میلے میں چلنے کے لیے کہے گی۔ یا انہیں اپنی کار میں بیٹھا کر بمبئی کی سڑکوں پر ایسے گھمائے گی کہ وہ چلانے لگیں گے۔

"منا! تم تو پاگل ہو چکی ہو لیکن مجھے تو سلامت رہنے دو... موٹر کو نہیں بھی دے مارو لیکن پہلے مجھے اتر جانے دو..."

ماں باپ کے ساتھ گزرا وقت اذیت ناک ہو یا خواب ناک' وہ روح کی طرح دل سے کبھی جدا نہیں ہوتا۔ موت کی پہلی سانس سے ذرا پہلے تک بھی' اس وقت کا احساس جان نہیں چھوڑتا۔ یوں وہ بیک وقت دو زندگیاں گزار رہی تھی۔ "مہ جبیں بانو" اور "مینا کماری ناز" بن کر۔

"مجھے میرا ماضی ہمیشہ پکارتا ہے۔ آوازیں دیتا ہے۔" (ڈائری)

مہ جبیں اپنے ماں بابو جی کے ساتھ کھولی میں رہتی۔ رات کو بھوکی سوتی۔ صبح بابو جی کے ریاض کے

Downloaded From http://paksociety.com

ساتھ اٹھتی۔۔۔

اس نے ماضی کو کبھی ہاتھ سے پھسل جانے ہی نہیں دیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے رو پڑتی۔ کچھ اور نہ بن پڑتا تو ہنسنے لگتی۔

اسے لگ جانے والے روگوں میں سے ایک یہ بھی ٹھہرا۔۔۔

جس کی دوا ملی نہ کوئی چارہ ہو سکا۔۔۔ موت کا ایک رنگ یہ بھی رہا۔۔۔

☆ ☆ ☆

دل سا ساتھی جب پایا۔

بے چینی بھی ساتھ ملی۔

"تمہارے میک اپ روم میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی منجو۔"

ایک رات اس کے گھر واپس آنے پر کمال نے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے حیرت سے کمال کو دیکھا۔ شوٹنگ کے وقفوں میں ہمیشہ سے اس نے آرام کرنے کی بجائے دریافت کو ترجیح دی۔ وہ کتابیں پڑھتی' شاعری لکھتی۔ اس کا ادبی ذوق ہمیشہ تشنہ ہی رہا۔ وہ شاعروں' کہانی نویسوں' ادیبوں سے ملتی۔ گیتا دت' لتا جی' رفیع' کشور' اسٹوڈیو میں بیٹھ کر وہ ان سب کے ریکارڈ ہونے والے گانوں کی ریکارڈنگ سنا کرتی۔ اس کے شوق کی حد تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔

"کیوں؟"

"کیوں کا جواب تم اچھی طرح سے جانتی ہو۔ باقر علی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ مجھے اس پر بحث نہیں کرنی۔"

اس کی چندن آنکھیں جھلملا گئیں۔ "میں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں جس پر تمہیں اعتبار نہیں۔"

"یہ فلم نگری ہے۔۔۔ اسے بازار ہی سمجھو۔"

"اسی بازار سے تم کمال امروہوی بنے۔۔۔"

کمال نے اپنی آنکھوں کی ساری محبت چھپا کر' مٹا کر اس کو دیکھا۔ "دنیا کا کوئی بازار مرد پر آنچ بھی آنے نہیں دیتا۔ بدنام تو عورت ہو جاتی ہے۔ اب تم میری عزت ہو۔ میں لوگوں کی چہ مگوئیاں نہیں سن سکتا۔"

"اتنا تو جانتے ہو نا کہ ہماری باتوں کے افسانے بن جایا کرتے ہیں۔"

کمال نے سفید کرتے پر پرفیوم اسپرے کیا اور جواب دینے کی زحمت کیے بغیر چلا گیا۔ اس نے دل گرفتی سے کمال کو یوں جاتے دیکھا۔ وہ اس کے شانے پر سر رکھتی اور کہہ دیتی کہ "چلو ٹھیک ہے" وہ اس سے پہلے ہی چلا گیا۔ اس دن باقر علی اس کے میک اپ روم کے باہر پہرے دار بنا بیٹھا رہا۔

بات شعلہ ہوئی۔۔۔ دھواں بن کر پھیلی۔۔۔

"کمال امروہوی نے مینا پر پہرا بٹھا دیا ہے۔ ان کے سیکرٹری باقر علی سائے کی طرح مینا کماری کے ساتھ رہتے ہیں۔"

وہ فون پر سب کو جواب دیتے دیتے تھک گئی۔ بہنیں الگ پریشان۔ خورشید آپا رونے ہی تو لگیں۔

"منا! تم سے غلطی تو نہیں ہو گئی۔۔۔ تم نے یہ کس شخص سے شادی کر لی؟"

وہ ہنس دی۔ "آپا چھوٹی باتوں کو چھوٹا ہی رہنے دیں۔ کمال میرے شوہر ہیں۔ میرے اچھے کے لیے کہتے ہیں۔"

بابو جی نے بس ایک نظر اسے دیکھا اور وہ شرمندگی سے زمین میں گڑ کر رہ گئی۔ رات بھر وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ بابو جی کی نظر میں کیا تھا' یہی کہ "جس انسان کے لیے باپ کو اندھیرے میں رکھا' وہ دن کی روشنی میں بھی تم پر اعتبار نہیں رکھتا۔"

وہ بھربھری مٹی۔۔۔ رات ہی رات کیچڑ ہو گئی۔

ایک اعتراض اپنے ساتھ کئی اور اعتراضات لایا۔ وہ اتنے اعتراضات کا جواب دیتے دیتے تھک گئی۔ ایک دن عاجز آ کر کہہ دیا۔

"تو پھر تم مجھے چھوڑ دو۔۔۔"

"تم نے کتنی آسانی سے الگ ہونے کی بات کہہ دی منجو!" اب کمال کے دل کو تکلیف ہوئی۔

"نہ جانے کس کی قسمت مجھے مل گئی ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

خوشیاں گھڑی بھر کی ملتی ہیں اور روگ صدیوں پر محیط۔"

"تمہارے منہ سے نکلے یہ الفاظ نجانے کب میری یادداشت سے نکلیں گے۔"

"میرے دل پر تمہارے رویے نے کچھ ایسے گھاؤ لگائے ہیں کہ میری محبت سسک رہی ہے۔ یہ گھاؤ جانے مندمل ہوں گے بھی یا نہیں۔"

کتنے ہی دن کمال اپنی یادداشت مٹانے کی کوشش کرتا رہا اور وہ اپنے زخم بھرنے کی کوشش کرتی رہی۔ جتنی جلدی انہوں نے تعلق بنانے میں کی تھی' اتنی جلدی میں وہ اسے توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر کمال نے اس کے سامنے چند شرطیں رکھ دیں۔

"تم شام چھ بجے تک گھر آجایا کرو گی۔ تمہارے میک اپ روم میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ صرف اپنی کار میں بیٹھ کر ہی جاؤ گی۔ کسی بھی انسان سے اکیلے میں نہیں ملوں گی۔"

اس نے ان شرطوں کو مان لیا لیکن اس احساس نے اسے تکلیف دی کہ اب ان کا رشتہ شرطوں پر چلے گا۔

"خدایا چاند کے گرہن کی طرح میری مشکل آسان کر اور مجھے قبر تک ایسا ہی ضبط و صبر بخش جیسا کہ اسے بخشا ہے۔" (ڈائری)

☆ ☆ ☆

"آپ ہی آپ کبھی آپ مجھے مل جاتے ہیں۔ کبھی بچھڑ جاتے ہیں۔ نہ جانے یہ میرا خواب ہے یا میں پاگل ہو گئی ہوں۔"

فلم کی شوٹنگ کے لیے وہ لوگ مدراس آئے تھے۔ شوٹنگ سے فارغ ہو کر وہ اور کمال کتنی ہی دیر تک شام کے سایوں میں' رات کا انتظار کرتے رہے.... دور بہت دور ایک ٹرین سیٹی بجاتی گزری....

پتھروں پر سنبھل سنبھل کر کمال سے دو قدم آگے چلتی مینا نے اچانک اپنی کمر پر اس کے ہاتھوں کی گرفت محسوس کی اور وہ مسکرا کر پلٹی۔

"کیا ہوا؟"

"میری پاکیزہ بنو گی؟"

"تمہاری ہی تو ہوں۔"

"میں نے زندگی میں دو ہی خواب دیکھے ہیں منجو۔ ایک یہ کہ میرا شہر امروہہ میرے نام سے پہچانا جائے۔"

مینا ہنس دی۔ "اور امروہہ تمہارے نام سے جانا جاتا ہے.... تمہارا یہ خواب پورا ہوا.... کیا دوسرا خواب مجھ سے شادی تھا۔"

اسے اپنے ساتھ ایک بڑے پتھر پر بیٹھا کر وہ پانی میں کنکر پھینکنے لگا۔ "دوسرا خواب پاکیزہ ہے۔"

"یعنی کہ میں....؟" اس کے شانے پر اپنا سر رکھ کر وہ شرارت سے مسکرانے لگی۔

"ہاں! تم ہی ہو۔ کمال امروہوی کی پاکیزہ۔ پاکیزہ میرے خوابوں میں آتی رہی ہے۔ جن دنوں میں لاہور پڑھتا تھا ان دنوں چپکے سے یہ میرے دل پر آشکار ہو گئی۔ اس کے کردار' منظر نامے' حتیٰ کہ بہت سے مکالمے بھی۔ ریل کی چھک چھک نے میرے دل کو پاکیزہ کے قدموں میں لے جا پٹخا۔ پائل کی چھن چھن نے ہمیشہ مجھے "صاحب جان" کے ساتھ ساتھ رکھا۔ پاکیزہ کے کرداروں کو میں نے چلتے پھرتے دیکھا ہے منجو! پاکیزہ مجھے سونے نہیں دیتی۔ صاحب جان کے عشق کی حدت مجھے بے قرار رکھتی ہے۔ میں بے تاب ہوں کہ اسے بنالوں۔"

"تو بنالو چندن۔ ہمارے پاس محل اسٹوڈیو ہے۔ ہم فلم بنا سکتے ہیں۔ لاہور کے بازار' بمبئی کے سیٹوں پر لائے جاسکتے ہیں۔"

"جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ صاحب جان میری نظروں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ میرے خواب سے نکل کر' میرے وجدان کی مکمل تصویر بن کر۔ جب تم آنچل کو جھٹک کر چلتی ہو' سارا پیار آنکھوں میں سمو کر' بالکنی میں کھڑی ہو کر میرا انتظار کرتی ہو' تو ریل کی کوک تمہارے انتظار سے نکلتی ہوئی لگتی ہے۔"

وہ حیرت سے کمال کو دیکھنے لگی۔ "تو میں پہلے سے

Downloaded From http://paksociety.com

ہی پاکیزہ تھی؟"

"پہلے دن سے ۔۔۔ پہلی نظر سے، پھرتے ہیں ہم اکیلے۔۔۔ بانہوں میں کوئی لے لے۔"

"اور میرے عشق کی حدت؟" کتنا پیار آرہا تھا اسے چندن پر کہ پیمائش ممکن نہیں تھی۔

"وہ مجھ تک آ پہنچی تھی۔ جب تم نے اخبار سے میری تصویر کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کی تھی۔ رموز محبت کا یہ سب سے گہرا رمز ہے۔"

"تو پھر سناؤ مجھے اپنی پاکیزہ کی کہانی۔۔۔"

"پہلے تم میرا لکھا یہ گیت سنو۔۔۔

یہ رات یہ خاموشی۔۔۔ یہ خواب سے نظارے۔۔۔
جگنو ہے یا زمین پر اترے ہوئے ہیں تارے
بے خواب میری آنکھیں۔۔۔ مدہوش ہے زمانہ
اے دل کہیں سے "ان" کو ایسے میں ڈھونڈ لانا۔۔۔

اس کے دائیں شانے سے سر ٹکائے، آنکھیں بند کیے، اس نے ساری کائنات کو یہی گیت گاتے سنا۔

"کیسا لگا؟" جواب وہ جانتا تھا، بس اسے الفاظ میں اظہار چاہیے تھا۔

"گیت میں ان کے تاثر نے مجھے بہت مسحور کیا ہے کمال۔۔۔ تم نے مجھے معتبر کردیا۔"

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "کیسے؟"

"ایسے میں "ان" کو ڈھونڈ لانا۔۔۔ تم نے "اس" کو "ان" کر کے اسے محرم بنا دیا۔ لڑکی کسی بھی شخص کو نہیں صرف اپنے "محرم" کو ڈھونڈ لانے کو کہہ رہی ہے۔۔۔ اپنے مجازی خدا کو۔۔۔"

کمال اسے داد دیے بنا نہیں رہ سکا۔ "تمہارا علمی ذوق بہت کمال کا ہے منجو۔ تم نے میرے گیت کی حقیقی روح کو پالیا۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔۔۔

بمبئی واپس آتے ہی جولائی 1956ء میں پاکیزہ بنانے کا اعلان کردیا گیا۔ کمال نے کہانی پر کام شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان نے اس فلم کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں، جس کی تیاری میں سولہ سال لگنے والے تھے۔

چار سال میں اسکرپٹ مکمل ہوا اور کمال نے ایک گمنام سنگیت کار کے ہاتھ میں کہانی دی تو اس نے اپنی روح گیتوں میں کھینچ لانے کا وعدہ کیا۔۔۔ اور ایسے۔۔۔

رات کے پچھلے پہر۔۔۔ رات کے پہلے پہر سے دیوار سے سر ٹکائے بیٹھے غلام محمد نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی انگلیوں میں دبے مضراب کو ستار کے تاروں پر رکھا۔۔۔

اور یوں "چلتے چلتے" کی دھن ٹھمری سے نکلی، وقت کے سپرد ہوئی۔

☆ ☆ ☆

بازار حسن، پالکیاں، بالکونیاں، گھوڑا گاڑیاں، وضع داریاں۔۔۔ پس منظر صاحب جان کی پشت سے جھانک رہا ہے۔

"جس نے اشرافی گزدینا دوپٹہ میرا۔۔۔ ہو جی ہو دوپٹہ میرا۔۔۔"

بازار حسن کے سامنے، جلتے فانوس کے نیچے، صاحب جان محو رقص ہے۔

پھول والے کی آنکھوں میں شوق دید کی انتہا ہے۔ وہ صاحب جان کو دیکھ دیکھ تھک نہیں رہا۔ شوٹنگ سے پہلے بھی یہی پھول والا مینا کو میک اپ روم سے نکلتے دیکھ کر غش کھا کر گر گیا تھا۔ یہ بات سیٹ میں گھوم گئی کہ پھول والا بچہ مینا کے حسن کی تاب نہیں لا سکا۔ مینا مسکرا دی۔ پھول والے کے گال پر چٹکی لی۔

"کیوں اتنی پیاری لگ رہی ہوں میں؟"

"اپسرا۔۔۔" ہکلا کر وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

سب ہنس دیے۔

بلیک اینڈ وائٹ، کلر سنیما اسکوپ کے چکر میں نہ جانے کتنی بار فلم کی شوٹنگ ہو چکی تھی۔ کتنے سال گزر چکے تھے۔ آج پھر اس گانے کی شوٹنگ تھی جو پہلے بھی دوبار شوٹ ہو چکا تھا۔ فلم کے رنگین اور وہ بھی سینما اسکوپ بنانے کے فیصلے کے بعد مینا نے خود ملبوسات ڈیزائن کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ کمال کا خواب اس کا خواب تھا۔ فلم کے سیٹ کی تعریف چہار عالم میں تھی۔ گلابی محل اور بازار حسن

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

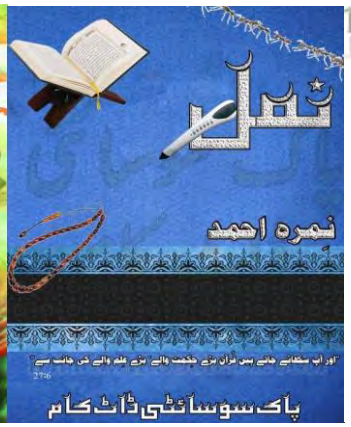

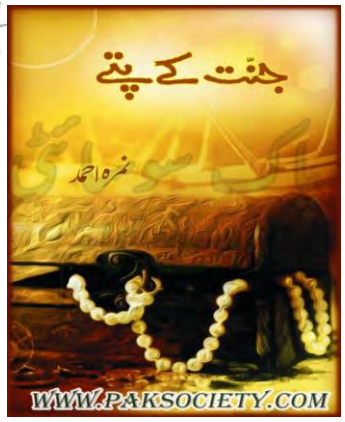

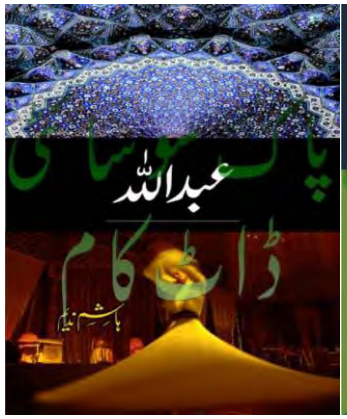

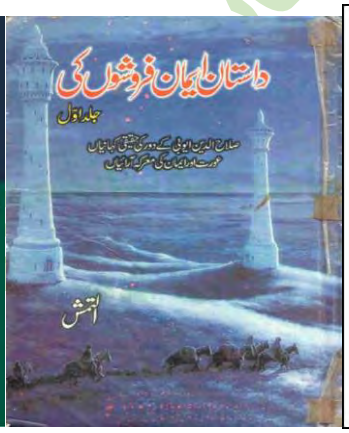

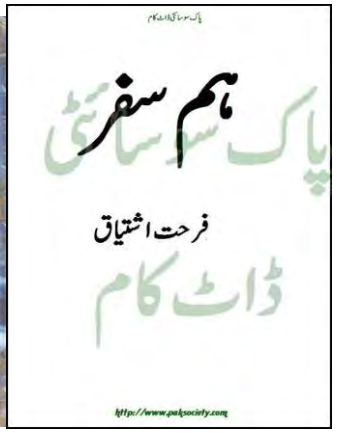

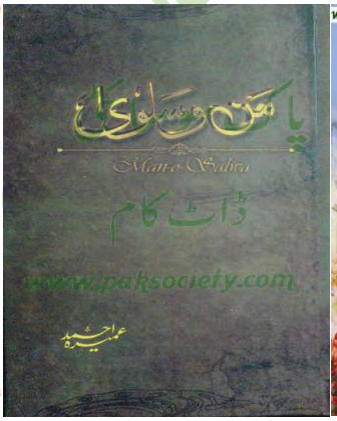

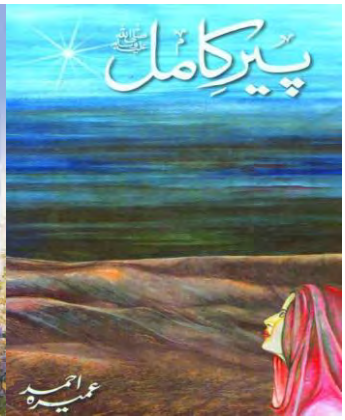

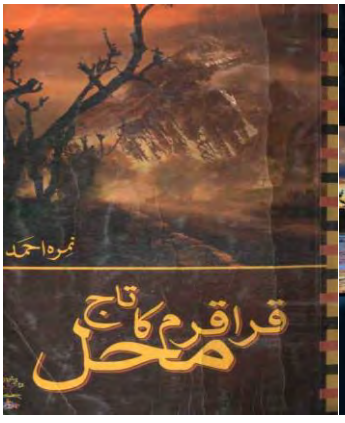

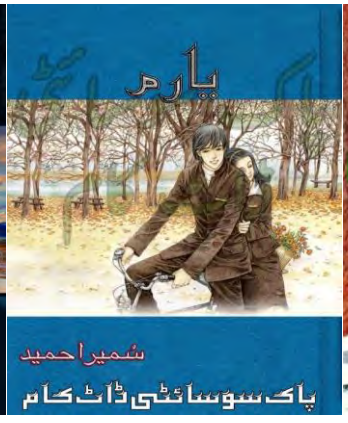

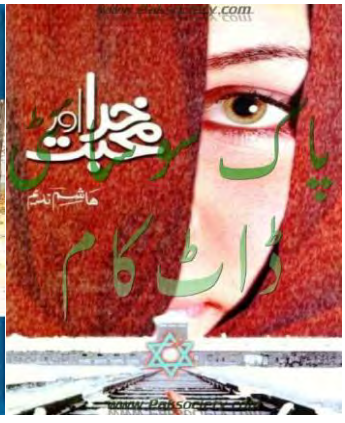

Downloaded From http://paksociety.com

کے سیٹ کو جو دیکھتا داد دیے بغیر نہ رہ پاتا۔

مینا کے گلابی فراک' سفید چوڑی دار' سرخیلے گھنگھروں سجے پیروں کی تصویر کسی فوٹو گرافر کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس تصویر کی اخبارات میں دھوم تھی۔ ایک تصویر نے ہی اتنی ہلچل مچادی کہ فلم کا انتظار مشکل ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ مینا کماری آج تک کبھی اتنی حسین نہیں لگی جتنی وہ بس اس ایک تصویر میں لگ رہی ہے۔ اگر ایک تصویر کا یہ عالم ہے تو پوری فلم کا کیا عالم ہو گا۔

جس دن گلابی محل میں "تمھارے رہیو" گانے کی شوٹنگ شروع ہوئی اس دن سیٹ پر سے کوئی بھی اس پر سے نگاہ ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کھلتے ہرے رنگ کے پہناوے' سفید و سنہری راجستھانی زیور' جھومر پٹی' پیروں میں چھن چھن گھنگھرو۔ اس کی چھاپ نے' اس کی آنکھ نے قیامت کا سماں برپا کر دیا تھا۔

وہ خود کو ابھی آئینے میں دیکھ کر آئی تھی۔ آخر ایسا بھی کیا ہو گیا تھا کہ یوں سب اسے دیکھتے ہی دم بخود ہو جاتے تھے۔ وہ کیا کرتی کہ بس ہنس سا دیتی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ آخر کیا چیز اسے اتنا خوب صورت بنا رہی ہے۔ ساتھی اداکار اس کے سامنے آکر مکالمے بھول جاتے۔ وہ ہونٹ کو دانت میں دبا کر چھوڑ دیتی۔ پہلے آنکھوں سے پھر ہونٹوں سے مسکرا دیتی۔

کمال اپنے خواب کی تکمیل کے لیے اس سے زیادہ پُرجوش تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو سو سو بار دیکھتا۔ اس کے ہار سنگھار' زیور' کپڑا' ایک ایک چیز اس کی نظر سے سند قبولیت حاصل کرتی۔ کتنے ہی سین اس نے بار بار شوٹ کیے۔ وہ مطمئن ہی نہیں ہوتا تھا۔ ویسے ہی اس کی شہرت "کاملیت پسند" کی تھی لیکن اس فلم کے لیے تو خاص اس پر کاملیت کا خبط سوار ہو گیا تھا۔

مینا موسیقار باپ کی بیٹی تھی۔ خود شاعرہ تھی۔ گانے کے سُر تال کو کھال' بال سمیت پہچانتی تھی۔ جب غلام محمد لتاجی کو بٹھائے ریاض کراتے تو وہ ان کے پاس موجود رہتی۔ جب گانا ریکارڈ کیا جاتا تب بھی۔ اسے گانے فلم کی اسکرین پر جانے سے پہلے سننا پسند تھے۔ لفظ عام ہونے سے پہلے' وہ ان کے خاص تاثر کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

گلابی محل میں "چلتے چلتے" کی شوٹنگ تھی۔ ایک کاروباری شخصیت مسٹر ایڈوانی سیٹ پر بیٹھے مینا کو دیکھ رہے تھے۔ سونے کے تاروں سے جھلمل قالین پر بیٹھی صاحب جان نے ہنس کر' چہرے کو ذرا سا خم دے کر طاؤس کو دیکھا' اور اپنے حسن میں اپنے محبوب کو لا کر' اپنے پیر کی پائل کو اپنے ہاتھ سے بجا کر گانا شروع کیا تو وہ اپنی آنکھیں جھپکنا بھول گئے۔ سانس لینا ان کے لیے دشوار ہو گیا۔

"آپ یہ فلم کلر میں بنا رہے ہیں۔ آپ کے ارادے کچھ نیک نہیں لگتے۔ یعنی کہ آپ چاہتے ہیں کہ لوگ سینما اسکرین توڑ کر مینا جی کو اپنی بانہوں میں بھر لیں۔"

"دھیان رہے مسٹر ایڈوانی' مینا میری بیگم ہیں۔"

"آپ کی بیگم وہ گھر میں ہوتی ہوں گی۔ سینما اسکرین پر وہ ہندوستانیوں کی دیوی ہوتی ہیں۔"

کمال نے ایک نظر مسٹر ایڈوانی کو دیکھا اور ایک نظر گلابی محل میں رقص کی مشق کرتی مینا کو۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ چلا کر بولا۔

"پیک اپ۔"

☆ ☆ ☆

"کسی کی حد مقرر ہے' کسی کا مقدر' کسی کا پیار' کسی کا ملاپ' سب ہاتھ تول کر ہے۔"

وہ سمجھتی تھی کہ محبت ایک ایسی واحد چیز ہے' جو بڑھتی ہی ہے گھٹتی نہیں۔ اسے لگتا تھا کہ جب انسان محبت کو پالے گا تو بس سب کچھ پالے گا۔ لیکن دونوں ہی باتیں غلط نکلیں۔ کمال کبھی کبھی اس سے بات نہ کرنے کا عہد سا کر لیتا۔ وہ خود کو کمال کے گھر کی ایک چیز سمجھتی۔

دل کا ساتھی دل میں بھی تھا' زندگی میں بھی' اور ان دونوں ہی جگہوں پر بے چینی بھی۔ اداسی شاید اسے

Downloaded From http://paksociety.com

گھٹی میں ملی تھی۔ بیماری' دیمک کی طرح جان کو لگی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے مجھے گھن لگ گیا ہے۔" (ڈائری)

اس کی فلمیں ہٹ ہو رہی تھیں۔ دلیپ کمار کے بعد وہ پہلی ہیروئن تھی جسے منہ مانگا معاوضہ دیا جا رہا تھا۔ وہ دن رات کام کر رہی تھی۔ ہر بڑے اداکار' ہر بڑی فلم کمپنی کے ساتھ۔ لیکن پھر بھی اسے لگتا تھا کہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ وہ ٹھیک ٹھیک یہ اندازہ کبھی لگا ہی نہیں سکی کہ ایسا کیوں ہے۔ کمال ہر روز اس سے اظہار عشق نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کیا یہی بات تھی جو اسے اداس کرتی تھی۔

ایک دن اس نے اپنے شاعر دوست گلریز سے پوچھا اور وہ بس مسکرا سا دیا۔ "یہ محبت کی بے اطمینانی ہے۔"

"محبت کی بے اطمینانی؟؟"

"محبت آپ کے لیے بہت با معنی ہے۔ جیسے آپ نے اس کے سارے مطلب کھوج لیے ہیں۔ جیسے آپ نے سارا ایریم پیالہ پی لیا ہے لیکن جس سے آپ محبت کرتی ہیں' وہ نہ اس پیالے کے پاس پھٹکا ہے نہ وہ کسی مطلب کو پا سکا ہے۔ یہ یک حرفی "محبت" کی سمجھ کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ۔۔۔ م۔۔۔ ح۔۔۔ ب۔۔۔ ت۔۔۔ چار لفظوں کے ہر احساس کا معاملہ ہے۔ یہ دنیا تو جاہلوں کی ہے مینا جی۔۔۔ یوں سمجھ لیں آپ کی سمجھ کے مقابلے میں سب جاہل ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو بس گنے چنے ہوتے ہیں۔ جیسے سمندر کی سیپیوں میں موتی۔ کوئی بھی آپ سے محبت تو کر سکتا ہے لیکن وہ آپ کو پا نہیں سکتا کیونکہ اسے پہلے "محبت" کے سب معنی پانے ہوں گے۔"

مینا اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ کمال کی محبت اب صرف ایک شوہر کی محبت رہ گئی تھی۔ دو افراد کی محبت جو ایک چھت' ایک تعلق میں بندھے رہتے ہیں۔

وہ کمال سے اکثر خفا رہتی تھی کہ وہ اسے امروہہ کیوں نہیں لے کر جاتا۔ خاندانی اختلافات کی صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ امروہہ نہیں جا سکتی تھی۔ اور ان ہی دنوں جب وہ "چہار محبت" کے احساس میں الجھی تھی' کمال اسے تاروں بھری رات میں امروہہ لے آئے۔ گاڑی میں بٹھائے بٹھائے اسے شہر کا چپہ چپہ دکھا دیا۔ ساری رات وہ دونوں گھومتے رہے۔ سارا امروہہ چاندنی میں نہایا ہوا تھا اور وہ دیوانی ہو رہی تھی۔

اسی دوران اس نے جان لیا کہ اس کے وہم کس قدر بے سروپا تھے کہ کمال اس محبت سے کوسوں دور ہے جو دراصل وہ اپنے دل میں اس کے لیے محسوس کرتی ہے۔

پھر ایک دن وہ دہلی آئے۔

دونوں لال قلعہ دیکھ رہے تھے۔ کمال کی تاریخ کے بارے میں معلومات حیران کن تھی۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوتی تھی۔ ایک مغل شہزادے جہاندار مرزا سے منسوب تاریخی حقائق کمال کے منہ سے سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی ساری مسرت کافور ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کمال کی طرف سکتے کے عالم میں دیکھتی رہ گئی۔ سارا قلعہ اپنی سرخ اینٹوں سمیت اس پر آ گرا۔

"اب میں جان گئی کہ آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر میرے یہاں کوئی بیٹا پیدا ہوا تو آپ اس کا نام جہاندار رکھیں گے۔ کیونکہ جہاندار مرزا ایک طوائف کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔"

چلا کر کہتے' وہ قلعے کو اپنے پیچھے وحشت زدہ چھوڑتی چلی گئی۔ بھاگتے ہوئے اس کا سفید پہناوا اور لمبا دوپٹہ قلعے کے فرش پر نہ جانے کہاں کہاں رک کر رویا' تڑپا۔ اس کے آنسو گنتی ہی اینٹوں میں جذب ہوئے' کتنے ہی پیروں تلے آئے۔

"لوگ کہتے ہیں کہ کمال اپنے خون کے معاملے میں بہت متعصب ہے۔ اس کی خاندانی بیوی سے اس کی اولاد ہے' اسے تم سے اولاد نہیں چاہیے۔ ایک ایسی لڑکی کے بطن سے وہ اولاد لے کر کیا کرے گا جس کا خاندانی پس منظر اس کی ناک کے نیچے ہے۔"

"تمہیں ایسی بے سروپا باتیں کرتے کچھ لحاظ کرنا

Downloaded From http://paksociety.com

چاہیے منجو۔۔۔"

"تو پھر میں اب تک ماں کیوں نہیں بنی۔۔۔ اتنے سال ہو چکے ہیں ہماری شادی کو۔" وہ چلانے لگی۔

"یہ تم خود سے پوچھو۔ تم جو خود کو دیوی سمجھتی ہو۔ تمہیں لگتا ہے تم ماں بن گئیں تو تمہارے ہاتھ سے سارے فلمیں نکل جائیں گی۔"

مینا اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ "کامیابی کا نشہ اتنا بھی میرے سر نہیں چڑھا کہ میں ماں نہ بننے کا فیصلہ کرلوں۔ افسوس تو مجھے یہ ہے کہ تمہیں اپنے خاندانی خون پر بہت ناز ہے۔ تمہاری بیوی کو میں نے اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھا، تمہارے بچوں کو اپنے بچے، تمہارے خاندان کو اپنا خاندان۔ تمہارے لیے اپنے باپ کو چھوڑ دیا اور تم مجھے ایک طوائف سمجھتے ہو؟ اگر میں طوائف ہوں تو تمہارے خاندان کی ہر عورت۔۔۔"

"بکواس بند کرو اپنی! ہاں ہے۔۔۔ بہت ناز ہے۔ تم ہو کیا۔۔۔ تمہاری نانی؟ ایک ہندو عورت تھی جس نے ایک پارسی سے گھر سے بھاگ کر شادی کی تھی۔ تمہاری ماں پھر بھادیوی، جو کامنی دیوی بنی پھر وہ اقبال بانو بن گئی۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہارے بابو جی سے محبت میں وہ واقعی مسلمان ہو گئی ہوں گی۔۔۔ یہ ہے تمہارا خاندان۔۔۔ اور تم میرے خاندان پر انگلی اٹھا رہی ہو۔"

سارا ہندوستان بھی مل کر مینا کو پکڑ کر آگ میں جھونک دیتا تو اسے ذرا سی تکلیف نہ ہوتی جو اب ہوئی ہاں اب ہوئی۔۔۔ اس محبت کی آزمائش، جو وہ کمال سے کرتی تھی۔

"اور میرے بابو جی۔۔۔؟ تم انہیں کچھ کہنا بھول گئے کیا کہو گے انہیں۔" چلا کر اس نے کہا۔ لبالب گلاس الٹ گیا ہو جیسے، خون اس کے منہ سے ایسے نکلا اور وہ ہوش سے بیگانہ ہو کر چکرا کر گر گئی۔

"تمام وقت میں اس دسیع سفید بستر پر ایک ایسے جنازے کی طرح پڑی رہتی ہوں، جسے لوگ دفنانا بھول گئے ہوں۔" (ڈائری)

بے خواب راتیں اور بے خواب ہو گئیں۔ کچھ دکھ کچھ جوگ، کچھ بیماری۔ اس کی زندگی کی کہانی وقت سے بہت پہلے ہی انٹرویل سے آگے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"اور اب سینے میں دل کی جگہ لگتا ہے کہ چاند ہے بھاری۔۔۔ سرد۔۔۔ اور سفید!" (ڈائری)

یہ شاید وہ خود بھی ٹھیک سے نہیں جان سکی کہ کمال سے محبت ہو جانے کے بعد کب، کہاں اور کیسے اس محبت میں بال آنے لگا تھا۔ ذاتی زندگی کے جھگڑے، اخباروں کی خبریں یا پھر لوگوں کی باتیں۔ کس چیز نے ان دونوں کو دور کرنا شروع کیا تھا۔ لوگ اسے کہتے کہ کمال تمہاری کمائی کھا رہا ہے۔ تمہیں ماں نہیں بننے دے رہا۔ جن دنوں تم علاج کے لیے ہسپتال میں داخل تھیں ان ہی دنوں ڈاکٹر کے ساتھ مل کر اس نے تمہیں بانجھ کر دیا تھا۔ اگر اسے اپنے حسب نسب کا خیال نہیں ہے تو وہ تمہیں امروہہ اپنے آبائی گھر میں کیوں نہیں رکھتا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم اس کی بیوی ہو۔ پھر خاندانی بیوی کہلائے جانے میں عذر کیسا؟

ایروز سینما میں فلم کے پریمیئر کے موقعے پر سہراب مودی نے مہاراشٹر کے گورنر سے کمال کا تعارف کچھ یوں کرادیا۔

"یہ ہیں مشہور اداکارہ مینا کماری۔۔۔ اور یہ ان کے شوہر کمال امروہی۔"

"سہراب صاحب! آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں ہوں کمال امروہوی اور یہ ہیں میری بیوی مینا کماری۔" کمال نے سہراب مودی کو فوراً ٹوک دیا۔ مینا کا ہاتھ چھوڑا اور ان سب کو حیران چھوڑ کر فوراً آڈیٹوریم سے باہر نکل گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

"تمہارا ایسے جانا ٹھیک نہیں چندن۔۔۔ ہم کچھ دیر میں چلے جائیں گے۔"

"سہراب صاحب کا ایسے کہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔۔۔ آؤ ہم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"ہمیں ایسے نہیں جانا چاہیے۔ سہراب صاحب

Downloaded From http://paksociety.com

کے احسانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تمہیں پہلی فلم دی تھی۔"

"وہ فلم مجھے میری قابلیت پر ملی تھی.... احسان نہیں کیا تھا انہوں نے۔"

"میرے بابو جی سُر ساگر تھے چندن' لیکن انہیں کبھی کام نہیں ملا۔ ہاتھ پکڑ کر آگے لے جانے والے کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے۔"

"تم میرے ساتھ آ رہی ہو یا نہیں....؟"

"تم اس بات پر خفا ہو کہ میرے نام سے تمہارا تعارف کروایا گیا؟"

"جب تم "مینا کماری" نہیں بنی تھیں' اس سے کہیں پہلے میں "کمال امروہوی" بن چکا تھا۔ ایک کامیاب کہانی نویس' ہدایت کار۔" لوگوں کے ہجوم میں مینا نے بات کو بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ کمال چلا گیا اور اس نے اکیلے بیٹھ کر فلم دیکھی۔ اگلے دن کے اخبارات میں شہ سرخیاں کچھ ایسے تھیں۔

"کمال امروہوی کو اپنی بیوی مینا کماری کے نام سے متعارف ہونا پسند نہیں۔"

پالی ہل کے اس گھر میں تناؤ بڑھنے لگا۔

اس ایک گھر میں دو ایسے افراد رہتے تھے جو اپنے اپنے شعبے میں بے مثال تھے۔ ایک کا فلم بے جوڑ تھا اور ایک کا فن۔ ایک اسکرین پر آتی اور چھا جاتی' ایک اسکرین کے پیچھے رہتا اور تاریخ لکھ دیتا۔ لیکن بس مینا ہر آنکھ' ہر کان' ہر زبان سے جانی جاتی تھی۔ اخبارات اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے تھے۔ اور وہ جو کیمرے کے پیچھے ہوتا تھا' اسے چند ہزار لوگوں سے زیادہ کون پہچانتا تھا۔ اور پھر لوگ فلم شروع ہونے اور ختم ہونے کے بعد یہ پڑھنا گوارا ہی کہاں کرتے ہیں کہ فلم کس نے لکھی ہے' کس نے بنائی ہے۔ وہ تو ایک ہی بات جانتے ہیں.... "ہیرو.... ہیروئن۔" ان دو کے علاوہ انہیں کسی تیسرے سے کیا سروکار ہے۔

اسی دوران اسے ایک اور بنگالی ناول پر بننے والی کہانی کی پیش کش ہوئی۔ پیش کش کیا ہوئی' گرودت نے اصرار کیا کہ یہ کردار صرف وہی کر سکتی ہے۔ ہدایت کار ابرار بھی پر زور دلائل دینے لگا۔

"تم یہ فلم نہیں کرو گی منجو...." کمال نے گرودت کو انکار کر دیا تھا۔

"میں کہانی سن چکی ہوں' ناول بھی پڑھ چکی ہوں۔ میں چھوٹی بہو کا کردار بہت اچھے طریقے سے کر لوں گی۔"

"تم چاہتی ہو لوگ باتیں کریں۔ گرودت نے تمہیں چھوٹی بہو کا کردار دے کر میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ ساری دنیا جان گئی ہے کہ تم شراب پینے لگی ہو۔ مریضہ ہو تم۔ اب تم چاہتی ہو سارا ہندوستان جان لے۔ امروہہ جان لے۔"

"میں یہ فلم کروں گی چندن!" اس نے غصے سے کہا۔

"تم ایک دکھی' لاچار' بے بس عورت ہو۔ جو اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں۔ جو تشے کی لت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ یہ سب ثابت کرنا چاہتی ہو؟"

"اگر مجھے یہ سب دنیا کو بتانے سے سروکار ہوتا تو اس کے لیے پریس میں میرا ایک بیان ہی کافی ہے۔"

"تم لوگوں کو اپنے نشہ کی وجہ کیا دو گی۔ بتا سکو گی انہیں اپنے گھٹیا کردار اور بد چلنی کے بارے میں؟"

"تتلی کے پروں کو اپنے ہاتھوں میں مسل کر تم کہتے ہو کہ میں بد چلن ہوں۔ تمہاری محبت' زہر بن کر میری روح میں دوڑ رہی ہے' اور تم کہتے ہو میں گھٹیا ہوں۔" وہ چلا کر بولی۔

"اور تم دوسرے مردوں میں اس زہر کا تریاق ڈھونڈتی ہو۔" کمال بھی اسی کی طرح چلایا۔

مینا نے اپنے لیے اپنے ہی دل میں ڈھیروں نفرت محسوس کی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فون اٹھایا۔

"میں آپ کی فلم صاحب بی بی اور غلام ضرور کروں گی.... چھوٹی بہو صرف میں ہی بنوں گی۔"

☆ ☆ ☆

"جس عورت کے بھاگ پھوٹے ہوں' وہی سمجھ سکے شاید۔ عورت ذات کے لیے اتنا بڑا ارمان.... اتنی

Downloaded From http://paksociety.com

بڑی لجا۔۔۔" (مکالمہ)

ساٹھ جمع دو کاسن تھا۔ صاحب بی بی اور غلام نے ریلیز ہو کر سب ہی کرداروں کو لے جا کر بام عروج پر ٹھہرا دیا تھا۔ لیکن ایک کردار ایسا تھا جو ان سب سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ سب مثالوں میں اپنی مثال آپ ہو گیا تھا۔ وہ کردار تھا "چھوٹی بہو" کا۔

گہنوں اور بنارسی ساڑھی میں سجی 'مہندی' پازیب' انگوٹھی' بندیا نیچے سہاگ بندی' ٹھوڑی ٹکے ہاتھ' ہونٹ کاٹتی مسکان' کرسی پر بیٹھی چھوٹی بہو۔۔۔ جب بھوت ناتھ اسے دیکھتا ہے تو اس کے حسن سے چکرا کر رہ جاتا ہے۔

"چکرا کیوں گئے۔۔۔ میں تو تمہیں بھوت ناتھ ہی کہوں گی۔۔۔ اور تم مجھے چھوٹی بہو کہہ سکتے ہو۔"

"پریس کیا کہہ رہا ہے' جانتی ہو؟ یہ دیکھو۔۔۔ یہ بھی۔۔۔ یہ بھی۔" کمال نے اس کے سامنے اخباروں' رسالوں' خطوں کے پلندے پھینکے۔

قالین پر آڑی ترچھی لیٹی کتاب پڑھتی مینا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "مجھے ان سب سے کوئی مطلب نہیں ہے۔"

"مطلب ہونا چاہیے مینا جی۔۔۔ انہیں کھولیں' پڑھیں۔ ایک ہی سوال ہزار انداز سے پوچھا گیا ہے۔" "چھوٹی بہو کیا کمال کی چھوٹی بیوی ہیں؟ کیا کمال کی بے وفائی نے مینا کو شراب کا عادی بنا دیا۔ یا کمال کی بے رخی مینا کو لے ڈوبی۔ ایسی شاندار حقیقی اداکاری' دراصل مینا جی کی حقیقی زندگی کی اصل تصویر ہے۔" وہ اخباروں کی شہ سرخیاں پڑھ رہا تھا۔

"تم سے کہا تھا تم یہ کردار نہیں کرو گی۔ میں کسی کوٹھے پر نہیں چڑھا تھا' جس سے اتارنے کے لیے تمہیں یہ سب کرنا پڑا ہو۔" کمال کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

"صرف ایک طوائف ہی تو عورت کی زندگی کا روگ نہیں ہوتا۔"

"کیا ہے تمہارا روگ۔۔۔ جواب دو۔"

"تم نے کسی بازی کی طرح مجھے جیتا۔ دعوے کی طرح بھلا دیا۔۔۔"

"تم میں ایسا تھا کیا جو میں تمہیں جیتنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتا۔ یہ تم تھیں جس نے میری تصویر دیکھ کر کہا تھا "یہ ہے میرے خوابوں کا شہزادہ۔" یہ تم تھیں جسے "کمال امروہوی" چاہیے تھا۔"

مینا رو دینے کو ہنس سی دی۔ "ہاں! میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ پورے دل سے میں نے تم سے محبت ہی تو کی تھی۔ چھپرہ کھولی میں مجھے دیکھ کر تم نے اپنے دوست سے کیا کہا تھا کہ میں آنے والے وقت کی بہت بڑی ہیروئن بننے والی ہوں۔ تمہیں یقین تھا کہ میں ضرور بڑی ہیروئن بنوں گی۔ تم نے ایک ہیروئن سے محبت کی شادی کی۔۔۔ کسی سلطنت کی طرح تم نے مجھے فتح کیا اب تمہارے آدمی میری نگرانی کرتے ہیں۔ اب تمہیں میرے نام سے متعارف ہونا پسند نہیں ہے۔ گھر گھر چھوٹی بہو کا ذکر پسند نہیں۔ مجھے تمہاری شہرت نے' نام نے کبھی تکلیف نہیں دی۔ تمہارا فخر میرا فخر رہا۔ میرا نام تمہارا نام کیوں نہیں رہا؟ میری پہچان تمہیں منظور کیوں نہیں؟

جو شخص بڑے بھائی کی معمولی سی سرزنش پر' اپنا گھر' خاندان' شہر چھوڑ سکتا ہے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ تمہیں غرور ہے کہ تم "کمال" ہو۔ بابو جی کہتے تھے "ہمارے خاندان میں شاید ایک ہی انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔" وہ ایک میں تھی۔ تم بھی شاید یہی چاہتے تھے کہ ہمارے اس گھر میں ایک ہی شخص کامیاب رہے اور وہ تم ہو۔"

"مینا جی۔۔۔ یہ آپ کی کسی فلم کا سیٹ نہیں ہے جہاں آپ مکالمے بول کر دیکھنے والوں سے داد وصول کر لیں گی۔"

وہ کچھ اس طرح ہنسا کہ محبت جو دل کے پنجرے کا پنچھی تھی' پھر سے پنجرہ توڑ کر نکلی۔ آہ کی طرح اس نے کہا۔

"میری محبت کی سفید دھرتی پر تم گندے پاؤں چلنے لگے ہو۔۔۔"

"تمہارے جن لوگوں سے چکر ہیں نا انہیں تم کس

Downloaded From http://paksociety.com

دھرتی پر چلاتی ہو؟"

"مجھے بھٹی کی آگ بنا کر تم کہتے ہو پانی کے لیے کسی ساگر میں نہ کودوں۔ مجھے جام بنا ڈالا ہے' پوچھتے ہو چھلکتی کیوں ہو؟"

کمال نے جواب میں اس کے منہ پر ایک زوردار چانٹا مارا۔

☆ ☆ ☆

"اسکرین پر غم کی جو تصویر مینا کماری بنتی ہیں' وہ ہندوستان میں کوئی اور ہیروئن نہیں بن سکتی۔" (اخبار)

اس نے ثابت کردیا اور وہ تاریخ کی پہلی ہیروئن بن گئی جو ایک ہی سال تین فلموں کے لیے بہترین اداکارہ کے ایوارڈ کے لیے منتخب کی گئی۔ اس سال کسی اور اداکارہ کو ایوارڈ مل جانے کا سوال سرے سے ہی ناپید ہوگیا۔

"جو کچھ ان کے پاس ہے.... ہے وہ میرے پاس؟ وہ سب کیا دے سکے تم مجھے.... مجھے.... مجھے.... ماں کہہ کر پکارنے والا۔"

ایوارڈ چھوٹی بہو کا ہوا۔ وہ.... وہ پہلی ہیروئن بن گئی' جس کے پاس تین ایوارڈ آچکے تھے۔ یہی فلم جب برلن فیسٹیول کے لیے منتخب کی گئی اور کمال اور مینا کو برلن بھیجا جانے لگا تو کمال نے صاف انکار کردیا۔ اسے مینا کے ساتھ شوہر کا ٹھپہ بن کر جانا منظور نہیں تھا۔ وہ خود بھی برلن نہیں گئی۔

زندگی کچھ ایسی ہی ہوگئی تھی۔ دکھ کا کوئی ایک سرا نہیں تھا جسے وہ کاٹ کر الگ کردیتی تو سکھی ہوجاتی۔ جب محبت کا پہلا پیر غلط پڑتا ہے تو چال سیدھی ہونے میں نہیں آتی۔ آگے موت رہ جاتی ہے۔ پیچھے خاموشی....

"موت اس میں رینگ آئی.... خاموشی اس پر حاوی ہونے لگی۔"

"آج ماں کی چودھویں برسی ہے اور پچھلی رات وہ مجھے دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے یقین ہے۔" (ڈائری۔)

وہ ایک مشہور اداکارہ تھی۔ گھر گھر اس کی پوجا ہوتی تھی۔ وہ کسی سے بھی کچھ کہہ دیتی تو اگلے دن اخبار میں کہانی چھپ جاتی۔ وہ جن پر اعتبار کرتی وہ اسے دھوکا دے جاتے۔ جن کی مدد کرتی وہ پلٹ کر خبر نہ لیتے۔ میک اپ مین سے چائے والے تک' کسی انسان کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ کسی ایک بھی شخص نے کبھی اس کی طرف انگلی اٹھا کر یہ نہیں کہا کہ "اس نے مجھے تکلیف دی ہے۔" اپنے علاوہ وہ ہر انسان کے لیے بے ضرر تھی۔ فلم سازوں کی فلمیں ڈوب رہی ہوتیں اور وہ بنا پیسوں کے کام کرتی۔ پروڈیوسر کو چیک لکھ لکھ کر دیتی۔ اس کے گھر مدد کی درخواست کرنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا' وہ دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی۔ وہ جتنی مشہور تھی اتنی ہی نیک دل۔ اس کی روح میں کھولی کی وہ بچی آباد تھی' جو یتیم خانے کی سیڑھیوں پر پڑی رو رہی ہے۔ برقع پہن کر بازاروں میں گم نام ہوکر خریداری کرتے' اس نے کبھی خود کو خاص عورت نہ سمجھا۔"

شوٹنگ سے گھر آکر وہ ایک عام عورت بن جاتی۔ وہ مینا کماری کو گھر کی دہلیز سے باہر چھوڑ دیتی۔ اندر صرف مہ جبیں بانو آتی' کمال کی منجو۔ وہ کھانے بناتی' بہنوں کی' دوستوں' رشتے داروں کی دعوتیں کرتی۔ بچوں سے کھیلتی۔ امروہہ سے کمال کے بچے آتے تو ان کے ناز نخرے اٹھاتی۔ حتیٰ کہ کمال کی پہلی بیوی اس کے گھر آئی تو اس نے انہیں دیکھتے ہی گھر کی چابیاں ان کے ہاتھ میں تھمادیں اور کہا۔

"آپ اس گھر کی بڑی ہیں' آپ کے ہوتے مجھے بڑا بنتے شرم آتی ہے۔"

محمودی بیگم کا دل اس کی خدمت' محبت پر ایسے صاف ہوگیا کہ انہیں یہ دکھ جاتا رہا کہ اس نے ان کا شوہر ان سے چھین لیا تھا۔ اس کی خوش اخلاقی کے قصے امروہہ تک گئے۔ ہر شخص جو اس سے ملا وہ اس کا دیوانہ ہی ہوا۔

پھر بھی.... پھر بھی.... اتنا اچھا ہونے پر بھی.... اسے چھپ چھپ کر رونا پڑتا۔ اس کا دل اندھیروں میں بھٹکتا

Downloaded From http://paksociety.com

پھرتا۔ ایک انسان جس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہا وہ یا دو قدم آگے ملا یا دو قدم پیچھے۔ علاج کے لیے اکثر نرسنگ ہوم رہتے' خالی کمرے کے سفید بیڈ پر لاش کی طرح لیٹے وہ ایسی میت بن جاتی جو اپنی قبر کا انتظار کر رہی ہو۔

دل کی تنہائی بانٹنے کو اسے ایک شفاف دل' نیک صورت انسان ملا۔ وہ اسے اپنی شاعری سناتی۔ اس کی شاعری سنتی۔ دونوں مل کر کچھ اشعار کہتے۔ کچھ وہ کہتا' کچھ وہ کہتی اور غزل' نظم بن جاتی۔ کبھی کبھی ایسے ہی اشعار تخلیق کرتے' وہ ان محسوسات کو سنتے' جنہیں بیان کرنے کے لیے الفاظ دنیا میں نہیں۔ ایسی محبت کو سمجھنے کے لیے مر کر دوبارہ زندہ ہونا پڑتا ہے۔ ایک شاعر... ایک شاعرہ... مر مر کر زندہ ہوتے ہیں تو ہی سمجھ پاتے ہیں۔

"محبت آخر ہے کیا۔"

بے وفائی کا چلن... وفا کا ساتھ عام ہوا۔

جب وفا ناپید ہوتی گئی... بے وفائی عام ہوتی گئی۔

انسان کسی بھی شاہراہ پر زیادہ دیر تک اکیلا نہیں چل سکتا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی عورت تو ہر گز نہیں۔ ساحل کنارے کی ریت کی طرح' ایک اسی کی دوستی' اسے وفا کے سمندر کے پانی سے گیلی ہوئی لگتی۔ دونوں کا تعلق وہ تو نہیں تھا جو لوگ سمجھ رہے تھے' ایک مرد اور عورت کا تعلق...؟

وہ اس کی خوب صورتی پر فدا تھا' لیکن اس خوب صورتی پر نہیں جو سامنے چہرے پر نظر آتی ہے۔ اس خوب صورتی پر جس تک صرف محبت کی دھوپ ہی چھن کر جاتی ہے۔ اس دھوپ میں اس کا چہرہ جب نکھر تا تو وہ مبہوت سے اسے دیکھتا اور کہہ دیتا۔

تمہارا نور پڑ رہا ہے چہرے پر
وگرنہ کون مجھے دیکھتا اندھیرے میں

٭ ٭ ٭

ایک نئی فلم کے افتتاح کا دن تھا۔ اسٹوڈیو فوٹو گرافر' صحافیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے شارٹ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ وہ میک اپ روم میں تیار ہو رہی تھی۔ کمال کے آدمی اس کی نگرانی پر تھے۔ باقر علی نے ہیر ڈریسر سے کہا کہ میک اپ روم میں کوئی نہ آئے اور اس نے سن لیا۔

"کیوں باقر بھائی؟ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے آخر... کون ہوں میں جس پر کسی کو یقین نہیں؟"

"عرصہ پہلے بھی یہی طے پایا تھا۔" وہ ذرا غصے سے بولا۔

"عرصہ پہلے تو اور بھی بہت کچھ طے پایا تھا' کیا اس کی پاسداری کی گئی ہے؟"

"وہ میں نہیں جانتا۔ کمال صاحب نے کہا ہے کہ میں آپ کے میک اپ روم میں کسی کو بھی گھسنے نہ دوں۔"

"میری زندگی کمال صاحب کے اشاروں پر نہیں چلے گی باقر بھائی۔"

"تو اس کا مطلب ہے تمہارے میک اپ روم میں وہ شاعر بیٹھا ہے۔" باقر علی دروازے کو دھکے سے کھول کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ وہ دروازے کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

"اب یہ میری عزت نفس کا سوال ہے۔ یہاں سے جاؤ باقر علی... ورنہ بہت کچھ بگڑ جائے گا۔"

باقر علی نے بدستور اسے دھکا دے کر اندر جانا چاہا۔ مینا سختی سے کھڑی رہی تو اس نے ایک تھپڑ کھینچ کر اس کے منہ پر مارا۔

اس تھپڑ کی گونج بہت دور تک گئی۔ سارے ہندوستان نے سنی... ہر اخبار نے لکھی... ہر آواز نے نشر کی۔

اس نے کمال کو فون کیا۔ ساری روداد سنائی۔ اسے یقین تھا کمال دوڑا چلا آئے گا' لیکن اس نے کہا۔

"تم گھر آجاؤ... میں یہاں فیصلہ کروں گا۔"

"جہاں تھپڑ پڑا ہے' فیصلہ بھی وہیں ہوگا۔"

"یقیناً" "تم نے کچھ ایسا کیا ہوگا جو اس کا ہاتھ اٹھا۔" کمال نے کہا اور مینا نے ایک دوسرا چانٹا اپنے گال پر پڑتا محسوس کیا۔ فون کو پھینک کر وہ روتی' سسکتی ہوئی

Downloaded From http://paksociety.com

کار میں بیٹھ کر دھو کے گھر چلی گئی۔ جاتے ہوئے اس کے یہ الفاظ وہاں موجود ہر شخص نے سنے۔

"کمال صاحب سے کہہ دینا۔ میں اب گھر واپس نہیں آؤں گی۔"

اور پھر وہ دوبارہ کبھی گھر واپس نہیں گئی۔

"وہ اپنا گھر خود چھوڑ کر گئی ہے۔ اسے خود ہی واپس آنا ہوگا۔ میں اسے کبھی لینے نہیں جاؤں گا۔"

وہ بھی دوبارہ اسے کبھی لینے نہ گیا۔

ایک کامیاب کہانی نویس، فلم ساز، ہدایت کار نے جو قسم کھائی، وہی قسم ایک بڑی ہیروئن نے کھائی اور مرتے دم تک نبھائی۔ تعلق ایک دم سے نہیں ٹوٹتے۔ ان کے پیچھے زمانے گزرتے ہیں۔ نفرتیں تشکیل پاتی ہیں، محبتیں ناپید رہتی ہیں... پھر ہی تو...

چاند تنہا ہے آسمان تنہا
دل ملا کہاں کہاں تنہا

جس خوب صورتی سے کمال اس کی زندگی میں آیا تھا، اس سے کہیں زیادہ بدصورتی سے وہ اس کی زندگی سے نکل گیا۔ دونوں کی علیحدگی کی خبر۔ ان کی شادی کی خبر کی طرح جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔

وہ لوگوں کو بھی ٹھیک سے سمجھا نہ سکی کہ وہ کیوں کمال سے الگ ہوگئی ہے۔ کچھ باتیں بتائی جائیں تو بہت بار شرمسار ہونا پڑتا ہے۔ پھر ایسی باتوں کے لیے الفاظ بھی تو نہیں ہوتے کہ انہیں بیان کردیا جائے۔ انہیں تو بس آنسوؤں میں ہی بہایا جاتا ہے۔

کمال امروہوی سے شادی کرنے والی انیس بیس سال کی لڑکی، بیس سال کی ہو چکی تھی۔ گیارہ، بارہ سال کے اس سفر نے کھیلی کی ننھی منی مہ جبیں ناز کو مار دیا تھا۔ وہ منجو بنی تھی اور اب "مینا کماری" بھی نہیں رہی تھی۔ نیند کی گولیوں کی مقدار نے جب اس کی صحت برباد کرنی شروع کردی تھی تو ڈاکٹر نے وہ مشروب دوا میں لکھ دیا تھا جو کلیجہ پھونکتا تھا۔ وہ یہ پیتی تھی تو نیند سے پہلے غم سے غافل ہوجاتی تھی۔ اسے یہ دوا، دنیا کی ہر دوا سے زیادہ اچھی لگی۔ یہ دوا جو اسے کھولی میں بھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ جو اس کی آہ و بکا کو قہقہوں میں بدل دیتی تھی۔ ایسی دوا وہ شوق سے پینے لگی۔

کمال سے علیحدگی کے دو سال پہلے بابو جی مر گئے تھے۔ ماں جی بھی تو زندہ نہیں تھیں۔

وہ بھٹکنے لگی۔ اتنا بھٹک گئی کہ نشے میں غرق ہو کر رہ گئی۔ کس کس کے ساتھ اس کا نام نہیں جوڑا گیا۔ گناہوں کی فصل کے بیج تو دوسروں کے ہاتھوں میں تھے، وہ تو بس زمین تھی۔ لوگ آتے گئے، فصل بوتے گئے۔ لوگ اس سے طرح طرح کے سوال کرتے اور اس کا دل چاہتا وہ ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ کر کہیں آگے نکل جائے۔

"دنیا چھوڑ کر تو صرف موت کی سواری میں ہی آگے نکلا جاسکتا ہے۔"

گرودت نے خودکشی کرلی۔ اس جیسے ذہین و فطین انسان کو زندگی نے آخر اتنا بے بس کر ہی دیا کہ اس نے موت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اخبارات گرودت کے لیے چلانے لگے اور مینا چپ چاپ سب دیکھتی رہی۔ اس نے یہ جان لیا کہ جو شخص جتنا وصول پاتا ہے وہ محصول بھی اتنا ہی ادا کرتا ہے۔

ہر گزرے دن کے ساتھ وہ اپنا معاوضہ بڑھانے لگی کہ کبھی تو اسے انکار کیا جائے گا۔ شاید کبھی تو وہ فلموں سے دور ہوگی۔ یہ ایک لاشعوری کوشش تھی، ورنہ شعوری کوشش تو یہ ہوتی کہ وہ ایک پریس کانفرنس بلاتی اور اعلان کردیتی۔

"میرا سفر تمام ہوا... اب میں مزید فلموں میں کام نہیں کروں گی۔"

دل ایک کھائی بن گیا، اس کی طلب بڑھتی گئی۔ جس چشمے کا پانی شفاف، میٹھا تھا، وہ گندی ندیوں میں مل کر غلیظ ہوگیا۔

اس نے کبھی کسی کو رو کر نہیں دکھایا تھا، پھر بھی ساری دنیا جان گئی وہ دکھی ہے۔ اس نے کبھی کسی کو اپنے دل کا حال نہیں سنایا تھا، پھر بھی سب جان گئے اس کا دل خالی ہے۔ اور دل خالی ہی تو نہیں ہو رہا تھا۔ گلریز اس کے پاس تھا۔ وہ اس کے آنسو پونچھتا۔

Downloaded From http://paksociety.com

وقت پر اس کو دوا دیتا۔ جب وہ خون کی الٹیاں کرتی تو وہ اپنی سانس کھینچ کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا اور یوں کچھ لمحوں کے لیے وقت اپنا ڈھب بدل دیتا۔

"دادا۔۔۔ دادا پانی پلاؤ گے؟"

وہ بے چارہ باہر گیا۔ بڑے خلوص سے اندر لے گیا۔ چھوٹی سی بینچ کو ہاتھوں سے صاف کیا اور کہنے لگا۔ "بسا بسا' بیٹھو بیٹھو۔"

پھر اندھیرا جیسے گھنگھرو بجانے لگا۔ میلی میلی چھوٹی سی لڑکی' ادھیا کٹوری لے آئی۔ بہت سے بچے بھی آ کھڑے ہوئے۔ پھر گھر کی عورت بھی۔۔۔ دیوالی ہے نا' پائل پہنے ہوئے تھی وہ بچی۔ سچ اس لمحے جیسے سب دیوالی میں تھے۔ (ڈائری)

☆ ☆ ☆

"جس شخص کو سکون و اطمینان میسر نہیں اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔" (ڈائری)

وہ لینڈ مارک بلڈنگ میں اپنے الگ فلیٹ میں رہتی تھی۔ مدھو اور خورشید آپا اپنے اپنے بچوں کے ساتھ وہیں آجاتیں۔ اس کی فلموں میں مانگ دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ کوئی ایک وجہ بھی ایسی نہیں تھی جو لوگوں کو اسے دیکھنے کے لیے سینما لانے سے روک سکتی۔ اس کی تصویریں شائع ہوتیں تو لڑکیاں اسے دیکھ دیکھ کر فیشن کرتیں۔ وہ جس انداز میں بات کرتی' وہ اسی انداز کو اپنا لیتیں۔ جس فلم میں وہ جن اطوار کا مظاہرہ کرتی' وہی اطوار عام ہوجاتے۔ اس کی شہرت آکاش بیل تھی' اوپر۔۔۔ اوپر اور بس اوپر۔۔۔ وہ اپنا چوتھا ایوارڈ بھی حاصل کرچکی تھی اور صدارتی ایوارڈ بھی۔ یوں وہ ہندی سینما کی پہلی ہیروئن بن گئی' جس کے ریکارڈ پر چار فلم فیئر ایوارڈ تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں اسے خط ملتے اور لوگ دیوانہ وار اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ اخباروں میں چھپتی اس کے معاشقے کی خبریں لوگوں کو بے چین کردیتیں۔ تفصیل جاننے کے لیے ایسے اخبار دھڑا دھڑ خریدے جاتے۔

"مینا کماری فلاں ہیرو سے عشق لڑا رہی ہیں۔" (ڈائری)

لوگ یہ پڑھتے ہی دیوانے ہوجاتے۔ مینا اس بار بھی کمال کی طرح دھوکا نہ کھالے۔ مینا اور دکھی نہ ہوجائے۔ اس کے دل کی دنیا نہ اجڑ جائے۔

"ملکہ جذبات مینا کماری ہر وقت شراب پیتی رہتی ہے۔ شراب ہی اس کا کھانا پینا ہے۔" (ڈائری)

ہر روز اخبار اس کی ایک نئی کہانی سناتے۔ وہ ایسی خبریں پڑھتی تو کبھی ہنس دیتی۔۔۔ کبھی رو دیتی۔۔۔ سب جھوٹ نہیں تھا۔ سب سچ بھی نہیں تھا۔ ویسے بھی سچ پانے کے لیے مرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اپنی پوری مقدار کے ساتھ "سچ" صرف اللہ کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔

"میں جلد سے جلد سکون و اطمینان حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ فلموں میں کنٹریکٹ کرتی ہوں' تاکہ جو کچھ عوام کو دکھانا چاہتی ہوں' وہ جلد از جلد منظر عام پر آجائے اور پھر میں ہوں اور میری تنہائی۔" (ڈائری)

"آہ۔۔۔ پاکیزہ۔۔۔"

چار سال پاکیزہ کی وقفے وقفے سے ہونے والی فلم بندی اب مکمل طور پر بند تھی۔ کمال کا گھر چھوڑ دینے کے چار سال بعد اسے کمال کی طرف سے ایک خط ملا اور "پاکیزہ" کو مکمل کرنے کی درخواست کی گئی۔ ساٹھ جمع آٹھ سن۔ اس نے وہ خط پڑھا اور دیر تک ہسٹریائی ہنستی رہی۔

"کاش مجھے گھر واپس بلا لینے کے لیے بھی تم نے ایسا ہی ایک خط لکھ دیا ہوتا۔ کاش تم اتنا لکھ دیتے۔"

"مینا لوٹ آؤ۔"

"مینا لوٹ آؤ۔" کمال نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا۔ یہ بلاوا اسے نمائش سے زیادہ کچھ نہ لگا۔

جتنی خوب صورت وہ فلم بن رہی تھی' اتنا ہی بدصورت اس کا انجام ہوتا جارہا تھا۔ پھر ایک دن اسے موسیقار غلام محمد کی موت کی خبر ملی۔ غلام محمد اسے اس کے بابو جی کی یاد دلاتے تھے۔ بابو جی کی طرح وہ بھی سر ساگر تھے۔ غلام محمد کے پاس واحد بڑی فلم "پاکیزہ" ہی

Downloaded From http://paksociety.com

تھی۔ انہوں نے بڑی جانفشانی سے لفظوں کو روح کیا تھا۔ اتنی مدت پر بھی فلم مکمل ہوتی نظر نہیں آئی تو وہ "پاکیزہ" کے گانوں کے ریکارڈ فلم سازوں کو جاجا کر سنانے لگی۔ لیکن سب نے ان کے کام کو رد کر دیا۔ "پاکیزہ" کی موسیقی سے کوئی بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

ان کی موت نے اس پر بہت گہرا اثر کیا۔ ایک انسان اپنا سارا فن "پاکیزہ" کو دے گیا اور خود مر گیا۔ مینا کو بہت رونا آیا۔ کتنے ہی لوگ تھے جن کی زندگیاں "پاکیزہ" سے جڑی تھیں۔ کچھ واقعات و حادثات اور کچھ نرگس، سنیل کا سمجھانا اس نے فلم مکمل کرنے کا عندیہ دے دیا۔ مارچ کے مہینے میں ہی وہ کمال سے الگ ہوئی تھی اور مارچ میں ہی وہ کمال کی "پاکیزہ" کی تکمیل کے لیے پھر سے اس کے ساتھ تھی۔

ایک بار وہ علاج کے لیے ماسکو جا چکی تھی۔ ایک بار لندن۔ نرسنگ ہوم بھی اسے اکثر رہنا پڑتا۔ ڈاکٹر کہتے اسے جگر کی بیماری ہے' وہ کہتی اسے دل کا عارضہ لاحق ہے۔ لندن سے واپسی پر وہ کافی بہتر تھی۔ واپسی پر ڈاکٹر نے بس اتنا کہا تھا۔

"جس دن مرنا ہو' اس دن شراب پی لیجئے گا۔"

اس نے مسکرا کر ڈاکٹر کو دیکھا اور اردو میں کہا۔

"زندگی کا زہر پی چکی۔ اب موت کا تریاق پیوں گی۔"

جب وہ واپس آئی تو اسے جس نے دیکھا یہی کہا کہ وہ بہت خوب صورت ہو کر آئی ہے۔ آپا اور رید ھو اس پر واری صدقے جاتی تھیں۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کے بچے اپنی ماسی کو "ماں سی" ہی سمجھتے۔

اپنی صحت کو کچھ بحال کر کے وہ سیٹ پر آ گئی۔ اس کی نظر کمال پر گئی تو سسکیاں اس کی نگاہ میں سمٹ آئیں۔ ٹرین کی چھک چھک میں جب اس کے پاؤں میں رقعہ رکھا گیا تو وہ پلو سے ڈھانپے اپنے چہرے کو تاریک ہونے سے نہ روک سکی۔ بے رنگ شلوار قمیص میں ملبوس جب اس نے "چلو دلدار چلو' چاند کے پار چلو" فلمبند کر دیا تو میک اپ روم میں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

کمال کے بعد ایک شخص آیا تھا اس کی زندگی میں۔ جس سے اسے ان سالوں میں محبت ہو گئی تھی۔ اتنی شدید کہ پھر کسی اور سے نہ ہو سکی۔ جسے دنیا بس اس کے ایک معاشقے کی حیثیت سے جانتی تھی۔ جسے اخباروں نے بڑی غلاظت سے اچھالا تھا۔ دونوں پر بڑی تہمتیں لگی تھیں کہ "محبت کی پاکیزگی" قائم نہ رہ سکی۔ کچھ روایات کی پابندیاں تھیں' کچھ دونوں ہی بدنصیب تھے کہ وہ ہو نہ ہو سکا جو اس نے چاہا۔ زندگی کہاں سے کہاں آ نکلی۔ ایک اس دنیا میں اس کے ہی دل کے لیے کوئی آسرا نہ تھا۔ اس شور' ہنگامے سے بھری پری زندگی میں ایک اسی کی تنہائی کو کاٹ ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔

اس کے دل کو' روح کو جو بیماریاں لگیں' انہوں نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا۔

"اس نے دکھوں پر صبر کیوں نہ کیا۔ اپنا راستہ کیوں نہ بدل دیا۔ اس نے خود کو ختم کر لینے کا انتخاب ہی کیوں کیا۔" یہ سوال ہمیشہ سوال ہی رہے۔ اس نے ان کے جواب وقت پر چھوڑ دیے۔

✡ ✡ ✡

"صبح سے بابو جی یاد آ رہے ہیں۔ ورشا کو نانی سے اپنے تک کا سلسلہ سنانی رہی۔" (ڈائری)

وہ اپنی اب تک کی زندگی میں اتنا نہیں تھکی تھی جتنا "پاکیزہ" کی شوٹنگ کراتے ہوئے تھکنے لگی تھی۔ سیٹ پر دو تین ڈاکٹر ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ اکثر اسے سہارا دے کر کھڑا کرنا پڑتا۔ اس کے لیے اسکرپٹ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ کیمرے کے زاویے بدلے گئے۔ اس کا چہرہ آنچل سے ڈھانپ کر چھپایا گیا۔ کہیں دور سے شارٹ لیا گیا' کہیں سائیڈ پوز۔

اس کا حسن' عمر سے پہلے ڈھل گیا۔ اندر کی دہشت چہرے سے جھلکنے لگی۔

اس کی حالت کی وجہ سے شوٹنگ کئی کئی دن تک رکی رہتی۔ وہ کچھ ٹھیک ہوتی تو پھر سے شوٹنگ شروع ہو جاتی۔ نقاہت' بیماری' تکلیف کے باوجود وہ پوری

Downloaded From http://paksociety.com

جانفشانی سے کام کرتی۔ تیس' بتیس سالوں میں اس نے نوے کے قریب فلمیں کی تھیں۔ ہر فلم کو اس نے آخری فلم سمجھ کر کیا تھا۔ اپنے کام کو وہ عبادت کا درجہ دیتی تھی۔ کام سے خیانت اس کے لیے سب سے بڑا گناہ تھی۔

"کچھ" جو ہو جانے والا ہے نہ جانے "ہو" کیوں نہیں جاتا کہ یہ اذیت ناک انتظار ختم ہو۔ (ڈائری)

"مدھو بالا بھی مر گئی۔" مرنے والے سارے اسے "خوش قسمت" لگتے۔ خود کو زندہ دیکھ کر وہ آہیں بھرتی۔ یہ سن ستر ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی زندگی کے سارے کام سمیٹ رہی تھی۔ سارے تعلق اس نے سمیٹ دیے تھے۔ اب بس خون کے ہی تعلق بچے تھے۔ زندگی میں اس کی ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ لوگوں کے سوال تو ابھی بھی وہیں تھے' البتہ اس نے اپنے جواب "سینت" کے لیے تھے۔

"جتنی شہرت اور جتنا نام آپ کو ملا ہے' اس کے بعد آپ کیا سوچتی ہیں؟"

"سوچتی ہوں' جہاں میں پہنچ چکی ہوں' وہاں سے ایسے ہی چلی جاؤں۔"

"ذرا وضاحت کیجیے؟"

"یہی کہ جتنی شہرت اور جتنا نام مجھے ملا ہے' اس کے بعد مجھے مر جانا چاہیے۔"

"آپ امر ہونا چاہتی ہیں' جیسے مارلن منرو ایک رات سوئی اور صبح امر ہو گئی؟"

"کاش میں مر جاتی... ابھی پتا نہیں اور کتنا درد سہنا ہے۔ شاید میرے اندر کی مینا جینا چاہتی ہے' لیکن دوائیں تن کو آرام پہنچا سکتی ہیں' من کو نہیں۔"

"محبت کے بارے میں آپ کا نظریہ؟"

"محبت ہی دنیا میں سب کچھ ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔" (انٹرویو)

محبت کے بغیر دنیا میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ تو پھر وہ کیسے زندہ رہتی۔ مرنے کے لیے اس نے اپنی سانسیں گننا شروع کر دیں۔ جیسے ٹوٹنے سے پہلے ستارہ پوری شان سے چمکتا ہے۔

اس کی زندگی کا محور اب "پاکیزہ" ہی تھی۔ اس کی بیماری کی خبر دنیا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اکثر جب وہ سیٹ پر کام کرتی تو اسے لگتا کہ بس یہیں کیمرے کے سامنے وہ اپنی آخری سانسیں لے دے گی۔ پھر وہ سوچتی اچھا ہی ہو گا۔ جو زندگی کیمرے کے سامنے شروع ہوئی ہے اسے ختم بھی وہیں ہو جانا چاہیے۔

"شام ہوئی اور آج پھر ڈر لگنے لگا ہے رات سے... شام سے... یہ ڈر کیوں ہے؟" (ڈائری)

رات کے سناٹے میں جب وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر بمبئی کی سڑکوں کو بہتا ہوا دیکھتی اور غروب ہو چکے سورج کے نشانوں کو تو وہ یہ سوچے بنا نہ رہ سکتی کہ اسے اپنا قصور کہاں سے نکالنا شروع کرنا چاہیے۔ زندگی کی بنت میں کون سا گھر غلط بیٹھا تھا کہ ساری زندگی ہی ادھڑتی چلی گئی۔ اس نے تو ہمیشہ باکردار رہنا چاہا' اس نے تو ہمیشہ سفید رنگ کو پسند کیا' پھر یہ غلیظ رنگ' یہ گندا' دھبے جیسا رنگ کیسے اس کے سفیدے پر بکھرتا چلا گیا۔ اسے تو گھر' شوہر اور بچے چاہیے تھے۔ پھر موٹر روک روک کر بمبئی کی سڑکوں پر خون تھوکنا کس وقت اس کے نصیب میں لکھا گیا۔

یہ سن ستر ہے جو ڈھلنے کو ہے۔

کچھ سال پہلے وہ ورشا کے ساتھ مہابلیشور گئی تھی۔ پندرہ سال پہلے وہ یہاں بابو جی کے ساتھ آئی تھی۔

"میں پونا کے حادثے کے بعد مر کیوں نہ گئی۔" (ڈائری)

اس نے وہ ساری جگہیں دیکھیں جہاں وہ بابو جی کے ساتھ آئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا اور پھر بھی سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔ کتنی ہی جگہوں پر رک رک کر وہ آنسو بہاتی رہی۔

"شاید لوگ میرے چہرے سے جان لیتے ہیں کہ اس بے چاری کو بھی پھول چاہئیں۔ ڈھیر سارے پھول دے اس بوڑھے ـــــ نے۔ باہر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی' تو مجھے دیکھ کر خود ہی پوچھنے لگا۔ "پھول مانگتا؟" کچھ نہیں بولی تو بھی ہاتھ میں تھما دیے۔"

Downloaded From http://paksociety.com

(ڈائری)

چند سال پہلے وہ اپنی کھولی بھی گئی تھی۔ وہاں بھی بیٹھ کر سسکتی رہی تھی۔ اس نے بمبئی کی ان سب سڑکوں پر نظریں دوڑائی تھیں، جن پر وہ مہ جبیں بانو بن کر گھوما کرتی تھی۔ جب دور، دور تک "مینا کماری" دکھائی نہیں دیتی تھی۔

"کس نے سوچا تھا کہ روپ تارا اسٹوڈیو میں کھیلنے والی بچی اتنی بڑی اداکار بن جائے گی۔" وجے بھٹ نے ایک دن ایسے ہی کہا۔

"ہیروئن نہ کہیں... ٹریجڈی کوئین کہیں۔" وہ تلخی سے ہنسی تو وہ خاموش ہو گئے۔

ایک دن نرگس نے بھی کہا تھا۔ "منجو! تم آزاد ہو، مگر ایسی بھی آزادی کس کام کی کہ خود کو ہی مار ڈالو۔"

سب ہی کچھ نہ کچھ کہتے تھے، لیکن وہ کسی سے کہہ نہ سکی کہ جو محبت اس کی مٹھی میں سیپ کے موتی کی طرح پڑی رہی تھی، اب یوں پتھر ہو گئی ہے تو اس سے جیا نہیں جاتا۔ روگ صرف محبت ہی نہیں تھا، لیکن ابتدا اسی سے ہوئی۔ بچپن سے محبت کا روگ، سہیلیوں سنگ کھیل نہ سکنے کا روگ، ماں کے چلے جانے کا، بابو جی کے گھر سے نکال دینے کا، گڑیا کے چھن جانے کا، گھر کا، بچوں کا اور سب سے بڑھ کر... ندی سے نالہ بن جانے کا۔

"مس اکھتر ڈوب چکا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے کہ مجھے کیا پسند ہے تو میں کہوں گی۔ "مجھے موت پسند" ہے۔ (ڈائری)

وہ آنکھیں موندے بیڈ پر لیٹی تھی۔ آس پاس دھواں سا پھیلا تھا۔

وہ پاکیزہ کی شوٹنگ مکمل کروا چکی تھی۔ اسے یہ چاہ نہیں تھی کہ وہ خود کو آسمان پر بلند تر دیکھے۔ جو چیزیں لوگ انگلیوں پر گنتے، وہ انہیں غفلت میں بھی نہیں گنتی تھی۔ وہ لینڈ مارک فلیٹ میں رہتی تھی۔ آپا اور مدھو اس کے ساتھ تھیں۔ وہ روز تاش کی بازیاں لگاتے اور شور برپا کرتے۔ پھر بھی زندگی کا سناٹا موت کی چاپ کو نہ روک پایا۔ کبھی اس نے اپنی غزلوں کا لانگ ریکارڈ اپنی ہی آواز میں ریکارڈ کروایا تھا۔ اکثر وہ اسے سنتی۔ وہ روز صبح اٹھتی اور سورج کو دیکھتی۔ زندگی کے اس مقام پر آ کر، جوانی کو یوں اندھیروں میں گرا کر اس نے جانا کہ سورج کی پہلی کرن کی تازگی کیسی ہوتی ہے۔

نئے سال کا سورج بھی طلوع ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں، بالکنی سے اگتے سورج کو دیکھ کر وہ، بہنوں کو دیکھ کر بے اختیار کہتی۔

"آپا! میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتی مدھو۔ مجھے بچالیں۔"

"کس نے کہا تم مر رہی ہو۔ دیکھو تمہاری زندگی کے لیے کیسے رو، رو کر دعائیں کرتی ہوں۔" آپا تڑپ جاتیں۔

"میں نے کبھی رو، رو کر اپنی موت کی دعائیں کی ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

ایک تھی مثال

رخسانہ نگار عدنان

مکمل ناول کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے

قیمت -/500 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

Downloaded From http://paksociety.com

آپا۔۔۔ میری دعائیں ہی قبول ہو جائیں گی۔"

"بہن نہیں ہو تم میری۔۔۔ بیٹی ہو۔۔۔ ماں ہوں میں تمہاری۔۔۔ مجھے یوں رنجیدہ نہ کرو منا۔"

اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ خورشید آپا' بابو جی کی پہلی بیوی سے تھیں۔ اس سے پندرہ سولہ سال بڑی تھیں۔ لیکن ان تینوں میں کبھی سگا سوتیلا نہیں آیا تھا۔ ماں کی طرح خورشید آپا نے اس کا خیال رکھا تھا۔

"شوکت کمار جی کہتے ہیں موت تو میٹھی نیند ہوتی ہے۔" زندگی کے لیے دعائیں کراتے ہوئے اسے پھر سے موت یاد آجاتی۔

آپا پلو آنکھوں پر رکھ کر رونے لگیں۔ "منا! بس کردو۔۔۔ میرے دل کو تکلیف دے کر تمہیں کیا ملتا ہے۔"

"اچھا سنیں! مجھے پھول بہت پسند ہیں۔ جانتی ہیں نا؟ میری تکیے پر ہمیشہ پھول دیکھے ہوں گے آپ نے۔"

"جانتی ہوں۔"

"میری قبر پر بھی پھول رکھ کر جایا کیجئے گا۔"

پلکوں کی درز سے اس نے روشنی کے ہالے میں سے جھانک کر دیکھنا چاہا۔ وہ اسپتال کے بیڈ پر دراز تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

تین فروری سن بہتر "پاکیزہ" کا پریمیئر ہے۔ وہ سینما سے فلم دیکھ کر نکل رہی تھی۔ پیٹ پھولا ہوا ہے۔ آنکھیں زرد ہیں۔ لوگوں کا ہجوم اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ وہ اس ہجوم پر ایک اجنبی نظر ڈالتی ہے۔ نگاہ سرد ہو چکی ہے۔ زندگی کی ساری آگ بجھ چکی ہے۔

جان لیوا ہے محبت کا سماں آج کی رات
شمع ہو جائے گی جل جل کے دھواں آج کی رات

"پاکیزہ" ایک کلاسیک فلم اور اس کی موسیقی لازوال۔ ہندی سینما شاید ہی ایسی تاریخ پھر کبھی دوبارہ دہرا سکے۔ (اخبار)

فروری ختم ہو رہا ہے۔ خزاں ایک اور خزاں کے لیے رخصت ہو رہی ہے۔

وہ کھولیوں کے باہر مٹکا سر پر رکھے راد ھا بنی ناچ رہی ہے۔

"میڈم! کل سے شوٹنگ کا شیڈول رات سے ہے۔"

بے بی! یہ بلی آپ کا منہ ایسے چاٹے گی۔

آپ ہندی سینما کی وہ پہلی ہیروئن بن چکی ہیں جس کے پاس چار ایوارڈ ہیں؟ کیسا لگتا ہے آپ کو؟

مینا جی اس چاقو سے میری کلائی پر اپنا نام لکھ دیں۔

آپ اور دلیپ کمار سب سے زیادہ معاوضہ لینے والوں میں سے ہیں۔ کیا چیز آپ کو دلیپ کمار کے برابر لا کر کھڑا کرتی ہے؟

میڈم مینا! آپ ٹریجڈی کوئین کیسے بنیں؟ اپنی اسٹوری شیئر کریں؟

مینا جی! آپ کے اعزاز میں جشن منایا جا رہا ہے' آپ کو دعوت دینے آئے ہیں۔

میڈم! سنا ہے آپ نئے آرٹسٹوں کی بہت مدد کرتی ہیں' ڈائریکٹر سے میرے لیے بھی بات کر دیں۔۔۔

میڈم۔۔۔ مینا جی۔۔۔ مہ جبیں۔۔۔ منا۔۔۔

اچھا تم ہو ناز؟ بڑی اداس شاعری کرتی ہو۔ سنا ہے آپ روز کے چالیس پان کھاتی ہیں؟ اتنا بیمار رہ کر بھی آپ کام کر لیتی ہیں؟

اس نے قہقہہ لگایا' لیکن یتیم خانے کی سیڑھیوں نے اس کا قہقہہ نگل لیا۔۔۔ وہ وہاں پڑی رو رہی ہے۔ وہ یہاں پڑی رو رہی ہے۔ سینٹ انتھنی نرسنگ ہوم' روم نمبر چھبیس۔

"لینڈ مارک میں اپنے فلیٹ کو وہ ایک نظر دیکھ رہی ہے۔ ساری دولت وہ پہلے ہی بانٹ چکی ہے۔ چابیاں اس نے آپا کے ہاتھ میں پکڑا دی ہیں۔ بھانجی کو لپٹا کر پیار کیا ہے۔ نیچے لوگوں کے ہجوم میں ایمبولینس کھڑی ہے۔ خاکروب عورت اس کے سینے سے لپٹ گئی ہے۔ اسے اپنا پرس پکڑا دیا ہے۔"

"مینا جی! ہمیں چھوڑ کر نہ جائیں۔" وہ زار زار رو رہی ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

ڈاکٹروں کی ٹیم اس کے بیڈ کے پاس کھڑی اس کا معائنہ کررہی ہے۔ آپا اور بدھو کا رو رو کر برا حال ہے۔ اسپتال کے باہر مجمع ہے۔ لندن سے منگوایا ایک خاص انجکشن اسے لگایا جارہا ہے۔ درد سے وہ بلبلا رہی ہے۔ مارچ تو بس جارہا ہے۔۔۔ مارچ کا اختتام بس اب قریب ہی تو ہے۔

وہ دریا کے دو کناروں پر کھڑی ہے۔ کشتی سامنے ہی تو کھڑی ہے۔ وہ آواز لگا رہی ہے۔

ہو۔۔۔ جی ہوووو۔۔۔ ووو۔۔۔ ووو۔۔۔

"آپ کی شادی گیارہ سال رہی۔ آپ ماں کیوں نہیں بنیں؟ آپ کو کین کا بھی استعمال کرنے لگی ہیں اور گھر والوں سے چھپا کر ڈیٹول کی بوتل میں وہسکی بھر کر رکھتی ہیں؟"

خاموشی۔۔۔

"سنا ہے آپ کے ایوارڈز محل اسٹوڈیو کے اسٹور روم کے جوتوں کے باکس میں پڑے ہیں۔ آپ نے انہیں اس قابل سمجھا؟"

"کمال صاحب سے علیحدگی کے بعد آپ نے اس ہیرو سے شادی کیوں نہیں کی، جس سے آپ ٹوٹ کر محبت کرتی تھیں؟"

"خاموشی۔۔۔"

"مجھے تنہائی کی وہ خاموشی پسند ہے، جس میں انسان اپنے دل کی دھڑکنوں سے باتیں کرتا اور بہت دیر تک اپنے دل کے توسط سے خود سے ہم کلام ہوتا ہے۔"

(ڈائری)

تنہائی کا عالم طاری ہوا۔ دھڑکن نے موت کی آہٹ پر کان کھڑے کیے۔ روح کے توسط سے وہ زندگی کے آخری لمحوں سے ہم کلام ہوئی۔

"میں مہ جبیں ناز کی حیثیت سے پیدا ہوئی۔ مینا کماری بن کر زندہ رہی اور اب میں — صرف "انسان" بن کر مررہی ہوں۔ میں نے زندگی میں ایک ہی چیز کی چاہ کی "محبت" کی اور وہی مجھے نہیں ملی۔ میں خدا سے اتنا ہی ڈری جتنا کوئی بھی عام انسان ڈرا۔۔۔ میں نے خدا سے اتنا ہی مانگا جتنا کوئی بھی انسان مانگتا۔"

اس نے آنکھیں پوری کھولیں، اور دیکھا کہ جو شہسوار زندگی لا رہے تھے وہ تو دراصل الٹے پاؤں تھے، تو اس کا انتظار تمام ہوا۔۔۔ ساعتیں ساکت ہوئیں۔

شب انتظار آخر۔۔۔ کبھی ہوگی مختصر بھی

یہ چراغ بجھ رہے ہیں۔۔۔ میرے ساتھ جلتے جلتے

آنکھ کی جھری سے اس نے ایک آخری منظر دیکھا۔ کشتی اس کے پیروں کو چھونے لگی ہے۔ وہ اس میں بیٹھ گئی اور چپو چلانے لگی۔ زندگی اپنی ساری حقیقتیں، تلخیاں، رنگینیاں لیے پیچھے رہ گئی اور ابد کا پانی اس کی کشتی کے نیچے بہنے لگا۔ کوئی جانے کے بعد زندگی کی آخری سانس سے پہلے، صرف اکتالیس سال کی عمر میں اس نے پورے شوق سے سب چراغوں کو بجھا دیا۔ اگست کی آخری تاریخ، موت کی پہلی تاریخ رہی۔۔۔ اور اس کی زندہ ڈائری کا یہ پنا پھڑپھڑاتا رہا۔

"موت، سکون اور خاموشی کی معراج بھی ہوسکتی ہے۔" (ڈائری)

جلتی بجھتی سی روشنی کے پرے
سمٹا سمٹا سا اک مکاں تنہا
راہ دیکھا کرے گا صدیوں تک
چھوڑ جائیں گے یہ جہاں تنہا

☆ ☆ ☆

عبرت ان لوگوں کے لیے جو آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور بینائی کھو بیٹھتے ہیں۔

نصیحت ان لوگوں کے لیے جو آنکھ اور دل کو اندھا کر دینے والی دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں اور دلدل میں جا گرتے ہیں۔

اور

سبق ان لوگوں کے لیے جو محبت کے لیے کاسۂ دل لیے پھرتے ہیں۔ انہیں دل بہلانے والے تو ملتے ہیں، دل میں بسانے والے نہیں ملتے۔

Downloaded From http://paksociety.com

عفت سحر طاہر

خواب شیشے کا

وہ اس کی سماعت میں زہر اتار کر کمرے سے ملحق بالکنی میں نکل گیا تھا۔ تزئین گنگ سی بیٹھی رہ گئی۔ لمحہ بھر کو دروازہ کھل کر بند ہوا تو سرد ہوا کا جھونکا اس کے وجود سے ٹکرایا۔۔۔ وہ جھرجھری لے کر حواس میں آئی۔ تب اسے احساس ہوا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔۔۔ وہ بے یقین ہوئی۔

"یعنی جو اس کا تھا وہ ابھی بھی اسی کا تھا تو میں۔۔۔ میرا کیا رول ہے اس کھیل میں۔" اسے شدید غصے نے اپنی لپیٹ میں لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اور اپنی سینڈل کو نظرانداز کرتی وہ ننگے پاؤں ہی بالکنی میں نکل آئی تو ٹھنڈے فرش نے اس کے پیروں میں کرنٹ سا دوڑا دیا۔ باہر وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پر جمائے' دور سڑک پر نظر جمائے موسم کی انتہا سے بے خبر کھڑا تھا۔ تزئین کا سر گھوما۔ سرد ہوا نے اس کے وجود میں پھریری سی دوڑا دی۔ ٹھنڈ ہڈیوں میں گھسنے لگی تھی۔

"طلال۔۔۔!" اس نے بے اختیار پکارا تو انداز میں ایک شکوے اور احتجاج کی سی کیفیت تھی۔ وہ چونک کر پلٹا۔ غیر متوقع طور پر تزئین کو وہاں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ناگواری سی اتر آئی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

بارہویں قسط

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

"میں بھی تم سے یہی سوال پوچھنے آئی ہوں طلال۔" اس نے دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر سردی سے کپکپاتے جسم کو گرم رکھنے کی کوشش کی۔

"اس وقت میرا دماغ خراب ہو رہا ہے تزئین۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے منہ سے کچھ غلط بات نکلے۔ تم جاؤ اندر۔" وہ بہت ضبط سے بولا۔ مگر تزئین کا کم از کم اس وقت تو ہتھیار ڈالنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"تو پہلے کون سا اچھا سلوک کر رہے ہو۔ میں اندر تب ہی جاؤں گی طلال جب تم اپنے اس رویے کی وضاحت کرو گے۔" طلال کی آنکھوں میں ضبط کی لالی اترنے لگی۔ اس نے آگے بڑھ کر تزئین کا بازو تھاما تو گرفت بے رحمانہ تھی۔

"مجھ سے اس قدر حق سے بات مت کرنا کبھی۔ سمجھیں۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تو درد کی شدت سے وہ کراہ اٹھی۔ ایک جھٹکے سے طلال کا ہاتھ اپنے بازو پر سے ہٹایا۔

"بی ہیو طلال۔۔۔ میں ایسے رویے کی عادی نہیں ہوں۔" تزئین کون سا غصے میں اس سے کم تھی۔ چیخ کر بولی۔ وہ پلٹ کر پھر سے ریلنگ کی طرف چلا گیا۔

"تو اب ہو جاؤ عادی۔ کیونکہ میں ایسا ہی ہوں۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

تزئین نے خالی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا اور تاسف سے بولی۔ "اس دوستی کا خیال کرو جو ہمارے بیچ تھی طلال۔۔۔ اور اپنا رویہ دیکھو۔ مجھ سے شادی کرنا تمہارا فیصلہ تھا۔ میرا نہیں۔"

"مر تو تم بھی رہی تھیں اس شادی کے لیے۔" طلال کا وار کاری تھا۔ تزئین بلبلا اٹھی۔

"پروپوزل تم نے بھیجا تھا طلال۔۔۔ ان فیکٹ ریکویسٹ کی تھی تم نے اگر تمہیں یاد ہو تو۔"

"اندر چلی جاؤ تزئین۔۔۔" وہ سرد مہری کی آخری حد پر تھا۔

"چلی جاؤں۔۔۔؟ اور تم اس گھٹیا لڑکی کی باتوں میں سنگ سنگ کر رات بتا دو۔ وہ لڑکی جس نے نہ اپنے گھر والوں کی عزت کا خیال کیا اور نہ تمہاری۔" وہ پھٹ پڑی۔

طلال کرنٹ کھا کر پلٹا۔ وہ نئی نویلی دلہن ہونے کے احساس سے ماورا ہتک اور ذلت کے حصار میں گھری اس کے مقابل تھی۔

"مجھے بے زبان جانور سمجھ کر ٹریٹ مت کرنا طلال۔۔۔" وہ انگشت شہادت اٹھا کر بولی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر لہجہ قطعی تھا پھر وہ پلٹی اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ طلال بے بسی کے احساس میں گھرا وہیں کھڑا رہ گیا۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے مہاہ اور مہاہ کا ہاتھ تھامے ہوئے موحد کے چہرے ہٹتے تو اسے پور پور اپنے لیے سجی تزئین دکھائی دیتی نا۔ آج کی رات کئی دلوں کے لیے بوجھل اور قاتل تھی۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ جان نکالنے والی۔

☆ ☆ ☆

مہاہ نے تزئین کی رخصتی سے پہلے ہی خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ جان تھی جو آہستہ آہستہ بدن سے نکلی تھی آج۔ طلال پر اپنی طمانیت جتانے کے لیے وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر ہمت دکھا آئی تھی۔ اس کی ہر خوش فہمی کو ختم کرنے کے لیے اپنے دل پر آج پیر رکھ دیا تھا مہاہ نے۔

اور دل پر پاؤں رکھنے کی تکلیف وہی جانتے ہیں جو اس قیامت خیز کرب سے گزرتے ہیں۔ اپنی خواہش کے آگے خود دیوار بننا ہر کسی کو نہیں آتا۔ مہاہ اسی کرب سے گزری۔۔۔ اپنے دل کی خواہش کے آگے دیوار بنی تو تھی مگر اب نڈھال ہو گئی تھی۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ مگر آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ پچھلے تین دنوں سے وہ بس "آخری"

Downloaded From http://paksociety.com

آنسو بہا رہی تھی۔۔۔ مگران کمبختوں کی اخیر تھی نہ انت۔

بھلا محبت کی راہ سے پلٹنے والے کی آنکھ کبھی سو سکتی ہے اور اگر زبردستی اس راہ سے پلٹایا گیا ہو تو پھر یہ آنکھیں ساون رویا کرتی ہیں۔ مہراہ بھی اسی کیفیت میں تھی۔ اسے طلال کی آخری نگاہ یاد تھی۔ اسے موحد کے ہمراہ دیکھ کر بے یقینی کے کرب و بلا بھری نگاہ۔

آہ۔۔۔ وہ نگاہ جو مہراہ کی طرف اٹھتی تو اس میں محبتوں کے گلاب کھلتے مہکتے دکھائی دیتے تھے۔ آج وہ نظر پرائی ہوئی۔۔۔ مہراہ کیسے خود کو گھسیٹ کر تائی جان کی نشست تک گئی' یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ برے حالات ہی میں سہی مگر اس نے خود کو کسی کے نکاح میں سونپ دیا تھا۔ کسی بد دیانتی سے بچنے کے لیے اللہ کو گواہ بنا کر اس نے دل سے نمیر آفندی کے لیے ہامی بھری تھی۔ تو اب طلال کی یاد میں رونا کیا' مگر وہ کیا کرتی۔۔۔ آنسوؤں کو پونچھتی تو یاد آتا کہ طلال تو اب ہر وقت نظر آیا کرے گا۔ تزئین کے شوہر کے روپ میں۔ اور یہ بات مہر کو مار ڈالتی تھی۔ وہ چار شادیاں کر لیتا مگر مہراہ کی نظروں سے دور رہتا تو وہ حالات سے سمجھوتا کر لیتی۔ مگر طلال نے تو فیصلہ ہی عجیب کیا تھا۔ اور مہراہ سمجھ سکتی تھی کہ طلال کا یہ غلط فیصلہ آفندی ہاؤس میں کیسے طوفان اٹھانے والا تھا۔ دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ نڈھال سی تکیے پر اوندھی گر کر سسکنے لگی۔

☆ ☆ ☆

سومیہ کی بے یقینی کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ اس کے لبوں سے اس کا اعتراف جرم سن کر بھی بے یقین نظروں سے سامنے بیٹھے نمیر کو دیکھ رہی تھی۔ کافی کے کپ کو اس کے سامنے کھسکاتا وہ جیسے روزمرہ کے مطمئن انداز میں تھا۔

"آج بہت سردی ہے۔ کافی بھی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

سومیہ نے آہستہ سے پلکیں جھپکائیں۔ گویا اس خواب کو توڑنے کی سعی کی۔ مگر یہ خواب نہیں تھا اور ویسے بھی خواب ہمیشہ وہی ٹوٹا کرتے ہیں جن کو انسان سینت سینت کر رکھتا ہے۔ جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔

"یہ تم نے کیا کیا نمیر۔۔۔؟ اس کی تو شادی ہونے والی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ تو؟ ہو گئی نا نکاح بھی تو شادی ہی ہوتا ہے۔" وہ مطمئن تھا۔ سومیہ کا دل کسی نے مٹھی میں کر لیا۔ اس کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں گلابی ہونے لگیں۔

"بہت ظالم انسان ہو نمیر۔۔۔ آفندیز ہی نکلے تم بھی۔"

"آفندیز سے آفندی بن کر ہی ملنا پڑا اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ میرے پاس" وہ پُرسکون انداز میں بولا۔ تو سومیہ سُلگ کر بولی۔

"اور وہ۔۔۔ ایک کمزور اور بے بس لڑکی کے خواب توڑنا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اور اس کمزور شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو سچائی کا پتا لگانے کے لیے چند دن اسٹینڈ نہیں لے سکا مہراہ کے لیے۔ اسی طے شدہ تاریخ پر اسی کی کزن کے لیے دولہا بن کے آگیا الو کا۔۔۔" طنز سے کہتا آخر میں وہ بڑبڑایا۔ پھر اسے گھور کر دیکھا۔ "ایک میں ہی نہیں یہاں اور بھی بہت ہیں' دو سروں کا دل اور خواب توڑنے والے۔ تمہیں صرف میں ہی نظر آتا ہوں۔"

"ہاں۔۔۔" سومیہ نے متاسفانہ گہری سانس لی۔ "مجھے تو ہمیشہ تم ہی نظر آئے۔ مگر تمہیں کبھی میں نظر نہیں آئی۔"

Downloaded From http://paksociety.com

"تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔ سومی" وہ سنجیدہ ہو گیا۔
سومیہ نے لب کچلے۔ "بس کرو نمیر۔ مت دو جھوٹی دوستی کا فریب مجھے۔"
"ایک تو تم لڑکیاں جذباتی بہت ہوتی ہو۔"
"تم نے انتقام لینے کے لیے ایک لڑکی کا سہارا لیا نمیر۔" وہ اسے شرم دلانے والے انداز میں بولی۔
"تو کون سا جرم کر دیا میں نے۔ آرام سے نکاح پڑھوا کر بخیر و عافیت گھر چھوڑا ہے آنسہ مہراہ کو۔" وہ تنک کر بولا۔

سومیہ نے بمشکل ضبط کر کے اسے دیکھا۔ "تمہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ تم کسی بے گناہ لڑکی کے ساتھ کیا کر چکے ہو؟"
"بے گناہ بے گناہ... کیا رٹ لگا رکھی ہے تم نے؟ میں 'میری ماں' میرا باپ... ہم میں سے کون قصوروار تھا؟ مگر سزا ہم سب نے بھگتی۔ اب ان کی باری ہے۔ جیسا مجھے صحیح لگے گا۔ میں ویسا ہی کروں گا۔" وہ خشک و تند لب و لہجے میں بولا تو سومیہ لب کچلتی چہرہ موڑ کر ریستوران میں دیکھنے لگی۔ اس کا رونے کو دل چاہ رہا تھا۔ کتنی آسانی سے نمیر نے اسے اپنی زندگی سے الگ کر دیا تھا۔ اس کی اچانک خاموشی نے شاید نمیر کو احساس دلایا تو معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔
"آئی ایم سوری سومیہ۔ اگر تمہارا دل دکھا ہے تو... مگر میں کیا کروں... مجھے اپنی پہچان چاہیے۔ اور وہ میں کسی بھی صورت حاصل کر کے رہوں گا۔ میں موحد آفندی جیسا خوش قسمت نہیں ہوں۔ چودہ سال بعد اس گھر میں واپسی پر جس کا والہانہ استقبال کیا گیا ہے۔
مجھے تو وقار آفندی کا بیٹا بھی نہیں سمجھا جاتا... میری پہچان صرف زر نگار ہے۔ اور تمہیں پتا ہے... مہراہ آفندی نے بھی مجھے میری ماں کے نام کا طعنہ دیا... یعنی ان سب کے دل ایک ہی ہیں۔" اس کی آنکھیں لال ہونے لگیں۔ وہ ضبط کی انتہا پر تھا۔
"مگر یہ نکاح تمہارے مسئلے کا حل تو نہیں ہے نمیر!" سومیہ نے اسے ٹوکا۔
"نہ ہو... مگر مجھے ان کی تڑپ دیکھ کر خوش ہو لینے دو سومیہ۔ ان لوگوں کو بھی پتا چلے کہ دل کیسے چھلنی ہوتا ہے۔"
"تمہیں سمجھانا بے سود ہے۔" سومیہ نے سر جھٹکا۔ درحقیقت وہ اندر سے ملول و پژمردہ تھی۔ طلال اور مہراہ کے ساتھ ساتھ نمیر آفندی نے جانتے بوجھتے سومیہ کا دل بھی توڑ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تزئین نے رات جیسے تیسے کر کے آدھی سوئی آدھی جاگی کیفیت میں گزار دی تھی۔ رات طلال کمرے میں آیا بھی تو اس کی طرف دیکھے بغیر بستر کے کونے پر پڑ کر کمبل لپیٹے سو گیا۔ تزئین کا جی چاہا اس سنگ دل شخص کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ جو مہراہ کے کیے کا بدلہ اس سے لے رہا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی تیز آواز پر وہ جاگی تو آنکھیں کھل جانے پر بھی نئے ماحول سے واقف ہونے میں اسے چند لمحے لگے۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ طلال شاید باتھ روم میں تھا۔ اس نے دکھتے سر کو ہاتھ سے دبایا۔ رات کی فلم پھر سے آنکھوں کے سامنے چلنے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
وہ کیا بد عا دیتی طلال اور مہراہ کو... بد دعا تو اسے لگ گئی تھی کسی کی۔ من کی مراد پا کر بھی جو نامراد رہی تھی۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا یا شاید انہیں جگانا ہی مقصود تھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور باتھ گاؤن میں

Downloaded From http://paksociety.com

ملبوس طلال باہر نکلا۔ تولیے سے رگڑ رگڑ کر بال خشک کرتا وہ جیسے کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ تزئین کا دل غصے سے بھرنے لگا۔

"تمہیں احساس ہے طلال کہ تم کیا کر رہے ہو؟" بستر سے اتر کر چپلوں میں مہندی کے نقش و نگار سے سجے پاؤں ڈالتی وہ تلخی سے مخاطب ہوئی۔ کرسی کی پشت پر تولیا ڈالتا وہ ایک نظر اس پر ڈال کر وارڈ روب کی طرف بڑھا اور اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ خفت کے مارے تزئین کی پیشانی تپ اٹھی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے طلال! تم اپنی زندگی کے خوب صورت پل اس لڑکی کے لیے برباد کر رہے ہو جسے تمہاری بربادی سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔"

تزئین کی بات سن کر طلال کے ہاتھ لمحہ بھر کو ٹھٹکے پھر وہ تیز لہجے میں بولا۔ "تیار ہو کر باہر جاؤ۔ دوبارہ ناشتے کے لیے بلاوا آچکا ہے۔" مگر تزئین اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ آج ولیمے کی تقریب تھی۔ رات تک وہ دوبارہ ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔

"تم نے مجھے خود پرپوز کیا تھا طلال....!" وہ اس کے سامنے آکر احتجاجاً بولنا شروع ہوئی۔ "میں یا میرے گھر والے منتیں تو نہیں کر رہے تھے تمہاری اس شادی کے لیے۔ پھر تم یہ سلوک کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟"

"ایسے تو نہیں چھوڑوں گا میں بھی اسے۔ میری دنیا تباہ و برباد کر کے وہ خود رنگ رلیاں مناتی پھرے۔ ہنہ۔ ابھی اس نے جانا ہی نہیں مجھے۔" وہ تنفر سے بولا تو بے یقینی سے تزئین کی آنکھیں پھیلیں۔

"تم نے مہراہ سے بدلہ لینے کے لیے مجھ سے شادی کی ہے یا مجھ سے بدلہ لینے کے لیے۔" وہ چیخ کر بولی۔

"میں ایک بار... بس ایک بار اس کے منہ سے ساری حقیقت سننا چاہتا ہوں...." طلال کے دل میں تو بھانبھڑ جل رہے تھے۔ جو کسی پل چین نہ آنے دیتے تھے۔ مگر تزئین کو شدید جھٹکا لگا۔ وہ تو سمجھی تھی کہ طلال کی مہراہ کے ساتھ شادی نہیں ہوئی... بات ختم۔ مگر یہاں تو وہ گڑے مردے اکھاڑنے کا پورا انتظام کیے ہوئے تھا۔

"اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے طلال... اور کیا حقیقت جاننا باقی رہ گئی ہے؟" وہ بے بسی سے دبی آواز میں چلا کر بولی۔

"تم اس بحث میں مت پڑو۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنے کا شوق تھا نا... تو کر لی نا... اب جان چھوڑو۔" حد درجہ اکتا کر کیے الفاظ نے تزئین کو ساکت کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"آپی... اللہ کا واسطہ ہے اب بس کر دیں۔ کیوں اپنی برداشت آزما رہی ہیں۔" بخار میں پھنکتی مہراہ کو نڈھال سا اٹھ کر ولیمہ کے فنکشن کے کپڑے اٹھاتے دیکھ کر ملاحہ کو رونا آگیا تھا اور وہ رو بھی پڑی۔ مہراہ نے اسے دیکھ کر حوصلے سے کہا۔

"اگر اب دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کی تو آئندہ بھی نہیں کر پاؤں گی ملاحہ... طلال نے کیا کیا میرے ساتھ؟ اس نے بھی اتنا ہی دکھ دیا جتنا نمیر آفندی نے۔ جلی تو میں نا' راکھ تو میں ہوئی نا۔" وہ آنسو ضبط کر رہی تھی۔ مگر آواز بھرا گئی۔

"میں کہہ دوں گی' آپی کی طبیعت خراب ہے۔" ملاحہ سے بہن کا دکھ برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ مہراہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے شکستہ اعصاب کو سمیٹا اور نرمی سے بولی۔

"مشکل وقت تو... کل گزر گیا ملاحہ... اب مجھے ٹوٹنے' بکھرنے اور خود کو سمیٹنے کی عادت ہونے دو پلیز۔ مجھے حوصلہ دو۔ میری ہمت مت توڑو۔" اس کی آنکھیں شدت ضبط سے گلابی ہو رہی تھیں۔ ملاحہ کا جی چاہا بہن کے

Downloaded From http://paksociety.com

گلے لگ کر دھاڑیں مار کر روئے۔ اپنا دکھ تو انسان برداشت کر لیتا ہے مگر اپنے پیاروں کا دکھ لمحہ بہ لمحہ مارتا ہے۔ وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ تائی جان تو کل سے لوگوں کے سوالات کے جواب دیتی ادھ موئی ہو رہی تھیں۔ سائرہ چچی اندر ہی اندر اس صورت حال پر تلملا رہی تھیں۔ مگر وہی... سب کو فرضی ایکسی ڈنٹ اور دماغی انتشار کا بہانہ...

"بھابی...؟" تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلتی مہو کو دیکھ کر سائرہ چچی صدیقہ بیگم کی طرف لپکیں "حد ہے بھابی! اب یہ مہو ولیمہ میں بھی جائے گی؟"

تائی جان کا سر گھوما۔ ناگواری سے سائرہ چچی کو دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

ان کا انداز دیکھ کر چچی جان فوراً" سنبھلیں۔ "میرا مطلب تھا بھابی... کل سے بے سدھ پڑی بخار میں پھنک رہی تھی بچی۔ اور اب اٹھ کر چل دی۔ اسی کے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ یہاں کون سا کسی نے اعتراض کرنا ہے اس کے نہ جانے پر۔"

انہوں نے لب و لہجے کو شیرے میں ڈبویا۔ مگر تائی جان بے وقوف نہیں تھیں اچھی طرح ان کا مطلب سمجھیں۔ اور انہوں نے بہتر سمجھا کہ آج ہی سائرہ چچی کے کان کھول دیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے تو ہی جا رہی ہے نا۔ اور ایک بات یاد رکھ لو سائرہ! تم لوگوں نے طلال اور تزئین کا رشتہ کر کے مہو کے لیے اس گھر میں مستقل آزمائش کھڑی کر دی ہے۔ اب مہو جس طرح اپنی زندگی کو لے کر چلنا چاہتی ہے اسے چلنے دو۔ تم سب اپنے حالات پر دھیان دو۔ اگر اس نے دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت کر ہی لی ہے تو اسے کوئی ٹوکے۔ طلال سے رشتہ مہو نے اپنی مرضی سے ختم کیا تھا' یہ بات سب یاد رکھیں۔"

اس قدر صاف جواب پر چچی جان اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ مگر یہ ضرور ہوا کہ اس گھر میں اب مہو کے لیے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا ایک اصول وضع ہو گیا تھا۔ اس پر اعتراض کا حق کسی کو نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"مہو نہ آئے ہمارے ولیمہ میں امی۔ کل بھی بے شرموں کی طرح بارات اٹینڈ کرنے چلی آئی تھی۔" سائرہ چچی نے تو ناشتا بھیجتے وقت یونہی تزئین کا حال پوچھ لیا تھا فون پر۔ مگر ادھر سے تو بہت کڑے انداز میں فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ تزئین کو امید تھی کہ آج مہاہ کی شکل نظر نہیں آئے گی۔ اپنی بے قدری کا دکھ اپنی جگہ مگر طلال کو مہاہ دکھائی نہ دے۔ کہیں وہ طلال کو اپنی مظلومیت کی کہانی سنانی نہ بیٹھ جائے۔ اسی لیے اس نے مہو کو ساتھ لانے سے منع کر دیا تھا۔

گلابی رنگ کی بھاری نفیس کامدانی پشواز اور میچنگ سونے کے زیورات میں آج بھی تزئین کا روپ کمال کا تھا۔ مگر دیکھنے والی آنکھ طلال کی ہوتی تو بات تھی... تزئین کا دل طلال کی ایک بے اختیار نظر کے لیے ہمکتا رہا۔ مگر شادی ہال تک گاڑی ڈرائیو کرتا وہ سپاٹ تاثرات لیے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا رہا۔ حالانکہ گاڑی میں صرف وہی دونوں تھے۔ مگر طلال کے دل پر تو مہو نامی چڑیل کا سایہ پڑ چکا تھا۔ تزئین کی زبان تک کئی الفاظ کئی شکوے آئے مگر عزت نفس نے زبان پر تالا لگا دیا۔ شادی ہال کے قریب پہنچتے ہی طلال کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے پارکنگ میں گاڑی روک کر فون سنا۔ دوسری طرف اس کی مامالڑکی والوں کے پہنچ جانے کی اطلاع دے رہی تھیں۔

"پہنچ گئے ہیں ماما۔ پارکنگ میں ہیں۔ آ کر لے جائیں اسے۔" وہ بڑے اکتائے ہوئے انداز میں بولا تو تزئین اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی۔ صاف ظاہر ہے کہ اسی کی بات ہو رہی تھی۔ پھر شاید اس کی ماما نے سمجھایا بجھایا تب وہ موبائل بند کر کے جیب میں ڈالتا ہم چشمی نگاہ تزئین پر ڈال کر بولا۔

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

"اترو نیچے۔۔۔ فون تو نہیں آئے گی اب تمہیں لینے۔"

"میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گے تو اکیلے ہی ولیمہ کا فنکشن اٹینڈ کرو گے طلال۔۔۔ برے رویّے محبت میں برداشت ہوتے ہیں، نفرت میں نہیں۔" تزئین کی برداشت جواب دے گئی تو وہ غصے سے بولی۔

طلال منٹوں میں ٹھنڈا پڑا۔ اندر اس کی بھی فیملی کی عزت کا سوال بنا ہوا تھا، وہ کیسے بھول گیا۔ وہ اس کے ساتھ خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تو سامنے سے اس کی کزنز اور ماما آ گئیں۔ لڑکیاں شوق سے تزئین کی تعریفیں کرتی اسے لے کر اندر کی طرف بڑھیں اور پیچھے طلال کو سرزنش کرتی ماما۔

"ایک تو تزئین کو اتنی لیٹ پارلر چھوڑا۔ سارے مہمان آ چکے اور دولہا دلہن اب پہنچ رہے ہیں۔ اوپر سے تم نے منہ بھی بنایا ہوا ہے۔ بس کرو اب یہ جذباتیت۔ تزئین بے قصور ہے طلال۔ جس کا قصور ہے وہ تو مزے سے پورا فنکشن اٹینڈ کر رہی ہے۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ ہمیں تو یہی کہا کہ لڑکی مینٹلی ڈسٹرب (ذہنی طور پر پریشان) ہے۔"

انہوں نے تو اپنی طرف سے اس کا دل تزئین کے لیے صاف کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا ذہن ایک ہی نقطے پر اٹک گیا۔ (مہو بھی آئی ہے) ایک پل میں وہ ساری باتیں بھولا تھا۔ چند قدم آگے بڑھ کر وہ تزئین کا ہم قدم ہوا۔ دنیا داری بھی کوئی چیز تھی۔ مووی میکرز، روشنیاں اور پُر اشتیاق ہجوم۔۔۔ بارات کے ساتھ کسی کو نہیں لے جایا گیا تھا اسی لیے دلہن دیکھنے کا سب کا شوق اور تجسس فطری تھا۔ طلال نے اچٹتی نگاہ اس ہجوم پر ڈال کر گویا کسی کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔ (مگر مرضی سے بچھڑ جانے۔۔۔ جان بوجھ کر چھپ جانے والے یونہی تھوڑی مل جایا کرتے ہیں۔) اس کی نظر بھی ناکام لوٹی تھی۔

اور وہاں سے بہت دور ایک کونے میں تائی جان اور ملاحہ کے ساتھ جُڑ کر بیٹھی مہماہ نے دلہن آ گئی کا جملہ سنتے ہی دل رکتا محسوس کیا۔ اس نے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ ملاحہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ ان کی فیملی جس دل کے ساتھ اس فنکشن میں شریک تھی، یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ ملاحہ نے نم آنکھوں سے بہن کو دیکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر گویا اسے حوصلہ دیا۔ وہ یونہی چہرہ موڑے بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ نیا شادی شدہ جوڑا جا کر اسٹیج پر بیٹھ گیا۔ فوٹو سیشن شروع ہو گیا تھا۔ تائی جان اور ملاحہ میں سے کوئی بھی اسٹیج پر جانے کے لیے نہیں اٹھا۔ اور نہ ہی کسی نے انہیں بلانے کی زحمت کی۔ ماحول پر ایک عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اور جاننے والے جانتے تھے کہ طلال کی ہال میں پھرتی متلاشی آنکھیں کس کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ طلال کی زرتاشہ بھابی کو بھی ایسے ہی موقع کی تلاش تھی۔ انہوں نے متلاشی نگاہوں سے ایک طرف میز پر بیٹھی مہماہ کو ڈھونڈ ہی لیا۔ اور تیزی سے اس کی طرف آئیں۔

"ارے واہ۔۔۔ واٹ اے سرپرائز۔۔۔ نائس ٹو سی یو مہماہ۔" وہ یوں زبردستی مہماہ سے گلے ملیں جیسے پتا نہیں اس سے کتنے اچھے تعلقات رہے ہوں۔ حالانکہ انہوں نے طلال اور مہماہ کی منگنی کے دوران کبھی اس سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ مہماہ زبردستی مسکرائی۔ تائی جان کا رنگ بھی بدلا۔ یہ ان کا سمدھیانہ تھا جو سائرہ چچی کی قسمت میں چلا گیا تھا۔ زرتاشہ بھی وہیں ایک کرسی پر براجمان ہو گئیں۔

"کیسی ہو اب؟" ان کی پوری توجہ مہماہ کی طرف تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس پوٹلی میں سے کچھ نہ کچھ نکال کر ہی رہیں گی۔ مہماہ نے ہلکا سا کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بہت ہمت سے ان کی طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔

"اب ٹھیک ہوں۔"

"تو پھر اتنا غلط فیصلہ کیوں کیا تھا۔۔۔ طلال کا بھی نہیں سوچا تم نے۔۔۔ ہم تو اس گھر میں تمہارے منتظر تھے۔" وہ یقیناً "بڑی" اداکارہ تھیں۔ مہماہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اور اس سے پہلے کہ اتنی ہمدردی پا کر تائی جان

Downloaded From http://paksociety.com

ان کے سامنے جذباتی ہو کر طلال کے لیے غلط قرار دیتیں مہاہ نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔
"ساری قسمت کی بات ہے بھابی۔ اس گھر میں تزئین کا آنا لکھا تھا۔"
"پھر بھی... چلو تمہاری تو مانا کہ ذہنی کیفیت کچھ ٹھیک نہیں تھی مگر طلال کو کیا ہوا۔ اسی گھر کی لڑکی کو شادی کے لیے چن لیا۔ کچھ تو خیال کرتا۔" وہ بدستور کچھ کھوجنے کی کوشش میں تھیں۔
"اررررے... تم یہاں ہو اور وہاں اسٹیج پر دولہے کی بھابھی کی ڈھنڈیا مچی ہوئی ہے۔" سائرہ چچی نے اپنی دانست میں تو چھاپا ہی مارا اور مصنوعی حیرت سے زرتاشہ کو دیکھا۔ وہ منہ بنا کر وہاں سے اٹھیں۔ سائرہ چچی ان ماں بیٹی پر بڑی جتاتی ہوئی نظر ڈال کر گئیں۔ ان کے جاتے ہی مہاہ کے جیسے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اپنا پرس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"مجھے گھر جانا ہے امی..." اس کا انداز سراسیمہ سا تھا۔ تائی جان نے دکھ سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی حالت سمجھ رہی تھیں۔ ایک تو بدترین ذہنی کیفیت اوپر سے بخار کی حالت۔ وہ محض لوگوں کا سامنا کرنے کی خاطر آ گئی تھی۔ مگر سوال کرنے والے کہاں رکتے ہیں۔
"اپنے ابو سے بات کرو... ابھی تو فنکشن شروع ہوا ہے وہ کہاں مانیں گے۔"
"آپ لوگ فنکشن اٹینڈ کریں امی۔ میں نہیں چاہتی کہ چچی جان کو مزید باتیں بنانے کا موقع ملے۔ میں کبیر کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی گھر نوکروں سے بھرا پڑا ہے۔" وہ مبین صاحب کو کال ملاتے ہوئے تحمل سے بولی۔
"اچھا... میں بھیجتا ہوں کبیر کو..." اس کی طبیعت کی خرابی کا سن کر فوراً انہوں نے کہا تھا۔ مہاہ مطمئن ہو گئی۔
کھانا شروع ہو گیا تب طلال کی نظر سرو قد اپنی نشست پر کھڑی مہاہ پر پڑی تو وہ گویا اڑتا ہوا اسٹیج پر سے اترا اور لوگوں سے ٹکراتا ان کو ہٹاتا اس کی طرف بڑھا۔ تزئین کی بے یقین نگاہ دور تک اس کا پیچھا کیا۔ دولہا دلہن کے سامنے کھانے کی میز سج چکی تھی۔ مگر وہ حواس میں ہی کہاں تھا۔
وہ چند قدموں کے فاصلے پر تھا... تبھی موحد کو اس نے مہاہ کے پاس آ کر رکتے دیکھا تو طلال کے قدم زمین میں ہی گڑ گئے۔ وہ مہاہ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تائی جان اس سے کچھ پوچھ رہی تھیں پھر طلال نے اسے موحد کے ساتھ آگے بڑھتے دیکھا... دور بہت دور... وہ ہال سے باہر نکل گئے تھے۔ طلال ضبط سے لال ہوتی آنکھیں لیے مٹھیاں بھینچے وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس کے نام کی پکار پڑی تو وہ بجھے دل سے اسٹیج کی طرف بڑھا۔ جہاں اس کے لیے قسمت نے نیا کھیل شروع کر رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ سیٹ سے سر ٹکائے نڈھال سی تھی۔ گاڑی سڑک پر ڈالتے ہوئے موحد نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔
"آر یو اوکے...؟"
"ہم م م..." مہاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"کبیر نہیں تھا۔ اس لیے آغا جان نے مجھے بھیجا۔" اس نے خواہ مخواہ وضاحت کی۔
"مجھے تو گھر جانا تھا۔ کوئی بھی لے چلے۔" مہاہ نے بات ختم کی۔ در حقیقت وہ گھر جا کر تنہائی میں خوب رونا چاہتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے دنیا للنا کے کہتے ہیں یہ مہاہ نے صحیح معنوں میں آج محسوس کیا تھا۔
"تمہیں کس نے کہا تھا یہاں آنے کو... طبیعت خراب تھی تو گھر میں ہی رہتیں۔" وہ شادی ہال میں مہاہ سے چند قدم پیچھے کھڑے طلال کو دیکھ چکا تھا۔ تب ہی خفگی سے بولا۔ مہاہ نے تپ کر سر اٹھایا۔

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From http://paksociety.com

"میں کون سا اپنی خوشی سے آئی ہوں یہاں۔۔۔ لیکن چھپ کر بیٹھ جانا بھی تو حل نہیں ہے۔"

"اتنی ہمت کر ہی لی تھی تو پورا فنکشن اٹینڈ کر لیتیں۔" وہ پُرسکون انداز میں بولا۔ اور ایک نظر بخار سے تمتماتے مہراہ کے چہرے کو دیکھا۔ مہراہ نے اسے غصے سے دیکھا۔ مگر غصے سے بولتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی۔

"پکے دشمن ہو تم تو میرے۔۔۔ جب تک ہمت تھی 'سامنا کیا نا حقیقت کا۔۔۔ طبیعت خراب ہو رہی ہے میری۔"

"اچھا۔۔۔" وہ بے یقینی سے بولا۔

"میں بھی کہوں۔۔۔ طلال سے بھاگنے والی تو نہیں لگتیں تم۔" اس کی غیر متوقع بات پر مہراہ ساکت سی ہوئی۔ پھر تیزی سے خود کو سنبھال کر بولی۔

"طلال سے مجھے کیا مطلب۔۔۔ میں اپنے فیصلوں کی خود مالک ہوں۔"

"ہوں۔۔۔ ویسے میں بنا معذرت کے کہوں گا کہ طلال نے تمہارے انکار کے باوجود اسی گھر میں شادی کرنے کا گھٹیا ترین فیصلہ کیا۔ اب اس کے پیچھے کیا پلاننگ کارفرما ہے 'وہ نہیں پتا۔" وہ بڑے آرام سے اپنا خیال اسے بتا رہا تھا۔ مہراہ کا دل کسی نے گویا مٹھی میں کر لیا۔ قسمت کیا ہے 'کیا کھیل کھیل گئی تھی اور وہ اپنی زندگی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔

"چلو یہ بھی بہتر ہی ہوا۔ اکیلی تم تو سزاوار نہیں غلط فیصلہ کرنے کی۔" وہ پھر سے اسی دوستانہ انداز میں بولا۔ تو مہراہ نے بیزاری سے اسے دیکھا۔

"تم خاموشی سے گاڑی نہیں چلا سکتے؟"

"بڑی بدتمیز ہو ویسے۔ میں تو تمہاری ہمدردی میں کہہ رہا تھا۔"

موحد جیسے اس کی خوبی سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ مہراہ نے سر سیٹ سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ یہ اشارہ تھا کہ اسے اس فضول بک بک میں کوئی دلچسپی نہیں۔ موحد نے ایک سرسری نگاہ آنکھیں موندے بیٹھی مہراہ پر ڈالی تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مہراہ گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ موحد کو ابھی واپس جانا تھا۔ کوریڈور کے سرے سے مڑتے ہوئے اس نے آغا جان کے اسٹڈی روم سے کسی چیز کے واضح طور پر گرنے کی آواز سنی تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ آغا جان کی غیر موجودگی میں ان کی اسٹڈی میں کسی نوکر کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا اسٹڈی کے دروازے تک آیا اور ناب پر ہاتھ جما کر گھمایا۔ خفیف سی کلک کی آواز اندر سیاہ ٹراؤزر شرٹ اور نقاب میں چہرہ چھپائے موجود شخص کے کان کھڑے کر گئی۔ ادھر دروازہ کھول کر موحد اسٹڈی میں داخل ہوا۔ نیم تاریک کمرے میں اس نے ٹارچ کی روشنی کو بند ہوتے اور ایک سیاہ پوش کو بہ سرعت بھاگ کر کھڑکی سے لان میں کودتے دیکھا۔ تو بے اختیار اس کے پیچھے بھاگا۔

"کون ہے۔۔۔ کون ہے یہاں؟" وہ اونچی آواز میں پوچھ رہا تھا۔

کھڑکی کے پار لان میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ موحد نے پلٹ کر جلدی سے بتی جلائی۔ اور کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ آغا جان کی الماری چوپٹ کھلی تھی۔ اور اندر موجود لاکر بھی۔۔۔ ایک کھلی فائل کے بے ترتیب صفحات زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ لب بھینچے ہوئے وہ باہر لپکا اور اونچی آواز میں ملازموں کو پکارنے لگا۔ نہ جانے گھر سے کیا کچھ لٹ چکا تھا۔ سب ملازم منٹوں میں جمع ہوئے۔ اور آغا جان کی اسٹڈی میں چور کا سن کر سب کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ ملازمہ سارے دروازے چیک کر آئی ماسوائے اسٹڈی کے سب کے تالے محفوظ تھے۔ تو گویا چور کو شخص آغا جان کے لاکر سے دلچسپی تھی۔۔۔ مگر صرف فائلز سے؟ موحد کا ذہن الجھ گیا۔ وہ ملازمین کو سختی سے

Downloaded From http://paksociety.com

چوکیداری کی تلقین کرنے کے بعد آغا جان کو کال ملانے لگا۔

☼ ☼ ☼

اللہ کا شکر تھا کہ گھر کی کوئی بھی چیز اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ آغا جان نے ملازمین کو خوب جھاڑا۔ مگر چونکہ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا اس لیے بات رفع دفع کردی گئی۔ مگر رات کو آفندی ہاؤس کی سیکیورٹی ضرور سخت کر دی گئی تھی۔

آج تزئین اور طلال مکلاوے کے لیے آرہے تھے۔ تو کچن کھانوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ مہماہ اپنے کمرے میں مقید ہوگئی۔ اب اور کتنی ہمت کا مظاہرہ کرتی۔

"داماد ہوگا تو سائرہ اور سہیل کا... وہی چونچلے اٹھائیں اس کے۔ مجھے کوئی نہ کہے۔" تائی جان نے میاں سے صاف کہہ دیا۔ شادی میں شرکت تو دنیا کا منہ بند کرنے کے لیے کرنا پڑی مگر اب اپنے گھر میں تو وہ طلال پر اس کی حیثیت واضح کرسکتی تھیں۔ تزئین سے رشتہ جوڑ کر اس نے صحیح معنوں میں کمینگی کا مظاہرہ کیا تھا اور ابھی وہ ٹھیک سے کمر ٹکا کر بیٹھی بھی نہیں تھیں کہ ملاحہ چلی آئی۔

"امی فون ہے آپ کا..." اس نے موبائل ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے اشارے سے پوچھا۔

"کوئی آدمی ہے۔ اپنا نام نہیں بتایا اس نے۔ آپ سے بات کرانے کا کہا ہے۔" وہ دبی آواز میں بولی تو انہوں نے موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہیلو...؟" ان کی تیوری چڑھی ہوئی اور انداز میں ناگواری تھی۔ مگر ان کے برعکس دوسری طرف سے بہت شگفتہ لہجہ ابھرا۔

"السلام علیکم ساس صاحبہ... کیسی ہیں آپ؟ آپ کا داماد عرض کررہا ہوں۔ نمیر وقار آفندی۔"

تائی جان کے اوپر گویا کسی نے سرد برفیلا پانی انڈیل دیا ہو۔ ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ ملاحہ ان کی حالت دیکھ گھبرا کر ان کی طرف بڑھی۔ ان کے ہاتھ سے موبائل پھسل کر بستر پر گر گیا تھا۔

ملاحہ نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھایا۔ ماں کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں کسی خطرناک بات کی طرف اشارہ تھیں۔ انہوں نے معاً حواس میں آتے ہوئے ملاحہ کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔

"ہ... ہیلو... ہیلو... کون ہو تم... کہاں سے بات کر رہے ہو؟" وہ متوحش سی اس کے اس قدر جتانے والے انداز میں کرائے گئے تعارف کے بعد بھی پوچھ رہی تھیں۔ دوسری طرف وہ مدھم سا بے ساختہ ہنسا۔

"ارے واہ... مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ کو اتنا اشتیاق ہے مجھ سے ملنے کا۔ ورنہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ہی حاضر ہوجاتا۔" وہ محظوظ ہونے والے انداز میں بولا۔ موبائل پر ان کی گرفت سخت ہوئی اور چہرے کے تاثرات ناقابل فہم۔ وہ پھٹ پڑیں۔

"خبیث... کمینے... ظالم ہو تم۔ کیوں میری بیٹی کی زندگی برباد کی تم نے؟" ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ فون سے نکال کر نمیر کی گردن مروڑ دیں۔

"برباآ... د؟" اس نے لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔ پھر مسکراتے لہجے میں انہیں یاد دلایا۔ "یہ تو آفندیز کی روایت ہے نا... لوگوں کی زندگیاں برباد کرنا۔ اب اگر میں یہ سب نہ کروں تو آفندی کیسے کہلاؤں؟" اس کا ایک ایک لفظ سلگا دینے والا تھا۔ ملاحہ بھاگ کر مہماہ کو بلانے گئی۔

"نمیر آفندی کی کال ہے۔ امی سے بات کر رہا ہے۔" وہ جوتا پہنے بنا بھاگی آئی۔ دوپٹا شانے پر دھرا تھا جو اب پیروں کے ساتھ گھسٹتا تھا۔ ثمرہ کے کانوں میں بھی ملاحہ کی آواز پڑی تھی۔ وہ بے اختیار ان کے پیچھے کمرے تک

Downloaded From http://paksociety.com

آئیں۔

"چلو ہم تو ظالم ہیں' مان لیا..... تم ہی ثابت کر دیتے کہ تمہاری رگوں میں وقار کا خون ہے۔ کوئی ایک ہی ثبوت مل جاتا۔ تمہارے حلال ہونے کا۔" تائی جان بہت نفرت سے اسے گندے خون کی گالی دے رہی تھیں۔ ثمو سُن رہ گئیں۔ مہماہ نے آگے بڑھ کر ماں کے ہاتھ سے موبائل چھینا اور کان سے لگا لیا۔

"اسی لیے آپ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے۔ کچھ تو حلال کا اثر پیدا ہو۔" دوسری طرف وہ بہت پُرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مہماہ کے دل میں نفرت کی لہر اٹھی۔ یہ شخص اس کے ارمانوں کو ناگ بن کر ڈس گیا تھا۔

"نمیر... میری بات سنو..." وہ بہ عجلت بولی تو لہجہ جذباتی تھا۔ "تم یہاں آؤ۔ آغا جان تم سے ملنا اور بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"مہماہ..." اس نے خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا تو وہ ٹھٹک گئی۔

"کیا بات کرنا چاہتے ہیں وہ مجھ سے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"وہ... وہ تم سے تمہارے پراپرٹی کے حصے کی بات کرنا چاہتے ہیں۔ جو تم چاہتے ہو وہ ملے گا تمہیں... بولو... کیا چاہتے ہو؟" مہماہ کو لگا وہ اس کے بچھائے جال میں پھنس جانے والا ہے۔ تیزی سے بولی۔

"مہماہ آفندی۔" ادھر سے ایک لفظی جواب آیا تھا۔ مہماہ کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ دل تو چاہا جتنی گالیاں یاد تھیں وہ آج ساری نمیر کو دے ڈالے مگر رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

"کمینہ... الو کا پٹھا..." مہماہ موبائل بستر پر اچھالتے ہوئے بولی۔ غصے سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ کس قدر مطمئن تھا وہ۔ جیسے کسی لڑکی کی زندگی برباد کی ہی نہ ہو۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ بے غیرت شخص؟" تائی جان نے مہماہ سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ثمو آگے آئیں۔ ان کے چہرے پر ناگواری تھی۔

"یہی رویہ ہے آپ لوگوں کا جس نے آج نمیر کو اس اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ وہ وقار کا بیٹا نہیں؟ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کسی انسان کے قدموں تلے سے زمین کھینچنے کا۔"

"وقار کا خون اس کی رگوں میں ہوتا تو وہ اتنا گھٹیا کام نہ کرتا۔" تائی جان ان کی نمیر کی طرف داری کرنے پر تپیں۔

"آپ نے کبھی یہ سوچا ہے بھابی... کہ وقار کی رگوں میں تو آغا جان کا خون تھا۔ پھر وہ کیوں ایک بازار والی پر مر مٹا؟" وہ تلخی سے پوچھنے لگیں۔ "کیونکہ فیصلوں کا تعین خون سے نہیں بلکہ ارادوں سے ہوتا ہے۔ دل سے اٹھنے والی چاہت سے ہوتا ہے۔"

"میری زندگی تو برباد کر دی نا اس نے... اپنی جنگ کے بیچ۔" مہماہ کی آواز بھرا گئی۔

"گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے مہو... نمیر بھی گھن کی طرح پسا ہو گا حالات کی چکی میں۔ اللہ معاف کرے' کیسے اس رات اس چھوٹے سے بچے کے سامنے اس کی ماں کو بار بار طوائف کہا گیا۔ کیا وہ لفظ اس کے ذہن پر تمام عمر کے لیے نقش نہیں ہو گیا ہو گا؟ ایک بیوہ اور اس کے یتیم بچے کو طوفانی رات میں گھر سے باہر نکال دینا... یہی بنیاد بنا ہو گا اس کے انتقام کی۔" وہ غیر جانبدارانہ مگر دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"مگر میں نے تو اسے کچھ نہیں کہا تھا۔" مہماہ رو دی۔

"اس نے بھی کسی کو کچھ نہیں کہا تھا۔" ثمو کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔

"یہ دیکھو... مار آستین۔ اس حرامخور کی ہمدردی آ رہی اسے۔" تائی جان نے نفرت سے ثمو کا ذکر کیا۔

Downloaded From http://paksociety.com

"اور ایک وہ ہے..... سہیل کی گھر والی۔ بے شرم عورت..... میری بچی کے دل پر ہاتھ ڈالتے دل نہ کانپا اس کا۔" وہ ہاتھ ملتے گویا بین ڈال رہی تھیں۔ مہرماہ کا دل بوجھل ہونے لگا۔ وہ تیزی سے ان کے کمرے سے نکل آئی۔ حلق خشک تھا۔ پانی پینے کے لیے کچن کا رخ کیا تو لاؤنج میں داخل ہوتے ہی قدم جم سے گئے۔ بالکل سامنے صوفے پر بڑے طمطراق سے طلال بیٹھا تھا۔ اور چچا جان کی فیملی کے علاوہ موحد اور آغا جان بھی..... اس سے پہلے کہ کسی کی نظر اس پر پڑتی' وہ تیزی سے کچن میں گھس گئی۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

"یا اللہ..... یہ کیسا امتحان ہے....." اس نے لرزتے ہاتھوں سے کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل اٹھائی اور اسٹول پر آبیٹھی۔ گلاس میں پانی انڈیلنے کی بجائے یوں ہی بوتل منہ لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگی۔

☆ ☆ ☆

اب سمجھ میں آتا ہے
پیار کی کہانی میں
کس جگہ ٹھہرنا تھا
کس سے بات کرنا تھی
کس کے ساتھ چلنا تھا
کون سے وہ وعدے تھے
جن پر جان دینا تھی
کس جگہ بکھرنا تھا
کس جگہ مکرنا تھا
کس نے اس کہانی میں
کتنی دور چلنا تھا
کس نے چڑھتے سورج کے
ساتھ ساتھ ڈھلنا تھا
اب سمجھ میں آتا ہے
اس نے جو کہا تھا سب
ہم نے جو سنا تھا تب
کس طرح ہلے تھے لب
کس طرح کٹی تھی شب
ہم نے ان سنی کردی
بات جو ضروری تھی
کس قدر مکمل اور
کس قدر ادھوری تھی
وہ جو اک اشارہ تھا
ذکر جو ہمارا تھا
وہ جو اک کنایہ تھا

Downloaded From http://paksociety.com

جو سمجھ نہ آیا تھا
اب سمجھ میں آتا ہے
جان ہی کے دشمن تھے
جان سے جو پیارے تھے
ہم جہاں پہ جیتے تھے
اصل میں تو ہارے تھے
راہ جس کو سمجھے ہم
راستہ نہیں تھا وہ
واسطہ دیا جس کو
واسطہ نہیں تھا وہ
کس نے رد کیا ہم کو؟
کس نے کیوں بلایا تھا؟
جس کو اتنا سمجھے ہم
کیوں سمجھ نہ آیا تھا؟
اب سمجھ میں آتا ہے
اب سمجھ میں آیا جب
زندگی اکارت ہے
ایسی اک بجھارت ہے
جو دیر سے سمجھ آئی
زندگی کے بھیدوں کو
ہم نے اب سمجھنا تھا

تب سمجھ بھی آتی تو
ہم نے کب سمجھنا تھا
آنکھ جب پگھل جائے
اور.... شام ڈھل جائے
زندگی کی مٹھی سے
ریت جب نکل جائے
بھید اپنے جیون کا
تب سمجھ میں آتا ہے
سب سمجھ میں آتا ہے

وہ جب برداشت کھو بیٹھی تو میز پر سر ٹکا کر بے آواز رو دی۔

تب ایک ہاتھ بہت نرمی سے اس کے سر پر آن ٹھہرا تو وہ ساکت رہ گئی۔ شکست و ریخت کی اس حالت میں کسی کا سامنا کرنا.... اففف۔ مہر ماہ نے آہستہ سے سر اٹھا کر مقابل کو دیکھا تو لحظہ بھر کو بے یقین رہ گئی۔ وہ ثمرہ تھیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

مہرماہ نے جلدی سے ہاتھ پھیر کر چہرہ صاف کیا اور خجل سی کھنکھاری۔
"وہ... میں... چائے بنانے آئی تھی۔" اسے بہانہ سوجھ ہی گیا۔
وہ اس کے ساتھ رکھے اسٹول پر ٹک گئیں۔ مہرماہ نے بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ان کو دیکھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی ان سے مہرماہ کا دل اور طبیعت مل نہیں پائی تھی۔ اور نہ ہی ثمرہ اسے صدیقہ بھابی کی بیٹی کے علاوہ کچھ سمجھنے کو تیار تھیں۔ مگر اب شاید دیکھنے کا انداز بدلا تھا... ثمرہ کا اور مہرماہ کا بھی۔
"میں جانتی ہوں۔" انہوں نے میز پر رکھے مہرماہ کے ہاتھ کو نرمی سے دبایا۔ تو اس نے سر جھکا لیا۔
"بہت غلط ہوا تمہارے ساتھ مہر... مگر کیا کیا جائے۔ بڑوں کا بھگتان عموماً بچوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔" مہرماہ نے انہیں آج پہلی بار نرم لہجے میں بولتے سنا تھا۔
"مجھے کوئی خوشی نہیں تمہارے اس حال سے بیٹا... مگر اب وقت اور حالات کے ساتھ انداز بھی بدلنے چاہئیں۔" مہرماہ نے ان کی طرف دیکھا۔ تو وہ اسی کی طرف متوجہ تھیں۔ "میں یہ نہیں کہتی کہ نمیر نے جو تمہارے ساتھ کیا وہ صحیح ہے بیٹا۔ مگر اب جبکہ یہ سب کچھ ہو چکا تو کیا اسے حوصلے اور عقل سے حل نہیں کرنا چاہیے؟"
"اور حوصلہ کیا ہوتا ہے پھپھی جان... اپنی زندگی اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھی ہے میں نے۔" وہ شکوہ کناں ہوئی۔ ثمرہ نے چند لمحے کچھ سوچا اور بولیں۔
"وہ سب تو ہو گیا مہر... اب واپس نہیں ہو سکتا۔ مگر بہتر ضرور ہو سکتا ہے۔"
"اب کیا بہتر ہو گا... سب کچھ تو برباد ہو گیا۔" مہرماہ ابھی سے ہار گئی تھی۔
"اگر نمیر نے غلط کیا ہے تو صدیقہ بھابی کا انداز بھی غلط تھا اس سے بات کرنے کا... موقع تھا ان کے پاس اس کی غلط فہمیاں دور کرنے کا۔ مگر وہ اپنی روش چھوڑنے کو تیار ہی نہیں۔ سختی ہمیشہ بغاوت کو جنم دیتی ہے۔ جو پہلے ہی غلط کر رہا ہو اس کو مزید غلط کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔" وہ ناصحانہ انداز میں نرمی سے کہتی مہرماہ کو بہت اچھی لگیں۔ "تم چاہو تو بدلے کے اس کھیل کو ختم کر سکتی ہو مہر!" انہوں نے مہرماہ کے رویے سے حوصلہ پا کر مزید کہا۔
"میں؟" تحیر سے اس کی آنکھیں پھیلیں۔
ثمرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب بات تم پر آ ٹھہری ہے مہر... اس نے آغا جان کو شکست دینے کے لیے تمہیں چنا ہے۔ تو اس کھیل کو ختم بھی تم ہی کر سکتی ہو۔"
"میں کیسے بھلا...؟ مجھے تو اس کے نام اور شکل کے علاوہ کسی بات کا علم نہیں۔" وہ الجھی۔
"کھیل کو کھیل کر ہی مقابل کو شکست دی جاتی ہے مہر! وہ تمہاری زندگی سے کھیل چکا۔ اب تم اسے مات دو۔ کچھ بھی کر کے۔" ثمرہ نے تولتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ بدکی۔
"میں...؟"
"ہاں تم مہر! حالات جتنے خراب ہونے تھے ہو چکے۔ اگر صدیقہ بھابی، نمیر اور اس صورت حال کو اپنے انداز و الفاظ سے ہینڈل کریں گی تو نتیجہ برا ہی ہو گا۔ اس لیے تم خود رابطہ کرو نمیر سے۔ اس سے بات کرو اس سے پوچھو بیٹا! وہ کیا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے سمجھانے سے اس کا دل پلٹ جائے۔" وہ نرمی سے کہہ رہی تھیں۔
مہرماہ کی پیشانی تنی۔ اسے یاد آیا نمیر نے اس سوال کے جواب میں کیا کہا تھا۔ وہ خاموشی سے ان کی بات پر غور کرتی رہی۔ ثمرہ اس کا ہاتھ تھپتھپاتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"اب کی بار وہ رابطہ کرے تو اعتماد سے بات کرنا۔ تم آندی ہاؤس میں بیٹھی ہو سڑک پر نہیں۔" انہوں نے رک کر قدرے توقف سے کہا۔ "اور یہ جو شخص ترئین کا نصیب بنا ہے... یہ اسی کو ڈیزرو کرتا تھا مہر۔ اس کو

Downloaded From http://paksociety.com

کھونے پر مت پچھتانا۔اصیل مرد ہوتا تو آخر وقت تک تمہارا انتظار کرتا۔" وہ ذومعنی انداز میں کہہ کر چلی گئیں۔
مہماہ سُن رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

مہماہ کھانے کی میز پر نہیں تھی۔ طلال ترستا ہی رہ گیا۔ اس کا دکھاوے کا اچھا مزاج' خراب ہونے لگا۔ تزئین کے دل میں سکون اترا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مہماہ طلال کے سامنے آئے۔ سب نے کھانا شروع کیا۔ تب بھی وہ اینٹھا ہی رہا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ مہماہ کے سامنے خوب ہنس ہنس کر تزئین سے باتیں کرے گا۔ اس کا ویسے ہی دل جلائے گا جیسے اس نے موحد کے ساتھ طلال کے سامنے آکر جلایا اور ویسے بھی وہ ایک بار تو مہماہ سے اس کی بیوفائی کا سبب ضرور پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے تو طلال کو اپنی ایک جھلک دکھانے کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ جھنجلا سا گیا۔ ذرا سا کھانا چکھ کر ہاتھ روک دیا۔
تزئین کا جی تو چاہ رہا تھا کہ سب پر طلال کی حقیقت کھول دے مگر اس سے کی جانے والی محبت تزئین کو یہ سب کرنے سے روکتی تھی۔ اس نے خود طلال کے رشتے کے لیے امی بھرنے کا کہا تھا۔ اور ویسے بھی اسے پورا یقین تھا کہ جلد ہی طلال مہماہ سے متنفر ہو کر اس کی طرف لوٹ آئے گا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا' اس کے فوراً" بعد ہی وہ معذرت کرتا اٹھ گیا۔ بلکہ تزئین کو بھی اشارہ کیا۔
"کہاں چل دیے بیٹا۔ آج رات رکنا ہے تم دونوں کو یہاں۔" سائرہ چچی کو داماد کے تیور کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔
"سوری..... مجھے اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند نہیں آتی۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "اور ویسے بھی ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے سسرال میں آکر رات گزارنا مجھے پسند نہیں۔ ہاں اگر تزئین رکنا چاہتی ہے تو موسٹ ویلکم۔" وہ قصداً" مسکرایا۔ باقی سب خاموشی سے تماشائی بنے ہوئے تھے۔
"طلال صحیح کہہ رہے ہیں امی..... میں بھی چلوں گی۔ اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔" تزئین نے سب کے سامنے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنی عزت کو سنبھالا دیا۔ ذرا دیر میں وہ طلال کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ چچی جان کا دل مٹھی میں آگیا۔ انہیں تزئین کی مصنوعی مسکراہٹ کا ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ جیسے ڈرائیور پر سفر کے لمحات گراں گزر رہے ہوں اور وہ پل بھر میں یہ فاصلہ ختم کر دینا چاہتا ہو۔ تزئین نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔
تم ایسے تو کبھی بھی نہیں تھے طلال..... میرے اچھے دوست تھے تم۔" تاسف سے اسے یاد دلایا۔
"اب وہ حالات نہیں رہے..... نہ وہ میں رہا نہ تم۔ سب کی جگہیں بدل گئیں اس کھیل میں۔" وہ سرد لہجے میں بولا تھا۔
"مگر ہم چاہیں تو ہم اپنی زندگی' اپنے حالات کو بہتر بنا سکتے ہیں طلال۔" تزئین نے بمشکل غصے پر قابو پا کر مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔
"میری زندگی تب ہی بہتر ہو گی جب اس میں مہماہ آئے گی۔ تم سوچ لو' تب تم کیا کرو گی۔" وہ اس قدر سفاکی سے بولا کہ تزئین سناٹے میں رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

Downloaded From http://paksociety.com

مبین آفندی نے اس نمبر کا پتا لگوایا جس سے نمیر آفندی کی کال آئی تھی۔ توقع کے عین مطابق وہ ایک پبلک فون بوتھ کا نمبر تھا۔

دن بہت بوجھل تھے۔ موسم بدل رہا تھا۔ بہار آنے کو تھی مگر مہاہ کے دل میں تو سردی کے بعد خزاں کا موسم جم گیا تھا۔ کبھی نہ بدلنے کے لیے۔ بہت عرصے کے بعد ملاحہ کالج گئی تھی۔ تائی جان کے ساتھ کچن میں تھوڑا ہاتھ بٹا کر وہ کمرے میں آگئی۔ اس کا موبائل بج رہا تھا۔ اس نے دیکھا' اجنبی نمبر تھا۔

"ہیلو۔۔۔" اس نے کال اٹینڈ کی۔

"جیتی رہیے۔ کیسی ہیں مسز نمیر آفندی؟" دوسری طرف سے ابھرتی آواز سن کر مہر کا دل بند ہونے لگا۔

"تم تو یقیناً" یاد کرتی ہی ہوں گی مجھے۔۔۔ سوچا آج میں بھی یاد کرلوں تمہیں۔" پُر تیقن انداز میں کہا گیا۔ مہاہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم کیا چاہتے ہو نمیر؟ صاف اور سیدھی بات کرو۔ دولت' پیسہ' جائیداد؟" اس نے ہارے ہوئے لہجے میں پوچھا تو لمحہ بھر رک کر اس کے لہجے کے بھیگے پن کو محسوس کرنے کے بعد وہ نرمی سے بولا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

مہاہ کو کرنٹ سا لگا۔ مگر ذہن میں بہت کچھ چلا تو وہ بے اختیار بولی۔ "کہاں۔۔۔ مجھے بھی بات کرنی ہے تم سے۔"

"آہاں۔۔۔ گڈ گرل۔۔۔" مسکراتے لہجے میں کہہ کر وہ اسے ہوٹل کا نام بتانے لگا۔

"میں تم پر چیک رکھوں گا مہاہ۔ مجھے دھوکا مت دینا۔" وہ ذرا سا رکا پھر سرد مہری سے بولا۔ "مرد کو دھوکا دینے والی عورت اچھی نہیں لگتی۔"

مہاہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑ اٹھی۔ فون بند ہو گیا تھا۔ مہاہ کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر نمیر آفندی اس کی باتوں میں آجاتا تو وہ اسے اچھا خاصا پھنسا سکتی تھی۔ اس کا گھر میں کسی کو نمیر کی کال کے بارے میں بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے وقت دیکھا۔۔۔ نمیر کے دیے وقت میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ گھر سے اکیلے باہر جانے کا بہانہ سوچنے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ آدھے گھنٹے سے نمیر کے بتائے ہوٹل میں بیٹھی آتے جاتے ہر شخص کو شکی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس کا دل پریشان ہونے لگا۔ کبیر اسے لائبریری چھوڑ کر کے گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی رکشہ لے کر وہ ہوٹل چلی آئی۔ اب اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے اغوا کرنے سے تو رہا۔ مہاہ کو اس بات کی تسلی تھی۔ ایک گھنٹے بعد کبیر اسے لینے آجاتا۔۔۔ جس میں سے آدھا گھنٹہ تو اس ذلیل شخص کے انتظار میں گزر گیا تھا۔ وہ نمیر کا نمبر ملا ملا کر تھک گئی مگر وہ نمبر اب کسی کے استعمال میں نہیں تھا شاید۔ وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ کوئی اس کے پیچھے سے جیسے گنگنایا۔

"مہاہ۔۔۔!"

مہاہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔ اور مقابل کو دیکھ کر حق دق رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

Downloaded From http://paksociety.com

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔

ولید 'نادرا کے سامنے والے صوفے پہ گم صنم اور ساکت سا بیٹھا مادرا سے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔

کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی' وہ قابلِ فراموش تو نہیں تھا۔

رضا حیدر... علی مرتضیٰ کے قاتل تھے... عافیہ بیگم اور نادرا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔

معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا' سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔

ولید کی پرسوچ آنکھیں پنپ رہی تھیں۔

بتاؤ ولید میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے۔ بہرحال میں...." مادرا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد' ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

سینتیسویں قسط

"رابعہ! رابعہ!" رضا حیدر زور زور سے دھاڑنے لگے۔

"اللہ خیر کرے' کیا ہو گیا ہے؟" رابعہ تیزی سے اندر آئی تھیں۔

"فون ملاؤ ابھی' مادرا مرتضیٰ کے نمبر پہ..." وہ ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔

"خیریت سب ٹھیک ہے نا؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولیں۔

Downloaded From http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

"پوچھو اس سے کہ وہ کس کا پاپ ہمارے بیٹے کے سر ڈال رہی ہے۔ کس کے بچے کو ہماری نسل کا نام دے رہی ہے؟" رضا حیدر زہر اگل رہے تھے اور رابعہ بیگم ششدر سی کھڑی تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ....؟ ماورا کا بچہ صرف ماورا کا نہیں ہے.... ہمارے بیٹے کا' ہمارے تیمور کا بھی ہے.... ہماری نسل ہمارا خون ہے.... آپ کیوں....؟"

"بکواس بند کرو اپنی...." انہوں نے یک دم انہیں تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا تھا مگر رابعہ بیگم کے چہرے پر پڑنے کے بجائے ان کا ہاتھ کسی کے ہاتھ کی گرفت میں آگیا تھا۔

"کہتے ہیں کہ ظلم' جبر اور سفاکی کی بھی ایک حد ہوتی ہے' لیکن آپ تو ہر حد پار کر چکے ہیں.... بے حسی نے اندھا کر دیا ہے آپ کو.... لیکن باقی دنیا تو بے حس نہیں ہے ناں....؟ سب کے سینے میں اللہ کا خوف رکھنے والا دل ہے.... جو آپ کے اندر بد قسمتی سے نہیں ہے.... آپ اس دولت کی ہوس میں اپنے خون اور اپنی ہی نسل کے دشمن ہو رہے ہیں....؟ جس خوش خبری کو سن کر آپ کو مٹھائیاں بانٹنا چاہیے تھیں اس خوش خبری پہ آپ لوگوں کی زبانیں کھینچ رہے ہیں اور ہاتھ اٹھا رہے ہیں.... ہونہہ.... صد افسوس بابا جان' صد افسوس۔"

عزت انتہائی مضبوطی سے ان کا ہاتھ دبوچے' اپنے اندر کا سارا غبار باہر نکال رہی تھی۔ اس کے لہجے سے شعلے لپک رہے تھے' دل چاہ رہا تھا کہ رضا حیدر جیسے باپ کو مار ڈالے یا خود مر جائے.... رضا حیدر نے زندگی کے اس موڑ پہ آکر انہیں دکھ' اذیت' شرمندگی اور اب پشیمانی سے دوچار کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور ان کی اولاد ہونے کے ناطے وہ دونوں بہن بھائی خود کو کسی کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھ رہے تھے۔

"مجھے صرف اتنا بتا دیں' آپ یہ دولت کس کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ اپنے لیے یا اپنے بیٹے کے لیے؟" اس نے خون رنگ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو مجھے بتائیں کہ اس عمر میں اتنی دولت کا کیا کریں گے۔" وہ ان ہی کے لہجے و انداز میں زہر اگل رہی تھی۔ "اور اگر بیٹے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پھر بیٹے کے دشمن کیوں ہو رہے ہیں اگر اس نے اپنی مرضی سے اپنی اپنی پراپرٹی اپنی بیوی کے نام کر دی۔ کیوں زندگی عذاب بنا رہے ہیں اپنی بھی اور ہماری بھی؟ پلیز کچھ تو خیال کریں.... اب اپنی آنے والی نسل کو تو انوالو مت کریں' اسے تو بخش دیں۔" عزت بولتے بولتے جیسے تھک گئی تھی....

سن رضا حیدر پھر سے بھڑک اٹھے تھے....

"کیوں نہ بخش دوں؟ کیوں نہ زندگی عذاب بناؤں.... کیوں....؟ آخر یہ دولت میری ہے۔ میں نے بڑی محنت اور بڑی کوششوں سے بنائی ہے۔" انہوں نے غضب ناک ہوتے ہوئے — جواب دیا تھا۔ اور ان کے ایسے جواب پہ عزت کے چہرے پہ طنز اور تمسخر کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"محنت اور بڑی کوششوں سے بنائی ہے یا پھر بڑے دھوکے اور بڑے فراڈ سے ہتھیائی ہے۔" عزت نے مزید زہر اگلا تھا۔

"زبان بند رکھو اپنی...." انہوں نے غضب ناک ہوتے ہوئے ایک ایک دم ہاتھ بلند کیا تھا' چٹاخ! زوردار تھپڑ عزت کا گال لال کر گیا تھا۔ مگر وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ یہ ایک تھپڑ اسے چپ نہیں کروا سکتا تھا بلکہ اس کا دماغ اور الٹ گیا تھا۔

"زبان بند رکھنے سے آپ کی اصلیت چھپ نہیں جائے گی۔ اور ویسے بھی کتنی زبانیں بند کریں گے؟ کتنے لوگوں پہ ہاتھ اٹھا کر انہیں چپ کروائیں گے....؟ آپ اپنے دوست علی مرتضیٰ کے قاتل ہیں.... آج میں کہہ رہی

Downloaded From http://paksociety.com

Italiano®

Permanent Hair Colour Cream

Colour Your Life

Esha Gupta

- ✓ Gives strength to hair
- ✓ Soft and glossy hair
- ✓ Even coverage
- ✓ No greys

Nourishment for Hair With Silk Protein, Vitamin E & Hair Conditioner

Available in 10 Different Shades

Downloaded From http://paksociety.com

دن کل پوری دنیا کہے گی کس کس کو چپ کروائیں گے کس کس کی زبان روکیں گے۔ بتا میں مجھے۔ عزت ان کے ہاتھ اٹھانے پر پاگل ہو رہی تھی۔ اور اتفاق سے واپس پلٹ آنے پر تیمور کے قدم ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے پہ ہی رک گئے تھے اور اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"بتائیں مجھے.....؟" وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔

"عزت.....!" تیمور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس تک آیا تھا۔ "پاگل ہو گئی ہو.....؟" اس نے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"بھائی چھوڑیں مجھے..... مجھے پوچھنے دیں..... یہ دولت آپ نے کمائی ہے یا ہتھیائی ہے.....؟ آپ نے یہ سکھ' آرام' عیش و عشرت سب کچھ دیا ہمیں..... مگر حلال نہیں..... حرام کھلایا ہے..... حرام کی کمائی بہہ رہی ہے ہماری رگوں میں..... چوری کی ہے..... ڈاکا ڈالا ہے..... قتل کیا ہے آپ نے..... ہماری رگوں میں ایک قاتل' ایک گناہ گار ایک مجرم کا خون دوڑ رہا ہے..... آخر ہماری اوقات ہی کیا ہے.....؟ انہوں نے ہمیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا..... ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں ہیں..... ہم گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہ گار اور مجرم سمجھتے ہیں..... اور آپ کو گناہ گار ہوتے ہوئے بھی احساس نہیں ہوتا۔؟ کیا آپ کے دل میں ذرا سی بھی پشیمانی نہیں ہے.....؟" عزت ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی' رضا حیدر شاکڈ سے کھڑے دیکھ رہے تھے اور رابعہ بیگم بھی دم بخود ہو چکی تھیں جبکہ تیمور عزت کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے قابو سے باہر ہو رہی تھی۔

"عزت..... ہوش میں آؤ۔" تیمور نے اسے جھنجھوڑا۔

"مجھے پوچھنے دیں آج..... کیا آپ کو اللہ سے خوف نہیں آتا.....؟" پہلے اپنے بھائیوں جیسے دوست کو نگل گئے..... اور اب بیٹے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں..... اپنی ہی نسل اپنے ہی خون کو پاپ کا نام دے رہے ہیں..... ایک اور جرم..... گناہ پہ گناہ..... غلطی پہ غلطی کیے جا رہے ہیں۔ کوئی آپ کو روکنے والا ہی نہیں.....؟ کوئی سمجھانے والا ہی نہیں کہ اب بس کرو رضا حیدر..... موت برحق ہے۔ مرنا آپ نے بھی ہے....." عزت کے منہ سے لفظ نہیں نشتر نکل رہے تھے۔ اور رابعہ بیگم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سب کچھ جو رابعہ بیگم آج تک ان کے ڈر کی وجہ سے نہیں کہہ پائی تھیں' وہ آج ان کی بیٹی کہہ رہی تھی۔

"ہمارے ساتھ جو ظلم کرنا تھا آپ نے کر لیا۔ اپنے دوست کے ساتھ جو کرنا تھا وہ بھی کر لیا..... لیکن اب اپنی آنے والی نسل کے ساتھ تو ایسا کچھ مت کریں..... اسے تو سر اٹھا کر جینے دیں....." عزت روہانسے لہجے میں کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

"ہم اپنے ہی گھر میں ڈر ڈر کے جی رہے ہیں۔ یہ کرنا ہے وہ نہیں کرنا..... اس دولت نے اور اس دولت کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا' ہماری نیندیں' ہمارا سکون' ہمارا کھانا پینا سب حرام ہو چکا ہے' ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں' دڑاریں پڑ گئی دلوں میں..... رشتے بکھر گئے ہیں' صرف آپ کی وجہ سے..... صرف اس کی دولت کی وجہ سے..... ہمیں ہر کام آپ سے چوری اور آپ سے چھپا کے کرنا پڑتا ہے..... کیونکہ ہم ڈرتے ہیں..... آپ ہمیں جینے نہیں دیں گے..... لیکن پلیز۔

میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کے پاؤں پکڑتی ہوں۔ ہمیں اپنی زندگی جینے دیں' ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں' رحم کریں' اللہ کے واسطے رحم کریں' یہ دولت سب کو نگل جائے گی' اور..... پچھتاوے رہ جائیں گے..... پلیز بابا۔ تیمور بھائی محبت کرتے ہیں' ماورا مرتضیٰ سے اور انسان اپنی محبت سے دور ہو جائے تو سمجھیں زندگی سے دور ہو جاتا ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو زندگی سے دور مت کریں۔ چھوڑ دیں ساری ضدیں۔ جینے دیں ہم

Downloaded From http://paksociety.com

کو۔۔۔ پلیز جینے دیں۔۔۔"
وہ کسی کی بھی کچھ سنے بغیر اپنی ہی کہے جارہی تھی اور رضا حیدر کے سامنے دوزانو بیٹھ کر ہاتھ جوڑے تھے آنسو بے تحاشا بہہ رہے تھے اور وہ تینوں نیچے فرش پہ بیٹھی روتی بلکتی عزت کو دیکھ رہے تھے۔!

☆ ☆ ☆

ماورا آج آفس نہیں گئی تھی۔ بلکہ اپنی ہی سوچوں میں گم کسلمندی سے بیڈ پہ لیٹی رہی۔۔۔ عافیہ بیگم نے ایک دوبار اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا بھی تھا اور اسے اس طرح منہ سر لپیٹے دیکھ کر انہیں کافی تشویش بھی ہوئی تھی لیکن وہ کچھ بھی کہے بغیر پلٹ گئی تھیں۔ البتہ بی گل خاموشی اختیار کرنے والی نہیں تھیں۔
وہ دھیمے قدموں سے چلتی اس کے کمرے میں آگئی تھیں۔
"ماورا' ماورا بچہ جاگ رہی ہو؟" وہ اس کے بیڈ کے قریب آتے ہوئے بولیں۔ ماورا نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور بی گل اس کی خاموشی سے سمجھ گئیں' وہ جاگ رہی ہے۔۔۔
"دیکھو میرا بچہ سو جانے سے مسئلے حل نہیں ہوتے ورنہ ساری دنیا ہی سو جاتی بلکہ سوئی ہی رہتی۔۔۔ لیکن اصل زندگی حقیقت میں ہے۔ چلتی پھرتی دنیا میں ہے۔۔۔" بی گل اس کے قریب بیڈ پر بیٹھی کہہ رہی تھیں۔
"دیکھو' پہلی بات تو یہ کہ اس حال میں ٹینشن لینا تمہاری اور تمہارے بچے کی صحت کے لیے سراسر نقصان دہ ہے۔ تمہیں ہر طرح کی فکر اور ٹینشن سے دور رہنا چاہیے۔ تمہارا ٹائم پہ کھانا پینا بہت ضروری ہے۔ تمہیں اپنی خوراک پہ توجہ دینا ہوگی۔ اب وہ پہلے والی لاپروائی نہیں چلے گی۔"
بی گل اپنے دھیان اور اپنی ہی دھن میں بولے جارہی تھیں کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ سب سن رہی ہے۔
"اور دوسری بات اگر تیمور کی طرف سے پریشانی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔۔۔ تم سمجھ رہی ہو کہ وہ تم سے اور بچے سے غافل اور بے خبر ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔۔۔ اسے تمہاری اور بچے کی بھی خبر ہے' بے فکر اور لاپروا نہیں ہے وہ۔۔۔"
"لیکن بے حس ضرور ہو چکا ہے۔" ماورا ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ پھٹ پڑی تھی اور بی گل ذرا دیر کے لیے رک گئیں پھر مسکرا اٹھی تھیں۔
"محبت ٹھنڈا جذبہ نہیں ہے' محبت ایک نرم گرم جذبہ ہے۔ اس کی گرمی انسان کو ہمیشہ پگھلائے رکھتی ہے۔ انسان لاکھ چاہے تب بھی بے حس اور پتھر کا نہیں بن سکتا۔۔۔ تم کیسے سوچ سکتی ہو کہ وہ بے حس ہو چکا ہے۔۔۔؟"
بی گل کا فلسفہ ہمیشہ الگ ہی ہوتا تھا۔
"وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔۔۔ میرے سوچنے کے لیے کیا یہ کافی نہیں۔۔۔؟"

ماورا تڑپ رہی تھی۔ اسے جو چوٹ لگی۔۔۔ کیا وہ کم تھی؟
بی گل تیمور کی طرف داری کر رہی تھیں اور ماورا ان کی طرف داری پہ انہیں دیکھ کے رہ گئی۔
"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ چوٹ نے محبت بھلا دی۔۔۔؟" ماورا اعتراض اٹھا رہی تھی۔
"چوٹ نے محبت نہیں بھلا دی۔۔۔" بلکہ چوٹ کے درد نے اسے بلبلا کے رکھ دیا۔ جیسے جیسے درد کم ہوتا جائے گا۔ اس کی بلبلاہٹ کم ہوتی جائے گی۔ زخم بھرتا جائے گا۔ طبیعت سنبھل ہوتی جائے گی۔"
بی گل اسے سمجھا رہی تھیں اور ماورا سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔
"لیکن۔۔۔!" ابھی وہ کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا تھا اور ماورا کے ساتھ ساتھ بی گل نے بھی

Downloaded From http://paksociety.com

بے ساختہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھے اس کے موبائل کی طرف دیکھا تھا جس کی اسکرین پہ تیمور حیدر کی تصویر جگمگا رہی تھی۔

اور پھر اسی بے ساختگی سے دونوں نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا تھا اور بی گل کے چہرے پہ دھیمی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"جیسے جیسے درد کم ہوتا جائے گا' اس کی بلبلاہٹ کم ہوتی جائے گی۔ زخم بھرتا جائے گا... طبیعت سہل ہوتی جائے گی..." بی گل کی بات اس کی سماعتوں میں دوبارہ سے گونجی تھی اور اس نے کال ریسیو کرلی تھی۔

"ہیلو... السلام علیکم..." ماورا نے اپنے آپ کو پرسکون ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی... اور بی گل یونہی مسکراتے ہوئے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

"وعلیکم السلام... کیسی ہو؟" تیمور بھی بہت مطمئن انداز میں بول رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" ماورا کی آواز دھیمی تھی۔

"تو پھر آفس کیوں نہیں گئیں...؟" تیمور کے سوال پہ وہ بری طرح چونکی تھی یعنی اسے یہ بھی خبر تھی کہ وہ گھر پہ ہے۔

"بس ایسے ہی..." اس نے لاپروائی سے کہا۔

"بس ایسے ہی کام نہیں چلتا۔ طبیعت نہیں ٹھیک تو ڈاکٹر کو بلا لو... ایسے کاموں میں لاپروائی نہیں اچھی ہوتی۔" اب بی گل کی جگہ ہدایت نامہ اس کی طرف سے جاری ہوا تھا۔

"تو کیا اچھا ہوتا ہے...؟" وہ بے اختیار بولی۔

"پروا..." تیمور نے بھی برجستہ جواب دیا تھا۔

"کس کو کرنی چاہیے...؟" ماورا کریدنا چاہتی تھی کہ اس نے فون کس لیے کیا ہے؟

"مجھے...!" وہ بھی کسی اور ہی موڈ میں نظر آرہا تھا۔

"تو...؟" اس کا سوالیہ لفظ حاضر تھا۔

"کر تو رہا ہوں۔" تیمور نے بغیر لگی لپٹی رکھے جواب دیا تھا۔

"کیا...؟" پتا نہیں کیوں وہ بات کو بڑھا رہی تھی۔ بے وجہ طول دے رہی تھی۔

"پروا..." اس نے بھی یک لفظی جواب سے نوازا۔

"اچھا... پروا ایسے ہوتی ہے...؟" وہ جیسے اندر سے مطمئن ہو چکی تھی۔

"تو کیسے ہوتی ہے...؟" اب وہ پوچھ رہا تھا۔

"پاس آکر... پاس بیٹھ کر... فکر میں مبتلا ہو کر۔" وہ اسے طریقہ بتا رہی تھی۔

"فکر میں ہی تو مبتلا ہوں۔" تیمور کے منہ سے بے ساختہ پھسلا۔

"کیسی فکر...؟ اور کس کی فکر...؟" وہ ٹھٹکی۔

"ان سب کی... جن کو میری فکر نہیں۔" تیمور کا جواب سیدھا ماورا کے دل میں پیوست ہوا تھا۔

"آپ کی سوچ غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔" اس نے تیمور کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا۔

"میری سوچ صحیح بھی تو ہو سکتی ہے...؟" تیمور نے جیسے استہزائیہ لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔

"ہو سکتی ہے مگر..." ماورا نے کچھ کہنا چاہا۔

"ماورا...!" تیمور نے اس کی بات کاٹ دی اور ماورا چپ ہو گئی۔

Downloaded From http://paksociety.com

gsk do more feel better live longer

پاکستان میں ہر سال اندازاً 15,000 بچے روٹا وائرس ڈائریا کے سبب موت کی نیند سو جاتے ہیں۔[1]

اپنے بچے کو روٹا وائرس سے تحفظ دینے کے طریقوں بشمول حفاظتی ٹیکوں کے بارے میں جاننے کے لیے آج ہی اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

References:

1. Tate. Jacqueline et al. Global. Regional. and National Estimates of Rotavirus Mortality in Children <5 Years of Age. 2000-2013. CID 2016: 62(S2): S96-105.

مفادِ عامہ کا یہ پیغام GSK Pakistan کی جانب سے پیش کیا گیا ہے۔

© GlaxoSmithKline Pakistan Limited

PRESTIGE PAK/ROT/0003/' 4tri1:

Downloaded From http://paksociety.com

"جی۔۔۔؟" وہ دھیمے سے بولی۔
"وہ کیسا ہے۔۔۔؟" تیمور کا گمبھیر لہجہ آنچ دے رہا تھا۔
"کون۔۔۔؟" ماورا نہیں سمجھی۔
"جس کو صرف میری فکر ہوگی۔" تیمور کا اشارہ کس طرف تھا' اب وہ فوراً سمجھ گئی۔
"آپ کا بے بی۔۔۔!"
"ہاں' میرا بے بی۔ میرا بچہ۔۔۔ میرے جسم کا حصہ۔۔۔ کیسا ہے؟" تیمور کے لہجے میں پیار کی شدت مہک رہی تھی اور پیار کی اس شدت پہ ماورا کے دل کو کچھ ہوا تھا۔
"بتاؤ ناں' کیسا ہے وہ۔۔۔؟" تیمور بچوں کی سی ضد سے پوچھ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ کیوں کہ آپ ہو ناں اس کی پروا۔۔۔ اس کی فکر کرنے والے۔" ماورا نے لہجے کو ذرا خوش گوار بنانے کی کوشش کی تھی۔
"ہاں۔۔۔ میں ہوں ناں۔۔۔ اسی لیے تو اس کی خاطر تمہاری گود بھرائی کی رسم ارینج کر رہا ہوں۔" تیمور نے بالآخر کہہ ہی دیا تھا۔
"گود بھرائی کی رسم۔۔۔؟" ماورا زیر لب دہرا کے رہ گئی۔
"ہاں۔۔۔ گود بھرائی کی رسم۔۔۔ صرف اس لیے کہ کل کو تم سے کوئی یہ سوال نہ پوچھے کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ کیونکہ ہمارا تو نکاح بھی دھوم دھام سے نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اب بچہ تو دھوم دھام سے ہونا چاہیے ناں؟"
تیمور ماورا کے رشتے اور کردار کو معتبر کر رہا تھا۔ ماورا کے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی بھلا؟

"بولو۔۔۔ آؤ گی ناں۔۔۔؟" وہ اسے مدعو کر رہا تھا۔
"کہاں۔۔۔؟"
"جہاں میں بلاؤں گا۔" وہ مبہم سا بولا۔
"ہاں۔۔۔ آؤں گی۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔
"تھینک یو۔۔۔ بی گل اور آنٹی سے بھی کہنا۔۔۔ ابھی کال بند کرتا ہوں اور لوگوں کو بھی انوائیٹ کرنا ہے۔۔۔ بلکہ تم بھی کسی کو بلانا چاہو تو بلا سکتی ہو۔"
تیمور نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور ماورا حیرت اور بے یقینی سے موبائل دیکھتی رہ گئی۔۔۔!

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم۔۔۔!" مونس مرزا نے اپنی دھن میں کال ریسیو کی تھی۔
لیکن دوسری طرف کا سلام اور ٹھہرا ہوا لہجہ سن کر ٹھٹک گیا تھا۔
"کون۔۔۔؟"
"تیمور حیدر بات کر رہا ہوں۔" تیمور کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔
"اوہ اچھا اچھا۔۔۔ تیمور حیدر۔۔۔؟" مونس مرزا نے جملہ خاصا لمبا کھینچا تھا۔ "جی۔۔۔ تیمور حیدر! فرمائیے۔۔۔ آج کیسے یاد کر لیا۔"
مونس مرزا کو شک ہو چکا تھا کہ یقیناً "کوئی بڑی بات ہے' اسی لیے اس نے فون کیا ہے۔۔۔
"یاد تو آپ ہمیشہ سے ہیں۔۔۔ لیکن فی الحال آپ کو اور آپ کی فیملی کو اپنی بیوی کی گود بھرائی کی رسم میں شرکت

Downloaded From http://paksociety.com

کے لیے انوائیٹ کرنا تھا اس لیے یاد کرنا پڑا۔" تیمور نے یاد کرنے کی وجہ بتائی۔

"اوہ... گود بھرائی کی رسم؟ مبارک ہو بہت بہت۔" مونس مرزا نے مسکراتے ہوئے اسے مبارک باد سے نوازا۔

"خیر مبارک... آپ اپنی فیملی میں اطلاع کر دیں... دو روز بعد گود بھرائی ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب... جیسے آپ کا حکم۔" مونس مرزا نے بڑی نیازمندی کا مظاہرہ کیا تھا اور تیمور نے سلام دعا کے بعد فون بند کر دیا تھا...!

☼ ☼ ☼

ولید اپنے پروگرام کی شوٹ کے لیے جا رہا تھا جب اس کے موبائل پہ بیل ہوئی تھی' اس نے عجلت سے چلتے چلتے موبائل نکال کر کال اٹینڈ کی... اور نمبر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

"ہیلو...!"

"کیسے ہو...؟" تیمور کی آواز پہ ولید کے تیزی سے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

"تیمور...؟" ولید نے تصدیق کرنا چاہی۔

"ہاں... تیمور ہی بول رہا ہوں... تمہیں کوئی شک ہے کیا؟" تیمور نے شرارت سے کہا۔

"ہاں شک تو ہے۔" ولید نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا... تو پھر یہ شک یقین میں بدل لو۔" تیمور مسکرا رہا تھا۔

"کیوں بدل لوں؟ وجہ...؟" ولید اکھڑے انداز میں بولا۔

"وجہ یہ کہ تم چاچا بننے والے ہو..." تیمور نے اسے خوش خبری سنائی۔

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہو؟ ذرا پھر سے کہنا۔" ولید خوشی سے چہکا تھا۔

مارچ 2017 کا شمارہ "سالگرہ نمبر" شائع ہو گیا

ماہنامہ کرن

سالگرہ نمبر

- ماہنامہ کرن کی سالگرہ کے موقعے پر فاخرہ گل کا مکمل ناول "گواہ ہیں سرمئی شامیں"
- "برگ اُمید وفا" مصباح علی کا مکمل ناول،
- "نیل گر" نگہت سیما کا ناولٹ،
- "بیلا" نشا محسن علی کا ناولٹ،
- "تو ہے تو درخشاں ہے حیات" قرۃ العین خرم کا ناولٹ،
- "اک اک لمحہ زندہ ہو" شبانہ شوکت کا ناولٹ،
- صدف ریحان گیلانی، عنبرین ولی اور امبر فاطمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے
- گلوکارہ "سائرہ رضا خان" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "خواتین کے عالمی دن" پر مشہور شخصیات سے شاہین رشید کا سروے،
- "شادی مبارک ہو" ندا حسنین کی شادی کا احوال،
- ماہنامہ کرن کی سالگرہ کے موقعے پر قارئین سے سروے،
- "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- "راہ غزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "گل گہسار" فرح بخاری کے مکمل ناول کی آخری قسط،

اس شمارے کے ساتھ کرن کتاب

"لباس اور فیشن"

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے

Downloaded From http://paksociety.com

"تم چاچا اور ماما بننے والے ہو؟ تیمور کے انداز میں شرارت تھی۔
"واؤ۔۔۔ امیزنگ یار۔۔۔ ایم ریئلی ہیپی۔۔۔ اینڈ ریئلی سرپرائزڈ۔" ولید کی خوشی دیدنی تھی۔
"کب خبر ملی؟ اور بھابھی کہاں ہیں؟ باقی سب کو پتا چلا؟" ولید نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔
"خبر دو دن پہلے ملی ہے۔۔۔ تھوڑی ٹینشن میں تھا اس لیے تمہیں بتا نہیں سکا۔۔۔ اور ماورا اپنے گھر میں ہے۔۔۔ البتہ اپنی فیملی کے علاوہ ابھی کسی کو بھی نہیں پتا۔۔۔ اس لیے گود بھرائی کی رسم ارینج کروا رہا ہوں۔۔۔ تم اپنی فیملی کے ساتھ آجانا اور پوری تیاری کے ساتھ آنا۔۔۔ گود بھرائی کی رسم کے ساتھ ساتھ میں عزت کی رخصتی کی رسم بھی ادا کر رہا ہوں۔"

تیمور نے انتہائی تحمل اور سکون سے کہتے ہوئے ولید کے سر پہ بم پھوڑ دیا تھا۔
"کیا رخصتی؟ وہ بھی دو دن بعد۔۔۔؟"
"ہاں۔۔۔ رخصتی! دو دن بعد نہ ہوئی تو پھر کبھی نہیں ہوگی۔ تم دونوں کا نکاح میں نے کروایا تھا۔ رخصتی بھی میں ہی کرواؤں گا۔" تیمور اپنے فیصلے پہ اٹل تھا۔
"تیمور! تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" ہمیشہ ہر کام میں عجلت کیوں کرتے ہو؟ جب اتنا انتظار کر لیا ہے تو تھوڑا اور سہی۔۔۔" ولید اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔
"اب انتظار کی گنجائش نہیں رہی۔۔۔ تم پریشان نہ ہو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" تیمور نے اسے تسلی دی۔
"یار! بات نفع اور نقصان کی نہیں ہے' بات تو۔"
"ولید! دو دن بعد رخصتی ہے۔" تیمور نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا اور ولید چپ کا چپ رہ گیا تھا۔
جبکہ اس کے بیڈ روم میں داخل ہوتی عزت کے قدم دروازے کی چوکھٹ میں ہی رک گئے تھے۔ وہ اس کی آخری بات سن چکی تھی۔
"عزت کو میں خود اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ یہ نہ ہو کہ بابا جان کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ جائے۔۔۔ اس لیے پلیز مجھے یہ ادھورا کام پورا کرنے دو۔"
تیمور کی بات پہ ولید اور کیا کہہ سکتا تھا سوائے ہامی بھرنے کے۔
لیکن عزت وہیں کی وہیں پتھرائی ہوئی کھڑی تھی۔
اور ڈبڈباتی نظروں سے تیمور کو دیکھ رہی تھی جو فون بند کرنے کے بعد مضبوط قدموں سے چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور عزت کو دونوں کندھوں سے تھام لیا تھا۔ چہرے پہ شفیق سی مسکان تھی' نرم اور میٹھی۔ دل کو اداس کر دینے والی!

(آخری قسط آئندہ ماہ)

Downloaded From http://paksociety.com

شکست کی آواز

زندگی کا حسین روپ بھی دیکھو پل بھر
اُفقِ ذہن کے اس پار جہاں
نیلگوں چرخ کی پہنائی میں
چاند کے پاس ستارہ ہے
جو چپکے چپکے
چاند کی نقرئی باہنوں میں سمٹ آیا ہے
کاخِ گل کے کسی خاموش جھروکے سے کبھی
جھانک کے دیکھا تم نے
کسی بہکی ہوئی خوشبو کا کوئی رقصِ لطیف
اور شبنم کے روپہلے گھنگھرو
جب بج اُٹھتے ہیں تو سورج کی سنہری کرنیں
کس لیے سجدے میں جھک جاتی ہیں ۔ کیا
پاتی ہیں؟
صبح دم موجِ صبا کرتی ہے کس کے لب وعارض
کا طواف؟
اس کی اٹھلاتی ہوئی چال میں کیوں ہوتی ہے
دل خیز ترنگ؟
اک ذرا سوچو کہ فطرت کا تقاضا کیا ہے
عشق کیا چیز ہے اور حسن کا منشا کیا ہے
(حمایت علی شاعر کی ایک تمثیلی نظم سے اقتباس)

جھنجلاتے ہیں، لجاتے ہیں پھر مسکراتے ہیں
کس اہتمام سے انہیں ہم یاد آتے ہیں

اب جا کے آہ کرنے کے آداب آتے ہیں
دُنیا سمجھ رہی ہے کہ ہم مسکراتے ہیں

اے جوشِ گریہ دیکھ نہ کرنا خجل مجھے
آنکھیں مری ضرور ہیں، آنسو پرائے ہیں

سمجھاتے قبل عشق تو ممکن تھا بنتی بات
ناصح عزیز اب ہمیں سمجھانے آئے ہیں

کعبے میں خیریت تو ہے سب حضرتِ خمارؔ
یہ دیر ہے جناب، یہاں کیسے آئے ہیں

خمار بارہ بنکوی

Downloaded From http://paksociety.com

نہلے پہ دہلا

ایک مشہور فلمی ہیروئن نے دوسری مشہور فلمی ہیروئین سے کہا۔

"میں نے تمہارا مضمون ایک رسالے میں پڑھا تھا۔ وہ مجھے بہت پسند آیا۔ بائی دا وے اس کو لکھا کس نے تھا؟"

دوسری ہیروئن نے فوراً" جواب دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تمہیں مضمون پسند آیا۔ لیکن یہ تو بتاؤ' آخر تمہیں وہ مضمون پڑھ کر سنایا کس نے؟"

سبق

ایک صاحب کی آفس سے چھٹی ہوئی تو ان کی ملاقات اپنے ایک جگری دوست سے ہو گئی۔ دونوں چائے پینے ایک ہوٹل میں گئے تو وہاں باتوں میں اتنے منہمک ہو گئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ رات جب دس بجے موصوف اپنے گھر پہنچے تو بیگم کھانے پر ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ صاحب "بھوک نہیں ہے" کہہ کر اپنے کمرے میں سونے چلے گئے۔

رات ساڑھے تین بجے الارم کی آواز پر ان کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور ٹائم دیکھ کر غصے سے بیوی کو جگایا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟"

"ہوں۔۔۔!" بیگم نے انتہائی سکون و اطمینان سے کہا۔ "میں نے سوچا دفتر سے واپس آنے میں آپ کو پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں تو اتنا ہی وقت جانے میں بھی لگے گا' اس لیے میں نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگا دیا تاکہ آپ وقت پر آفس پہنچ جائیں۔"

پہچان

ایک سردار جہاز میں دوسرے مسافر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے اعتراض کرنے پر سردار بولا۔

"میں پہلے سے بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نہیں اٹھوں گا۔"

جہاز کے عملے نے پوری کوشش کی لیکن سردار جی سیٹ سے نہ اٹھے۔ یہ دیکھ کر ایک دوسرا سردار اٹھا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر وہ سردار فوراً" پچھلی سیٹ پر چلا گیا۔ سب حیران رہ گئے۔ آخر ایئر ہوسٹس نے سردار سے پوچھا کہ "آپ نے ان کے کان میں کیا کہا تھا؟"

"میں نے کہا' اس سیٹ کا مسافر دبئی جا رہا ہے اور پچھلی سیٹ کے مسافر پنجاب جا رہے ہیں۔"

سزا

کلاسیکی موسیقی کے ایک بہت بڑے استاد کو جیل میں قیدیوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ استاد نے تقریباً" چار گھنٹے تک اپنے فن کا مظاہرہ کیا' بعد میں چائے کی میز پر استاد نے اس بات کی تعریف کی کہ اب جیل میں قیدیوں کو بڑی سہولتیں دی جاتی ہیں حتیٰ کہ موسیقی سنوانے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے چونک کر کہا۔

"سہولتیں۔۔۔ ارے جناب یہ تو انتہائی خطرناک قیدی تھے۔ جن کے سامنے آپ نے مظاہرہ کیا ہے۔ ان سے کچھ راز اگلوانے تھے' اسی لیے انہیں چار گھنٹے کلاسیکی موسیقی سننے کی اذیت میں مبتلا کیا گیا تھا۔ آپ

Downloaded From http://paksociety.com

کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی وجہ سے تین قیدی اپنے ساتھیوں کے نام و پتے بتانے پر راضی ہو گئے ہیں۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

اُف

دو دوست احمر اور ندیم رازدار بھی تھے۔ احمر بلیڈ سے اپنے بازو پر اپنی گرل فرینڈ کا نام لکھ رہا تھا۔ خون بہہ رہا تھا۔ ندیم اپنے دوست احمر کی تکلیف برداشت کرنے کے حوصلہ پر متاثر ہو رہا تھا۔ جب نام لکھا جا چکا تو احمر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ندیم نے کہا۔ "تم نے کتنی تکلیف برداشت کی' اب نام لکھا جا چکا ہے تو یوں رو رہے ہو۔" احمر نے روتے ہوئے کہا۔ "اسپیلنگ (ہجے) غلط لکھ دیے ہیں۔"

مسز رانی لاہور کینٹ

شکر پارے

☆ ایک صاحب کی اپنی کزن کے ساتھ شادی ہوئی۔ ایک ماہ بعد بیگم کا تعارف کرواتے ہوئے بولے۔ "یہ ہیں میری" اہلیہ پہلے ان سے میرا بلڈ کا رشتہ تھا اور اب بلڈ پریشر کا ہے۔

☆ محلے میں اگر عورتوں کی لڑائی ہو جائے تو دو' تین عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پیچھے کھڑی بیک گراؤنڈ میوزک دے رہی ہوتی ہیں "آہو آہو"

☆ امی نے کہا بازار سے مہمان کے لیے کچھ لے کر آؤ۔ میں ٹیکسی لے آیا۔

☆ بیٹے دو ہونے چاہئیں اگر ایک انجینئر بن بھی جائے تو دوسرا گھر کا خرچہ چلا سکے۔

وجہ

ماں بیٹے سے۔ "اپنے لیے لڑکی ڈھونڈو جو نمازی' پرہیزگار' پردے دار' نیک سیرت ہو۔"

بیٹا۔ "یہ بتائیں اس سے شادی کرنی ہے یا پانی پر دم کروانا ہے۔"

یقین

لڑکا: "تم دنیا کی پہلی اور آخری لڑکی ہو جس سے میں نے محبت کی۔"

لڑکی: "تم وہ پہلے لڑکے ہو جس کے اس جھوٹ پر میں نے یقین کر لیا ہے۔"

اشتہار

پچھتر سال کی ایک عورت نے اشتہار دیا۔

"ضرورت رشتہ"

تین دن کے بعد اس کے گھر خط آیا۔

"محترمہ آپ "ف" لکھنا بھول گئی ہیں۔ اس عمر میں "رشتہ" نہیں "فرشتہ" آتا ہے۔"

(ثمینہ اکرم۔ لیاری)

حیرت

ایک مکرانی سے پٹھان نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔۔۔؟"

مکرانی۔ "میں ٹائی ٹانک کا ہیرو ہوں۔۔۔"

پٹھان۔۔۔ حیرانی سے بولا۔ "ابے بھئی ٹائی ٹانک ڈوبا تھا جلا تھوڑی تھا۔۔۔"

(غنویٰ اکرم۔ لیاری)

فائرنگ

ہنری اپنے دوستوں کو امریکہ کے واقعات سنا رہا تھا۔

"ایک روز مجھے ریڈ انڈین لوگوں نے گھیر لیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' ان پر فائر کھول دیا۔ ایک۔۔۔ دو' تین۔۔۔ بارہ۔۔۔ چودہ۔"

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔" ایک دوست نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تم نے اپنا ریوالور لوڈ کب کیا تھا؟"

"جب کوئی شخص اتنی بری طرح گھر جائے۔" ہنری نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ فضول چکروں میں پڑے۔ اس کو تو صرف فائرنگ سے غرض ہوتی ہے۔"

فضہ یوسف۔ کراچی

Downloaded From http://paksociety.com

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے۔

"جو شخص عصبیت کی وجہ سے ناراض ہوتا ہے یا عصبیت کی طرف بلاتا ہے یا عصبیت کی وجہ سے کسی کی مدد کرتا ہے، پس مارا گیا تو اس کا قتل جاہلیت کا ہوگا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے اور میں اس سے نہیں ہوں۔" (مسلم)

ایسے تھے حضرت عمرؓ،

جب اسکندریہ فتح ہوا تو سالار لشکر عمرو بن العاصؓ نے معاویہؓ بن خدیج کو قاصد بنا کر مدینہ بھیجا اور کہا۔

"جس قدر جلدی جاسکتے ہو جاؤ اور امیرالمومنین کو مژدہ فتح سناؤ۔"

حضرت معاویہ ٹھیک دوپہر کے وقت مدینے میں داخل ہوئے اور اس خیال سے کہ آرام کا وقت ہے امیرالمومنین کے گھر نہیں گئے بلکہ مسجد نبوی کا رخ کیا۔ راستے میں امیرالمومنین کی لونڈی ملی، اس نے حضرت عمرؓ کو جاکر اطلاع دی کہ اسکندریہ سے قاصد آیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے کہا کہ "جاؤ فوراً قاصد کو یہاں پر بلا لاؤ۔"

لونڈی نے جاکر قاصد سے کہا کہ "تم کو امیرالمومنین بلاتے ہیں۔"

لیکن حضرت عمرؓ حالات جاننے کی جلدی میں قاصد کے آنے کا انتظار بھی نہ کر پائے بلکہ خود چادر سنبھال کر چلنے کے لیے تیار ہوئے۔ اسی وقت معاویہؓ آگئے۔

حضرت عمرؓ نے فتح کا حال سنا تو زمین پر گر پڑے۔ سجدہ ریز ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ منادی کروا کے تمام لوگوں کو مسجد میں جمع کیا۔ حضرت معاویہؓ نے فتح کے حالات بیان کیے۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ ان کو اپنے گھر لائے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فراغت کے بعد امیرالمومنینؓ نے پوچھا۔

"تم مدینے میں داخل ہو کر سیدھے میرے پاس کیوں نہ چلے آئے؟"

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا۔ "چونکہ یہ آرام کا وقت ہے اس لیے میں نے خیال کیا کہ شاید آپ سوئے ہوں اور میری وجہ سے آپ کے آرام میں خلل واقع ہو۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"افسوس تم میرے بارے میں یہ خیال رکھتے ہو (اگر میں دن کو سویا کروں) تو خلافت کا بار کون سنبھالے گا۔"

موتی مالا،

☆ جب تم کو یقین ہو کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے تو پھر اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کون تمہارے خلاف ہے۔

☆ ان چیزوں کے بارے میں نہ سوچو جو دعا کے باوجود اللہ نے تمہیں نہیں دیں بلکہ ان چیزوں کے بارے میں سوچو جو اللہ تمہیں بن مانگے دیتا ہے۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

چار علم،

حاتم نے کہا۔ "میں نے چار علم اختیار کیے اور دنیا کے تمام علوم سے جان چھوٹ گئی۔"

کسی نے پوچھا۔ "وہ چار علم کون سے ہیں؟"

حاتم نے جواب دیا۔ "پہلا یہ کہ میں نے سمجھ لیا ہے کہ جو رزق میری قسمت میں لکھا ہے نہ وہ زیادہ

Downloaded From http://paksociety.com

ہوتا ہے نہ کم اس لیے میں زیادہ کی طلب سے مطمئن ہو گیا۔

دوسرا یہ کہ اللہ کا جو مجھ پر حق ہے' وہ میرے سوا کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا' اس لیے میں مشغول ہو گیا۔

تیسرا یہ ہے کہ ایک چیز ہے جو مجھے ڈھونڈتی ہے' وہ ہے موت۔ میں اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ اس لیے میں نے سمجھوتہ کر لیا۔

چوتھا یہ ہے کہ میرا اللہ ایک ہے جو مجھ سے باخبر ہے۔ میں نے اس سے شرم رکھی ہے اور برے کاموں سے ہاتھ اٹھا لیا۔"

شیطانی وسوسہ

ایک شخص کثرت سے ذکر الٰہی کرتا رہتا تھا شیطان نے اسے وسوسے میں مبتلا کر دیا۔

"بے فائدہ ذکر کی کثرت کر رہا ہے۔ تو اللہ اللہ کرتا رہتا ہے جبکہ اللہ کی طرف سے لبیک کی آواز ایک بار بھی نہیں آئی اور نہ ہی اللہ کی طرف سے کوئی جواب ملتا ہے۔ پھر یک طرفہ محبت سے کیا فائدہ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تیرا ذکر الٰہی اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔"

شیطان کی ان پُرفریب باتوں سے صوفی نے ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ شکستہ دل اور افسردہ ہو کر سو گیا۔ آنکھ سو گئی اور قسمت جاگ گئی۔

عالم خواب میں دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے دریافت کیا۔

"ذکر الٰہی سے غفلت کیوں؟ اے نیک بخت! تو نے ذکر حق کیوں چھوڑ دیا؟"

اس نے کہا "بارگاہ الٰہی سے مجھے کوئی جواب ہی نہیں ملتا۔ اس سے دل میں خیال آیا کہ میرا ذکر قبول نہیں ہو رہا ہے۔"

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا "تمہارے لیے اللہ عزوجل نے پیغام بھیجا ہے کہ تمہارا پہلی دفعہ اللہ کہنا قبول ہوتا ہے تب دوسری بار تمہیں اللہ کہنے کی توفیق ملتی ہے۔ اے بندے! تیرا خوف اور میری ذات سے تیرا عشق میرا ہی انعام ہے۔ ہر بار یا اللہ کی پکار میں میرا لبیک شامل ہوتا ہے۔ تیرے ذکر کی قبولیت کی نشانی یہی ہے کہ تمہیں ذکر حق میں مشغول کر دیا ہے۔"

(حکمت رومی۔ مولانا رومی)

نخبہ اکرم۔ گاؤں کوٹلی

دکھاوا

انسان کو اچھی سوچ پہ وہ انعام ملتا ہے جو اُسے عمل پہ بھی نہیں ملتا کیونکہ سوچ میں دکھاوا نہیں ہوتا۔

ڈر

اُس دشمن سے مت ڈرو جو تنہائی میں تم پہ وار کرتا ہے۔ اُس دوست سے ڈرو جو محفل میں تمہاری عزت پر وار کرے۔

مدیحہ نوید۔ مہک۔ گجرات

سائبان

ایک مرتبہ چڑیا رزق کی تلاش میں کافی لمبا سفر کرنے کے بعد واپس اپنے گھونسلے میں پہنچی تو اس کے بچوں نے پوچھا۔

"ماں! تم نے اتنا لمبا سفر طے کیا۔ ہمیں ذرا بتاؤ کہ آسمان کتنا بڑا ہے؟"

چڑیا نے بچوں کو اپنے پروں میں سمیٹتے ہوئے نہایت اطمینان بھرے انداز میں جواب دیا۔

"بچو! یاد رکھنا والدین کے سائے سے بڑی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

افکار

- غم چھوٹے آدمی کو توڑ دیتا ہے۔ اگر غم میں غم دینے والے کا خیال رہے تو پھر انسان بہت بلند ہو جاتا ہے۔
- دعا یہ کرو کہ اے اللہ جو تو نے دینا ہے وہ بغیر مانگے دے اور جو تو نے نہیں دینا اس کے مانگنے کی توفیق ہی نہ دے۔
- مسلمان وہ ہے جو ہندو کی نگاہ میں مسلمان ہو۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From http://paksociety.com

وہ گناہ ہر وہ عمل ہے جو تمہارے لیے نقصان دہ ہے۔

وہ جس نے اپنی زندگی کو قبول کرلیا اس نے اللہ کو مان لیا۔

(واصف علی واصف)

کنیز فاطمہ۔ جڑانوالہ

آگ ٹھنڈی ہوگئی

حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے آگ کو ٹھنڈا کرنے کا نمونہ امت محمدیہ کے ایک بزرگ حضرت ابومسلم خولانیؒ کے لیے ظاہر فرمایا۔ جس وقت یمن کے چھوٹے مدعی نبوت اسود عنسی نے انہیں بلا کر اپنی نبوت کا اقرار لینا چاہا لیکن انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر اسود عنسی نے آگ کی ایک زبردست چتا دہکائی اور حضرت ابومسلم خولانیؒ کو اس آگ میں ڈال دیا لیکن رب تعالیٰ نے آگ کو ان کے حق میں بے ضرر بنا دیا اور یہ اس سے صحیح سالم نکل آئے۔

لوگوں نے اسود عنسی کو مشورہ دیا کہ اب آپ ان کو مزید نہ چھیڑیں، البتہ اگر یہ آپ کے ملک میں رہے تو لوگوں میں آپ کے خلاف فساد مچائیں گے اس لیے یہاں سے جلاوطن کر دیں، چنانچہ اسود عنسی نے حضرت ابومسلمؓ کو جلاوطن کر دیا۔ یمن سے جلاوطن ہو کر انہوں نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا۔ جب مدینہ پہنچے تو آنحضرتؐ کی وفات ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بن گئے تھے۔

مسجد نبوی کے قریب پہنچ کر انہوں نے اپنی اونٹنی کو باندھا اور ایک ستون کی آڑ میں نماز پڑھنے لگے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھا تو پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "یمن سے۔"

اس واقعے کی شہرت مدینے تک پہنچ چکی تھی کہ اسود عنسی نے ایک مسلمان کو آگ میں ڈالا تھا مگر وہ اللہ کی رحمت سے محفوظ رہا اس لیے حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا۔

"ہمارے اس دوست کا کیا قصہ تھا جسے اللہ کے دشمن (اسود عنسی) نے آگ میں ڈالا تھا۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا؟"

"وہ واقعہ ابن ثوب کے ساتھ پیش آیا تھا۔" ابومسلم خولانیؒ نے جواب دیا۔ ابن ثوب، ابومسلم خولانیؒ کا نام تھا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "قسم کھا کر بتاؤ، وہ شخص تم ہی تو نہیں ہو؟"

"ہاں، وہ میں ہی ہوں۔" ابومسلم نے فرمایا۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ابومسلم خولانیؒ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور انہیں حضرت ابوبکرؓ کے پاس لے گئے اور فرمایا۔

"اللہ کا شکر ہے اس نے مجھے امت محمدیہ کے ایسے شخص کو دیکھنے سے پہلے موت نہ دی جس کے ساتھ بالکل ابراہیمؑ جیسا معاملہ ہوا۔"

ابومسلم خولانیؒ، حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت تک زندہ رہے۔ حضرت معاویہؓ ان کا بڑا احترام فرماتے تھے، یہ حضرت معاویہؓ کو نرم و گرم نصیحتیں کرتے رہتے تھے اور وہ ان کی باتیں بڑی قدر کے ساتھ سنتے تھے۔

عمرہ، اقرا۔ کراچی

جواہر پارے

- کچھ لوگ اس لیے اپنے پاؤں اٹھاتے اٹھاتے بھرتے ہیں کہ کہیں کسی کی دکھتی رگ دیکھیں اور اس پہ پاؤں رکھیں۔
- تعلق بھی رزق کی طرح ہوتا ہے۔ بدنیتی آجائے تو برکت ختم ہو جاتی ہے۔
- اُن کا بھروسا مت کرو جن کا خیال وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ اُن کا بھروسا کرو جن کا خیال ویسا ہی رہے جیسا آپ کا وقت بدل جائے۔
- انسان اپنے قد سے نہیں اپنے ظرف سے پہچانا جاتا ہے۔
- انسان اگر اپنی انگلیوں کا استعمال اپنی غلطیاں گننے کے لیے کرے تو دوسروں پہ انگلی اٹھانے کا وقت ہی نہ ملے۔

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

Downloaded From http://paksociety.com

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

ثمرہ جاوید ـــــــ بسم اللہ پور

حاصل زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، وہ رہا نہیں

طوبیٰ مشتاق ـــــــ لاہور

شہر وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

گڑیا شاہ ـــــــ کہروڑپکا

یوں حوصلہ دل نے ہارا کب تھا
سرطان میرا ستارہ کب تھا
لازم تھا گزرنا زندگی سے
بن زہر پیے گزارا کب تھا

نسبت گیلانی ـــــــ کہروڑپکا

بزم میں تیرے نہ ہونے کا سوال آیا بہت
تو نہیں تھا تو آج تیرا خیال آیا بہت
دیکھتے ہی دیکھتے تباہی چمن گئی!
باکمال لوگوں پہ زمانے میں زوال آیا بہت

مدیحہ نورین مہک ـــــــ گجرات

یہ اور بات کہ وہ چشم پوش ہو جائے
کبھی تو علم اُسے بھی ہمارے حال کا تھا
محبتوں میں، میں بھی قائل تھا لب نہ کھولنے کا
جواب ورنہ میرے پاس ہر سوال کا تھا

ایمہا طارق ـــــــ گوجرانوالہ

کتاب زندگی کا میری وہ خوبصورت باب تھا
یوں حرف حرف پڑھا جیسے وہ شخص میرا نصاب تھا
سرِ راہ مجھے چھوڑ کر وہ کسی اور کے ہمراہ ہو لیا
وہ شخص جسے چاہا میں نے بے حساب تھا

ایمان جلبانی ـــــــ گاؤں دریا خان

مانا کہ بہت قیمتی ہے وقت تیرا
ہم بھی نایاب ہیں یہ تُو نے ہی کہا تھا

شائستہ اکبر ـــــــ گڈو کالونی

دل کے ہنگاموں کو بے کار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سُن

فوزیہ ثمر بٹ ـــــــ گجرات

وہ اور وعدہ وفا کرے
تم بھی ناصحؔ کمال کرتے ہو

کنیز فاطمہ ـــــــ جڑانوالہ

نگاہ و دل کو قرار کیسا نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے

ثوبیہ قطب ـــــــ کراچی

غم جہاں ہو غم یار ہو کہ تیر ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

زنیرہ طاہر ـــــــ بہاول نگر

نہ عشق با ادب رہا، نہ حسن میں حیا رہی
ہوس کی دھوم دھام ہے نگر نگر، گلی گلی

زرتاشیہ شیرازی ـــــــ جڑانوالہ

مرحلہ دشوار آیا ہے ظرف سب کے کھل گئے
لوگ جیسے لگ رہے تھے ایک بھی ویسا نہ تھا

کائنات اصغر لونڈدار ـــــــ ڈہرکی

ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی
مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی
منزل تمنا تک کون ساتھ دیتا ہے
گردِ سعی لاحاصل ہر سفر کی قسمت تھی

خالدہ پروین ـــــــ گاؤں افکہ

اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے

Downloaded From http://paksociety.com

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں

اللہ تعالیٰ سے آپ سب کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے جس نے ہمیں ہمت اور حوصلہ عطا کیا اور آپ سب کی محبتوں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں، آپ کو اور ہمارے پیارے وطن کو دشمنوں کی بد نظر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پہلا خط لاہور سے یاسمین اقبال کا ہے، لکھتی ہیں

اب تو یاد بھی نہیں کہ کب سے پڑھ رہے ہیں۔ یاد ہے تو بس اتنا کہ زندگی کے ہر موسم میں ساتھ شعاع کا پایا ہے اب جبکہ

بالوں کی سفیدی سے ڈر لگتا ہے
زندگی تیری رفتار سے ڈر لگتا ہے

پھر بھی یہ ہمیں روز اول کی طرح پیارا ہے۔ کوثر خالد صاحبہ کو صاحب کتاب ہونے پر ڈھیروں مبارک باد۔ یوں تو سب ہی بہنوں کے خطوط بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ثمینہ اکرم مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ میں آج کل امی کے گھر کراچی آئی ہوئی ہوں۔ شیر شاہ اور لیاری میں کوئی دوری تو نہیں مگر ایڈریس نہ ہونے کی وجہ سے مل نہ سکے ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح۔ اب تو ویسے بھی صبح واپسی ہے۔ ماہ فروری کے شمارے کی ساری کہانیاں ابھی پڑھ نہیں سکی "خواب شیشے کا" اور "شہر خطا" بڑی عمدہ تحریریں ہیں نایاب جیلانی میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ صائمہ اکرم کے "شہرزاد" نے بھی ہمیں جکڑ لیا ہے۔ بہت اچھی تحریر ہے۔ تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ یہ زبردست سلسلہ ہے۔ مجھے تو بہت پسند ہے۔ ڈاکٹر ص۔ م کی تحریر پڑھ کر اچھا ہی نہیں بہت اچھا لگا۔

ج : پیاری یاسمین! یہ آپ کا ساتھ، آپ کی بے مثال محبت کا کمال ہے کہ شعاع نے اتنی لمبی مسافت میں نہ صرف اپنا معیار برقرار رکھا بلکہ بہنوں کا مقبول ترین پرچا بھی رہا ہے اور زندگی کی ہر رت میں آپ کے ساتھ دوستی نبھا رہا ہے۔

ثمینہ اکرم کا ایڈریس آپ کے پاس نہیں تھا لیکن ہمارا پتا تو بہ آسانی مل سکتا تھا، کراچی آئی تھیں تو ہم سے ملنے کو دل نہیں چاہا؟ آئندہ آئیں تو ضرور ملیے گا۔ اپنی اتنی پرانی قاری سے مل کر ہمیں خوشی ہوگی۔ نایاب جیلانی اور صائمہ اکرم تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔

تجھ سے ناتا جوڑا ہے کے سلسلے میں ضرور شرکت کریں۔ یہ سلسلہ ہماری قارئین کے لیے ہی ہے۔ اپنے کوٹ سے دو سالہ پوتے کو ہماری طرف سے پیار دیجیے گا۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ہمارے دل و دماغ میں، روح کی پرواز میں تیرا ہی علم ٹھاٹھیں مارتا ہے اور بس اسی کے ساتھ نے ہمیں عام لوگوں سے منفرد بنایا ہے مگر.... بقول فوزیہ ثمر.... پاؤں کی زنجیریں.... سماج کی دیواریں یا عمل میں رکاوٹیں۔ بس یہ سمجھ لیں.... یا تو میں ایک کامل الوجود.... ست ترین عورت ہوں یا پھر میرے کام کا بوجھ زیادہ ہے۔ جناب.... آپ جانتے تو ہوں کہ ہم ہانڈی بھی روز نہیں پکاتے اور گھر کے دوسرے کام بھی چھوڑ دیا کرتے ہیں جب رسالوں کا موسم وارد ہو ماہ بہ ماہ۔

گھر کی صفائی، چھت کی، گلی کی، بار بار برتن دھونا۔

Downloaded From http://paksociety.com

روزانہ کپڑے دھونا' استری کرنا' دادی کے پیمپر بدلنا' دو چار بچے پڑھانا۔ لوگوں کا آنا جانا۔ بطور مشورہ بیگم کام.... اور روزانہ سادگی اور کم سامان پر دھواں دار تقاریر کرنا دادی کے باہر جانے کی فرمائش پر ڈانٹ ڈپٹ' رونا کرلانا اور چھ یتیم بچوں اور ان کی ماں کے مسائل۔ وقت پر نمازیں صرف آج پڑھنا نصیب ہوئیں۔ کیونکہ شمع اور رضا فیصل آباد گئے۔ میری بہن عالیہ کا گونگا میاں شاہد عمرہ کرکے آیا اور اس کی والدہ اسپتال نازک حالت میں ہیں اور ہم تو کہیں جا ہی نہیں سکتے.... یوں بھی ہمیں آنا جانا دشوار لگتا ہے شروع سے.... کہ کام چھوڑ کر جانا پسند نہیں۔

ساس جی اب کالی بدل ڈالی ہیں اور ہم نے انہیں نعت پڑھنے اور توبہ تائب پہ لگا رکھا ہے (خود بھی یہی) اور ماشاء اللہ 15 دن سے دوا کے بغیر رہ رہی ہیں دعاؤں کے سہارے.... اور اب میں ان کی بالیاں اور کوکا بھی صدقہ کروانے کے چکر میں ہوں۔

فوزیہ ثمر.... ہم نے بھی اس بار اپنی زنجیریں لکھ دی ہیں.... ارے ہم تو خط ہی اتنی مشکل سے لکھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں کسی کو ہمارا جنون نہیں بھاتا۔ بچے کہتے ہیں ممی کا دل ہی نہیں بھرتا.... "بنت حوا" تمہیں میری کہانی پڑھ لینی چاہیے۔ یا پھر میرے گھر آکر میری نصیحتیں اور تقریریں سن لو.... میں کہتی رہتی ہوں گھر میں سادگی لاؤ۔

سامان کم کرو۔ رسمیں ختم کرو اور بس ہر پل توبہ کرو اور نماز قرآن کتابیں اور جو مل جائے کھالو باسی واسی۔ بہت خوشی کہ تمہیں ربیع ثمر نام پسند آیا۔ مگر مہنگائی ہوگی۔ اسے نمازی ہیرو بنانا۔ آگے ہی اس کی ماں اسے لولی کارٹون بچے دکھا کر چپ کرواتی ہے۔ بعد میں لوگ مجھے کہیں گے' بے بے دیکھ تیرا منڈا بگڑی جائے۔

زندگی تنویر.... سچ ہے پابندیاں ہم پر بھی بہت ہیں۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ بشریٰ ایمان....

لوگ تو پیڑ ہوا کرتے ہیں
سبز رکھو تو دعا دیتے ہیں

ثمینہ جی شکریہ۔ شکریہ کروڑ بار۔ کہانیاں سب ایک سے بڑھ کر ایک مگر فرزانہ کھرل.... پیار کا دوسرا شہر بازی لے گیا ہے۔ ایوارڈ یافتہ تحریر' بہت پر تاثیر قلم کی مالک ہیں۔ اک مکمل سبق لڑکیوں کے لیے۔ دیکھو۔ سنو' مسلمان بچیوں کو تو اس سے مضبوط ہونا چاہیے۔ ہیرو کے ساتھ پھرنا بھی نہ چاہیے.... عورت گھر کی چار دیواری میں ہی اچھی لگتی ہے۔

ج : پیاری کوثر! کہتے ہیں' خط آدھی ملاقات ہوتی ہے لیکن آپ کے خط پڑھ کر تو لگتا ہے جیسے آپ سے روبرو ملاقات ہوگئی۔ آپ ست الوجود ہیں نہ کاہل بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اتنی ذمہ داریاں جس خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہیں' اس کے لیے داد کی مستحق ہیں اور جو چیز آپ کی ہمیں اچھی لگتی ہے وہ آپ کی سادگی اور دوسروں کے لیے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دیورانی کی مغفرت فرمائے آمین

ریحانہ چوہدری نے مدد کے سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

پہلی شعاع میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ جانے کیوں آپ کے خیالات سے کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ آپ کی ہر بات حرف بہ حرف درست لگتی ہے اسے تعریف ہی سمجھے گا (خوشامد نہیں)۔ اب آتی ہوں شمارے کی طرف حمد و نعت کی تو کیا بات ہے۔ پیارے نبی کی پیاری باتوں میں ایک بہن کی فرمائش پر بیماریوں کی اقسام اور ان کے علاج کا بیان بہت ایمان افروز ہے۔ جنید جمشید کی شہادت کے بعد ان کی یادیں اور باتیں شیئر کرکے آپ نے ان سے محبت کا ثبوت دیا۔ اچھا لگا۔ دستک میں سنیتا مارشل اچھی لگی جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے میں ڈاکٹر ص۔ م نے لیہ سے جوابات ارسال کیے۔ بہت ہی اچھا لگا۔ ایک بہو کا اپنی ساس کو خراج تحسین پیش کرنا۔ عفت سحر طاہر آپ نے "خواب شیشے کا" میں مہرو کا خواب توڑا اس کی کرچیاں پتا نہیں کس کس کی آنکھوں میں چبھو دیں مگر کچھ لوگوں کی آنکھیں پھر بھی نہیں کھلیں۔ یا اللہ سمیرا حمید کے قلم کو اور اور بہت زیادہ روانی اور فصاحت عطا فرما۔ ہر تحریر ہی پہلے سے بڑھ کر۔ عندلیب زہرا کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ واہ شہرزاد کی کیا بات ہے۔ "سیاہ حاشیہ" کی طرح اب شہرزاد میں بھی اپنے قاری کو اپنے ساتھ باندھنے اور اپنے سحر میں جکڑنے کی پوری صلاحیت موجود ہے' شاعری میں احمد مشتاق کی شاعری نے بہت متاثر کیا۔

پیاری ریحانہ! ہمیشہ کی طرح آپ کا خط بہت اچھا لگا اور ہمیں کب انکار ہے 12 صفحات کے خط پڑھنے پر' بے شک ہم آپ کی رائے کے منتظر رہتے ہیں اور پورا خط

Downloaded From http://paksociety.com

پڑھتے ہیں۔ لیکن ہمیں کہانیوں اور افسانوں کے لیے بھی تو جگہ چاہیے ہوتی ہے' اس لیے آپ لوگوں کے خطوط کے بعد جو جگہ بچتی ہے اس میں آپ لوگوں کی تفریح طبع کا اہتمام کرتے ہیں۔

امتل آپ کی دعاؤں کے لیے شکریہ کہہ رہی ہیں۔

مبشرہ سلیم نے نوشہرہ سے لکھا ہے

"خواب شیشے کا" میرا فیورٹ کردار مہراہ۔ بہت برا ہوا اس کے ساتھ' صائمہ اکرم "شہرزاد" کے ساتھ چھا گئیں "پیار کا دوسرا شہر" فرزانہ کھرل بہت پیارا تھا۔ اب آتے ہیں میرے موسٹ فیورٹ "شہر خطا" کی طرف اُف عنایا مر گئی۔ وہ چینی کی گڑیا مر گئی۔ اپنی زندگی میں کوئی بھی خوشی دیکھے بنا وہ اس ظالم دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی "عہد سکوت" سمیرا حمید ویل ڈن باقی تمام افسانے ہٹ تھے۔ جنید جمشید کے بارے میں اچھا لگا "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ڈاکٹر ص۔ م پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ دنیا میں اچھے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بشریٰ گوندل بجائے ناول ناولٹ کے خط میں نظر آئیں مگر پھر بھی اچھی لگیں۔ پلیز فرحت اشتیاق' فائزہ افتخار' کنیز نبوی' مریم عزیز یہ سب کہاں ہیں۔ سیدہ حنا بخاری آف دیپال پور دنیا کی بھیڑ میں گم ہی ہو گئی ہیں پلیز موسم کے پکوان میں سینڈوچ بنانے کا طریقہ ضرور دیں اور پیٹ کم کرنے کا کوئی طریقہ بھی۔

ج : پیاری مبشرہ! خط تو ہم آپ کا جب پڑھتے نا جب وہ ہمیں موصول ہوتا اور یہ لکھائی تو کوئی مسئلہ ہی نہیں' جب کیمسٹ حضرات ڈاکٹرز کی تحریر پڑھ لیتے ہیں تو کیا ہم آپ کی لکھائی نہیں پڑھ سکتے۔ یہ تو ان سے ہزار درجے بہتر ہے۔ آپ کی فرمائش پر سینڈوچ بنانے کی ترکیب حاضر ہے۔ پرچے کی پسندیدگی اور تبصرے کا شکریہ۔ کشمالہ اور ہادیہ کو پیار اور دعائیں۔

آسیہ فرید نے جیوے والا ملتان سے لکھا ہے

پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں' آپ سے پوچھنا تھا کہ یہ تلبینہ یعنی حریرہ کیا چیز ہے مجھے ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔ پلیز اس کے بارے میں بتا دیں۔ نایاب جی کا "شہر خطا" پڑھا بہت زبردست' عنایہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اتنی جلدی آخری قسط۔ روبا کہاں گئی؟ خواب شیشے کا بھی بہت اچھا ناول ہے مہراہ کی حالت زار پر بہت دکھ ہوا۔

شہرزاد بے حد خوب صورت ناول بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ افسانے ابھی پڑھے نہیں۔

ج : بہن آسیہ! تلبینہ دلیے کو کہتے ہیں۔ یہ گندم سے بنتا ہے اور جو سے بھی بنا سکتے ہیں۔

کنیز فاطمہ نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

خواب شیشے کا ـــــ بھئی عفت آپ نے تو کمال کر دیا۔ زہر لگتا تھا طلال مجھے (بھئی موحد کا رقیب جو ٹھہرا) اچھا ہی ہوا۔ اس کی شادی تزئین کے ساتھ ہو گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ موحد کی مشکوک حرکتیں یہی ظاہر کرتی ہیں کہ مہو کا نکاح موحد سے ہی ہوا ہے۔ اب دیکھو 'عفت جی یہ راز کب فاش کرتی ہیں۔

اب آتے ہیں "شہر خطا" کی طرف۔ نایاب نے جادو کو کچھ زیادہ ہی پروموٹ کیا ہے بھئی ایسے تو نہیں ہوتا کہ جادو سے کسی کی زندگی ہی تباہ ہو جائے انسان کو وہی ملتا ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ایسی کہانیاں نہیں لکھنی چاہئیں ہم لوگ اپنی خطاؤں اور غلطیوں کا خود ذمہ لینے کے بجائے کہیں اور تھوپنا زیادہ آسان سمجھتے ہیں۔ مثلاً" سازش' جادو وغیرہ آپ کے پرچے تو اندھیرے میں چراغ کا کام کرتے ہیں۔ بہت سی زندگیوں کو سیدھے راستے کی طرف لانے کی وجہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین اور پوزیٹو سوچ کے ساتھ انسان بڑی سے بڑی آزمائش سے با آسانی نکل سکتا ہے۔

باقی دکھ اور تکالیف تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اب یہ انسان کی مرضی ہے کہ انہیں جادو سمجھے یا کچھ اور۔

ج : پیاری کنیز! آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے' جو کچھ ہوتا ہے 'اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ جادو یا عمل کچھ نہیں کر سکتے ہم نے اس ناول کو اسی لیے شائع کیا ہے کہ قارئین کو بتا سکیں برے عمل کرنے والے لاکھ کوشش کر لیں' کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ خود تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ دیا کا نام و نشان مٹ گیا۔ سارے عملیات کرنے کے باوجود وہ ناکام و نامراد رہی۔ رافع' فاتح اور انابیہ بالآخر زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ روبا اور افراہیم بھی آخر تک ساتھ رہے۔ انادیہ کے عمل انہیں جدا نہ کر سکے۔

عنبر عتیق الرحمٰن لاہور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

"رقص بسمل" پھر غائب ہے۔ سب بہنوں کے خط

Downloaded From http://paksociety.com

اب ہر دن خوبصورت

مکمل تحفظ
مکمل تازگی

GIRL TALK

f facebook.com/GirlTalk.by.Butterfly

Downloaded From http://paksociety.com

بہت اچھے لگے۔ خط آپ کے میں تفصیلی اور تنقیدی تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں اور سب سے پسندیدہ چیز آپ کے شوخ و چنچل جوابات ہیں۔ ویسے تو سب جوابات اچھے لگے لیکن ڈاکٹر طاہرہ جیلانی کو دیا جانے والا جواب دلچسپ ترین تھا۔ خط آپ کے' کے صفحات بڑھادیں مزید بشریٰ ایمان کا خط پڑھ کر ان کی منفی ذہنیت سے بہت دکھ ہوا۔ "خواب شیشے کا" عفت سحر بہت خوب صورتی سے ناول کو آگے بڑھارہی ہیں۔

سمیرا حمید کی تحریر اچھی تھی۔ بہت اچھی تھی۔ نسوانی انا' نسوانی غیرت اور نسوانی جذبات کو (اور سچ کہوں تو مردانہ بے غیرتی کو) اجاگر کرتی ایک خوب صورت تحریر ہے۔ "شہر خطا" میں اس بار سب کے ساتھ بہت برا ہوا۔ ایک عورت کی منفی ذہنیت نے کتنے دلوں کو اجاڑ ڈالا۔ شبانہ شوکت کا ناول اچھا تھا۔ لیکن ڈاکوؤں کا حملہ' انٹیلی جینس کی نوکری' معذوری سے ہیرو کی ماں کا دل پسیجنا وغیرہ فلمی سا لگا۔ ام ایمان قاضی نے بہت خوب صورتی سے اس بات کی وضاحت کی کہ جو انسان کے نصیب میں ہو' وہ اسے ضرور ملتا ہے۔ صائمہ اکرم کا نیا ناول بہت اچھا لگ رہا ہے۔ درشہوار کا کردار بہت بروست ہے۔

فرح بخاری کا ناولٹ اچھا لگا۔ فردوس باجی کا کردار متاثر کن تھا۔ اس طرح کی تحریریں ضرور شائع کیا کریں جس سے سب بیٹیوں کو سبق ملے۔

فرزانہ کھرل کی تحریر کا عنوان پڑھ کر بے اختیار چاچا جی (مستنصر حسین تارڑ) کا "ریت کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا پہلا شہر" یاد آگیا۔ لیکن ایک بات کہ تحریروں میں تمثیلاتی انداز بہت بہت برا لگتا ہے۔ اتنی طوالت بری لگتی ہے۔ ہمیں اگلی بات' اگلا موڑ جاننے کی جلدی ہوتی ہے۔ ادھر یہاں رقص کررہی ہیں تو کبھی سازبج رہے ہیں۔ کبھی قافلے کوچ کررہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ کتنی بہنوں کو تو اس کی سمجھ بھی نہیں آتی۔ سب افسانے بھی اچھے لگے۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح زبردست تھے۔ پڑھ کر لطف اٹھایا۔ اس مرتبہ کا ناتا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ بھرپور بلکہ کھرے کھرے تبصرے پڑھ کر بہت لطف آتا ہے اور اپنی کم الفاظی کا احساس ہوتا ہے۔

ج : پیاری عنبر اچھ صفحات پر مشتمل آپ کا "کم الفاظی کے احساس" پر مبنی خط پڑھا۔ بہت لطف آیا۔ امید ہے، آپ کی تجاویز ہماری لکھاری خواتین کی نظر سے ضرور گزریں گی۔ آئندہ بھی آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے۔

انادیہ کے بارے میں آپ کی رائے زیادہ ہی خراب ہے لیکن یہ بھی یاد رکھیں کوئی انسان برا نہیں ہوتا۔ حالات اسے برا بنا دیتے ہیں' انادیہ ایسی کیوں بنی؟ اس کا بچپن ظالم اور سفاک دادی' بے حس باپ اور ذہنی معذور ماں کے سائے میں گزرا۔ ماں کو اپنی خبر نہیں تھی۔ بچی پہ کیا توجہ دیتی' دادی ظالم اور سفاک ہونے کے ساتھ ساتھ چالاک بھی تھی اور باپ بے حس' وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اتنا تشدد اور زیادتی ہوتے دیکھ کر بھی خاموش رہتا تھا۔

پھر آپ تائی صاحبہ یعنی افراہیم کی والدہ کا کردار دیکھیے' انادیہ کی دادی ان کی بھی ساس تھیں۔ کبھی انہوں نے اپنی ساس کی خبر لی' ان کی کوئی خدمت کی؟ انادیہ کی ماں ظلم و تشدد کا شکار ہو کر مرگئی۔ کبھی انہوں نے اسے اس ظلم سے نہیں بچایا۔ پھر اس کے مرنے کے بعد معذور دادی کی دیکھ بھال بھی انادیہ کے سپرد کردی جبکہ وہ ایک کم عمر لڑکی تھی۔ سوتیلی ماں کے مرنے کے بعد سوتیلی بہن کی پرورش بھی انادیہ نے کی اور وہ سگے تایا زاد افراہیم صاحب جنہیں دادی سے بہت ہمدردی تھی۔ وہ انادیہ کو تو تلقین کرتے۔ کبھی خود دادی کا کوئی کام نہ کیا۔ انادیہ کی ماں کے مرنے کے بعد کم از کم تائی کو اپنی ساس کا خود خیال رکھنا تھا۔ پھر افراہیم جو ایک پڑھا لکھا اعلا افسر تھا' اس نے ایک کمزور لڑکی پر ہاتھ اٹھایا۔ بے غیرتی اور بے شرمی کی انتہا ہے۔ انادیہ نے ایک بار اپنی غلطی کا احساس ہونے پر کاشف کی والدہ سے معافی چاہی بھی لیکن انہوں نے معاف نہیں کیا حتیٰ کہ ماں باپ اکلوتے بیٹے کاشف کی بیٹی پر بھی انادیہ کا تشدد دیکھتے رہے۔ لیکن اسے بچانے کی کوشش نہیں کی بلاشبہ انادیہ بہت خراب تھی لیکن اچھا کردار تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ رافع فاتح' افراہیم' تائی' کاشف کے والدین اور خود کاشف سب ہی نے غلطیاں کیں اور سزا بھی پائی۔

آمنہ زاہد نے (میاں چنوں) سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اتنے لمبے عرصے سے ہم شعاع سے منسلک ہیں۔ کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ ہم خط لکھیں اور آپ وہ شامل نہ

Downloaded From http://paksociety.com

کریں۔ ہم سروے بھیجیں تو اس کی طرح نگاہ الفت نہ کی جائے۔ ہم نے سال نو کا سروے بھیجا تھا' خط لکھا تھا۔ اس سے پہلے "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں بھی سروے بھیجا تھا۔ مگر مجھے آپ سے کہنا ہے کہ "ناتا" والا سروے آپ کو شامل کرنا ہو گا گلے شکوے اپنی جگہ۔ آپ کا اور ہمارا یہ پرچا تو بہت شاندار اور اعلیٰ ہے۔

ج : پیاری آمنہ! اب آپ کا خط لیٹ ملے تو ہم کیا کریں' خیر اب خواتین کے سالگرہ نمبر کے سروے میں شامل ہو جائے گا۔ اور بھئی سچ مانیں تو پرچے پر صرف اور صرف آپ قارئین کا ہی حق ہے۔ ہماری کیا مجال کہ آپ لوگوں کی کسی چیز کو رد کریں مگر بقول شاعر "انسان کے نصیب میں مجبوریاں بھی ہیں۔"

اور نگی ٹاؤن کراچی سے مہناز یوسف نے شرکت کی ہے۔ لکھا ہے

"خط آپ کے" بہترین سلسلہ ہے۔

آآآآآ آیہ کیا؟ آپ نے مریم فاطمہ کے خط کے جواب میں کیا کہا؟ "پرچا آپ بے شک پورا نہ پڑھیں لیکن سلسلہ وار ناولوں کی اقساط ہر ماہ پڑھ لیا کریں۔" اللہ اللہ یہ تو آپ نے باقی افسانوں اور ناولوں کے ساتھ سوتیلی ماں والا سلوک کیا۔ آپ کو سلسلے وار ناولوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار شائع ہونے والے مہناز یوسف کے افسانے کو پڑھنے کی تاکید لازمی کرنا چاہیے تھی نا۔

ناظمہ زیدی نے مجھے یاد کیا۔ بہت شکریہ۔ اب ناظمہ کو کیا بتاؤں' پچھلے چند ماہ فیس بک کی محبت کی نذر ہوئے۔ فیس بک اپنی جگہ مگر ہر ماہ پہلی تاریخ آنے سے قبل شعاع کے آنے کا انتظار۔ شعاع آنے کی خوشی کا تو کسی سے مقابلہ ہی نہیں ہے۔

سب سے اچھا اور سب سے پیارا ناول اس وقت' خواب شیشے کا ہے عفت سحر بہت خوب صورتی سے اس ناول کو لے کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہر قسط نیا موڑ لیے بے حد دلچسپ ہوتی ہے۔

"شہر خطا" میں عنایہ کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ سب نے ہی عنایہ کے ساتھ غلط کیا۔ دیا نے' رافع نے' حتیٰ کہ فاتح نے بھی۔ سب سے زیادہ برا فاتح نے کیا۔ عنایہ کی موت سے بہت دکھ ہوا۔

شہرزاد بہترین آغاز ہے۔ سمیرا حمید کے لیے کیا کہا جائے' لگتا ہے کہ جیسے سمیرا' اردو افسانے کو نیا موڑ دینے چلی ہیں۔ بہترین' بہت عمدہ "عہد سکوت"

"پس آئینہ" کو دوبار پڑھا جب سمجھ آیا کہ آخر والا حصہ خواب تھا۔ اچھا افسانہ لگا "پس آئینہ" فرزانہ کھرل سے شکایت ہے کہ وہ ہر بار ہیروئن کو جدا کیوں کر دیتی ہیں۔ فرزانہ کی تحریر کا اختتام آنسوؤں کی نمی کے ساتھ پڑھا۔ "پیار کا دوسرا شہر" لفظ لفظ سے اس ناول پر کی گئی محنت عیاں تھی۔ بہت بہت داد کی مستحق ہیں فرزانہ کھرل۔

جنید جمشید کا انٹرویو پڑھ کر جہاز کے حادثے والے دن کی تکلیف دوبارہ محسوس کی۔ "اپنے حصے کا دیا" اور "پاک دل" زبردست افسانے۔ ام ایمان قاضی کا ناولٹ بہت خوب۔

پیاری مہ ناز! یہ شرارتی کارٹون ضرور فیس بک کی کارستانی ہو گی مگر ہمیں دیکھ کر یہ جو اس نے ایک آنکھ بند کی ہے نا.... اللہ اللہ.... یہ تو آپ ہی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ اے مسٹر کارٹون "کچھ شرم ہوتی ہے' کچھ حیا ہوتی ہے۔" اور قارئین! آپ ناولوں کے ساتھ ساتھ مہناز یوسف کا افسانہ ضرور پڑھیں اور ہمیں اپنی رائے بھی لکھیں۔ فرزانہ کھرل ہمیشہ ہی تو جدائی پر اختتام نہیں کرتیں۔ شاید آپ "چھپا کی چھٹی" کو بھول گئیں۔

خرو فاطمہ کبیر والا سے لکھتی ہیں

میں نے شعاع کا پرانا رسالہ پڑھا' مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے پہلی بار ایسا رسالہ پڑھا ہے۔ پہلے میں بچوں کے رسالے پڑھتی رہی ہوں۔ میں اس رسالے میں اشعار بھیجنا چاہتی ہوں۔

ج : پیاری فاطمہ! آپ ایک صفحے پر مختلف اشعار لکھ کر بھیج سکتی ہیں۔ اور کسی دوسرے سلسلے میں شرکت کرنا چاہیں تو ایک ہی لفافے میں مختلف سلسلوں کے لیے لکھ سکتی ہیں۔

ن۔ق نے لاہور سے لکھا ہے

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میں ڈاکٹرس۔ م لیہ کا سروے پڑھا' یقین ہی نہیں آیا کہ یہ اسی دنیا کے باسی ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے والے۔ انہوں نے اپنے پولیس والے میاں کا حال نہیں لکھا اتنی نیک ماں کا

Downloaded From http://paksociety.com

بیٹا ہی یقیناً" نیک ہی ہو گا اور پولیس کی برائیوں کی بہتی گنگا میں یقیناً" ہاتھ نہیں دھوئے ہوں گے جب سے ہوش سنبھالا ہے شعاع اور خواتین کا ساتھ ہے اب تو بڑھاپے کی دہلیز پر ہوں لیکن خط پہلی دفعہ لکھ رہی ہوں۔

[illegible] ن-ق! شعاع اور خواتین کے ساتھ اتنی لمبی رفاقت میں پہلی بار خط لکھا اور تبصرہ صرف "ناتا جوڑا" پر [illegible]۔ باقی پرچے کے بارے میں کیا رائے ہے؟ امید ہے وقت نکال کے ضرور اپنی رائے سے آگاہ کریں گی۔

[illegible] ندیم نے گوجرانوالہ سے شرکت کی ہے "لکھا ہے"

[illegible] تحریریں ہیں جنہیں پڑھ کر دل چاہا کہ تبصرہ [illegible] لیکن پھر اپنی سوچ کے مطابق "خط آپ کے" میں [illegible] دل خوش ہو جاتا کہ میں نے بھی تو ایسا ہی سوچا تھا۔ لیکن آج میں نے جب "خط آپ کے" میں ایک بہن بشریٰ ایمان کا خط پڑھا تو یقین کریں میرا تو خون کھول گیا۔ مجھے [illegible] آیا اور میں نے قلم اور کاغذ اٹھایا اور خط لکھنے کی جرأت کر ڈالی۔ تو میڈم ایمان صاحبہ! جن عورتوں سے تم ملی ہو ان کے حالات تم جانتی نہیں۔ ان کے آنسوؤں' ان کی تکالیف کا تم کیسے مذاق اڑا سکتی ہو۔ ان کو ڈرامہ باز کیسے کہہ سکتی ہو۔ ان کو تم مکار عورتیں کہہ رہی ہو۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں' وہاں آج بھی مڈل کلاس گھرانوں کی سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ رات بارہ بجے ماں [illegible] پیٹ میں درد ہو اور بیٹا ماں کو ہسپتال لے جائے تو وہ نیک [illegible] اور بیٹی ہے۔ بہن کو لے کر جائے تو فرماں بردار ہے بیوی کو لے کر جائے تو زن مرید ہے (تھلے لگا ہے) بیوی کو [illegible] کہا جاتا ہے کہ لو بھلا ذرا سا پیٹ میں درد ہی تو تھا [illegible] اور ایمان جی آپ نے لکھا کہ آج کل کی لڑکیاں [illegible]

[illegible] کہ بس میاں مٹھی میں .... حقیقت یہ ہے کہ [illegible] بھی یا بہو کے ورغلانے سے پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ ماں [illegible] بہن کے شکووں سے پیچھے ہٹتا ہے۔ شادی سے پہلے [illegible] بڑی خطائیں بھی معاف لیکن شادی کے بعد تو چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی ناقابل معافی سمجھی جاتی ہے۔ ہم [illegible] بڑا نہیں کرتے جو لڑکی اپنے تمام رشتے چھوڑ کر ایک شخص کی خاطر آتی ہے تو ہم کیوں یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک شوہر کے علاوہ سب کو خوش کرے۔

پیاری جویریہ! ہمیں یہی ڈر ہے کہ بات کہیں واقعی لمبی نہ ہو جائے۔ بشریٰ کے خیالات شائع کیے تھے تو وہ ان کا تجربہ تھا۔ یہ آپ کا تجربہ ہے۔ اور ہمارا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس سلسلے کو یہیں روک دیا جائے۔ کیونکہ بات چل نکلی تو پھر بہت دور تک جائے گی۔ ویسے بھی ہم نے بشریٰ کو جواب دے دیا تھا جو ہمارے خیال میں کافی ہے۔

سحرش مصطفیٰ نے میانوالی سے لکھا ہے

شعاع اور خواتین کی کہانیاں بہت عمدہ اور دلچسپ ہوتی ہیں نیز "جب تجھ سے ناتا جوڑا" کا عنوان بہت زبردست ہے۔ لگ رہا ہے ناول شہزاد بھی یقیناً" ٹاپ پہ چلے گا۔ "خواب شیشے کا" میں مہرماہ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

میرا بھی کہانیوں پہ تبصرہ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں خط پوسٹ کرانے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ میں نے آپ کے ادارے کو بہت سے خطوط اور چھ افسانے بھیجے تھے۔ جن میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ اور مجھے یقین ہے' آپ گاؤں اور شہر میں فرق کیے بنا لوگوں کی صلاحیت کو مد نظر رکھتے ہوں گے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا" میں میری امی جان کی آپ بیتی ہے۔ ویسے تو وہ بہت کم رسالے وغیرہ پڑھتی ہیں۔

ج: پیاری سحرش! تحریر کو منتخب کرتے ہوئے نہ ہم گاؤں دیکھتے ہیں نہ شہر صرف تحریر کا معیار مد نظر رکھتے ہیں۔ آپ کی تمام کہانیاں ہم نے پڑھ لی ہیں۔ آپ نے بہت ڈپریسڈ اور نصیحتوں بھری کہانیاں لکھی ہیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ کسی ہلکے پھلکے موضوع پر لکھیں اور دیر سویر کا نہ سوچا کریں جب سہولت ہو' ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کر دیا کریں۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا سلسلہ ضرور شائع کریں گے۔

اقراء الیاس نے مرید کے ضلع شیخوپورہ سے لکھا ہے

مصباح علی اور ایمل رضا ان دونوں رائٹرز کا شمار میری فیورٹ رائٹرز میں ہوتا ہے سب سے پہلے سلسلے وار ناول میں سے "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر کا پڑھا' نایاب کا ناول "کوئی چاند رکھ میری شام پر" مجھے آج تک نہیں بھولا "شہر خطا" بھی ان کی بہترین کاوش ہے جس میں نایاب جیلانی بہت اچھے طریقے سے اپنے الفاظ کا جادو بکھیر رہی ہیں اور اس ماہ کے سب افسانے بہت اچھے تھے "کمال

Downloaded From http://paksociety.com

سینے کی جلن، بد ہضمی اور تیزابیت سے نجات

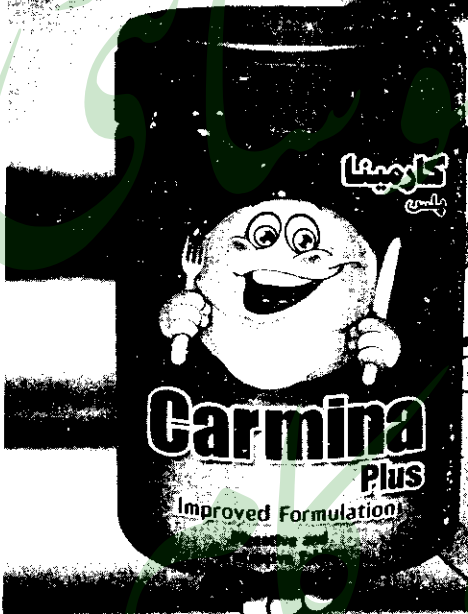

کارمینا پلس سے سب ہضم

افاقہ نہ ہونے کی صورت میں معالج سے رجوع کریں۔

Downloaded From http://paksociety.com

ضبط" اور "سوچنے کی بات" ہم قارئین بہنوں کے لیے اچھا سبق تھی۔

ج : پیاری اقراء! افسانہ یا ناول بھجوانے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں۔ آپ کو جب بھی سہولت ہو' آپ بلا جھجک ہمیں بھجوا دیں۔ افسانے ای میل کرسکتی ہیں لیکن سلسلوں کے لیے آپ بذریعہ ڈاک اپنی نگارشات بھیجیں۔ صفحے کے ایک طرف لکھنا ضروری ہے۔ دوسری طرف کچھ نہ لکھیں اور جو کچھ ہمیں بھیجیں اس کی ایک کاپی ضرور اپنے پاس رکھیں۔ ہم ناقابل اشاعت تحریریں واپس نہیں کرتے۔

فوزیہ شموٹ' مانیہ عمران' آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

سرورق ٹائٹل سو سو لگا۔ ماڈل کا آئی میک اپ بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ سب سے پہلے بہتر "شہر خطا" پڑھا ایک ناقابل فراموش داستان۔ ہر کردار مجھے تو سائیکو کیس لگا۔ تحریر بھی بڑی منفرد۔ دیا نے بہت ظلم کمایا اپنی بہن اور بیٹی کے ساتھ۔ اینڈ کا بے صبری سے انتظار ہے۔

سلسلے وار دونوں ناول بہت اچھے جا رہے ہیں۔ عفت اور صائمہ جی کا مزاح انداز ایک جیسا لگتا ہے۔ عفت جی ' کبھی ٹائم ملا تو آپ کے گھر میں نے آنا ہے جس ناول نے زیادہ متاثر بلکہ دکھی کیا' وہ پیار کا دوسرا شہر تھا۔ رامین کی محبت کو سلام' ہر بیٹی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ "ہوائے کشت وفا" معذرت کے ساتھ خاص پسند نہیں آئی۔ کہانی میں تھوڑا ڈرامہ نیچ اچھا نہیں تھا زندگی کے رنگ بھی سو سو لگی۔ افسانے اچھے تھے۔ "عہد سکوت" خوب تر تھا۔ سمیرا حمید کے کسی ناول کے منتظر ہیں۔ کسی انوکھی تحریر کے ساتھ آئیں۔

پہلی شعاع مسکراہٹیں بکھیر گئی۔ یخ بستہ ہواؤں میں سرما کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر جن سوغاتوں کا مدیرہ صاحبہ نے ذکر کیا ہے۔ کھانے کا پھر منگائی کا اعتراف بھی۔ لطف آیا آپی کی سادگی پر "پیاری نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح اچھی لگیں۔"

او کاڑہ کی ڈاکٹر جی کو تو آپنے لاجواب ہی کردیا۔ کچھ تو بھرم رہنے دیتیں ان کا اپنے میاں جی کے سامنے۔

ثمینہ جی بڑے دل کی بات ہے۔ کہ آپ شعاع دے رہی ہیں۔ ہم ابھی جب نئے گھر شفٹ ہوئے تھے تب عمران صاحب نے کہا تھا کہ رسالے فروخت کردو۔ اتنی جگہ نہیں۔ میں نے بھی مولا جٹ والی بڑھک ماری اور کہا جس نے بھی میری جائیداد کو ہاتھ لگایا' میں چھت سے کود جاؤں گی میرے ماموں کی بہو شائستہ طیب جب بھی گھر آتی ہے کہتی ہے باجی کچھ ڈائجسٹ دو پڑھنے کے لیے۔ میں وضو کرکے پڑھوں گی اور ہاتھ لگاؤں گی۔ میں اسے نہیں دیتی کہ پھاڑ دے گی یا گم کردے گی۔

آپ سے پوچھنا تھا۔ بنت حوا رائٹر ہے یا قاری۔ جس خط نے متاثر کیا وہ بشریٰ ایمان کا ہے اور آپ کے جواب نے بھی۔ اس سلسلے کو نندوں کے لیے بھی بنائیں۔

قسم سے چھلی دل کی دہائیاں ہم بھی سنانا چاہتے ہیں قارئین کو آئینہ خانے میں ارشد خاں کے متعلق سن کر حیرانی ہوئی۔ تقدیریوں بھی پلٹا کھا سکتی ہے۔ واہ کیا قسمت پائی ہے۔ اس لڑکے نے۔ اس ماہ کا بھی ناتا جوڑا اچھا تھا۔

ج : پیاری فوزیہ! تبصرے تو آپ کے بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ ویسے فوزیہ ہم اپنی قارئین کو ایک بات بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے جوابات اپنی قارئین سے محض دوستانہ بے تکلفی اور محبت کا اظہار ہوتے ہیں اس سے کسی کی دل آزاری اور دل شکنی ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔ بس جیسے دوست آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ ہم بھی اپنی قارئین کو دوست سمجھتے ہوئے کچھ باتیں کرلیتے ہیں۔

ناتا جوڑا ہے کا سلسلہ نندوں کے لیے بھی بنانے کی تجویز کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ آپ دیکھیے نا' نندوں کو تو رخصت ہو کر اپنے گھر چلے ہی جانا ہوتا ہے۔ وہ تو مہمان ہوتی ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے اگر کوئی بھاوج نند کے ساتھ برا سلوک یا رویہ رکھے ہوئے ہے تو اس کا قصوروار صرف بھائی ہے۔ بھاوج نہیں۔ بھائی اچھا ہو تو بھاوج کی کیا مجال ہے کہ وہ نند کو کچھ کہہ سکے۔

سدرہ احسان سمبریال ہدوکے سے شرکت کر رہی ہیں' لکھا ہے

آنٹی ریحانہ کوثر (ہدوکے) اپنے گاؤں کا نام اور وہ بھی آپ کے کام کے ساتھ خوشی سے اچھل پڑی۔ قارئین میں بھی اسی گاؤں کی ہوں۔ مجھے شعاع کی لت ریحانہ آنٹی سے ہی لگی۔ شعاع بالکل پرفیکٹ ڈائجسٹ ہے بس رائٹرز سے یہ کہنا ہے کہ پلیز عورت کو بہت زیادہ مظلوم نہ

Downloaded From http://paksociety.com

دکھایا جائے۔ ایمل رضا اتنا اچھا ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ''خواب شیشے کا'' بہت اچھا جا رہا ہے۔ مجھے جوائنٹ فیملی والے ناول جہاں بہت سارے کزنز مل جل کر رہتے ہیں بہت پسند ہیں۔ اب نایاب جیلانی آپ کی طرف آتے ہیں۔ آپ کے بہت سے ناول پڑھے۔ ہر ایک تحریر انوکھی اور لاجواب ہوتی ہے شہر خطا پڑھتے پڑھتے تجسس بھی بڑھتا گیا اور ساتھ ساتھ رونگٹے بھی کھڑے ہوتے گئے۔ انادیہ تو مجھے خوب صورت ڈائن لگی جو ہر ایک کا بطور خاص افراہیم کی فیملی کا خون چوس رہی ہے۔

میں نے ایم اے اردو پارٹ ون کے پیپرز دیے ہیں۔ میرے لیے خصوصی دعا کرنا پاس ہو جاؤں فوزیہ ثمر آپ اتنا جاندار اور بے لاگ تبصرہ کیسے کر لیتی ہیں کوئی ناول افسانہ ہی لکھ ڈالیں۔ میرا تو اتنا ناول کرتا ہے لکھنے کو۔

ج : پیاری سدرہ! پیپر آپ نے اردو کا دیا ہے اور خط میں جگہ جگہ انگریزی ٹھونس رکھی ہے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں' اور دعا اس وقت کارگر ہوگی جب آپ نے امتحان میں کچھ کارگزاری بھی دکھائی ہوگی۔ آپ نے اتنے مفت مشورے دیے ہیں' ایک مفت مشورہ ہم بھی دے دیں۔ آپ اردو میں ایم اے کر رہی ہیں تو تھوڑی سی اپنی لکھائی پر بھی توجہ دے لیں۔ یقین کریں کہ آپ کا خط بہت مشکل سے پڑھا ہے اگر ممتحن بھی ہمارے جیسی ''قابلیت'' کا حامل ہوا تو آپ سوچ لیں کیا ہوگا۔

رشیقہ کلثوم نے لکھا ہے

آج میں کن جذبات سے خط لکھ رہی ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانتی۔ بھری ہوئی بھی ہوں۔ اور بالکل خالی بھی .... کسی کھوکھلے کنویں کی طرح۔

ہر احساس سے عاری بھی .... اور احساس و جذبات کا ایک اُمڈتا ریلا آنکھ اور دل میں ہے .... اگر اس ریلے کو اپنے اوپر حاوی کرلوں تو میرے لیے سانس بھی مشکل کر دے۔ بہت رو بھی لیا اور رو رو کے تھک بھی گئی۔ رنج اب بھی ہے۔ درد پھر بھی باقی ہے۔ ہم انسانوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوتا۔ ہم کتنے بے بس ہیں۔ اور کتنے با اختیار.... کہ اپنی بے بسی پر ہنسی آتی ہے۔

اس گزرے سال نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ بہت برا۔ نہ نئے سال آنے کا مجھے ہوش رہا۔ نہ سال بیت جانے کا۔ اس سال نے میرے دادا کو بھی چھینا' نانا کو بھی اور اب جبکہ ان دو اموات سے میں سنبھل بھی نہیں پائی تھی۔ اس کا رسمبر جاتے جاتے میری ماں کو لے کر چلا گیا۔ ٹھیک ٹھاک خوش و خرم ہستی ماں کو۔

میری تمام قاری بہنوں سے گزارش ہے۔ تین بار درود پاک پڑھ کر ان کے لیے ضرور ہی ایصال ثواب کردیں۔

ج : پیاری رشیقہ! اللہ پاک آپ کی والدہ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر عطا کرے۔ والدین میں سے کسی ایک یا دونوں کا چلے جانا واقعی بے حد عظیم سانحہ ہوتا ہے۔ مگر رونے دھونے کے بجائے ان کی مغفرت و بخشش کے لیے دعائیں اور اعمال کریں کہ یہ جدائی عارضی ہے۔ ایک روز ہم بھی اپنے پیاروں سے جا ملیں گے۔ ان کے لیے اور سب کے لیے دعا کیا کریں۔ ایک بات اور 'نیا سال آپ کے لیے ایک خوشی بھی تو لایا ہے۔ یاد رکھیں زندگی میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

نوشین بخاری نے لیہ سے لکھا ہے

مجھے کچھ ناول درکار ہیں کتنی رقم ارسال کروں اور کتابیں مجھے کب تک مل جائیں گی۔

ج : پیاری نوشین! مکتبہ عمران ڈائجسٹ کا نمبر لکھ رہے ہیں۔ آپ انہیں فون کرکے جو کتابیں آپ کو درکار ہیں ان کی قیمت اور دیگر معلومات حاصل کرلیں۔ نمبر یہ ہے۔

021 - 3221261

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- نازیہ علی

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹوگرافی ---------- موسیٰ رضا

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما' ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

Downloaded From http://paksociety.com

آسمان سے آگے

واصفہ سہیل

قدم

رمیز راجا نے کرکٹ کھیلی پھر وہ کمنٹری کرنے لگے اور اب وہ اسی حوالے سے ٹی وی پر آتے ہیں۔ ٹی وی پر آتے آتے رمیز راجا اب فلم کے پردے پر بھی جگمگانا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے انہوں نے ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ جس کا نام "ٹور باز" ہے۔ جس کی کہانی بقول رمیز راجا انہوں نے خود لکھی ہے (آہم ۔۔۔ کیوں' کیا وہ کہانی نہیں لکھ سکتے ۔۔۔؟) رمیز راجا اس بارے میں کہتے ہیں کہ دس سال سے کوشش کر رہا تھا۔ فلم کی ڈائریکشن کے لیے انڈین ہدایت کار کو لیا ہے۔ جس نے فلم "جل" بنائی تھی (کیوں پاکستان میں آپ کو کوئی اس قابل نہ لگا جو آپ کی فلم کی ڈائریکشن دے سکتا؟) مرکزی کردار کے لیے سنجے دت (لو جی! اداکار بھی انڈین) کو لیا ہے اور ہیروئن کے کردار کے لیے ماہرہ خان (چلو کچھ تو پاکستانی ٹچ آیا) یا کترینہ

انکشاف

اداکارہ ایمان علی کا کہنا ہے کہ انہوں نے 2016ء میں سات فلمی آفرز مسترد کر دیں اور ان سب سے معذرت بھی کی۔ جو فلمیں مسترد کیں' ان میں ہمایوں سعید کی فلم بھی ہے۔ ایمان علی کا کہنا ہے کہ میں ہمایوں سعید کی فلم میں ہیرو کے گرد ڈانسنگ ہیروئن بننے کو ہرگز تیار نہ تھی۔ ایمان علی کا کہنا ہے کہ اگر انہیں اچھی فلمیں نہ ملیں تو وہ خود لکھنا شروع کر دیں گی۔ (پوری فلم یا صرف اپنا کردار ۔۔۔؟) اور ان دنوں وہ سنجیدگی سے ایک ناول لکھنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں (ہائیں! ناول' فلم نہیں؟) ایمان علی نے کہا کہ ماہ میر میں انجم شہزاد سے دوستی کی وجہ سے انہوں نے ایک چھوٹا کردار بھی قبول کر لیا تھا (ایمان علی! کردار چھوٹا بڑا نہیں ہوتا بلکہ ۔۔۔؟)

Downloaded From http://paksociety.com

کیف کو لینا چاہتے ہیں۔ (یعنی پھر....؟) رمیز راجا اس میں اداکاری کے ساتھ ساتھ معاون ہدایت کار بھی ہوں گے۔ (پرسانوں کی....؟)

محب وطن

پاکستان فلم انڈسٹری کے اداکار شان نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ بھارتی فلموں کو اگر پاکستان میں نمائش کی اجازت مل رہی ہے تو پھر پاکستانی فلموں کو بھی بھارت میں برابری کی سطح پر نمائش کی اجازت ملنا چاہیے (شان! آپ کی تجویز ایک محب وطن پاکستانی کی ہے لیکن کیا ہماری فلمیں اس قابل ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو بھارتی فلموں کی یہاں نمائش نہ ہوتی۔) حکومت کو برابری کی سطح پر اس معاملے پر بات کرنا چاہیے۔ (ایک محب وطن فنکار اسی طرح کی بات ہی کر سکتا ہے شان! مگر....؟)

سماجی تعلقات؟

اداکارہ ماورا حسین آج کل ایک ٹی وی ڈرامے "دھی" میں اپنے کردار کے بارے میں کہتی ہیں کہ "اب ہمارے ڈراموں کے ذریعے سماجی پیغامات زیادہ

بہتر انداز میں عام ہو رہے ہیں۔ (ماورا! پی ٹی وی کا پچھلا دور تو ان سماجی پیغامات سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن آج تک تبدیلی.... نہیں آئی ناں تو پھر....؟) اور مجھے خوشی ہے کہ میں بھی اس کا ایک حصہ ہوں' کیوں کہ ایک فنکار انفرادی طور پر سوشل ورک نہیں کر سکتا۔ جو کسی با مقصد ڈرامے کی ٹیم کا حصہ بن کر کر سکتا ہے۔ (اچھا تو جو آپ کر رہی ہیں اسے سوشل ورک کہتے ہیں۔)

ادھر ادھر سے

☆ امریکی شہر شکاگو کے بارے میں بارک اوباما نے کہا تھا میرا تعلق شکاگو سے ہے، 'تم مجھے نہیں توڑ سکتے' اس شہر کے لیے یہ بھی مشہور ہے کہ شکاگو سے محبت کرنے کا مطلب ہے اس عورت سے محبت کرنا جس کی ناک ٹوٹی ہوئی ہو۔

(اعجاز منگی.... آواز حق)

☆ عمران خان کا عدالت میں بیان کہ اپوزیشن کا کام الزامات لگانا ہے، 'ثابت کرنا عدالت کا کام ہے' انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ عمران خان شاید کیلی فورنیا کی ایک عدالت کے فیصلے کو بھول گئے ہیں۔

(میاں منیر احمد.... کچہری)

Downloaded From http://paksociety.com

امت الصبور

اودھ کی بیگمات

نصیرالدین حیدر شاہ اودھ کا عہد دولت، عیش و عشرت کے لیے ضرب المثل ہے۔ اس کے زمانے میں ادنیٰ سے لے کر اعلا طبقے تک کے لوگ خوش حال تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ محاصل سلطنت کے چودہ کروڑ روپیہ نواب سعادت علی خاں کا ترکہ خزانے میں جمع تھا۔ علاوہ بریں ملک اس زمانے میں قحط وغیرہ سے پاک تھا۔ اسی دولت اور خوش حالی کی وجہ سے لکھنؤ کمال اور متلاشیان روزگار کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس وقت اکثر اہل یورپ و شہزادگان دہلی، لکھنؤ آتے تھے اور بادشاہ کی فیاضی سے فائز المرام ہوتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ میں جو بڑے بڑے عالی شان محل ہیں، وہ اسی عہد کے تعمیر کردہ ہیں۔ اگر تحقیق کریں کہ ان کے بانی کون تھے تو معلوم ہوگا کہ وہ ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے اور ان کی تنخواہیں اتنی قلیل تھیں کہ مشکل سے آج کل دو تین آدمی اس میں زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ نصیرالدین حیدر کی فیاضی نے کچھ دنوں کے لیے اودھ میں غربت کا لفظ بے معنی بنادیا تھا اور اس کے دریائے جود و سخا سے سب چھوٹے بڑے سیراب تھے۔

بادشاہ نصیرالدین حیدر کی بیویوں کی تعداد تو کئی سو تک تھی۔ لیکن وہ اپنی دو بیگمات سے بہت زیادہ محبت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے لکھنؤ کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا اور اس زمانے کی سیاست کی کشتی ان ہی دونوں کے اشاروں پر چلتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں بیگمات کا نام تاریخ اودھ میں قیامت تک باقی رہے گا۔

ان دونوں کے نام یہ ہیں۔ اول ملکہ زمانیہ بیگم دوسری نواب قدسیہ بیگم۔

نواب ملکہ زمانیہ کا عروج ابتدائے سلطنت نصیر الدین حیدر میں زیادہ تھا۔ جنرل سلیمن ریذیڈنٹ لکھنؤ اپنی کتاب میں (جو حقیقتاً" باعث انتزاع اودھ ہوئی) اس بیگم کو اصلی فرماں روائے اودھ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بیگم اصل میں ایک کرمی کی لڑکی تھی۔ ایک شخص فتح مراد نے اس کو اپنے قرضے کے عوض میں اس کے باپ سے لے لیا تھا۔ فتح مراد کی بہن کرامت النساء نے اس کو اپنی بیٹی بنا کر پرورش کیا۔ جب دلاری (ملکہ زمانیہ کا پہلے یہی نام تھا) سن شباب کو پہنچی تو اس کی رستم نامی ایک شخص سے شادی کردی۔ ان دونوں نے آخر میں رستم نگر میں بود و باش اختیار کی۔ کیونکہ رستم خاں، نواب مجیب خاں کے یہاں جو اس وقت ایک افسر فوج تھے، ملازم تھا۔ اسی زمانہ میں دلاری کے دو اولادیں ہوئیں، ایک بیٹا تھا جس کا نام محمد علی رکھا گیا اور دوسری بیٹی جس کا نام زینت النساء تھا۔

دلاری کی اس زمانہ میں نہایت عسرت کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ آخر اس کے نصیب نے کروٹ بدلی اور نصیرالدین کے ——— محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا وہی منا جان تھا، جس کی تخت نشینی پر سیکڑوں جانیں ضائع ہوئیں اور وہ مدت العمر چنار گڑھ کے قلعہ میں بادشاہ بیگم کے ساتھ قید رہا۔ کچھ لوگ دایہ کی تلاش میں نکلے۔ خوش نصیبی نے ان کو دلاری کے گھر پہنچایا۔ جب دلاری محل سرائے شاہی میں داخل ہوئی۔ بادشاہ بیگم نے اس کو پسند کیا اور اطباء نے بھی اس کے دودھ کو مفید بتایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلاری ملازم ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی قدرتی خوبیوں نے بادشاہ کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔ اس نے بادشاہ بیگم سے

Downloaded From http://paksociety.com

اجازت لے کر اس سے نکاح کیا اور نواب ملکہ زمانیہ کے خطاب سے سربلند کیا۔

یہ بیگم بڑی عاقلہ اور دور اندیش تھی۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ کی قسمت اس کے ہاتھوں میں رہی۔ ہڑھ روا کا کل علاقہ اس کو جاگیر میں ملا' جس کی تحصیل چھ لاکھ روپے کی تھی۔ اس کے علاوہ بادشاہ کے انعام و عطا کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس کا بیٹا محمد علی ـــ جاہ کے خطاب سے سرفراز ہوا اور بادشاہ نے اس کو ولی عہد بنانے کی حتی الامکان بہت کوشش کی' لیکن گورنمنٹ نے منظور نہیں کیا۔ اس کی بیٹی زینت النساء کی شادی نواب ممتاز الدولہ سے ہوئی' جس میں تیس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے حکم دیا کہ سب عزیز و اقربا بیگم کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر دیں۔ سب نے طوعاً و کرہاً" حکم شاہی کی تعمیل کی۔ لیکن نواب نصیر الدولہ (یعنی محمد علی شاہ) کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بادشاہ کا یہ حکم وہ بجا نہ لا سکے۔ جب نصیر الدولہ تخت نشین ہوئے' بیگم بقید حیات تھی۔ اس کو اپنی سمدھن قرار دیا اور بہت مرتبہ اپنے یہاں بلایا' لیکن اس نے علالت کا ہمیشہ بہانہ کر دیا۔

حاصل یہ کہ اس بیگم کا انتہا درجہ عروج ہوا۔ یہ قدرتاً" بہت فیاض تھی۔ سیکڑوں' ہزاروں آدمیوں کی اس کے ذریعے سے پرورش ہوتی تھی۔ اس کی سخاوت اور سیر چشمی لکھنؤ میں ضرب المثل ہو گئی۔ زندگی بھر وہ بادشاہ سے مستغنی اولاد رہی۔ اس لیے ہر نوچندی کو درگاہ حضرت عباس جاتی تھی اور وہاں دس ہزار روپے صرف دسترخوان و نذر نیاز میں صرف کرتی تھی۔

اس بیگم کا 22 دسمبر 1843ء میں انتقال ہوا۔ لکھنؤ میں اس کا عالی شان امام باڑہ و مسجد اب تک موجود ہے۔

ملکہ زمانیہ کا یہ عروج بہت تھوڑے دنوں تک رہا۔ کیونکہ نواب قدسیہ بیگم کے آفتاب اقبال نے اس کے نصیب کی چمک کو ماند کر دیا۔ یہ بیگم بھی کوئی اعلا خاندان سے نہ تھی۔ یہ نواب ملکہ زمانیہ کے یہاں اول اول بطور کنیز کے ملازم ہوئی تھی اور فرائض پرستاری ادا کرتی تھی' لیکن اس وقت ملکہ زمانیہ کو کیا معلوم تھا کہ یہ ایک دن بادشاہ کی خوشی و مسرت کی روح رواں بن جائے گی اور عزت کی اس قدر بلندی پر پہنچے گی کہ وہاں سے میرا مرتبہ بھی بہت چھوٹا نظر آئے گا۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر سے اس کے تعلق کا دیباچہ یہ ہے کہ وہ ایک روز نواب ملکہ زمانیہ کے محل میں آئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ کچھ پیاس محسوس ہوئی اور آب خاصہ طلب کیا۔ اس وقت قدسیہ محل میں موجود تھی۔ فوراً" زریں پیالہ میں آب سرد حاضر کیا۔ بادشاہ نے پانی پی کر چند قطرے قدسیہ پر ڈال دیے۔ قدسیہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بادشاہ کو اس بے باکانہ حرکت پر غصہ آگیا اور کہا۔

"بادشاہ وقت سے یہ گستاخی؟"

اس نے فوراً" جواب دیا۔" کھیل میں بادشاہی اور غریبی کا ذکر کیا؟"

بادشاہ اس جواب معقول سے ساکت ہو گئے اور اس کی شوخی اور حاضر جوابی سے بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد سے جب اس محل میں جانے کا اتفاق ہوتا۔ اس سے ضرور باتیں کرتے تھے۔ آخر کچھ زمانے کے بعد اس سے شادی کر لی۔

قدسیہ محل انتہا درجہ کی حسین اور بہت سخت تھی۔ بادشاہ نے بیس لاکھ روپے صرف اس کے زیورات وغیرہ کے لیے عطا کیے تھے۔ چھ لاکھ روپے کی جاگیر تھی۔ اس کو پڑھنے لکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک مغلانی بیگم اس کی اتالیق تھی جو بہت لیاقت رکھتی تھی اور درسی تعلیم کے ساتھ اس کو امور خانہ داری اور کفایت شعاری وغیرہ کا بھی سبق دیتی تھی۔ حاصل یہ کہ یہ بیگم بڑی تعلیم یافتہ تھی۔ فہم و فراست بھی اس کو بہت زیادہ ودیعت کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے یہ سیاست میں بھی بہت زیادہ دخل دیتی تھی۔ وزراء اور اعلا عہدہ داروں کا تنزل اور ترقی وغیرہ اسی کے ہاتھوں میں تھا۔ سلطنت کے اہم امور میں اس کی

Downloaded From http://paksociety.com

رائے بہت زیادہ اثر رکھتی تھی۔ بادشاہ اس بیگم سے خاص محبت رکھتا تھا۔ شادی کے بعد اس نے ایک روز بادشاہ سے کہا کہ.....

"میں نے تین لاکھ روپے نہیں دیکھے ہیں۔"

اس نے فوراً" حکم دیا کہ مبلغ مذکورہ خزانہ عامرہ سے لایا جائے۔ آخر اس حکم کی تعمیل ہوئی اور تین لاکھ روپے کا ایک چبوترہ بنایا گیا۔ اس پر بیگم نے جلوس کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ روپیہ غربا میں خیرات کردیا جائے۔

اس بیگم کے مصارف بہت زیادہ تھے' کیونکہ شاہانہ سازوسامان سے بسر کرتی تھی اور ہزاروں لاکھوں روپے ادنیٰ باتوں میں خرچ کردیتی تھی۔ نواب ظفرالدولہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر وزیراعظم معتمد الدولہ اور نواب قدسیہ بیگم کچھ اور جیتے تو سلطنت اودھ ان کی فضول خرچیوں سے بک جاتی۔

قدسیہ بیگم بہت تند مزاج اور غصیل عورت تھی۔ اگرچہ بادشاہ اور اس میں انتہا درجہ کی محبت تھی' مگر کبھی کبھی لڑائی بھی ہوجاتی تھی۔ آخر اس کا یہی غصہ و غضب باعث ہلاکت ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بادشاہ اور قدسیہ محل بعد انقضائے ایام چہلم تفریح طبع کی غرض سے کوٹھی دل کشا میں گئے ہوئے تھے۔ ایک روز بادشاہ بارہ دری میں بیٹھے ہوئے تھے' دیکھا کہ کچھ بندر درختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اندر سے بندوق طلب کی۔ راجہ بختاور سنگھ بھی موجود تھا۔ اس نے بادشاہ کو اس حرکت سے منع کیا کہ بے وجہ کسی جان دار کو مارنا موجب نزول بلائے آسمانی ہوتا ہے۔ بادشاہ نے ہنس کر دو چار بندر شکار کیے اور محل سرا میں چلے گئے۔ وہاں جاتے ہی قدسیہ بیگم سے لڑائی ہوگئی' بیگم نے کہا۔

"ان شاء اللہ' یہ صورت صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔"

بادشاہ نے غصہ میں جواب دیا۔ "قول و فعل مختلف چیزیں ہیں۔"

بیگم نہایت درجہ غیور اور تند مزاج ثابت ہوئی' سنکھیا ہیکل میں رکھی ہوئی تھی' فوراً" کھالی۔ اس پر آب شورہ لیموں پی لیا اور چند دانے بھنے ہوئے بھٹے کے بھی کھالیے۔ تھوڑی دیر بعد خونی استفراغ ہوا' جس میں چند لخت جگر بھی نکل آئے۔ اسی کے ساتھ محل میں قیامت برپا ہوگئی۔ بادشاہ بھی دوڑے ہوئے محل میں آئے اور اشک حسرت و یاس برسانے لگے اور کہا کہ "اے بانوئے وفا' آخر تو نے اپنا کام تمام کیا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہاں! جو کچھ کہا' اسے کر دکھایا۔"

بادشاہ شدت غم سے وہاں دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ چکر والی کوٹھی میں' جو لکھنؤ سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے' چلے گئے۔

فوراً" اطبائے حاذق جمع ہوئے اور علاج میں حتی الامکان بہت کوشش کی گئی' لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر بیگم نے چوبیس سال کی عمر میں 15 ربیع الثانی 1250ھ میں انتقال کیا۔ اس خبر کے ساتھ شہر میں ہڑتال گئی۔ چالیس روز تک بادشاہ سے لے کر فقیر تک سیاہ پوش رہے۔ ارکان دولت' اقربائے شاہی' سب خاک بسر تھے۔ بہشت لکھنؤ ماتم سرا ہوگئی۔ رات کے وقت جنازہ نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اٹھا اور کربلائے نو تعمیر دفن بنایا گیا۔

بادشاہ بیگم کو بھی حد درجہ افسوس ہوا اور بوجہ جوش محبت مادری بغیر سیاہ لباس کے بادشاہ کے پاس چلی آئیں اور بہت تسکین و تشفی دی اور کہا کہ "خدا تجھ کو سلامت رکھے' ایسی سو بیگم تجھ کو مل جائیں گی۔" اس سے بادشاہ کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور کہا۔

"اگر آپ کو کچھ غم ہوتا تو سیاہ پوش ہوتیں۔"

بیگم نے جواب دیا "میں لباس سیاہ فقط عزاداری جناب سید الشہدا علیہ السلام کو پہنتی ہوں۔" اور یہ کہہ کر چلی گئیں۔

بادشاہ کے اب تمام باطنی جذبات غصے میں بدل گئے اور بیگم کو حکم دیا کہ وہ فوراً" محل سرا کو چھوڑ الماس باغ

Downloaded From http://paksociety.com

میں قیام کریں۔

انہوں نے جواب دیا کہ ..... "یہ عطیہ میرے شوہر کا ہے میں خالی نہیں کر سکتی۔"

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سپاہ بادشاہ پہنچی اور بیل داروں کے ذریعہ سے محل کھدوانا شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طرفین سے گولیاں چلنے لگیں اور دیر تک یہ طوفان بدتمیزی رہا۔ بیگم کی طرف کی حبشی عورتیں اور لونڈیاں ماری گئیں اور شاہی فوج کی بھی متعدد جانیں ضائع ہوئیں۔ حاصل یہ کہ اس سانحہ سے بادشاہ کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اکثر بیگم کے مدفن پر جایا کرتے تھے اور اس پر قطرہ اشک کے پھول چڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی ریذیڈنٹ صاحب بھی ساتھ ہوتے لیکن وہ قبر سے دور کھڑے ہوتے تھے۔ کئی مہینے تک بادشاہ کا یہی حال رہا اور امور سیاست کی مشین تو بالکل بند ہوگئی۔

اقربائے شاہی 'بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر بہت غمگین ہوئے اور سمجھے کہ جب تک اسی بیگم کی صورت اور سیرت میں مشابہ عورت نہیں ملے گی۔ بادشاہ کی حالت درست نہ ہوگی۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ اس کی بہن سے جو نواب الدولہ کی بیوی تھی۔ طلاق دلوا کر بادشاہ کی شادی کردی جائے 'مگر وہ عورت بھی بہت باوفا ثابت ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کی مفارقت قبول نہ کی۔ میر سید علی اس مہم عظیم کا بیڑا اٹھا کر روانہ کانپور ہوئے۔ آخر بہ ہزار جدوجہد نواب الدولہ سے طلاق دلوا کر اس کو لکھنؤ لائے۔ لیکن تب بھی وہ راضی نہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد اسے قید کیا' لیکن وہ قید خانے سے بھاگ کر کانپور اپنے شوہر سے جا ملی۔ (آفریں)

آخر بہ ہزار کوشش 'بادشاہ کی نسبت شادی پختہ ہوئی اور رجب 1250ھ میں تاریخ عقد معین ہوئی۔ رسم حنابندی ادا کی گئی۔ اس کے بعد محفل شاہانہ آراستہ ہوئیں۔ بزم کے گراں بہا ساز و سامان سے آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں۔ روپے کے مصارف کی کوئی انتہا نہ تھی۔ عروس کو خطاب "نواب بادشاہ جہاں ممتاز الدہر" عنایت ہوا۔

اس شادی کے بعد بھی بادشاہ کی کچھ حالت متغیر نہ ہوئی' کیونکہ ممتاز الدہر نو عروس سے ان کو نفرت ہوگئی۔ اس کی وجہ مورخین نے یہ لکھی ہے کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپے اور پینتالیس بدریاں' دوشالے و رومال و جامہ دار اور تھان ہائے لباس گرما۔ بیگم کو عنایت کیا کہ وہ اپنے متوسلین وغیرہ میں تقسیم کردے۔ بیگم تو دلہن تھی۔ یہ کام اس کی ماں کا تھا۔ لیکن اس نے اس میں تامل کیا۔ بادشاہ نے ایک روز جو اس کے متعلق پوچھا تو بیگم نے جواب دیا۔

"حضور! ہم آپ کا گھر بنانے کو آئے ہیں نہ کہ بگاڑنے کو....." اس پر بادشاہ کو بہت طیش آیا اور یہ کہہ کر کہ "تو کنگلی ہے 'کسی کو کیا دے گی۔" اٹھ کھڑے ہوئے۔

بیگم نے دامن پکڑا' لیکن نہ مانے اور باہر آکر راجہ غالب جنگ سے کہا کہ" ہم نے اس محل کو خطاب 'کنگلا محل" کا دیا" چنانچہ آج تک وہ اس نام سے مشہور ہے۔ یہ تھیں شاہان اودھ کی فیاضیاں جس کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔

اس کے بعد پھر بادشاہ نے نواب تاج محل سے شادی کی' اس کی جاگیر بہت بڑی تھی۔ اس کے ساتھ چھ ہزار ماہوار بھی جیب خرچ کو ملتے تھے۔

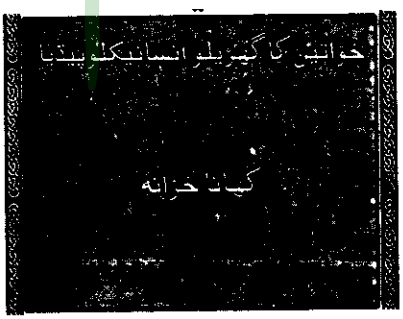

Downloaded From http://paksociety.com

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن سینڈوچز

اجزا :

چکن	آدھا کلو (ثابت رکھیں)
بند گوبھی	آدھا پھول
(لمبی لمبی باریک کٹی ہوئی)	
گاجر	تین عدد (کدوکش کرلیں)
شملہ مرچ	دو عدد
(بیج نکال کر باریک کاٹ لیں)	
ہری پیاز کے پتے	ایک پیالی
(باریک کٹے ہوئے)	
ڈبل روٹی بڑی	دو عدد
انڈے	چار عدد (سخت ابلے ہوئے)
سفید مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
چینی	ایک چائے کا چمچ
گرم دودھ	آدھی پیالی
مکھن	ایک پیکٹ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

چکن کو دھو کر ایک دیگچی میں تھوڑا پانی' ایک عدد تیزپات' نین چار کالی مرچیں اور تین لہسن کے جوے بغیر چھلے ہوئے ڈال کر ــــ ابال لیں' جب گل جائے تو نکال کر ہڈی سے گوشت الگ کرلیں اور ریشے کرلیں۔ ابلے انڈے چھیل کر چھوٹے ٹکڑے کرلیں پھر مکھن سبزیاں' کالی' سفید مرچ' چینی اور نمک اچھی طرح سے ملائیں۔ آدھی پیالی گرم دودھ ملا کر تھوڑی دیر کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اب ایک سلائس کے اوپر تیار کیا ہوا سینڈوچ کا آمیزہ لگائیں' اس کے اوپر خالی سلائس رکھیں آہستہ آہستہ سے دبا کر تیز چھری کے ساتھ چاروں کنارے کاٹ لیں پھر چار حصے کر لیں۔ بچوں کے لیے چھوٹے سائز کے سینڈوچ ہی صحیح رہتے ہیں۔

ٹوٹکا : سینڈوچ سلائس پر گرم دودھ لگانے سے سینڈوچ کئی گھنٹے نرم رہتے ہیں۔

دم کے کباب

اجزا :

گائے/بکری کی بوٹی	بغیر ہڈی کے ایک کلو
دہی	ایک پیالی
خشخاش پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچ
ہری مرچ	چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
تیل	آدھی پیالی
کچا پپیتا پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
کالی مرچ کٹی ہوئی	آدھا کھانے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
لیموں	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

سب سے پہلے بوٹی کو اچھی طرح سے دھو کر ایک جگہ پھیلا کر رکھ لیں۔ کسی بھاری چھری کے ساتھ ہلکا ہلکا کچل لیں پھر سارے مسالے اچھی طرح لگا کر دو سے ڈھائی گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں مسالا ملا ہوا گوشت اور تیل ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ جب گوشت کا پانی سوکھنے لگے اور گوشت گل جائے تو دم پر رکھ دیں' دس منٹ رہنے دیں' پھر ایک کوئلہ دہکا کر پیاز کے چھلکے کو بوٹیوں پر رکھ دیں' اس پر کوئلہ رکھ دیں اور اس پر ایک چمچہ تیل ڈال دیں۔ مزے دار بوٹی کباب تیار ہیں۔ گرم گرم پراٹھوں کے ساتھ

Downloaded From http://paksociety.com

پیش کریں۔

ہرے مسالے کی چکن

اجزا :

چکن	ڈیڑھ کلو
(بارہ ٹکڑے کروالیں)	
بغیر چھلے ہوئے لہسن کے جوئے	چھ عدد
ہری مرچ	آٹھ عدد
ان تینوں چیزوں کو ملا کر چٹنی پیس لیں	
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
پیاز	دو ڈلی۔(باریک کٹی ہوئی)
کٹی مرچ کٹی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
تیل	ایک پیالی
ہرا دھنیا	دو گٹھی
دہی	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	تین سے چار عدد

ترکیب :

چکن کو اچھی طرح سے نیم گرم پانی سے دھولیں پھر دہی، نمک، ادرک اور لہسن لگا کر ایک دیگچی میں بغیر ڈھکن ڈھانکے پکنے رکھ دیں۔ جب پانی سوکھ جائے تو اتار لیں۔ ایک دیگچی میں تیل ڈال کر گرم کریں اور پیاز ڈال کر سنہرا ——— کرلیں۔ جب گولڈن براؤن ہو جائے تو نکال کر کسی اخبار پر پھیلا دیں تاکہ خشتہ ہو جائے پھر پسی ہوئی چٹنی ڈال کر ہلکا سا تل لیں۔ اس میں ابلی ہوئی چکن ڈال دیں پھر کٹی کالی مرچ اور تلی ہوئی پیاز اور لیموں کا رس ڈال دیں۔ پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ دھیان رہے آنچ ہلکی رکھیں۔ گرم گرم سادہ چاول اور پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

بیسن اور سوجی کا حلوہ

اجزا :

بیسن	دو پیالی
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد (کچل لیں)
بادام پستے	حسب ضرورت (باریک کٹے ہوئے)
چینی	تین پیالی
گھی	آدھی پیالی
سوجی	دو پیالی
کش مش	دس عدد
تازہ دودھ	ایک پیالی
پانی	آدھی پیالی

ترکیب :

ایک دیگچی میں گھی گرم کریں۔ گرم ہو جائے تو الائچی ڈال دیں۔ خوشبو آنے لگے تو سوجی اور بیسن ڈال کر ہلکی آنچ پر اچھی طرح بھون لیں جب بھن جائے تو نکال لیں اب دیگچی میں چینی اور پانی ڈال کر پانچ منٹ تک پکائیں۔ شیرا بننے سے پہلے بھنی ہوئی سوجی اور بیسن ڈال دیں پھر سے بھونیں جب دونوں چیزیں پک جان ہو جائیں تو آخر میں دودھ ڈال کر جلدی جلدی چمچ چلاتے رہیں دو منٹ بعد اتار لیں حلوہ تیار رہے ایک تھالی میں حلوہ پھیلا کر ڈال دیں۔ پستے بادام سجانے کے لیے اوپر ڈال دیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو ٹکڑے کاٹ لیں۔ آپ حلوہ پکانے کے لیے تیل بھی استعمال کر سکتی ہیں۔

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ

کی جانب سے بہنوں کے لیے خوشخبری

خواتین ڈائجسٹ کے ناول گھر بیٹھے حاصل کریں

30 فی صد رعایت پر

طریقہ کار ناول کی قیمت کے 30 فی صد کاٹ کر ڈاک خرچ -/100 روپے فی کتاب منی آرڈر کریں۔

37 اردو بازار کراچی فون 32216361

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

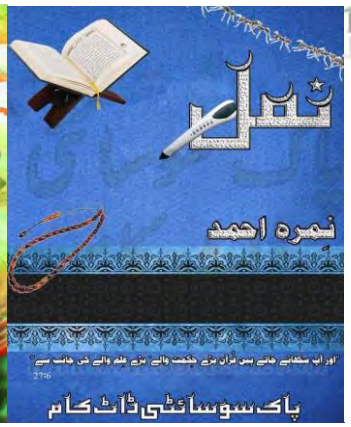

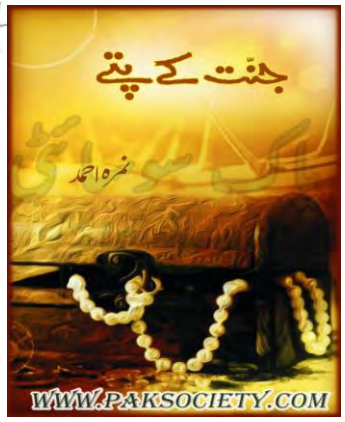

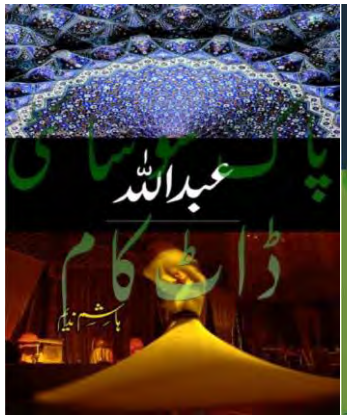

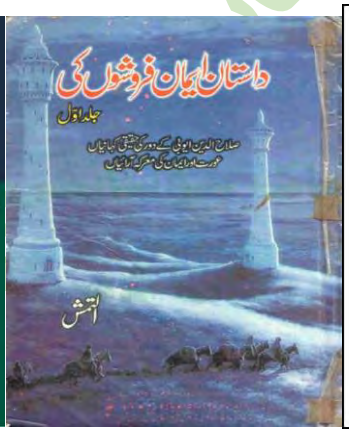

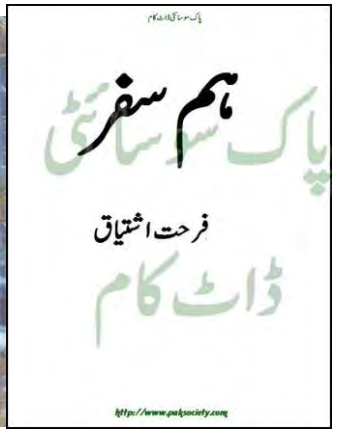

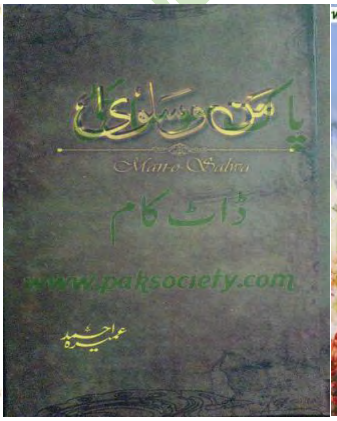

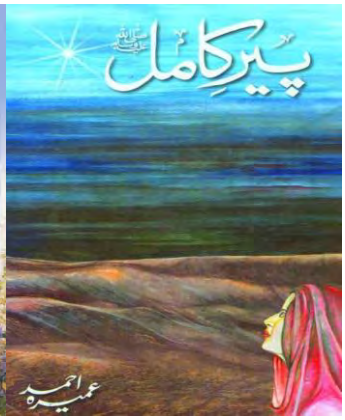

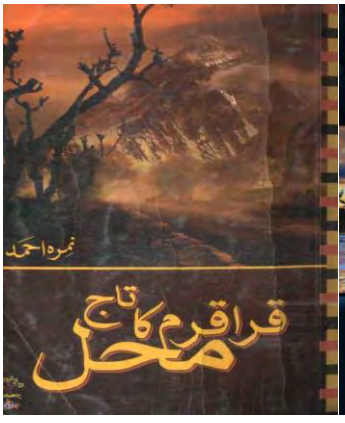

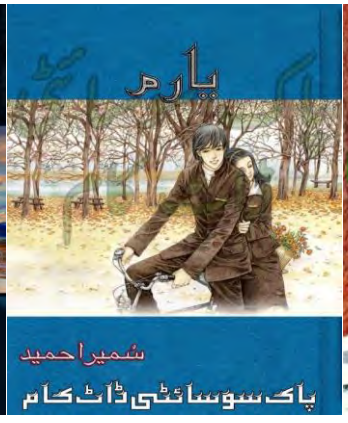

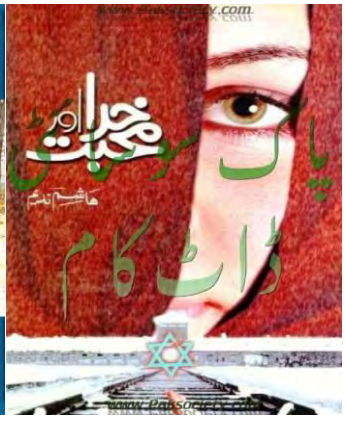

www.paksociety.com

ادارہ

خوب صورت بنیے

تھوڑی توجہ سے دلکش روپ پائیں

خوب صورت بننا یا خوب صورت کہلوانا ہر انسان کا فطری حق ہے۔ اگر آپ خوب صورت بننا چاہتی ہیں یا اپنے آپ کو نمایاں کرنا چاہتی ہیں تو ان مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کیجئے' ہم آپ کو اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ اگر آپ نے ان اصولوں پر عمل کیا تو آپ کا شمار بھی خوب صورت لوگوں میں کیا جانے لگے گا۔

1۔ رات کو ساڑھے نو یا دس بجے تک سو جائیں اور صبح پانچ بجے بے دار ہو جائیں۔

2۔ صبح کے وقت تقریباً" پچیس منٹ قریبی پارک یا گھر کے لان میں ننگے پاؤں گھاس پر چہل قدمی کریں۔

3۔ چہل قدمی سے فراغت کے بعد ایک گلاس بغیر ملائی کا دودھ پئیں۔

4۔ صحت مند رہنے کے لیے ورزش بے حد ضروری ہے۔ اپنی صحت اور طاقت کو مدنظر رکھ کر ورزش کے ان طریقوں کو اپنائیں جو آپ کے لیے مناسب ہوں۔

5۔ ورزش سے فراغت کے بعد غسل کرنا ضروری ہے' تاکہ آپ کو دن بھر تازگی اور راحت کا احساس رہے۔

6۔ صبح کا ناشتا ہلکا ہونا چاہیے۔ ایک کپ کم شکر کی چائے' ایک ہاف بوائل انڈا' چند بادام' چند کھجوریں اور دودھ کا ایک گلاس صبح کے ناشتے کے لیے ضروری ہے۔

7۔ ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے درمیانی عرصے میں ایک گلاس لیموں کا شربت یا پانی میں شہد ملا کر پئیں۔

دوپہر کے کھانے میں پھلوں کو زیادہ فوقیت دیں۔ اگر ہو سکے تو ایک ٹکڑا تربوز' ایک سیب' پپیتے کی چند قاشیں اور ایک دہی کا پیالہ ضرور لیں۔

8۔ رات کے کھانے میں سبزیوں کا استعمال کیجئے۔ پالک' بند گوبھی' گاجر' کھیرے کا سوپ پیجئے' سبزیوں کو ابال کر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دو سلائس براؤن بریڈ یا دو چپاتی لیجئے' کیونکہ رات کا کھانا عموماً" بھاری ہوتا ہے۔

9۔ رات کو سونے سے قبل ایک دودھ کا گلاس لیں۔

10۔ دن بھر میں کم از کم دس گلاس پانی پیجئے' تاکہ آپ کی رنگت نکھرے۔

11۔ چٹ پٹی اور تیل یا گھی میں تلی ہوئی چیزیں نقصان کا باعث ہوتی ہیں' اس لیے ضروری ہے کہ آپ چٹ پٹی اور تلی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں چائنیز کھانوں کی طرز پر مختلف سبزیاں پکا کر کھائیں۔

12۔ ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھیے کہ آپ کا چہرہ آپ کا محتاج ہے' اس لیے اس جانب خاص توجہ دیجئے۔ چہرے کو نکھارنے کے لیے روزانہ چہرے پر بیسن' ہلدی' ذرا سی بالائی ملا کر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد منہ دھولیں۔ جسم پر گائے کے کچے دودھ کا لیپ کریں۔

سر کے بال بھی توجہ کے طالب ہوتے ہیں' اس لیے ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ ہفتے میں دو دفعہ ضرور نہائیں اور نہانے سے قبل سرسوں کے تیل کا مساج بالوں میں ضرور کریں۔ اگر آپ کے بالوں میں خشکی ہے تو ناریل کے تیل میں لیموں کا عرق ملا کر بالوں میں لگائیں' تاکہ آپ کے بال مزید نہ گریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY